آثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد 23

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

فہرست

سورہ قمر ۲۰

سورۂ قمر کے مضامین ۲۹

فضیلت سورۂ قمر ۳۰

آیت ۱ تا ۳ ۳۱

چاند شق ہوگیا ۳۱

چند نکات ۳۴

۱. شق القمر، پیغمبر اسلامؐ کا ایک عظیم معجزہ ۳۴

۲. "شق القمر" موجودہ زمانے کے علوم کے لحاظ سے ۳۴

(الف) نظام شمسی کی تخلیق ۳۵

(ب) بڑے شہاب ۳۵

(ج) آسمانی کُرّوں کے انشقاق کا ایک دوسرا نمونہ ۳۵

(د) آسمانی کُرّوں کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ ۳۶

۳. "شق القمر" تاریخی اعتبار سے ۳۶

اس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ ۳۷

آیت ۴ تا ۸ ۳۹

وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر نکلیں گے ۴۰

ایک نکتہ

قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے ۴۲

آیت ۹ تا ۱۷ ۴۴

قوم نوح کا ماجرہ درس عبرت تھا ۴۵

آیت ۱۸ تا ۲۲

اور اسی طرح قوم عاد کی سرگزشت ۵۰

ایک نکتہ

نیک اور بد دن ۵۲

آیت ۲۳ تا ۳۲ ۵۶

قوم ثمود کا دردناک انجام ۵۸

آیت ۳۳ تا ۴۰ ۶۳

قوم لوط زیادہ منحوس صورت حال سے دوچار ہوئی ۶۴

آیت ۴۱ تا ۴۶ ۶۸

کیا تم گزشتہ اقوام سے افضل و برتر ہو ۶۹

ایک نکتہ

ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے والی پیش گوئی ۷۲

آیت ۴۷ تا ۵۵ ۷۳

مقام صدق میں خداوند مقتدر کے پاس ۷۴

چند ایک نکات

۱. اس جہان کی تمام چیزیں حساب و کتاب کی تابع ہیں ۷۷

۲. تقدیر الٰہی اور اس کے ارادہ کی آزادی ۷۸

۳. خدا کا فرمان صرف ایک ہی کلمہ ہے ۸۰

۴. سورۂ قمر کا آغاز و اختتام ۸۰

سورۂ رحمٰن ۸۳

سورۂ رحمٰن کا مضمون ۸۵

سورۂ رحمٰن کی تلاوت کی فضیلت ۸۷

آیت ۱ تا ۶ ۸۹

خدا کی نعمتوں کا آغاز ۹۰

ایک نکتہ

چند روایات پر ایک نظر ۹۴

آیت ۷ تا ۱۲ ۹۵

آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قرار دی ۹۶

چند نکات
۱. نعمتوں کی شناخت خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ ۱۰۰
۲. زندگی میں نظم وحساب کا مسئلہ ۱۰۰
آیت ۱۴ تا ۱۸ ۱۰۲
انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے ہوئی ہے۔ ۱۰۲
آیت ۱۹ تا ۲۵ ۱۰۶
سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ ۱۰۷
چند نکات
۱. سمندر خدا کی نعمتوں کے مرکز ۱۱۰
۲. گلف سٹریم بڑے بڑے سمندری دریا اور نہریں ۱۱۱
۳. بطون آیات میں سے ایک تفسیر ۱۱۲
آیت ۲۶ تا ۳۰ ۱۱۳
ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف تیرے لیے ہے ۱۱۴
چند نکات
۱. فنا کی کیا حقیقت ہے؟ ۱۱۶
۲. وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق کرتا ہے۔ ۱۱۷
۳. حرکتِ جوہری ۱۱۸
آیت ۳۱ تا ۳۶ ۱۲۰
اگر قدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سرحدوں سے آگے نکل جاؤ۔ ۱۲۱
آیت ۳۷ تا ۴۵ ۱۲۵
گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے ۱۲۶
آیت ۴۶ تا ۵۵ ۱۳۰
یہ دونوں جنتیں خائفین کے انتظار میں ہیں ۱۳۱
آیت ۵۶ تا ۶۱ ۱۳۶
ایک نکتہ
نیکی، نیکی کی جزا ہے ۱۳۹
آیت ۶۲ تا ۶۹ ۱۴۰
دو اور جنتیں اپنے حیران کن اوصاف کے ساتھ ۱۴۱
ایک نکتہ
پھلوں کی قدر وقیمت ۱۴۳
آیت ۷۰ تا ۷۸ ۱۴۵
جنت کی بیویوں کا دوسری مرتبہ تذکرہ ۱۴۶
چند نکات
سورہ واقعہ ۱۵۱
سورۂ واقعہ کے مضامین ۱۵۳
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت ۱۵۴
آیت ۱ تا ۱۲ ۱۵۷
آیت ۱۳ تا ۱۴ ۱۵۸
عظیم واقعہ ۱۵۹
آیت ۱۵ تا ۲۶ ۱۶۴
جنت کی وہ نعمتیں جو مقربین کی منتظر ہیں ۱۶۵
آیت ۲۷ تا ۳۹ ۱۷۰
آیت ۴۰ ۱۷۱
وہ نعمتیں جو اصحاب یمین کو حاصل ہوں گی۔ ۱۷۲
آیت ۴۱ تا ۵۰ ۱۷۶
اصحاب الشمال کو ملنے والی سزائیں اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب۔ ۱۷۷
آیت ۵۱ تا ۵۶ ۱۸۱
ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک اور حصہ ۱۸۲
آیت ۵۷ تا ۶۲ ۱۸۴
عقیدہ معاد پر سات دلیلیں ۱۸۵
ایک نکتہ
آیت ۶۳ تا ۶۷ ۱۸۹
دانوں کو اگانے والا خدا ہے یا تم ہو۔ ۱۸۹

آیت ۶۸ تا ۷۴ ۱۹۲
یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں ۱۹۳
ایک نکتہ
آیت ۷۵ تا ۸۲ ۱۹۸
صرف پاکیزہ افراد حریم قرآن تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ ۱۹۹
چند نکات ۲۰۲
آیت ۸۳ تا ۸۷ ۲۰۴
جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائے گی ۲۰۶
چند نکات
۱۔ جابرین کی ناتوانی کا لمحہ ۲۰۷
کیا جانکنی تدریجی امر ہے ؟ ۲۰۸
آیت ۸۸ تا ۹۵ ۲۰۹
نیک کاروں اور بدکاروں کا انجام ۲۱۰
ایک نکتہ
عالم برزخ ۲۱۳
سُورۂ حدید ۲۱۵
سُورۂ حدید کے مشمولات ۲۱۷
سُورۂ حدید کی تلاوت کی فضیلت ۲۱۸
آیت ۱ تا ۳ ۲۱۹
گہری فکر رکھنے والوں کی علامات ۲۲۰
ایک نکتہ
خدا کی صفات میں اضداد کا جمع ہونا ۲۲۲
آیت ۴ تا ۶ ۲۲۵
وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے ۲۲۶
ایک نکتہ
خدا کے اسم اعظم کی نشانیاں ۲۳۰
آیت ۷ تا ۱۰ ۲۳۱
آیت ۱۱ ۲۳۲
ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے دو عظیم سرمائے ہیں۔ ۲۳۳
چند نکات
۱۔ انفاق کے اسباب ۲۳۷
۲۔ راہِ خدا میں انفاق کے شرائط ۲۳۷
۳۔ ایمان، جہاد اور انفاق میں پیش قدمی کرنے والے ۲۳۹
آیت ۱۲ تا ۱۵ ۲۴۱
ہمیں اپنے نور سے استفادہ کرنے دو۔ ۲۴۳
ایک نکتہ
قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا ۲۴۶
آیت ۱۶ تا ۱۸ ۲۴۸
شانِ نزول ۲۴۹
غفلت و بے خبری کب تک ۲۴۹
وہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سن کر توبہ کی۔ ۲۵۲
آیت ۱۹ تا ۲۰ ۲۵۵
۱۔ دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ ۲۵۶
چند نکات ۲۵۱
دُنیاوی زندگی ان اسباب و علل کا مجموعہ ہے۔ ۲۶۰
آیت ۲۱ تا ۲۴ ۲۶۱
ایک عظیم معنوی مقابلہ ۲۶۳
آیت ۲۵ ۲۶۹
بعثتِ انبیاء کا مقصدِ اعلیٰ ۲۶۹
چند نکات
۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو ۲۷۲
۲۔ زندگی کی عمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلق رکھتی ہیں ۲۷۳
آیت ۲۶ تا ۲۷ ۲۷۵
ہم نے یکے بعد دیگرے انبیا بھیجے ۲۷۶

چند نکات	۲۷۹
۱. اسلام اور رہبانیت	۲۷۹
۲. رہبانیت کا تاریخی سرچشمہ	۲۸۰
۳. رہبانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مفاسد	۲۸۱
۴. انجیل یا اناجیل	۲۸۳
آیت ۲۸ تا ۲۹	۲۸۴
شانِ نزول	۲۸۵
ایک نکتہ	
تقویٰ اور نگاہِ دُور رس کا رابطہ	۲۸۷
۵. سُورہ مجادلہ	۲۸۹
سُورۂ "مجادلہ" کے مضامین	۲۹۱
سُورۂ "مجادلہ" کی تلاوت کی فضیلت	۲۹۱
آیت ۱ تا ۴	۲۹۳
شانِ نزول	۲۹۵
ظہار زمانۂ جاہلیت کا ایک قبیح عمل	۲۹۶
بعض احکامِ ظہار	۳۰۰
آیت ۵ تا ۷	۳۰۲
وہ جو خدا سے دُشمنی کرتے ہیں	۳۰۳
اس آیت میں چند نکات قابلِ توجہ ہیں	۳۰۵
ایک نکتہ	۳۰۶
آیت ۸ تا ۱۰	۳۰۸
شانِ نزول	۳۰۹
چند نکات	
۱. نجویٰ کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں	۳۱۲
۲. خدا کا سلام کون سا ہے؟	۳۱۳
آیت ۱۱	
شانِ نزول	۳۱۴
مجالس میں پہلے آنے والوں کا احترام	۳۱۵
چند نکات	۳۱۶
۲. آدابِ مجلس	۳۱۸
آیت ۱۲ تا ۱۳	۳۱۹
شانِ نزول	۳۲۰
ایک جاذبِ توجہ امتحان	۳۲۰
چند نکات	
آیۂ نجویٰ وصدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص	۳۲۱
۲. نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریع اور پھر نسخ کا فلسفہ	۳۲۲
۳. کیا یہ فضیلت تھی؟	۳۲۳
۴. مدتِ حکم اور مقدارِ صدقہ	۳۲۴
آیت ۱۴ تا ۱۹	۳۲۵
حزبِ شیطان	۳۲۷
آیت ۲۰ تا ۲۲	۳۳۱
حزب اللہ کامیاب ہے	۳۳۲
چند نکات	
۱. حزب اللہ اور حزبِ شیطان کی اصل نشانی	۳۳۶
۲. حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر	۳۳۷
۶. سُورہ حشر	۳۳۹
سُورۂ حشر کے مضامین	۳۴۱
اس سُورہ کی فضیلت	۳۴۲
آیت ۱ تا ۵	۳۴۳
شانِ نزول	۳۴۴
یہود بنی نضیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ	۳۴۶
چند نکات	
۱. خدا کے غیر مرئی لشکر	۳۵۱
۲. موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں	۳۵۲
آیت ۶ تا ۷	۳۵۳

شانِ نزول ۳۵۴

اِن اموالِ غنیمت کے بارے میں حکم جو جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں۔ ۳۵۴

ایک نکتہ

۱۔ فیٔ کا مصرف (وُہ اموالِ غنیمت جو بغیر جنگ کے حاصل ہوں اُن کا مصرف) ۳۵۸

۲۔ ایک سوال کا جواب ۳۵۸

۳۔ فدک کی غم انگیز داستان ۳۵۹

آیت ۸ تا ۱۰ ۳۶۱

تین گروہ مہاجرین، انصار اور تابعین اور ان کے نمایاں اوصاف ۳۶۲

ایک نکتہ

صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں ۳۶۷

آیت ۱۱ تا ۱۴ ۳۶۸

شانِ نزول ۳۷۰

یہودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں منافقین کی شمولیت ۳۷۰

آیت ۱۵ تا ۲۰ ۳۷۴

شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ کنویں میں نہ جاؤ۔ ۳۷۵

چند نکات ۳۷۹

۱۔ اہلِ نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکت عمل ۳۷۹

۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان ۳۸۰

۳۔ جو کچھ آگے بھیجنا چاہیئے ۳۸۱

آیت ۲۱ تا ۲۴ ۳۸۳

اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ۳۸۴

چند نکات

۱۔ قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ ۳۸۹

۲۔ سُورہ حشر کی آخری آیات ۳۸۹

سُورۂ قمر

یہ سُورہ مکہ میں نازل ہُوا ۔

اِس میں ۵۵ آیتیں ہیں ۔

تاریخ آغاز : ۷/۹/ ۱۳۶۴ھ ش ، ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۶ھ ق

سُورۂ قمر کے مضامین

یہ سُورہ اپنے اندر مکی سُورتوں کی خصوصیتیں یعنی مبداء و معاد کے عظیم مباحث کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ یہ سُورہ گزشتہ اقوام سے تعلق رکھنے والے ایک گروہ کی بدکاری کو بیان کرتا ہے جو ہٹ دھرمی، عناد، کفر، ظلم اور فساد کے راستے پر چلنے کی وجہ سے خُدا کی طرف سے بھیجے ہُوئے سرکوبی کرنے والے پے بہ پے عذاب میں گرفتار ہو کر ہلاک ہوئے۔ ان افراد کے متعلق بیان ہونے والی ہر سرگزشت کے بعد یہ سُورہ (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر) "ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کی نصیحت کے لیے آسان کیا ہے تو کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے" کی تکرار کرتا ہے تاکہ مسلمانوں اور کافروں دونوں کے لیے درسِ عبرت ثابت ہو۔

اِس سُورہ کے مضامین کو مجموعی طور پر چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سُورہ کے آغاز میں قُربِ قیامت، شق القمر اور مخالفین کی طرف سے آیاتِ الٰہی کے انکار پر گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ دُوسرے حصّہ میں سب سے پہلی سرکش، متمرّد اور ہٹ دھرم قوم یعنی قوم نوح اور طوفانِ نُوح کے بارے میں مختصر بحث ہے

۳۔ تیسرا حصّہ قوم عاد کی داستان بیان کرتا ہے اور ان پر آنے والے دردناک عذاب کی کیفیت پیش کرتا ہے۔

۴۔ چوتھے حصّہ میں قوم ثمود اور ان کی مخالفت کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام سے روا رکھی۔ ناقہ صالح کے معجزہ کا بھی ذکر ہے۔ آخر میں اس عذاب الٰہی کا بیان ہے جو اس گروہ پر آیا۔

۵۔ اس کے بعد قوم لوط کا ذکر ہے اور ان کے کفر کی جانب اور اخلاق سے انحراف کی طرف ضمنی طور پر مختصر سا اشارہ ہے اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا بیان ہے۔

۶ ۔ ایک اور حصہ میں آلِ فرعون اور ان پر عذاب و سزا کے بارے میں مختصر سی گفتگو ہے ۔

۷ ۔ آخری حصہ میں گزشتہ اقوام، مُشرکینِ مکّہ اور مخالفینِ پیغمبرِ اسلام کا موازنہ ہے اور مُشرکینِ مکّہ کے اُس بھیانک مُستقبل کا تذکرہ ہے جو وہ اپنی روش کی وجہ سے اپنے لیے متعین کرچکے تھے ۔

یہ سُورہ مجرموں کی سزا، ان پر نازل ہونے والے عذاب اور پرہیزگاروں کو ملنے والے اُجر و ثواب کے بیان پر ختم ہوتا ہے ۔

اس سُورہ کی آیتیں عام طور پر مختصر اور دل ہلا دینے والی ہیں ۔

اس سُورہ کا نام پہلی آیت کی مناسبت سے " قمر " رکھا گیا ہے ۔ پہلی آیت شق القمر کو موضوعِ بحث بناتی ہے ۔

فضیلتِ تلاوتِ سُورہ قمر

ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں : " من قرأ سورة اقتربت الساعة فی کل غب بعث یوم القیامة و وجهه علی صورة القمر لیلة البدر ومن قرأ ها کل لیلة کان افضل وجاء یوم القیامة ووجهه مسفر علی وجوه الخلائق " " جو شخص سُورہ اقتربت کو ایک دن چھوڑ کر پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس حالت میں اُٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہوگا اور جو اسے ہر شب میں پڑھے تو یہ اس سے بھی افضل ہے ۔ قیامت میں ایسے شخص کے چہرے کی روشنی تمام مخلوق پر برتری رکھتی ہوگی "۔[1]

میدانِ قیامت میں چہرے کی یہ چمک یقیناً مضبوط اور سچّے ایمان کی علامت ہوگی ۔ یہ چمک اس سُورہ کی تلاوت، اس میں غور و فکر اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوگی نہ صرف تلاوت سے نہیں ۔

✣ ✣ ✣

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۹ آغاز سورۂ قمر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝

۲۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝

۳۔ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہوگیا۔

۲۔ جس وقت نشانی اور مُعجزہ کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحرِ مستمر ہے۔

۳۔ اُنہوں نے (خدا کی آیتوں کی) تکذیب کی، اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور ہر اَمر کے لیے ایک قرارگاہ ہے۔

تفسیر

چاند شق ہوگیا

پہلی آیت میں دو اہم باتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ ایک تو قیامت کا آنا کہ جس کا وُرود اس عالم فانی کے لیے اپنے ہمراہ ایک عظیم انقلاب لیے ہوئے ہے۔ دوسرا عنوان ہے "نئی زندگی کی ابتداء"۔ وہ ایسی دُنیا ہے کہ جس کی عظمت و وُسعت اس دُنیائے دَنی میں مقید رہنے والوں کے لیے ناقابلِ فہم و ناقابلِ توصیف ہے۔

دُوسرا واقعہ "مُعجزہ شق القمر" کا ہے جو خُدائے بزرگ و برتر کی ہر شے پر قُدرت رکھنے کی دلیل بھی ہے اور اس کے پیغمبرِ گرامیِ قدر

کی صداقت کی نشانی بھی۔ قیامت قریب ہوئی اور چاند شق ہوگیا۔ (اقتربت الساعة وانشق القمر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ سُورہ "سُورۂ نجم" قربِ قیامت کو بیان کرنے والے جُملوں پر ختم ہوا۔ "ازفت الازفة" یہ سُورہ بھی اسی معنی و مفہوم سے شروع ہو رہا ہے۔ یہ تاکید ہے اس بات کی کہ قیامت قریب ہے خواہ یہ قُربِ دُنیا کے پیمانے کے اعتبار سے ہزاروں سال ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس دُنیا کی مجموعی عمر کی طرف توجہ کرتے ہُوئے اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس دُنیا کی تمام عمر قیامت کے مقابلے میں ایسے ایک لمحہ سے زیادہ نہیں جو جلدی سے گزر جائے، اس سے مقصود یہ ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم واضح ہو جائے۔

مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق ان دونوں حادثوں کا اکٹھا ذکر اس وجہ سے ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ جو کہ خُدا کے آخری پیغمبر ہیں ان کا ظہور اصولی طور پر خُود قُربِ قیامت کی ایک نشانی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث ہے، آپؐ نے فرمایا: بعثت انا والساعة کهاتین "میرا مبعوث ہونا اور قیامت مثل ان دو کے ہے"[1] یہ آپؐ کی دو اُنگلیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت ایک دُوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔

دُوسری طرف چاند کا دو ٹکڑے ہونا ستاروں کے نظام کے درہم برہم ہونے کے امکان پر خُود ایک دلیل ہے اور ایک چھوٹا سا نمونہ ہے ان عظیم حادثات کا جو قُربِ قیامت میں ظہور پذیر ہوں گے کیونکہ تمام ستارے بمع زمین ٹُوٹ پھُوٹ جائیں گے اور ان کی جگہ ایک نئی دُنیا معرضِ وجود میں آجائے گی۔ ایسی مشہور روایات کے مطابق کہ جن کے بارے میں بعض راویوں نے متواتر ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے مُشرکین پیغمبرؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر آپ سچ کہتے ہیں اور خُدا کے پیغمبر ہیں تو ہم کو چاند کے دو ٹکڑے کرکے دکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اگر میں یہ کام کرکے دکھا دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے"؟ اُنہوں نے کہا جی ہاں۔ وہ چودھویں کی رات تھی۔ پیغمبرؐ نے بارگاہِ ایزدی میں دُعا کی کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں وہ تو کر دے۔ چاند اچانک دو ٹکڑے ہوگیا۔ رسول اللہؐ ایک ایک شخص کو آواز دیتے تھے اور فرماتے تھے[2] "یہ مُعجزہ دیکھ لو"

اس سلسلہ میں چند سوالات ہیں مثلاً یہ کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک آسمانی کُرہ شق ہو کر دو ٹکڑے ہو جائے نیز اس قسم کا حادثہ کُرۂ زمین اور نظامِ شمسی کے لیے اپنے اندر کیا تاثیر رکھتا ہے۔ شگافتہ ہو جانے کے بعد چاند کے دونوں ٹکڑوں کے ملنے کی کیفیت اور یہ کہ اس قسم کے حادثہ کا ہونا کس طرح ممکن ہے۔ پھر یہ بھی کہ تواریخ عالم نے اس کا ذکر بھی نہ کیا ہو۔ اس ضمن میں کچھ یہ اور کچھ ایسے ہی دوسرے سوالات ہیں۔ اِنشاءاللہ نکات کے ذیل میں ہم یہ سب تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

وُہ نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے یہ ہے کہ بعض ایسے مفسرین، کہ جن کی شہرت اچھی نہیں ہے اور جو ہر قسم کے اس عمل کے جو خارقِ عادت ہو "سوائے قرآن کے" پیغمبرِ اسلامؐ کے ذریعے انجام پانے کے مُنکر ہیں باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا آیت واضح ہے اور اس عنوان پر عُلمائے اسلام کی کتابوں میں روایات کثرت سے موجود ہیں، وہ اُلجھن میں گرفتار ہیں کہ اس خارقِ عادت عمل کی کس طرح توجیہ کریں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس موضوع کو اس طرح زیرِ بحث لائیں کہ اس واقعہ کے معجزانہ پہلو کی نفی ہو جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۲۹، ص ۲۹

[2] "مجمع البیان" اور دُوسری کتب تفاسیر زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

شق القمر کا واقعہ بطور اعجاز ظہور پذیر ہوا ہے اور بعد میں آنے والی آیتیں اس امر پر اپنے اندر واضح شواہد لیے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ آیاتِ قرآنی معجزہ کی نفی کرتی ہیں تو وہ ایسے معجزات کی طرف اشارہ ہے کہ بہانے بنانے والے افراد جن کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ نہ تو حق کو قبول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور نہ اس کے انجام پا جانے کے بعد حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ وہ معجزات کہ جن کی تحقیق کے لیے مطالبہ ہوتا تھا پیغمبرؐ کی طرف سے انجام پاتے تھے۔ اس امر پہ بہت سے شواہد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی میں موجود ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے "ہٹ دھرم اور کج بحثی کرنے والے مخالفین جب تیری تبلیغ کی صداقت کے بارے میں کوئی معجزہ یا نشانی دیکھتے ہیں تو اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعی مستقل جادو ہے" (وان یروا اٰیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر)۔ مستمر کا لفظ اس لیے کہا کہ انہوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کی طرف سے پے در پے معجزات دیکھے تھے اور "شق القمر" اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ وہ ان سب باتوں کو مستقلاً جادو قرار دیتے تھے اگرچہ یہ تہمت حق کو تسلیم نہ کرنے کا محض ایک بہانہ تھی۔ کچھ مفسرین نے "مستمر" کے معنی طاقتور قرار دیے ہیں۔ جیسا کہ (حبل مریر) کہا جاتا ہے جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی ناپائیدار کے لیے ہیں۔ لیکن صحیح پہلی تفسیر ہی ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے مخالفانہ نکتے اور اس مخالفت کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی نحوست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "انہوں نے تکذیب کی اور اپنی ہوائے نفس کی پیروی کی اور ہر چیز کی ایک قرارگاہ ہے"۔ (وکذبوا واتبعوا اھواءھم وکل امر مستقر)۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی مخالفت یا آپؐ کے دلائل اور معجزات کی تکذیب اور قیامت کے انکار کا سبب ان کی ہوائے نفس کی پیروی تھی۔ تعصب، ہٹ دھرمی اور نفس پرستی انہیں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرنے دیتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلا کسی قید کے مفادات کا حاصل کرنا اور ہر قسم کے گناہ میں آلودہ ہونا اس راہ میں حائل تھا کہ وہ دعوتِ حق کو قبول کریں کیونکہ دعوتِ حق کا قبول کرنا ذمہ داری عائد کرتا تھا۔ جی ہاں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا کیونکہ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مفاد پرستی ہی ہوتی ہے۔

(وکل امر مستقر)۔ "ہر چیز کی ایک قرارگاہ ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کی سزا پائے گا۔ نیکی کرنے والوں کی نیکی کی قرارگاہ اور برائی کرنے والوں کی برائی کی قرارگاہ۔ اس تفسیر سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی اور ہر نیکی اور برائی باقی رہتی ہے یہاں تک انسان اس کی جزا یا سزا پائے۔

مندرجہ بالا تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ جھوٹے الزامات حق کے چہرے کو ہمیشہ نہیں چھپا سکتے۔ ہر چیز اپنی قرارگاہ کی طرف جاتی ہے اور زیادہ دیر نہیں لگتی کہ حق کا خوبصورت اور باطل کا قبیح چہرہ آشکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس دنیا کی ایک مستقل روایت ہے۔ یہ تفسیریں ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

❖ ❖ ❖

چند ایک نکات

۱۔ شق القمر۔ پیغمبرؐ اسلام کا ایک عظیم معجزہ : اگرچہ بعض کوتاہ نظر مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ اس معجزہ کی اس طرح توجیہ کریں کہ اس کی خارق العادت حیثیت باقی نہ رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا آیت آئندہ اور مستقبل کے بارے میں خبر دیتی ہے' قیامت کی شرائط سے متعلق ہے اور اس سے پہلے کے حوادث میں سے ہے۔ لیکن ایسی متعدد قرآنی آیات موجود ہیں جو اس کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس معجزہ کا بیان ماضی کے صیغے میں کیا گیا ہے جو بتاتا ہے کہ شق القمر واقع ہو چکا ہے جیسا کہ آخری پیغمبرؐ کے مبعوث ہونے کی وجہ سے قربِ قیامت کی تصدیق ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں اگر گفتگو معجزے کے بارے میں نہ ہو تو پیغمبرؐ کی طرف سحر کی نسبت' جو بعد والی آیت میں آئی ہے' کوئی مناسبت نہیں رکھتی اور اس طرح (وکذبوا واتبعوا اھواءھم) کا جملہ جو ان کی تکذیب کی خبر دیتا ہے' وہ بھی کوئی مناسبتِ کلام نہیں رکھتا۔

قطع نظر اس سے کُتبِ اسلامی میں اس معجزے کے وقوع کے بارے میں بہت سی روایات بھی موجود ہیں جو حدِ تواتر و شہرت تک پہنچی ہوئی ہیں اور اس وجہ سے قابلِ انکار نہیں ہیں۔ ہم فخر الدین رازی اور طبرسی اہل سنت اور اہل تشیع کے دو معروف مفسرین کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہیں۔ فخر الدین رازی کا کہنا ہے کہ زیادہ تر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے اور صحیح روایتیں بھی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا وقوع ایسا نہیں کہ اس کے ماننے میں کسی قسم کے شک یا تردّد کو دخل ہو۔ پھر پیغمبرِ اسلامؐ نے اس کی خبر دی ہے اس بنا پر اسے قبول کرنا چاہیئے۔ باقی رہی عدم فرق والتیام کی داستان (مطابق عقیدۂ ابطال شدہ بطلیوس) تو وہ بے بُنیاد ہے اور اس کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ دلائل عقلیہ سے ثابت ہے کہ افلاک میں سے کسی چیز کا ٹوٹنا اور پھر جڑ جانا ممکن ہے۔ مرحوم طبرسی مجمع البیان میں رقم طراز ہیں کہ مفسرین اس آیت کو زمانۂ پیغمبرؐ اسلام میں رُونما ہونے والے معجزۂ شق القمر سے متعلق سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد ان چند مخالفین کے بے اعتنائی کے ساتھ نام لیتے ہیں۔ وہ نام یہ ہیں عطا، حسن اور بلخی۔

بعض افراد نے نقل کیا ہے کہ حذیفۂ یمانی جو مشہور صحابی تھے اُنھوں نے شق القمر کا واقعہ مسجد مدائن میں ایک کثیر جماعت کے سامنے بیان کیا۔ وہاں ان پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے حاضرین ایسے تھے جنھوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کا زمانہ دیکھا تھا (اس حدیث کو دُرِ منثور اور قرطبی نے اس آیت کے عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے)

آیت میں جس مفہوم کے قرائن موجود ہیں' جو روایات اس سلسلہ میں ہیں اور جو مفسرین کے اقوال ہیں' ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی شق القمر کا واقعہ قابلِ انکار نہیں ہے۔ یہاں چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کے جواب ہم پیش کرتے ہیں۔

۲۔ "شق القمر" موجودہ زمانے کے علوم کے لحاظ سے : وہ اہم سوالات جو اس بحث میں سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اجرامِ سماوی میں شگاف کا پیدا ہونا اصولی طور پر ممکن ہے یا نہیں اور علم اس کی تائید کرتا ہے یا تردید۔ ماہرین فلکیات کے انکشافات کے مطالعے سے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات نہ صرف یہ کہ محال نہیں ہیں بلکہ ایسے امور کا مشاہدہ ہوا ہے اگرچہ ہر مشاہدہ میں مخصوص عوامل کارفرما تھے۔ نظامِ شمسی کے متعلقات اور

دُوسرے آسمانی کُروں میں سے کسی آسمانی کُرہ کا اس طرح شق ہونا اور پھر مِل جانا ایک ممکن اَمر ہے ۔ نمونے کے طور پر چند باتیں درج ذیل ہیں

(الف) **نظامِ شمسی کی تخلیق** : اس نظریے کے تمام ماہرین نے تصدیق کی ہے کہ نظامِ شمسی سے تعلق رکھنے والے تمام کُرّے ابتداء میں سُورج کے اجزا تھے۔ کسی وقت اس سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے مدار میں گردش کرنے لگے ۔ یہ بات ضرور ہے کہ الگ ہونے کے اس عمل کے اسباب و عوامل میں اختلاف ہے ۔" لاپلاس" کا نظریہ یہ ہے کہ کسی چیز کے الگ ہونے کے اس عمل کا سبب مرکز سے گریز کی وُہ قوت ہے جو سُورج کے منطقہ استوائی میں پائی جاتی ہے ۔ وہ اس طرح کہ جس وقت سُورج ایک جلانے والی گیس کے ٹکڑے کی شکل میں تھا (اور اَب بھی ایسا ہی ہے) اور اپنے گرد گردش کرتا تھا تو اس گردش کی سُرعت منطقہ استوائی میں اس بات کا سبب بنی کہ سُورج کے کچھ ٹکڑے اس سے الگ ہو جائیں اور فضا میں بکھر جائیں اور مرکز اصلی یعنی خُود سُورج کے گرد گردش کرنے لگیں لیکن " لاپلاس" کے بعد بعض دوسرے ماہرین کی تحقیقات ایک دوسرے مفروضہ پر منتج ہوئیں ۔ وہ اس علیحدگی کا سبب اس شدید مدّ و جزر کو قرار دیتے ہیں جو سُورج کی سطح پر سے ایک بہت بڑے ستارے کے عبور کرنے کی وجہ سے ہوا ۔ اس مفروضہ سے اتفاق کرنے والے اس وقت کی سُورج کی حرکتِ وضعی کو سُورج کے ٹکڑوں کے علیحدہ ہونے کی توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے ۔ وہ اس مفروضہ کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مدّ و جزر نے سُورج کی سطح پر بہت بڑی بڑی لہریں اس طرح پیدا کیں جیسے پتھر کا کوئی بہت بڑا ٹکڑا سمندر میں گرے اور اس سے لہریں پیدا ہوں اس طرح سُورج کے ٹکڑے یکے بعد دیگرے باہر نکل کر گر پڑے اور خُود سُورج کے گرد گردش کرنے لگے ۔ بہرحال اس علیحدگی کا عامل کچھ بھی ہو اس پر سب متفق ہیں کہ نظامِ شمسی کی تخلیق انشقاق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی ۔

(ب) **بڑے شہاب** : یہ بڑے بڑے آسمانی پتھر ہیں کہ جو نظامِ شمسی کے گرد گردش کر رہے ہیں اور جو کبھی کبھی چھوٹے کُرات اور سیاروں سے مشابہت رکھنے والے قرار دیے جاتے ہیں ۔ بڑے اس وجہ سے کہ ان کا قطر ۲۵ کلومیٹر تک ہوتا ہے لیکن وہ عموماً اس سے چھوٹے ہوتے ہیں ۔ ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ " استروئیدھا " ایک عظیم سیارے کے بقیہ جات ہیں کہ جو مشتری اور مریخ کے درمیان مدار میں حرکت کر رہا تھا اور اس کے بعد نامعلوم عوامل کی بنا پر وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اَب تک پانچ ہزار سے زیادہ اس طرح کے ٹکڑے شہاب معلوم کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے جو بڑے ہیں ان کے نام بھی رکھے جا چکے ہیں بلکہ ان کا حجم ، مقدار اور سُورج کے گرد ان کی گردش کا حساب بھی لگایا جا چکا ہے ۔ بعض ماہرینِ فضا ان استروئیدوں کی خاص اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کا نظریہ ہے کہ فضا کے دُور دراز حصّوں کی جانب سفر کرنے کے لیے اوّلین قدم کے عنوان سے ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔

آسمانی کُروں کے انشقاق کا ایک دُوسرا نمُونہ

(ج) شہابِ ثاقب چھوٹے چھوٹے آسمانی پتھر ہیں جو کبھی کبھی چھوٹی اُنگلی کے برابر بھی ہوتے ہیں ۔ بہرحال وہ سُورج کے گرد ایک خاص مدار میں بڑی تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں اور جب کبھی ان کی سمتِ سفر کُرۂ زمین کے مدار کو کاٹ کر گزرتی ہے تو وُہ زمین کا رُخ اختیار کرتے ہیں ۔ یہ چھوٹے پتھر ، اس ہوا سے شدّت کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے ، کہ جو زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور تھرتھراہٹ پیدا کرنے والی اس تیزی کی وجہ سے کہ جو ان کے اندر ہے زیادہ گرم ہو کر اس طرح بھڑک اُٹھتے ہیں کہ ان میں سے شعلے

نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم انہیں ایک پُر نُور، خوبصورت لکیر کی شکل میں فضائے آسمانی میں دیکھتے ہیں اور انہیں "شہاب کے تیر" کے نام سے موسُوم کرتے ہیں اور کبھی یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دُور دراز کا ستارہ ہے جو گر رہا ہے حالانکہ وہ چھوٹا شہاب ہے کہ جو بہت ہی قریبی فاصلہ پر بھڑک کر خاک ہو جاتا ہے۔

شہابوں کی گردش کا مدار زمین کے مدار سے دو نقطوں پر ملتا ہے۔ اسی بنا پر مرداد (ایرانی مہینے کا نام ہے) اور آبا نماہ (یہ بھی ایرانی مہینے کا نام ہے) میں جو دو مداروں کے نقطہ تقاطع ہیں، شہاب ثاقب زیادہ نظر آتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ دُمدار ستارے کے بقیہ حصے ہیں جو نامعلوم حوادث کی بنا پر پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

آسمانی کُروں کے پھٹنے کا ایک اور نمونہ

بہر حال آسمانی کُروں کا انفجار و انشقاق یعنی پھٹنا اور پھٹ کر بکھرنا کوئی بے بُنیاد بات نہیں ہے اور جدید علوم کی نظر میں یہ کوئی فعلِ محال بھی نہیں کہ یہ کہا جائے کہ معجزہ کا تعلق امرِ محال کے ساتھ نہیں ہوا کرتا۔ یہ سب انشقاق یعنی پھٹنے کے سلسلہ کی باتیں ہیں، دو ٹکڑوں میں جو قوتِ جاذبہ ہوتی ہے اس بنا پر اس انشقاق کی بازگشت ناممکن نہیں ہے۔

اگرچہ ہیئتِ قدیم میں بطلیموس کے نظریہ کے مطابق نو آسمان پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکوں کی طرح ہیں اور گھومتے رہتے ہیں اور یوں یہ نو آسمان ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جن کا ٹوٹنا اور جڑنا ایک جماعت کی نظر میں امرِ محال تھا۔ اس لیے اس نظریہ کے حامل افراد معراجِ آسمانی کے بھی منکر تھے اور "شق القمر" کے بھی لیکن اب جب کہ ہیئتِ بطلیموس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تو اب ان باتوں کی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ یہ نکتہ کسی یاددہانی کا محتاج نہیں کہ "شق القمر" ایک عام طبیعی عامل کے زیرِ اثر رُونما نہیں ہوا بلکہ اعجاز نمائی کا نتیجہ تھا لیکن چونکہ اعجاز محالِ عقلی سے تعلق نہیں رکھتا لہذا یہاں مطلوب اس مقصد کے امکان کو بیان کرنا تھا، غور فرمائیں۔

۳۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے

ایک اور اعتراض جو بعض بے خبر افراد "شق القمر" پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ شق القمر کا اپنی اس اہمیت کے ساتھ کہ جو وہ رکھتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا تو دُنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا جب کہ ایسا نہیں ہوا۔

یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس اعتراض کی حقیقت کیا ہے اس مسئلہ کا تجزیہ اور اس کی تحلیل کی جاتی ہے۔

(الف) یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ چاند ہمیشہ صرف آدھے کُرہ ارض سے نظر آتا ہے اور سارے کُرہ ارض سے بیک وقت نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے زمین کے آدھے حصہ کے لوگ تو اس حساب سے خارج ہیں یعنی ان کے اس واقعہ کے دیکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(ب) اس نیم کُرہ کے جو آدھے لوگ ہیں ان میں اکثریت کا سویا ہوا ہونا ممکن ہے، چونکہ معاملہ آدھی رات کے بعد کا ہے۔ اس لیے ساری دُنیا کے چوتھائی افراد اس واقعہ سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

(ج) قابل رویت حصہ میں بھی عین ممکن ہے کہ آسمان کا کوئی خاص حصہ اَبر آلود ہو اور چاند کا چہرہ بادلوں میں پوشیدہ ہو۔

(د) آسمانی حوادث افراد کی توجہ صرف اس صُورت میں اپنی طرف مبذول کرتے ہیں جب بجلیوں کی سی شدید کڑک اپنے اندر رکھتے ہوں یا مکمل گرہن کی صُورت میں کہ جب چاند بالکل ہی غائب ہو جائے اور وہ بھی ایک طویل وقفہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منجمین کی طرف سے اعلان نہ ہو تو چھوٹے موٹے گہن کی بہت کم لوگوں کو خبر ہوتی ہے۔ بہت سے افراد تو مکمل چاند گرہن سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ صرف وہ لوگ کہ جو اجرامِ فلکی یعنی چاند وغیرہ کا رصدگاہوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ کہ اتفاق سے جن کی نگاہ آسمان پر پڑ جائے تو ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے واقعہ سے باخبر ہوں اور کچھ اور لوگوں کو بھی باخبر کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا مختصر وقت کے لیے رُونما ہونے والا واقعہ جیسا کہ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، پُوری دنیا کے لوگوں کی توجہ تو جذب کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ علی الخصوص اس زمانے کے لوگ کہ جو اجرام سماوی کی اہمیت کے اصولی طور پر بہت کم قائل تھے۔

(ہ) علاوہ ازیں تاریخ میں مندرج مطالب اور ان کی نشر و اشاعت کے وسائل اس زمانے میں محدُود تھے، یہاں تک کہ لکھے پڑھے افراد بہت کم تھے اور کتابیں صرف ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت موجودہ دَور کی کیفیت نہیں تھی کہ اہم واقعات بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو اس واقعہ کے غیر اسلامی تاریخوں میں مندرج نہ ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اس صُورتِ حال کو اس واقعہ کی نفی پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ اِس عظیم معجزہ کے وقوع کی تاریخ

راویانِ حدیث اور مفسرین میں اس بات پر قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے کہ شق القمر کا معجزہ پیغمبرِ اسلام کی ہجرت سے پہلے قیامِ مکہ کے زمانے میں رُونما ہوا۔ لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابتدائے بعثتِ پیغمبرؐ میں ہوا ہے[1] جب کہ بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں ہجرت کے قریب ہوا اور وہ بھی کچھ حقیقت کے متلاشی افراد کے تقاضے پر۔ وہ مدینہ میں پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے عقبہ میں آپ کی بیعت کی[2] بعض روایات سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی طرف سے شق القمر کا اعجاز دکھانے کی علت یہ تھی کہ جادو اور سحر کے اثرات زمینی امور سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بات کا اطمینان حاصل کرلیں کہ محمدؐ کے معجزات جادو نہیں ہیں[3]

متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کی ایک جماعت نے اس معجزہ کو دیکھ کر کہا کہ ہم اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ شام اور یمن کے قافلے آن پہنچیں اور ہم ان سے سوال کریں کہ کیا اُنہوں نے یہ واقعہ دیکھا ہے لیکن جب آنے والے مسافروں نے اس واقعہ

[1] "بحار الانوار" جلد ۱۷ ص ۳۵۴ (حدیث ۸)
[2] " " " ۳۵۲ (حدیث ۱)
[3] " " " ۳۵۵ (حدیث ۱۰)

کی تصدیق کی تب بھی وہ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے۔[1]

آخری نکتہ کہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے اور بہت سے معجزات کی طرح یہ معجزہ بھی تاریخ اور ضعیف روایتوں کے خرافات میں آمیزش کا شکار ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اس کا چہرہ غور و فکر کرنے والوں کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ مثلاً یہ کہ چاند کے ایک ٹکڑے کا زمین پر آنا وغیرہ۔ مناسب یہ ہے کہ ایسی خرافات کو اس واقعہ سے جُدا رکھنا چاہیئے تاکہ معجزہ کی اصل حقیقت اس میں ملوث نہ ہو۔

✣ ✣ ✣

---

[1] درالمنثور جلد ۶ صفحہ ۱۳۳۔

۴۔ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ

۵۔ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۙ

۶۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۙ

۷۔ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ
جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ

۸۔ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ
عَسِرٌ ○

ترجمہ

۴۔ بُرائیوں سے عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی خبریں ان تک پہنچی ہیں۔

۵۔ یہ آیتیں خُدا کی حکمتِ بالغہ ہیں لیکن ڈرانے والی چیزیں (ہٹ دھرم لوگوں کے لیے) مفید نہیں ہیں۔

۶۔ اس بنا پر ان سے مُنہ پھیر لے اور اس دن کو یاد کر جب خُدا کی طرف بُلانے والا لوگوں کو اعمال کے حساب کے لیے بلائے گا۔

۷۔ وہ قبروں سے نکلیں گے اس صورت میں کہ ان کی آنکھیں وحشت کی وجہ سے جُھکی ہوئی ہوں گی اور وہ منتشر ٹڈی دل کی طرح بلامقصد ہر طرف دوڑ رہے ہوں گے۔

۸ ۔ درآنحالیکہ (وحشت و اضطراب کے زیرِ اثر) اس بلانے والے کی طرف سَر اُٹھا کر دیکھیں گے اور کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے۔

تفسیر

وہ دن کہ جب سب قبروں سے باہر نکلیں گے

اس بحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں کفّار کی ایک ایسی جماعت کے بارے میں کہ جس نے پیغمبرِ اسلامؐ کی تکذیب کی تھی اور کسی بھی معجزے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا تھا، یہ آیتیں آئیں۔ ان میں اس قسم کے افراد کے بارے میں مزید تفصیل ہے اور یہ کہ قیامت میں دردناک عذاب کی وجہ سے ان کا کیا حال ہوگا۔

پروردگارِ عالم پہلے ارشاد فرماتا ہے کہ اس طرح نہیں ہے کہ یہ لوگ بے خبر ہوں بلکہ وہ خبریں کہ جو ان کے لیے بُرائیوں سے اور قبیح چیزوں سے دامن بچانے کا موجب بن سکتی ہیں کافی مقدار میں ان کے پاس آئی ہیں (ولقد جاءهم من الانباء مافیه مزدجر)۔ خدا کی طرف بلانے والوں کی تبلیغ میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ یہ ان کا بے غیرت پن ہے، یہ نہ تو سُننے والے کان رکھتے ہیں اور نہ ان میں حق طلبی کی رُوح ہے۔ ان میں اس حد تک تقویٰ بھی موجود نہیں کہ جو انہیں آیاتِ الٰہی میں تحقیق و تدبر کی دعوت دے۔

"انباء" (خبریں) سے مراد گزشتہ اُمتوں اور قوموں کی خبریں ہیں جو مختلف النوع سزاؤں اور عذاب سے ہلاک ہوئیں۔ اس میں قیامت کی خبریں ہیں اور ظالموں اور کافروں کی ان سزاؤں کے بارے میں بیان ہے جس کا ذکر وضاحت سے قرآن میں موجود ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرماتا ہے کہ یہ آیتیں حکمتِ بالغہِ الٰہی ہیں اور اپنے اندر گہرائی رکھنے والی نصیحتیں ہیں لیکن یہ ڈرانے والی چیزیں ان ہٹ دھرم افراد کے لیے مفید نہیں ہیں۔ (حکمة بالغة فما تغن النذر)[1][2]

خلاصہ یہ ہے کہ فاعل کی فاعلیت میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جو نقص ہے وہ قابل کی قابلیت میں ہے ورنہ گزشتہ انبیاء کے پاس ان کی اُمتوں کے بارے میں جو خبریں آئی ہیں اور وہ خبریں جو قیامت کے بارے میں ان تک پہنچی ہیں، ان میں سے ہر ایک حکمتِ بالغہ ہے اور اتنی پُر تاثیر ہے کہ ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو سکتی ہے بشرطیکہ ان میں تھوڑی سی رُوحانی توجہ موجود ہو۔

بعد والی آیت میں فرماتا ہے اب جبکہ یہ حق سے بیگانہ افراد قبول کرنے کی طرف قطعاً آمادہ نہیں ہیں تو تُو انکو اسی حالت پر چھوڑ دے اور ان سے منہ پھیر لے اور آمادگی رکھنے والے افراد کو تلاش کر (فتول عنهم)۔

۱۔ "حکمة بالغة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ کلام میں هذه حکمة بالغة ہے۔

۲۔ "نذر" جمع ہے نذیر کی یعنی ڈرانے والی چیزیں عام اس سے کہ وہ آیاتِ الٰہی ہوں یا گزشتہ انبیاء اور اُمتوں کی خبریں کہ جن کی صدا لوگوں کے کانوں تک پہنچی ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی تسلیم کیا ہے کہ "نذر" مصدر ہے انذار کے معنوں میں لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ضمناً "ما" "ما تغن النذر" میں نافیہ ہے نہ کہ استفہامیہ۔

" یاد کر اس دن کو کہ جب لوگ پراگندہ ٹڈیوں کے مانند ہوں گے"۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے کہ " جس وقت یہ لوگ اس پکار کے بعد قبروں سے نکلیں گے تو شدتِ وحشت کی وجہ سے پکارنے والے فرشتوں کی طرف گردنیں اُٹھا کر دیکھ رہے ہوں گے"۔ (مھطعین الی الداع)۔" مھطعین " کا مادہ " اھطاع " ہے۔ اس کے معنی گردن اُٹھا کر دیکھنے کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی کسی چیز کی طرف تیزی سے دوڑنے یا نگاہِ خیرہ سے دیکھنے کے لیے ہیں۔ مذکورہ معانی میں سے اس تفسیر میں ہر ایک کا احتمال ہے، اگرچہ پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں، کیونکہ جب انسان کسی وحشت ناک صدا کو سنتا ہے تو فوراً گردن اونچی کر کے اس طرف دیکھتا ہے جہاں سے آواز آرہی ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام امور آیت میں اکٹھے موجود ہوں۔ یعنی وہ خدا کی طرف بلانے والے کی آواز سننے کے بعد گردنیں اُٹھا کر خیرہ نگاہی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور پھر تیزی کے ساتھ اس کی طرف دوڑ پڑیں گے اور بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوں گے۔ یہ وہ دن ہے کہ اس دن برپا ہونے والے سخت حوادث کی وحشت ان کے وجود کو گھیرے گی، اس لیے اس آیت کے آخر میں ہے " کافر کہیں گے کہ آج سخت اور دردناک دن ہے" (یقول الکافرون ھٰذا یوم عسر) وہ دن واقعی سخت ہو گا کیونکہ خدا ان معنوں کی تصدیق کرتا ہے اور سورۂ فرقان کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے :

" وکان یومًا علی الکافرین عسیرًا "

" وہ کافروں کے لیے سخت دن ہے " اس تعبیر سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ دن مومنین کے لیے سخت نہیں ہو گا۔

ایک نکتہ

قیامت کا دن کیوں بہت سخت ہے ؟

وہ دن سخت کیوں نہ ہو جب کہ خوف و دہشت کے تمام عوامل مجرموں کا احاطہ کیے ہوئے ہوں گے۔ جب نامۂ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیے جائیں گے تو ان کی فریاد بلند ہو گی :

" یا ویلتنا مالھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا "

" وائے ہو ہم پر یہ کیسا نامۂ اعمال ہے کہ چھوٹا یا بڑا کوئی کام ایسا نہیں جو اس میں مندرج نہ ہو" (کہف۔۴۹)

پھر یہ کہ کوئی اچھا یا بُرا، چھوٹا یا بڑا کام جو اُنھوں نے کیا ہو گا اس سب کا حساب انتہائی باریک بینی کے ساتھ کیا گیا ہو گا۔

ان تک مثقال حبۃ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السماوات او فی الارض یأت بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر "

" اگر خردل کے دانہ کے برابر اچھا یا بُرا عمل کسی پتھر کے اندر یا آسمانوں کے کسی گوشہ میں یا ذہن کے اندر چھپا ہو گا تو خدا اس کو حساب کے لیے حاضر کرے گا کیونکہ خدا باریک بین اور آگاہ ہے"۔ (لقمان ۱۶)

تیسری بات یہ ہے کہ وہاں کسی قسم کی تلافی کا امکان نہیں ہو گا اور کوئی عذر بھی نہیں سنا جائے گا نیز واپسی کی راہ بھی مسدود ہو گی جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے :۔

"واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئًا ولا یقبل منها شفاعة ولا یؤخذ منها عدل ولا هم ینصرون"

"اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی شخص سزا و جزا میں دوسرے کی جگہ نہیں لے گا نہ اس کے بارے میں شفاعت قبول ہوگی اور نہ تاوان یا بدل ہی قابلِ قبول ہوگا اور نہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے کھڑا ہو سکے گا۔" (بقرہ ۴۸)

پھر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں:

"ولو تری اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربنا ونکون من المؤمنین"

"اگر تو ان کی حالت دیکھے جس وقت وہ جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اے کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہوتے" (لیکن یہ باتیں ان سے قبول نہیں کی جائیں گی) (انعام ۲۷)

چوتھا امر یہ ہے کہ خدا کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ مائیں اپنی اولاد کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے اور لوگ مبہوت اور مست نظر آئیں گے حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے۔ لیکن خدا کا عذاب شدید ہے۔

"یوم ترونها تذهل کل مرضعة عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملها وتری الناس سکاری وما هم بسکاری ولکن عذاب الله شدید" (حج ۲)

"اس بنا پر گنہگار اضطراب و وحشت میں اس قدر گرفتار ہوں گے کہ وہ پسند کریں گے کہ جو کچھ اس جہان میں ان کے پاس ہے اسے دے دیں اور عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کر لیں۔"

"یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه وصاحبته واخیه وفصیلته التی تؤویه ومن فی الارض جمیعًا ثم ینجیه کلا انها لظی"

"مجرم خواہشمند ہوگا کہ اس دن کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا بیٹا، بیوی اور رشتہ دار جو مشکلات میں اس کے مددگار تھے حتیٰ کہ تمام لوگ جو روئے زمین پر ہیں فدا کر دے لیکن کوئی چیز کچھ فائدہ نہ دے گی۔ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ اس کے انتظار میں ہے۔" (معارج ۱۱ تا ۱۵)

کیا ان چیزوں کے ہوتے ہوئے اور دوسری ان دل ہلا دینے والی باتوں کی موجودگی میں کہ جو قرآن میں مذکور ہیں، یہ ممکن ہے کہ وہ دن سخت دردناک اور تکلیف دہ نہ ہو (خدا ہم سب کو اس دن اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے)

۹۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝

۱۰۔ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝

۱۱۔ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ ۝

۱۲۔ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝

۱۳۔ وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ ۝

۱۴۔ تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا جَزَاءً لِمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝

۱۵۔ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝

۱۶۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ۝

۱۷۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۝

ترجمہ

۹۔ اس سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی (جی ہاں) ہمارے بندے (نوحؑ) کی اور کہا وہ دیوانہ ہے۔ اور انھیں جھڑکیاں دیں۔

۱۰۔ اُس نے بارگاہ پروردگار میں عرض کیا میں اس سرکش قوم سے مغلوب ہوں ان سے میرا

انتقام لے۔

۱۱۔ اس وقت ہم نے آسمانوں کے دروازے کھول دیے اور بہت زیادہ اور مسلسل پانی برسنے لگا۔

۱۲۔ اور زمین کو ہم نے شگافتہ کیا اور بہت سے چشمے نکالے اور یہ دونوں قسم کے پانی جس مقدار میں بھی تھے آپس میں مل گئے۔

۱۳۔ اور ہم نے نوحؑ کو ایک سواری (کشتی) پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا۔

۱۴۔ ایسی سواری کہ جو ہماری نگرانی میں چلتی تھی۔یہ عذاب تھا اس گروہ کے لیے کہ جو اس کا منکر تھا۔

۱۵۔ ہم نے یہ واقعہ نشانی کے عنوان سے اُمتوں کے درمیان باقی رکھا۔تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

۱۶۔ اَب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف دونوں کیسے تھے۔

۱۷۔ ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان قرار دیا۔تو کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قومِ نوحؑ کا ماجرا درسِ عبرت تھا

قرآن کی سُنت یہ ہے کہ کفار و مجرمین کو خوف دلانے کے بعد گزشتہ قوموں کی سرگزشت اور ان کی عبرتناک عاقبت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے تاکہ انہیں سمجھائے کہ اگر تم اپنے غلط راستے پر چلتے رہے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ اس سُورہ میں بھی ان مباحث کے بعد کہ جو گزشتہ آیتوں میں مذکور ہوئے مختصر اور پُرمعنی اشارے گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کے متعلق موجود ہیں کہ جن میں سے پہلی قوم، قومِ نُوحؑ تھی۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ان سے پہلے قوم نوحؑ نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی" (کذبت قبلھم قوم نوح)۔ جی ہاں! اُنہوں نے ہمارے بندے نوحؑ کی تکذیب کی اور کہا کہ یہ شخص دیوانہ ہے اور اس کے بعد طرح طرح کی ایذارسانیوں کے ذریعے اسے اپنی پیغام رسانی جاری رکھنے سے منع کیا۔" (فکذبوا عبدنا و قالوا مجنون وازدجر)۔

"کبھی اس سے کہتے کہ اگر تو اپنے کام سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے۔"

"قالوا لئن لم تنتہ یا نوح لتکونن من المرجومین" (شعرا - ۱۱۶)

اور کبھی اس کا گلا اس طرح دباتے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا لیکن جب ہوش میں آتا تو کہتا:

"اللّٰھم اغفر لی لقومی فانھم لا یعلمون"

"خداوندا! میری قوم کو بخش دے یہ نہیں جانتے"۔ ¹

خلاصہ یہ کہ جس طرح ان سے ہو سکا انہوں نے اسے ایذا پہنچائی لیکن وہ تبلیغ سے دستبردار نہ ہُوا۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس آیت میں تکذیب کا ذکر دو مرتبہ ہوا ہے۔ بظاہر اس بنا پر کہ پہلی مرتبہ اجمالی شکل میں ہے اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ۔ "عبدنا" "ہمارا بندہ" سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مغرور و سرکش قوم نوحؑ کی نہیں بلکہ ہماری مدِ مقابل تھی۔ (وازدجر) کا جملہ اصل میں زجر سے ہے جو اس کے معنی دُور کرنے کے ہیں اور بلند آواز سے کسی کو دھتکارنے کے ہیں لیکن یہ لفظ ہر ایسے عمل کے لیے بولا جاتا ہے جس کا روکنا مقصود ہو۔

قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "قالوا" فعل معلوم کی شکل میں آیا ہے اور (ازدجر) فعل مجہول کی شکل میں۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کے اعمال نوحؑ کے زجر و توبیخ کے مقابلے میں اتنے زیادہ نامناسب تھے کہ پروردگارِ عالم ان میں سے کسی گروہ کا نام تک لینا گوارا نہیں کرتا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "جس وقت نوحؑ ان کی ہدایت سے کُلی طور پر مایوس ہو گئے تو انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی پروردگارا! یہ باغی اور مُجرم گروہ مجھ پر غالب آگیا ہے۔ پروردگارا! ان سے میرا انتقام لے" (فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر)۔ انہوں نے دلیل، حجت اور بُرہان کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل نہیں کیا بلکہ ظلم، تکذیب، انکار اور مختلف قسم کے دباؤ کے ذریعہ مجھ پر غلبہ حاصل کیا ہے۔ تو اب یہ قوم باقی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے میرا انتقام لے اور مجھے ان کے مقابلے میں کامیابی عطا فرما۔² جی ہاں! یہ عظیم پیغمبر جب تک ان کے ہدایت پانے کی اُمید رکھتا تھا اس وقت تک خدا سے دعا کرتا رہا کہ انہیں بخش دے لیکن جب بالکل مایوس ہو گیا تو پھر اس نے ان پر نفرین کی اور ان کے حق میں بددعا کی۔

اس کے بعد ان کے عذاب کی کیفیت کی طرف صاف اور دل ہلا دینے والا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ "ہم نے نوحؑ کی اس درخواست کے بعد آسمان کے دروازے کھول دیے، پھر شدید اور مسلسل بارش ہونے لگی" (ففتحنا ابواب السماء بماء منھمر)۔

آسمان کے دروازوں کو کھول دینے کے الفاظ بہت ہی خوبصورت ہیں کہ جو شدید بارش کے وقت استعمال کیے جاتے ہیں جیسا کہ ہم اُردو میں بھی کہتے ہیں "گویا آسمان کے دروازے کھُل گئے اور جتنا پانی تھا سب برس گیا"۔ منھمر کا مادّہ "ھمر" بروزن "صبر" ہے اس کے معنی شدّت سے آنسوؤں کا بہنا یا پانی کا برسنا ہے۔ یہ لفظ جانور کے تھن کو دودھ کے آخری قطرہ تک دوہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تعجب اس امر پر ہے کہ مفسرین کے بعض اقوال میں آیا ہے کہ وہ برسوں سے خشک سالی کا شکار تھے اور بارش کے انتظار میں تھے

۱۔ "تفسیر کشاف" "ابوالفتوح رازی" در ذیل آیات زیرِ بحث۔

۲۔ "انتصر" کے معنی مدد طلب کرنے کے ہیں جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۴۱ میں آیا ہے لیکن یہاں انتقام کے معنی میں ہیں۔ ایسا انتقام جو عدل و حکمت پر مبنی ہو۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ تقدیرِ عبارت میں "انتصر لی" تھا۔

یہاں تک کہ اچانک بارش ہونے لگی مگر زندہ کرنے والی بارش نہیں بلکہ جان سے مار دینے والی [1]

نہ صرف یہ کہ آسمان سے زیادہ پانی برسنے لگا بلکہ زمین سے بھی اُبلنے لگا جیسا کہ آیت میں آیا ہے: "اور ہم نے زمین کو شگافتہ کیا اور اس سے زیادہ چشمے نکالے"۔ (وفجرنا الارض عیونًا)[2]۔

اور یہ دونوں پانی اتنی مقدار میں کہ جس قدر مطلوب تھے آپس میں مل گئے اور اس نے ساری زمین کو گھیر لیا۔ فالتقی الماء علیٰ امر قد قدر)۔ بعض مفسرین نے "قد قدر" کے لفظ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ یہ دونوں پانی پورے طور پر ایک دوسرے کی مقدار کے برابر تھے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ساری زمین سے پانی اُبلنے لگا، چشمے نکل آئے، آسمان سے پانی برسنے لگا، یہ دونوں آپس میں مل گئے اور انہوں نے ایک عظیم سمندر اور طوفان تشکیل دیا۔ یہاں قرآن نے طوفان کے مسئلہ کو چھوڑ دیا، کیونکہ جو کچھ کہنا تھا وہ گزشتہ جملوں میں کہا جاچکا تھا۔ اب نوحؑ کی کشتیٔ نجات کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوحؑ کو ایک سواری پر کہ جو تختوں اور میخوں سے بنائی گئی تھی سوار کیا"۔ (وحملناہ علیٰ ذات الواح ودسر)۔ "دسر" جمع ہے "دسار" کی "کتاب" کے وزن پر جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "دسر" کے معنی کسی کو غصہ سے دھتکارنے کے ہیں اور چونکہ میخ ان شدید چوٹوں کی وجہ سے کہ جو اس پر پڑتی ہیں، لکڑی وغیرہ میں گھس جاتی ہے اس لیے اسے دسار کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کے معنی طناب یعنی رسّی کے لیے ہیں۔ وہ اس سے کشتی کے بادبان کی رسّیوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن پہلے معنی علی الخصوص الواح کی مناسبت سے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال یہاں قرآن کی تعبیر جاذبِ توجہ اور پُر معنی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ اس عظیم مجسم طوفان کے درمیان کہ جو ہر چیز کو نگل گیا تھا، ہم نے حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کی نجات کا فرمان مٹھی بھر میخوں اور لکڑی کے تختوں کے سپرد کر دیا اور انہوں نے یہ ذمہ داری عمدہ طریقہ سے پوری کی اور یہ قدرت کا عظیم مظاہرہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ قرآنی تعبیر اس زمانے کی ترقی یافتہ صورت رکھنے والی کشتیوں کے مقابلے میں اُس زمانے کی ان سادہ کشتیوں کی طرف اشارہ کے طور پر ہو جن میں خصوصی طور پر بیٹھنے کی جگہیں تھیں اور نہ ان کی خاص صورتیں تھیں۔

پھر بھی حضرت نوحؑ کی کشتی کافی بڑی تھی اور تاریخ کے بیان کے مطابق اس کی تعمیر کے سلسلے میں نوحؑ نے برسوں محنت اور مشقت کی تھی تاکہ مختلف جانوروں کا ایک ایک جوڑا اس میں سما سکے۔ اس کے بعد خدا اپنی خاص عنایت کے ساتھ نوحؑ کی کشتیٔ نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ "یہ کشتی ہمارے (علم) کی نظروں کے سامنے موجوں کے سینے کو چیرتی ہوئی ہمارے مشاہدہ اور حفاظت کے ماتحت اپنے سفر کو جاری رکھے رہی" (تجری باعیننا)۔ "باعیننا" کی تعبیر (ہماری آنکھوں کے سامنے) ایک لطیف اشارہ ہے کسی چیز کی طرف خصوصی توجہ اور اس کی مکمل نگرانی کی طرف۔ ایسا ہی سورہ ھُود کی آیت ۳۷ میں بھی ہم اسی موضوع کے ایک اور حصہ میں پاتے ہیں۔ "واصنع الفلک باعیننا ووحینا"۔ "ہم نے اس پر وحی کی کہ ہماری نظروں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا" بعض مفسرین نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے کہ یہ ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتی پر سوار تھے [3]

---

[1] "رُوح المعانی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] "عیونًا" ہوسکتا ہے کہ الارض کے لیے تمیز ہو اور تقدیر عبارت میں (فجرنا عیون الارض) ہو۔ اس کے بعد "عیون" جو کہ مفعول ہے جُدا ہوا ہے اور تمیز کی شکل میں آیا ہے تاکہ مبالغہ اور اہمیت کو بتائے یعنی ساری زمین چشمے میں بدل گئی تھی۔

[3] "اعین" جمع ہے "عین" کی جس کے ایک معنی آنکھ اور دوسرے معنی انسان کے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی معنی ہیں۔

اس وجہ سے " تجری باعیننا " کے جملے کے معنی ہیں کہ وہ کشتی ہمارے مخلص بندوں کو ساتھ لیے ہوئے ہے لیکن قرآن کی دوسری آیتوں میں اس تعبیر کے دوسرے موارد پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر صحیح نظر آتی ہے۔

ایک یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ " باعیننا " ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو کشتیِ نوح کے سلسلہ میں ہدایات آئی تھیں ان میں دخل رکھتے تھے لیکن یہ تفسیر بھی اس دلیل کی بنا پر کہ جو ہم نے اوپر بیان کی ضعیف ہے۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے : " یہ تمام سزا تھی ان لوگوں کے لیے کہ جنھوں نے نوحؑ کی تکذیب کی اور کافر ہوئے"۔ (جزاء لمن کان کفر)[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوحؑ بھی دوسرے انبیاء کی طرح خدا کی بڑی مہربانیوں اور نعمتوں میں سے ایک تھے جن کی بے خبر اور جاہل افراد نے تکذیب کی اور کافر ٹھہرے۔[2]

اس کے بعد اس عظیم واقعہ سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " ہم نے اس واقعہ کو درسِ عبرت اور اُمتوں کے درمیان نشانی کے طور پر باقی رکھا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے"۔ (ولقد ترکناھا اٰیۃ فھل من مدکر)۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ تمام باتیں جو اہم تھیں اس واقعہ کے ذیل میں بیان کر دی گئی ہیں اور ایک بیدار مغز انسان کو جو کچھ سمجھنا چاہیئے وہ اس واقعہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق کہ جو قبل و بعد کی آیتوں سے مطابقت رکھتی ہے " ترکناھا " کی ضمیر واقعہ طوفان، سرگزشت نوح اور ان کی مخالفت سے تعلق رکھتی ہے لیکن بعض مفسرین اسے کشتیِ نوحؑ کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ کشتی ایک مُدت تک عام لوگوں کے درمیان باقی رہی تھی اور جس شخص کی نظر اس پر پڑتی تھی اس کی نظروں کے سامنے طوفانِ نوحؑ کا تمام واقعہ مجسم ہو جاتا تھا۔ اگر ہم اس روایت کو تسلیم کر لیں کہ اس کشتی کے بچے ہوئے تختے پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانہ تک باقی تھے اور اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ بعض افراد کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے زمانے میں اس کشتی کے بقیہ حصے کوہ قفقاز و ارارات میں دیکھے گئے ہیں تو پھر یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ ایک اشارہ دونوں جانب ہو یعنی واقعہ نوح بھی ایک نشانی تھا اور لوگوں کے درمیان رہنے والی کشتی بھی ایک نشانی تھی۔[3]

پروردگارِ عالم بعد والی آیت میں ایک تہدید آمیز اور پُر معنی سوال کے عنوان کے ماتحت ان کافروں کے متعلق کہ جو زمانۂ نوح کے کافروں والے راستے پر چل رہے ہیں فرماتا ہے : " اب بتاؤ کہ میرا عذاب اور تخویف دلانے والے امور کس طرح کے تھے " (فکیف کان عذابی ونذر)۔ کیا وہ حقیقت تھے یا محض ایک افسانہ؟۔

اس بحث سے متعلق آخری آیت میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ :

" ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان کیا ہے کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے " (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر)۔

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ یہاں " کفر " فعل مجہول کی شکل میں ہے جو کہ حضرت نوحؑ کی طرف اشارہ ہے جن کی نسبت وہ لوگ کافر ہوئے تھے اگر کہ فعل معلوم ہے اور کفار کی طرف اشارہ ہے۔ [2] اگر آیت میں کسی چیز کا مقدر نہ مانا جائے تو کفر کا نائب فاعل حضرت نوحؑ کی ذات ہوگی کہ جو وہ نعمت تھے کہ جس کا کفران ہوا اور اگر کہیں تقدیر میں کفر بہ تھا تو حضرت نوحؑ اور ان کی تعلیمات پر عدم اطمینان کی طرف اشارہ ہوگا۔

[3] قومِ نوحؑ کے بارے میں ہم تفصیلی مباحث سورہ ھود کی آیت ۲۵ تا ۴۹ (جلد ۹ تفسیر نمونہ) میں تحریر کر چکے ہیں۔

بلاشک وشبہ اس قرآن میں کسی قسم کا اُلجھاؤ نہیں ہے۔ تاثیر کی تمام شرائط اس میں جمع ہیں۔ اس کے الفاظ شیریں اور پُرکشش ہیں۔ اس کی تعبیریں زندہ اور پُرمعنی ہیں۔ اس کے خوف اور بشارتیں واضح اور صریح ہیں۔ اس کی داستانیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے دلائل مضبوط و مستحکم ہیں۔ اس کی منطق فصیح و بلیغ و متین ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ کسی کلام کو پُر تاثیر بنانے کے لیے ضروری ہے وہ اس میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی آمادگی رکھنے والا دل اس کی طرف جھکے گا تو وہ اس میں کشش محسوس کرے گا۔

اسلام کی طویل تاریخ میں قرآن کی اس عمیق تاثیر کے بارے میں کہ جو توجہ رکھنے والے دلوں میں موجود تھی اور اس امر (تاثیر) کی واضح شاہد تھی، عجیب وغریب شواہد ملتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اگر کسی تخم کا جوہرِ حیات ہی مُردہ ہو چکا ہو تو اسے اگر بہترین زمین میں بھی بو دیں اور بہترین باغبانوں کی زیرنگرانی اس کی آبِ کوثر سے آبیاری کریں تب بھی وہ نشوونما نہیں پائے گا اور اس سے پھول اور سبزہ پیدا نہیں ہوگا۔

۞ ۞ ۞

۱۸۔ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۱۹۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○

۲۰۔ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ○

۲۱۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۲۲۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○

ترجمہ

۱۸۔ قوم عاد نے (اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی تو اب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔

۱۹۔ ایک منحوس اور طویل دن ہم نے ان کی طرف سرد تیز اور وحشت ناک آندھی بھیجی۔

۲۰۔ کہ جس نے لوگوں کو کھجور کے گھن کھائے ہوئے تنوں کی طرح اپنی جگہ سے اکھاڑ دیا۔

۲۱۔ (اب دیکھو) کہ میرا عذاب اور تخویف کس طرح کے تھے۔

۲۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

اور اسی طرح قوم عاد کی سرگزشت

دوسری قوم کہ جس کی سرگزشت اس سورہ میں حضرت نوحؑ کی سرگزشت کے بعد آئی ہے، "قوم عاد" ہے۔ قرآن کافروں اور مجرموں کو خبردار اور متنبہ کرنے کے لیے زیر بحث آیات میں مختصر طور پر اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "قوم عاد" نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (کذبت عاد)۔

ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام تبلیغ پر جتنا زیادہ زور دیتے اور مختلف طریقوں سے انہیں خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتے ان کی کج فہمی اور ہٹ دھرمی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا۔ اپنی دولت و ثروت کے غرور اور خواہشات میں مستغرق رہنے کی وجہ سے جو اُن میں غفلت آگئی تھی اس کے باعث وہ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔

آخر کار خدا نے انہیں دردناک عذاب کی سزا دی۔ اس لیے اس آیت کے آخر میں پروردگارِ عالم اجمالی طور پر فرماتا ہے کہ "دیکھو میرا عذاب اور تخویف کس طرح کے تھے"۔ (فکیف کان عذابی ونذر)۔

اس کے بعد والی آیت میں اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ:

"ہم نے وحشت ناک، سرد اور تیز آندھی، ایک ایسے منحوس دن کہ جو بہت طویل تھا، ان کی طرف بھیجی" (انا ارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا فی یوم نحس مستمر)۔ "صرصر" کا مادہ "صر" بروزن شر ہے۔ اس کے معنی باندھنے اور محکم کرنے کے ہیں۔ صرصر کے لفظ میں اس کی تکرار تاکید کے لیے ہے اور چونکہ یہ ہوا سرد، شدید، پُرسوز اور گونج سے بھری تھی، اس وجہ سے یہ لفظ اس کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نحس اصل میں اس شدید سُرخی کے معنوں میں ہے جو کبھی کبھی اُفق پر نمودار ہوتی ہے اور اس طرح وہ شعلہ جس میں دُھواں نہ ہو۔ عرب اسے "نحاس" کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس منحوس کے لیے استعمال ہوا ہے جو نیک کے مقابل ہو۔ "مستمر" "یوم" کی یا "نحس" کی صفت ہے۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن کے حوادث اسی طرح طولانی تھے جس طرح کہ سورہ حاقہ کی آیت ۷ میں مذکور ہیں "سات رات اور آٹھ دن یہ عذاب الٰہی ان پر مسلط رہا۔ یہاں تک کہ اس نے سب کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا"۔

دوسری صورت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن کی صورت برقرار رہی یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دیا۔

بعض مفسرین نے نحس کے معنی گرد و غبار سے لبریز کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ آندھی اس قدر غبار آلود تھی کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب یہ آندھی دُور سے ظاہر ہوئی تو وہ یہ سمجھے کہ گھنگھور گھٹا ان کی طرف آرہی ہے لیکن بہت جلد وہ سمجھ گئے کہ تیز آندھی ہے جو ان پر عذاب کی صُورت میں ہلاک کرنے کے لیے وارد ہوئی ہے۔ سورہ احقاف کی آیت ۲۴ میں آیا ہے۔ "فلما راوہ عارضًا مستقبل اودیتھم قالوا ھٰذا عارض ممطرنا بل ھو ما استعجلتم بہ ریح فیھا عذاب الیم"

یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کے معنوں میں دونوں مفہوم موجود ہوں۔ اس کے بعد اس تیز آندھی کی کیفیت کے بارے میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ "لوگوں کو گھن کھائے ہوئے کھجور کے تنوں کی طرح اکھاڑ دیا اور وہ ان کو ہر طرف پھینکتی تھی۔ (تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر)۔ "منقعر" کا مادہ "قعر" ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا سب سے نیچے کا نقطہ۔ اس لیے یہ لفظ جڑ سے اکھاڑنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ مفہوم یا تو اس بنا پر ہے کہ قوم عاد کے لوگ قوی الجثہ تھے اور سخت جسم رکھتے تھے یا یہ کہ انہوں نے تیز آندھی سے بچنے کے لیے زمین میں گڑھے کھود رکھے تھے اور زیرِ زمین پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لیکن اس روز آنے والی آندھی اتنی زور دار اور طاقتور تھی کہ ان کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالتی تھی اور اِدھر اُدھر پھینکتی تھی۔ وہ ان کو اس زور سے زمین پر پٹختی تھی کہ ان کے سر تن سے جُدا ہو جاتے تھے۔ "اعجاز" جمع "عجز" "رجل کے وزن پر"۔ عجز کے معنی ہیں کسی چیز کا نچلا یا پچھلا حصّہ۔ ان لوگوں کو کھجوروں کے تنوں کے نچلے حصّہ سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ وہ ہوا پہلے ان کے سروں اور ہاتھوں

کو جدا کر کے اپنے ساتھ اُڑا کر لے جاتی تھی اور اس کے بعد بدن کے باقی حصّہ کو بے شاخ و برگ کھجور کے تنے کی طرح چاہے جس طرف پھینک دیتی تھی۔ یا اس وجہ سے کہ، جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، ہوا اس قدر تیز تھی کہ وہ ان کو سر کے بل زمین پر گراتی تھی اور ان کی گردنوں کو توڑ کر سروں کو الگ کر دیتی تھی۔

اس کے بعد قرآن تنبیہ کے طور پر کہتا ہے: " اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تخویف کس طرح کی تھی " (فکیف کان عذابی ونذر)۔ ہم نے دوسری ایسی قوموں کے ساتھ کہ جنہوں نے تکذیب، کبر و غرور اور گناہ و عصیان کا راستہ اختیار کیا تھا، اس طرح کا سلوک کیا ہے تو تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو کیونکہ تم بھی تو اُنہی کے راستے پر چل رہے ہو۔ پھر اس واقعہ کے آخر میں مزید کہتا ہے: " ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا کوئی ہے کہ جو پند و نصیحت حاصل کرے۔ کیا تم خدا کی طرف سے آنے والی تنبیہ و تخویف کے لیے کوئی دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہو۔ (ولقد یسّرنا القراٰن للذکر فھل من مدّکر)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ: فکیف کان عذابی ونذر کے جملے کی قومِ عاد کے بارے میں تکرار ہوئی ہے یعنی وہ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اس سرگزشت کے بیان کے آغاز میں اور ایک مرتبہ اس کے آخر میں۔ یہ بات غالباً اس لیے ہے کہ اس گروہ پر آنے والا عذاب دوسری قوموں پر آنے والے عذاب کی نسبت زیادہ شدید اور وحشت ناک تھا۔ اگرچہ سارے عذاب شدید ہی ہوتے ہیں۔

ایک نکتہ

نیک اور بد دن

یہ بات لوگوں کے معمولات میں سے ہے کہ وہ بعض ایام کو نیک اور بعض کو نحس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ اس نیک یا منحوس ہونے کے تعین کے بارے میں اختلافات بھی بہت ہیں۔ یہاں گفتگو یہ ہے کہ آیا یہ عقیدہ اسلام کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں یا پھر کیا یہ نظریہ اسلام سے اخذ کیا گیا ہے؟۔ بہرکیف یہ نظریہ عقلی طور پر محال نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے زمانے کے اجزا ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں اور ان میں فرق موجود ہو۔ بعض اجزا میں نحوست کے اثرات ہوں اور بعض میں اس کی ضد کے اثرات ہوں۔ اگرچہ کسی دن کو منحوس اور کسی کو نیک ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس عقلی دلیلیں نہیں ہیں۔ پس اس قدر ہم کہہ سکتے ہیں کہ " یہ ممکن ہے " لیکن عقلی لحاظ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اگر شریعتِ محمدیہ کی طرف سے، اس وحیِ الٰہی کے ذریعہ کہ جو نہایت وسیع آفاق کو ظاہر کرتی ہے، ہمارے پاس دلیلیں ہوں تو ان کے قبول کرنے میں ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے بلکہ اس کا ماننا ہمارے لیے ضروری ہے۔

آیاتِ قرآنی میں صرف دو مواقع ایسے ہیں جن میں " دنوں کی نحوست " کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک تو زیرِ بحث آیتوں میں اور دوسرے سورہ حٰمٓ سجدہ کی آیت ۱۶ میں کہ جہاں اسی قومِ عاد کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں ہمیں یہ ملتا ہے کہ (فارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا فی ایّام نحسات) " ہم نے سخت تیز اور سرد آندھی منحوس دنوں میں ان پر مسلط کی "۔ [1]

---

[1] توجہ کرنی چاہیے کہ " نحسات " اس آیت میں " ایام " کی صفت ہے یعنی ایامِ مذکور کی نحوست کے ساتھ توصیف ہوئی ہے جب کہ زیرِ بحث آیات میں (فی یوم نحس مستمر) " یوم " کی " نحس " کی طرف اضافت ہوئی ہے۔ اور وہ وصفی معنی نہیں رکھتا البتہ اوپر والی آیت کے قرینے سے ہمیں کہنا چاہیے کہ یہاں موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی وجہ سے ہے۔

اس کے برعکس لفظ "مبارک" کی تعبیر بھی بعض آیات قرآنی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ چنانچہ شب قدر کے بارے میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ "ہم نے قرآن کو بابرکت رات میں نازل کیا"۔ (دخان۔۳) نحس اصل میں جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے عرض کیا ہے اُفق کی شدید سُرخی کے معنی میں ہے کہ جو اُسے "نحاس" یعنی آگ کے اُس شدید شعلے کی شکل میں پیش کرتا ہے جو دھوئیں سے خالی ہو۔ پھر اسی مناسبت سے "شوم و منحوس" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح قرآن اس مسئلہ کے بارے میں اجمالی اشارہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کہتا لیکن اسلامی روایات میں "ایامِ نحس و سعد" سے متعلق بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سی روایات و احادیث ضعیف ہیں اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں پھر بھی ان روایات میں ایسی چیزیں موجود ہیں جو قابلِ وثوق ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا آیتوں کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تائید کی ہے۔ محدّثِ اعظم علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بھی اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بحار الانوار میں نقل کی ہیں[۱]۔

یہاں مختصراً جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے:

(الف) بہت سی روایتوں میں نیک اور منحوس دن ان حادثات سے متعلق ہونے کی وجہ سے کہ جو ان دنوں میں واقع ہوئے ہیں تفسیر کے ذیل میں مذکور ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے، بدھ کی جو بدشگونیاں مشہور ہیں، ان کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ یہ کونسا بدھ کا دن ہے تو آپ نے فرمایا:

آخر اربعاء فی الشھر وھو المحاق وفیہ قتل قابیل ھابیل اخاہ ...... ویوم الاربعاء ارسل اللہ عزوجل الریح علی قوم عاد ......

مہینے کا آخری بدھ کہ جو محاق میں واقع ہو۔ اس دن قابیل نے اپنے بھائی ھابیل کو قتل کیا تھا ...... اور خدا نے اسی بدھ کو تیز آندھی قوم عاد کی طرف بھیجی تھی[۲]۔

اس لیے بہت سے مفسرین متعدد روایات کی پیروی کرتے ہوئے مہینے کے آخری بدھ کو منحوس سمجھتے ہیں اور اسے (اربعاء لا تدور) وہ بدھ مانتے ہیں کہ جو پلٹ کر نہیں آتا۔ بعض دوسری روایتوں میں ہمیں ملتا ہے کہ مہینے کی پہلی تاریخ نیک ہوتی ہے کیونکہ حضرت آدمؑ اسی تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی طرح ۲۶ ویں تاریخ کیونکہ خدا نے دریائے نیل کو حضرت موسٰےؑ کے لیے اسی تاریخ کو شگافتہ کیا تھا[۳]۔

یا یہ کہ مہینے کی تیسری تاریخ نحس ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت آدمؑ و حواؑ جنت سے نکالے گئے تھے اور جنت کا لباس ان کے بدن سے اتارا گیا تھا[۴]۔ یا یہ کہ مہینے کی ساتویں تاریخ مبارک ہے کیونکہ اس تاریخ کو حضرت نوحؑ اپنی کشتی پر سوار ہوئے (اور انہوں نے غرق ہونے سے نجات پائی)[۵]۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۵۹ کتاب السماء والعالم ص ۱ تا ۹۱ اور کچھ اس کے بعد۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۸۳ (حدیث ۲۵)

۳۔ گزشتہ مدرک ص ۱۰۵

۴۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۸

۵۔ تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۶۱

یا پھر یہ کہ نوروز کے سلسلہ میں امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہماری نظر سے گزرتی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے کہ "کشتی نوحؑ کوہِ جودی پر آکر ٹھہری اور جبرئیل پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوئے اور یہی وہ دن بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے دوشِ پیغمبرؐ پر سوار ہوکر بتوں کو توڑا اور واقعہ غدیر بھی نوروز ہی کو واقع ہوا[1]۔

روایتوں میں اس قسم کی اطلاعات عام ہیں کہ جو دنوں کی نحوست اور نیکی کو اچھے واقعات اور ناپسندیدہ حوادث سے وابستہ کرتی ہیں خصوصاً روزِ عاشور کہ جسے بنو امیہ اہلبیت کے مقابلہ میں کامیاب ہونے کی وجہ سے نیک دن شمار کرتے ہیں ہماری روایتوں میں اس دن کو بابرکت قرار دینے کی شدت سے مخالفت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس دن کو آذوقہ مال کے ذخیرہ وغیرہ کا دن قرار نہ دیا جائے بلکہ اس روز اپنے کاروبار کی تعطیل کی جائے اور عملی طور پر بنو امیہ سے اپنا نظام الاوقات مختلف قرار دیں۔ ان روایات کے مجموعہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے نیک اور بد ایام کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ اسلام کا مقصد مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ وہ عملی طور پر خود کو ان تاریخی واقعات کے ساتھ مربوط رکھیں اور ناپسندیدہ حوادث اور ان کی بُنیاد رکھنے والے لوگوں سے احتراز کریں۔ یہ تفسیر، ممکن ہے کہ، ان روایتوں کے ایک حصہ کے بارے میں ٹھیک ہو لیکن سب کے بارے میں یقیناً ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ان میں سے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پوشیدہ تاثیر بعض دنوں سے تعلق رکھتی ہے جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔

(ب) یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ بعض لوگ نیک و بد ایام کے بارے میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جس کام کو وہ کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے وہ ایام کے نیک و بد کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور عملی طور پر بہت سے ضروری کاموں سے غافل ہو جاتے ہیں اور کئی سنہرے مواقع ہاتھ سے کھو دیتے ہیں' یا پھر یہ کہ بجائے اس کے کہ اپنی اور دوسروں کی شکست و کامیابی کے اسباب و عوامل کی تحقیق کریں اور زندگی کے گراں بہا تجربات سے فائدہ اُٹھائیں؛ وہ یہ کہتے ہیں کہ اپنی تمام ناکامیوں کا ذمہ دار اور کامیابیوں کا سبب ایام کی نحوست اور ان کے سعد ہونے کو سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا حقیقت سے فرار ہے اور افراط کا شکار ہونا ہے نیز حوادثِ زندگی کی نامعقول توجیہ ہے۔ اس قسم کے طرزِ عمل سے شدت کے ساتھ پرہیز کرنا چاہیئے اور عامۃ الناس میں جو چیزیں مشہور ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔ نجومیوں اور فال نکالنے والوں کی پیشین گوئیوں کو بھی نظر انداز کرنا چاہیئے۔

صرف معتبر حدیث ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی رُو سے اگر کوئی حقیقت ثابت ہو تو اسے صدقِ دل سے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ دوسرے جتنے عوامل ہیں ان کو نظر انداز کرکے زندگی کے کام کرنے چاہئیں اور کاوشِ پیہم سے کام لے کر زندگی کی راہ میں قدم آگے بڑھانا چاہیئے، خدا پر توکل رکھنا اور اس کے لطف و کرم سے مدد طلب کرنا سب سے مقدم ہے۔

(ج) دنوں کے نیک و بد کی طرف توجہ کرنا نہ صرف یہ کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخی حوادث سے رُوشناس کراتا ہے بلکہ پروردگارِ عالم کی ذات والا صفات کے ساتھ توسّل کرنے کی توفیق بھی بخشتا ہے نیز اس سے امداد طلبی کا درس دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایسی متعدد روایات پڑھتے ہیں کہ وہ ایام جن کو نحس قرار دیا گیا ہے ان میں ہمیں صدقہ دینے، دُعا مانگنے اور پروردگارِ عالم سے مدد طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہم قرآنِ پاک کی تلاوت کریں' ذاتِ خدا پر توکل رکھیں۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنی جدوجہد میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ منجملہ دیگر باتوں کے ہم حدیث میں ایک ایسے واقعہ سے باخبر ہوتے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام

---

[1] بحار الانوار ج ۵۹ ص ۹۲

کے ایک محبِ مخلص کو خدمتِ امام میں وارد ہوئے تو امامؑ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں کل نہیں دیکھا۔ وہ عرض کرنے لگا کہ میں پیر کو کہیں آنا جانا مناسب نہیں سمجھتا اس کے جواب میں آپ نے فرمایا، (من احب ان یقیه الله شر یوم الاثنین فلیقرأ فی اول رکعة من صلاۃ الغداۃ هل اتی علی الانسان ثم قرأ ابوالحسنؑ فوقٰهم الله شر ذالك الیوم ولقّٰهم نضرة وسرورًا) " جو شخص پسند کرتا ہے کہ پیر کے شر سے محفوظ رہے تو وہ نمازِ فجر کی پہلی رکعت میں سُورہ " هل اتی علی الانسان " تلاوت کرے۔ پھر امامؑ نے سُورہ هل اتی کی اس آیت کی کہ جو دفعِ شر کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے، تلاوت فرمائی فوقاهم الله شر ذالك الیوم... " خدا نیک لوگوں کو قیامت کے دن کے شر سے محفوظ رکھے گا " وہ انہیں ظاہری مسرّتیں اور باطنی خوشحالی عطا کرے گا۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ چھٹے امام کے اصحاب میں سے ایک شخص نے آپ سے پوچھا کیا کسی صُورت میں بُدھ جیسے مکروہ او ناپسندیدہ دن میں سفر کرنا مناسب ہے ؟ امام نے فرمایا کہ اپنے سفر کا آغاز صدقہ سے کرو اور روانگی کے وقت آیت الکرسی کی تلاوت کرلو۔ (اور پھر جہاں کہیں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ)۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ دسویں امام علی نقیؑ کا ایک صحابی کہتا ہے کہ میں امامؑ کی خدمت میں پہنچا، اس حالت میں کہ راستے میں میری اُنگلی زخمی ہوگئی تھی اور اثنائے راہ میں ایک سوار نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے میرے کاندھے پر ضرب بھی لگائی تھی اور میں ایک ہجوم میں پھنس کر رہ گیا تھا جنھوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیے تھے تو میں نے اس دن کو مخاطب کرکے کہا کہ خدا مجھے تیرے شر سے محفوظ رکھے تو کیسا منحوس دن ہے۔ یہ سُن کر امامؑ نے فرمایا کہ تو ہم سے عقیدت بھی رکھتا ہے اور پھر ایسی نامناسب بات زبان پر لاتا ہے۔ وہ دن کہ جس کی کوئی ذمّہ داری نہیں ہے تو اسے ذمّہ دار قرار دیتا ہے۔ وہ شخص بیان کرتا ہے کہ امامؑ کی بات سُن کر میں سنبھلا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے عرض کیا مولا میں خدا سے اپنی غلطی کے سلسلہ میں استغفار کرتا ہوں اور اس سے اپنی بخشش طلب کرتا ہوں۔ پھر امامؑ نے مزید فرمایا: ماذنب الایام حتٰی صرتم تتشأمون بها اذا جوزیتم باعمالکم فیها " دنوں کا کیا قصور ہے کہ تم انہیں منحوس قرار دیتے ہو حالانکہ صورتِ حال یہ ہے کہ تمہاری اپنی پستیِ کردار تمہیں گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔" اس شخص نے کہا کہ فرزندِ رسولؐ میں ہمیشہ کے لیے خدا سے استغفار کرتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں۔ تو امامؑ نے فرمایا : (ماینفعکم ولکن الله یعاقبکم بذمها علی مالاذم علیها فیه اما علمت ان الله هو المثیب والمعاقب والمجازی بالاعمال عاجلاً واٰجلاً ؟ قلت : بلٰی یامولای! قال لاتعد ولاتجعل للایام صنعًا فی حکم الله)۔ یہ چیز تمہارے لیے فائدہ نہیں رکھتی۔ خدا تمہیں اس چیز کی مذمّت کرنے کی سزا دیتا ہے کہ جو قابلِ مذمّت نہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا ہی جزا و سزا دیتا ہے وہ بندوں کو اعمال کی جزا و سزا اس دنیا میں بھی دیتا ہے اور اس جہان میں بھی دے گا۔ پھر فرمایا ایسی بات آئندہ زبان پر مت لانا اور دنوں کے بارے میں حکمِ خدا کے برخلاف اثرات قرار نہ دینا۔[3]

یہ پُرمعنی حدیث اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنوں کی اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ حکمِ خدا کے مطابق ہے لہٰذا ان کے لیے مستقل تاثیر کا کبھی قائل نہیں ہونا چاہیئے اور اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے لُطف و کرم سے بے نیاز نہیں سمجھنا چاہیئے۔ وہ حوادث کہ جو عام طور پر انسان کے غلط افعال و اعمال کا کفارہ ہوتے ہیں انہیں دنوں کی تاثیر سے منسوب نہیں کرنا چاہئے اور اس طرح خُود کو بری الذمہ قرار نہیں دینا چاہئے۔ ممکن ہے کہ امام کا یہ بیان اس باب کی مختلف احادیث کے جمع کرنے کی بہترین راہ ہو۔

---

[1] بحار الانوار ج ۵۹ ص ۳۹ حدیث ۵ ۔ [2] وہی مدرک ص ۲۸ ۔ [3] "تحف العقول" مطابق نقل بحار الانوار جلد ۵۹ ص ۲ (مختصر سی تلخیص کے ساتھ)

۲۳۔ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ○

۲۴۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ○

۲۵۔ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ○

۲۶۔ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ○

۲۷۔ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ○ۡ

۲۸۔ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ○

۲۹۔ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ○

۳۰۔ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○

۳۱۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ
الْمُحْتَظِرِ ○

۳۲۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ○

ترجمہ

۲۳۔ قوم ثمود نے بھی تخویفِ خدا کی تردید کی۔

۲۴۔ اور کہا کہ کیا ہم اپنے جیسے ہی ایک بشر کی پیروی کریں، اور اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم جنون اور گمراہی کا شکار ہوں گے۔

۲۵۔ کیا ہمارے درمیان صرف اس شخص پر وحی نازل ہوئی ہے ؟ نہیں وہ بہت ہی جھوٹا ہے اور ہوس کا شکار ہے۔

۲۶۔ لیکن کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا اور خواہش کا پرستار ہے۔

۲۷۔ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش کے لیے بھیجیں گے۔ تُو ان کے انجام کے انتظار میں رہ اور صبر کر۔

۲۸۔ اور انہیں بتادے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیئے (ایک دن ناقہ کے لیے اور دُوسرا دن ان کے لیے) اور ہر ایک کو اپنے مقررہ وقت پر حاضر ہونا چاہیئے۔

۲۹۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا، وہ اس کام کے لیے آیا اور (ناقہ) کی کونچیں کاٹ دیں۔

۳۰۔ اَب دیکھو کہ میرا عذاب اور تخویف کیسے تھے۔

۳۱۔ ہم نے ان کی طرف صرف ایک چیخ بھیجی جس کے بعد وہ سب ایسی خشک گھاس میں تبدیل ہوگئے کہ جسے چوپاؤں کے مالک اپنے باڑہ میں جمع کرتے ہیں۔

۳۲۔ ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے آسان کیا ہے پس کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

تفسیر

قومِ ثمود کا دردناک انجام

وہ تیسری قوم کہ جس کی زندگی کی داستان 'مختصر طور پر' درسِ عبرت کے عنوان سے گزشتہ مباحث کے بعد اس سورہ میں پیش ہوئی، قومِ ثمود ہے کہ جو سرزمین "حجر" میں، کہ جو حجاز کے شمال میں واقع ہے، رہائش پذیر تھے۔ ان کے پیغمبر حضرتِ صالحؑ نے انتہائی کوشش کی کہ وہ ہدایت پالیں لیکن ان کی تمام محنت رائیگاں گئی۔

پروردگارِ عالم اس سلسلے میں پہلے فرماتا ہے کہ "قومِ ثمود نے بھی خدائی تنبیہ کی تکذیب کی اور اس کی طرف سے دیے جانے والے خوف کی کوئی پرواہ نہیں کی" (کذبت ثمود بالنذر)۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں "نذر" کو ڈرانے والے پیغمبروں کے معنی میں لیا ہے اور قومِ ثمود کے حضرت صالحؑ کی تکذیب کرنے کو تمام پیغمبروں کی تکذیب قرار دیا ہے۔ وہ اس لیے کہ تمام پیغمبروں کی دعوت تبلیغ ہم آہنگ ہوتی ہے لیکن ظاہرِ آیت یہ ہے "نذر" یہاں "انذار" کی جمع کے طور پر آیا ہے اور اس سے مُراد تخویف یعنی ڈرانا ہے۔ اور یہ قدرتی طور پر ہر پیغمبر کے کلام میں موجود ہے۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم' ان لوگوں کی طرف سے جو تکذیب کی گئی اس کی علت کو پیش کرتے ہوئے' فرماتا ہے: "انہوں نے کہا کیا ہم اپنی نوع کے ایک انسان کی پیروی کریں! اگر ایسا کریں تو گمراہی اور جنون میں مبتلا ہوں گے" (فقالوا ابشرًا منا واحدًا نتبعه انا اذًا لفی ضلال وسعر)۔

جی ہاں! کبر و غرور، خود بینی و خود پسندی' ان کے لیے انبیا کی دعوتِ فکر کے مقابلہ میں ایک عظیم حجاب تھے۔ انہوں نے کہا صالحؑ ہم جیسا ہی ایک شخص ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو جنون اور گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ وہ ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز رکھتا ہے جو رہبر بنے اور ہم اس کی پیروی کریں۔ یہ وہی اعتراض ہے کہ جو گمراہ اُمتیں زیادہ تر اپنے پیغمبروں پر کیا کرتی تھیں کہ وہ ہماری ہی طرح کے افراد ہیں لہٰذا خدا کے پیغمبر کس طرح ہو سکتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے "واحدًا" کی تعبیر سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ صالحؑ کے دشمنوں کی مُراد یہ تھی کہ وہ ایک عام شخص ہے۔ زیادہ مال و دولت نہیں رکھتا۔ اس کا کوئی عظیم نام و نسب بھی نہیں ہے۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ فردِ واحد ہے۔ اس کا اپنا کوئی گروہ نہیں ہے۔ حالانکہ رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے گروہ کا مالک ہو جس پر اسے اختیار حاصل ہو۔ وہ اس امتیاز کے ذریعے دوسروں کو اپنی طرف بلائے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی ہے' وہ یہ کہ وہ لوگ "واحد عددی" پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا اعتقاد "واحد نوعی" پر تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہماری ہی جنس و نوع کا فرد ہے اور نوعِ بشر رسالتِ الٰہی کا عہدہ نہیں سنبھال سکتی۔ پیغمبر کو فرشتوں کی نوع میں سے ہونا چاہیئے تھا۔ تینوں تفسیروں کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن ہے لیکن بہرحال ان کا دعویٰ بے بنیاد تھا۔ "سعر" بروزن "شتر" ہے جمع اس کی سعیر ہے۔ مفہوم اس کا بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اسی لیے پاگل اُونٹنی کو "ناقۂ مسعورہ" کہتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ قومِ ثمود نے یہ تعبیر اپنے پیغمبر صالحؑ سے لی ہو کہ جو ان سے کہتے تھے کہ اگر تم بُت پرستی سے باز نہ آئے اور میری دعوتِ حق کی پیروی نہ کی تو "ضلال و سعر" (گمراہی اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ) میں ہوگے۔ تو وہ جواب میں کہتے: "اگر ہم اپنے جیسے

بشر کی پیروی کریں تو " ضلال و سعر " میں ہوں گے۔ بہرحال " سعر " کا ذکر جمع کی شکل میں حقیقتاً دوام اور تاکید کے لیے ہے خواہ جنون کے معنی میں ہو یا بھڑکتی ہوئی آگ کے معنوں میں۔ اس کے بعد وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بفرض محال وحی الٰہی کسی انسان ہی پر نازل ہوتی ہے تو کیا ہمارے درمیان میں اسی کم حیثیت پر وحی نازل ہوئی ہے ؛ حالانکہ زیادہ جانے پہچانے مشہور اور دولت مند افراد مل سکتے تھے (ءَ اُلقی الذکر علیه من بیننا)۔

حقیقت یہ تھی کہ قوم ثمود کی باتیں مشرکین مکہ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھیں جو کبھی یہ اعتراض کرتے تھے کہ مال هٰذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیه ملک فیکون معه نذیرًا " یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔ فرشتہ کیوں نہیں نازل ہوا جو اس کے ساتھ مل کر تخویف کا فرض انجام دیتا۔ (فرقان-۷) کبھی وہ کہتے: لولا نزل هٰذا القراٰن علی رجل من القریتین عظیم " یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے اور دولت مند شخص پر کیوں نہیں نازل ہوا " (زخرف-۳۱)۔ اُب بنیادِ کلام یہ ہے کہ خدا کا رسول کوئی بشر ہی ہو تو پھر کوئی تہی دست بے کس اور بے کار بشر ہی کیوں ہو۔ یہ دل کے اندھے کہ جو گویا پورے دَورِ تاریخ میں ایک ہی طرح کی باتیں کرتے تھے یعنی اگر کوئی شخص صاحبِ مال و دولت ہو کسی اُونچے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو، مقام و منصب کے اعتبار سے بلند ہو اور شہرت بھی رکھتا ہو تو وہ تو خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ معمولی شخص کس طرح رسول ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جو لوگ ظالم و جابر ہوتے تھے وہ زیادہ تر ایسے ہی دولت مند نام نہاد طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

اس تفسیر میں بعض مفسرین نے اس نقطۂ نظر کو بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ کیا وحی صرف اس شخص پر نازل ہوئی ہے۔ ہم سب پر نازل کیوں نہیں ہوئی۔ ہمارے اور اس کے درمیان کیا فرق ہے جیسا کہ سورہ مدثر کی آیت نمبر ۵۲ میں آیا ہے ؛ بل یرید کل امرئ منهم ان یؤتی صحفاً منشرة " بلکہ ان میں سے ہر شخص توقع رکھتا ہے کہ اس پر آسمان سے کتابیں نازل ہوں "۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم آیت کے آخر میں فرماتا ہے: " انہوں نے اس موضوع کو اپنے پیغمبر صالحؑ کے کذب کی دلیل قرار دیا اور کہا کہ وہ بہت جھوٹا نفس پرست اور متکبر شخص ہے " (بل هو کذّاب اشر)۔ وہ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم پر حکومت کرے اور ہر چیز اپنے قبضے میں رکھے اور اپنی خوشی کے مطابق کام کرے۔ لفظ " اشر " کا مادہ " اشر " بروزن قمر ہے جس کے معنی ہیں ایسی خوشحالی جس میں نفس پرستی شامل ہو۔ لیکن قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے " کل ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ کونسا شخص جھوٹا اور نفس پرست ہے "۔ (سیعلمون غدًا من الکذّاب الاشر)۔ وہ وقت کہ جب عذاب الٰہی نازل ہوگا اور ان کی سرکوبی کرے گا اور ان کو ایک مُشتِ خاک میں تبدیل کر دے گا اور " موت کے بعد کا عذاب " اس پر مستزاد ہوگا تو یہ سمجھ لیں گے کہ ان باتوں کا تعلق کس قسم کے افراد کے ساتھ ہو سکتا ہے اور یہ پوشاک کس کے جسم سے مناسبت رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ " غدًا " کل سے مُراد مستقبل قریب ہے اور یہ مفہوم پُر کشش بھی ہے اور لطیف بھی۔ ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں تو وہ اپنے عذاب کو واقعی دیکھ چکے ہوں۔ لہٰذا اب اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ کہا جائے کہ کل وہ سمجھ لیں گے کہ جھوٹا اور نفس پرست کون ہے۔ اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ حقیقت میں یہ بات خدا نے اپنے پیغمبر صالحؑ سے کہی تھی اور بعد والے دن کے ساتھ مشروط کر کے کہی گئی تھی اور یہ واضح حقیقت ہے کہ جس دن یہ بات کہی گئی اس دن تک عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔

دوسرے یہ کہ کل سے مراد روزِ قیامت ہو کہ جس روز ہر چیز نہایت واضح طور پر سامنے آئے گی (پہلی تفسیر زیادہ مناسب اور بعد والی آیتوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے)۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ قومِ ثمود نے نزولِ عذاب سے پہلے ہی صالحؑ کی حقانیت کو سمجھ لیا تھا اور ان کے ناقابلِ تردید معجزہ کو دیکھ چکے تھے تو پھر ان سے کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ کل سمجھ لیں گے۔ اس سوال کا جواب بھی ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی چیز کے جاننے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ممکن ہوتا ہے کہ مقابل اس کا انکار کر دے لیکن بعض اوقات وہ ایسے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے کہ پھر اس کے لیے گنجائش انکار باقی نہیں رہتی اور ہر چیز بالکل واضح انداز میں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ علم یعنی جاننے سے یہاں سمجھ لینے کی یہی انتہا مراد ہے۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم صالحؑ کے ناقہ کی جو ایک معجزہ تھا اور ان کی صداقت کی سند کے طور پر بھیجا گیا تھا، داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صالحؑ کی طرف ہم نے وحی کی کہ ہم ناقہ کو ان کی آزمائش اور امتحان کے لیے بھیجیں گے لہٰذا آپ ان کے انجام کار کا انتظار کریں اور صبر سے کام لیں" (انا مرسلوا الناقة فتنة لهم فارتقبهم واصطبر)۔ "ناقہ" وہی اونٹنی کہ جو حضرت صالحؑ کے معجزہ کی حیثیت سے بھیجی گئی تھی، کوئی عام اونٹنی نہیں تھی بلکہ معجز نما کیفیتوں کی حامل تھی۔ مشہور روایتوں کی رُو سے یہ اونٹنی پہاڑ کے ایک پتھر سے برآمد ہوئی تھی تاکہ وہ کج فہم اور ہٹ دھرم منکرین کے لیے ایک منہ بولتا معجزہ ثابت ہو۔ "فتنہ" جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں، سونے کی کٹھالی میں ڈال کر آگ پر پگھلا کر اس کے کھرے ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ ہر طرح کے امتحان اور آزمائش کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ قوم ثمود اب ایک عظیم آزمائش میں ڈالی جانے والی تھی۔ اس لیے بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "ہم نے صالح سے کہا کہ انہیں بتا دے کہ بستی کا پانی ان کے درمیان تقسیم ہونا چاہیئے۔ (ایک دن ناقہ کے لیے اور ایک دن بستی والوں کے لیے) اس طرح ایک فریق کو اپنے مقررہ دن پانی استعمال کرنا چاہیئے اور دوسرے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ (ونبئهم ان الماء قسمة بينهم كل شرب محتضر)۔[1]

اگرچہ قرآن نے اس سلسلہ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کی لیکن بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ صالحؑ کی اونٹنی کے پانی پینے کا جو دن ہوتا تھا، اس دن وہ سارا پانی پی جاتی تھی لیکن بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس کی ہیئت کذائی ایسی تھی کہ جس وقت وہ پانی کے قریب آتی تو دوسرے جانور بھاگ جاتے تھے اور اس کے پاس نہیں پھٹکتے تھے۔ لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ایک دن پانی پینے کا حق اس اونٹنی کو دیا جائے اور دوسرے دن ان لوگوں کے اختیار میں ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ، جیسا کہ کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ، ان کی آبادی میں پانی بہت کم تھا۔ اگرچہ یہ معنی آیت ۱۴۶ تا ۱۴۸ سے مناسبت نہیں رکھتے، کیونکہ ان آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی جو باغوں اور چشموں سے پُر تھی۔ بہرکیف اس سرکش، ہٹ دھرم اور مفاد پرست قوم نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ ناقہ صالحؑ کو ختم کر دیں حالانکہ صالحؑ انہیں خبردار کر چکے تھے کہ اگر انہوں نے ناقہ کو کوئی اذیت پہنچائی تو جلد ہی ان پر عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کی اور "اپنے ایک ساتھی کو آواز دی وہ اس کام کے لیے آیا اور اس نے ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں"۔ (فنادوا صاحبهم فتعاطى فعقر)۔ "صاحب" سے

---

[1] "محتضر" کا مادہ حضور ہے۔ یہ اسم مفعول ہے اور "شرب" پانی کے حصہ یا مقررہ وقت کے معنوں میں ہے۔ اس بنا پر "کل شرب محتضر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر مقررہ وقت پر جس کو اجازت ہے وہ پانی پیئے گا اور دوسرا اس روز نہیں آئے گا اور اُسے مزاحمت کا حق نہیں ہوگا۔

یہاں مُراد ممکن ہے کہ قوم عاد کا کوئی سردار ہو۔ ان لوگوں میں کا ایک بہت ہی شریر شخص "قدارہ بن سالف" [1] تعاطٰی جس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ تعاطی کسی چیز کو پکڑنے یا کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز اہم اور خطرناک کاموں کے انجام دینے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ جس کام میں زحمت بہت ہو یا اس کی کوئی مزدوری مقرر کی گئی ہو، اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہ تمام مفاہیم زیرِ بحث آیت میں موجود ہیں اور وُہ اس لیے کہ مذکورہ ناقہ کو قتل کرنے کے لیے اچھی خاصی جرأت اور جسارت کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے مشقت بھی درکار تھی اور حسبِ قاعدہ انہوں نے اس کام کے لیے اُجرت بھی مقرر کی تھی۔

"عَقر" کا مادہ "عقر" ہے جو ظلم کے وزن پر ہے اور بنیاد اور جڑ کے معنوں میں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن یہاں ناقہ کے قتل کو ایک فرد کی طرف منسوب کرتا ہے جب کہ سُورہ والشمس میں پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "فعقروھا" "قوم ثمود نے ناقہ کو مار ڈالا تھا" اس وجہ سے ہے کہ ناقہ کو مار ڈالنے والے ایک شخص نے پوری قوم کی رضامندی سے ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ کام کیا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص کسی دوسرے کے کام سے خوش ہو وہ اس میں شریک ہوتا ہے۔ [2]

بعض روایات میں آیا ہے کہ قدارہ نے پہلے شراب پی پھر نشہ کی حالت میں اس نے اس امرِ قبیح کو سرانجام دیا۔ ناقہ کے قتل اور اس کی کیفیت کے بیان بھی مختلف قسم کے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ تلوار سے اس کی کونچیں کاٹیں۔ بعض کا قول ہے کہ پہلے وہ اس کی گھات میں بیٹھا پھر اس کے تیر مارا آخر میں اس پر تلوار سے حملہ آور ہوا۔ بعد والی آیت اس سرکش قوم پر آنے والے وحشت ناک عذاب کے ذکر کے لیے ایک تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "اب دیکھو کہ میرا عذاب اور میری تخویف کس طرح کی تھی": (فکیف کان عذابی ونذر)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ہم نے ان کی طرف ایک چیخ بھیجی جس کے نتیجے میں وہ ایسی خشک اور روندی ہوئی گھاس کی طرح ہو گئے کہ جس کو گڈریا اپنے جانوروں کے لیے باڑہ میں جمع کرتا ہے": (انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ فکانوا کھشیم المحتظر)۔ "صیحۃ" سے یہاں مُراد ایک عظیم آواز ہے کہ جو آسمان سے اُٹھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک وحشت ناک چیخ کی طرف اشارہ ہو کہ جو ان کے شہر میں سنائی دی جیسا کہ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ١٣ میں آیا ہے: فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود "اگر وہ رُوگردانی کریں تو ان سے کہہ دے کہ مَیں تمہیں قوم ثمود و عاد کے صاعقے سے مشابہ صاعقہ سے ڈراتا ہوں"۔

"ھشیم" کا مادہ "ھشم" بروزن "خشم" ہے۔ یہ کمزور چیزوں کے توڑنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ اس کتری ہوئی گھاس کے لیے بولا جاتا ہے جو گوسفندوں کے مالک گوسفندوں کے لیے کاٹ کر رکھتے ہیں۔ کبھی اس خشک گھاس کو بھی کہا جاتا ہے جو جانوروں کے قدموں کے نیچے باڑہ میں روندی جاتی ہے۔ "محتظر" کا مادہ "حظر" بروزن "مغز" ہے۔ اس کے معنی منع کرنے کے ہیں۔ اسی لیے اس باڑہ کو جو بھیڑ بکریوں وغیرہ کے لیے بنایا جاتا ہے اور جو انہیں باہر نکلنے سے روکتا ہے اور وحشی جانوروں کے حملے سے بچاتا ہے، حظیرہ کہتے ہیں اور "محتظر" بروزن "محتسب" وہ شخص ہے جو باڑہ کا مالک ہو۔ وہ مفہوم کہ جو اس آیت میں، قوم ثمود پر نازل ہونے والے عذاب کو لیے ہوئے ہے بہت ہی عجیب اور پُرمعنی ہے کیونکہ خداوندتعالیٰ نے اس سرکش قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے زمین یا آسمان سے لشکری ہرگز روانہ

---

[1] "قدارہ" بروزن "عمارہ" ایک قبیح صُورت بدسیرت اور شوم ترین فرد تھا۔

[2] اس مطلب کی تشریح ہم نے "پیوند مکتبی" کے عنوان کے ماتحت جلد نہم سورۂ ھود کی آیت ٦٥ کے ذیل میں بیان کی ہے۔

نہیں کیے۔ صرف ایک آسمانی چیخ سے، ایک ایسی آواز سے کہ جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، ایک پھاڑ دینے والی عظیم موج سے کہ جس نے اپنے راستے کی ہر چیز کو ایک وسیع و عریض چمک کی لپیٹ میں لے لیا ہو انہیں کوٹ پیس کر رکھ دیا اور ختم کر ڈالا۔

ان کے آباد محل اور مکانات گوسفندوں کے باڑوں کی طرح ہو گئے اور ان کے بے جان لاشے اس کٹی ہوئی خشک گھاس کی طرح ہو گئے کہ جو بھیڑ بکریوں کے قدموں کے نیچے روندی جاتی ہے۔

مذکورہ صورت حال گزشتہ لوگوں کے لیے ممکن ہے کہ مشکل ہو لیکن اس زمانے کے لوگوں کے لیے جو کسی چیز کے پھٹنے اور دھماکے سے پیدا ہونے والی ان موجوں کے اثرات سے باخبر ہیں، جو اپنے دائرۂ اثر میں آنے والی ہر چیز کو پیس کر رکھ دیتی ہیں، نہایت آسانی سے قابل فہم ہے۔ ہاں البتہ عذاب الٰہی کی گڑگڑاہٹ کا انسانوں کے بنائے ہوئے بموں کی گڑگڑاہٹ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان لوگوں پر اس صاعقہ سے نازل ہونے والی مصیبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کو پیش کرنے والی آیتوں میں سب سے آخری آیت میں اس دردناک اور عبرت انگیز سرگزشت کے خاتمہ پر پروردگارِ عالم دوبارہ فرماتا ہے کہ:

"ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسانوں کے بیدار کرنے کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے"؟

(ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر)۔

قرآن کے مفاہیم زندہ اور واضح ہیں، اس کے واقعات اور داستانیں زبان حال سے گویا ہیں اور اس کی تخویف و تہدید دل ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے۔

❖ ❖ ❖

۳۳. كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ○

۳۴. إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ○

۳۵. نِعْمَةً مِنْ عِنْدِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ○

۳۶. وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ○

۳۷. وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا
عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۳۸. وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُسْتَقِرٌّ ○

۳۹. فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ○

۴۰. وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ○

ترجمہ

۳۳. قوم لوط نے اپنے پیغمبر کی طرف سے کی گئی تخویف کی پے در پے تکذیب کی۔

۳۴. ہم نے ان پر ایسی آندھی بھیجی کہ جو سنگریزوں کو اڑاتی تھی (اور ہم نے سب کو ہلاک کر دیا)، سوائے لوطؑ کے گھر والوں کے کہ سحر کے وقت ہم نے ان کو نجات دی۔

۳۵. یہ نعمت تھی ہماری طرف سے۔ ہم اس طرح شکر گزار کو جزا دیتے ہیں۔

۳۶۔ اس نے انہیں ہماری سزاؤں سے ڈرایا لیکن وہ ایک تو شک سے کام لیتے تھے، دُوسرے جھگڑا کرتے تھے۔

۳۷۔ اُنہوں نے لُوطؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کو ان کے قبضہ میں دے دیں لیکن ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں اور انہیں نیست و نابُود کر دیا (اور کہا کہ) ہمارے عذاب اور تخویف کا مزہ چکھو۔

۳۸۔ آخر کار صبح کے وقت دن کے پہلے حصہ میں پائیدار اور واقعی عذاب ان پر آپہنچا۔

۳۹۔ (اور ہم نے کہا) اَب ہمارے عذاب اور تخویف کا مزہ چکھو۔

۴۰۔ ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کیا ہے۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟

تفسیر

قومِ لُوط زیادہ منحوس صُورتِ حال سے دوچار ہُوئی

اِن آیتوں میں واقعۂ قوم لوطؑ اور اس گمراہ اور بے شرم گروہ پر نازل ہونے والے وحشت ناک عذاب کے بارے میں مختصر اور دل ہلا دینے والے اشارے پائے جاتے ہیں۔

اس سورہ میں گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا یہ چوتھا حصہ ہے۔

پروردگارِ عالم پہلے فرماتا ہے: "قوم لوط نے اپنے پیغمبر کی پے در پے تخویف کی تردید کی"۔ (کذبت قوم لوط بالنذر) "نذر" جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے "انذار" کی جمع ہے جس کے معنی خوف دلانے اور متنبہ کرنے کے ہیں۔ اس تخویف کا ذکر جمع کے صیغوں کے ساتھ بہت ممکن ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی پے در پے تنبیہوں کی طرف اشارہ ہو کہ اس کج فہم قوم نے ان تمام ڈرانے والی باتوں کو جھٹلایا۔ یا پھر یہ اشارہ ہے حضرت لوطؑ اور ان سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی طرف سے کی جانے والی تنبیہوں کی طرف کیونکہ تمام پیغمبروں کی دعوتِ حق ایک ہی حقیقت کو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملے میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ اور حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی نجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے ان پر وہ تیز آندھی کہ جو سنگریزوں کو اڑاتی تھی، بھیجی" (انا ارسلنا علیھم حاصبا)، اور ان سب کو سنگریزوں کی اس بارش میں دفن کر دیا۔ "سوائے لوطؑ کے

خاندان کے کہ ہم نے ان کو سحر کے وقت اس سرزمین بلا سے نجات دی " (اِلّاَ آلَ لوطٍ نجّینٰهم بسحرٍ)۔

"حاصب" اس تیز آندھی کے معنوں میں ہے کہ جو "حصباء" ریت اور سنگریزوں کو اُڑائے۔

قرآن کی دوسری آیتوں میں جہاں قوم لوط پر نازل ہونے والے عذاب کا ذکر ہوتا ہے، اس زلزلے کے علاوہ کہ جس نے ان کے شہروں کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا تھا، پتھروں کی بارش کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سُورہ ھود کی آیت ۸۲ میں ہمیں ملتا ہے۔ فلما جاء امرنا جعلنا عالیها سافلها وامطرنا علیها حجارة من سجیل منضود ۔" جس وقت ہمارا فرمان آگیا تو ہم نے اس شہر کو زیر وزبر کر دیا اور اس پر سخت اور پتھریلی مٹی کے پتھروں کی بارش کی "۔

کیا یہ دو قسم کے عذاب تھے، ایک تو تیز آندھی کہ جو اپنے ساتھ سنگریزوں اور ریگ بیاباں کو اُڑاتی تھی اور ان کی سرکوبی کرتی تھی، دوسرے آسمانی پتھروں کی بارش، یا یہ کہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔

بعض اوقات بڑی بڑی آندھیاں بیابان کے گرد و غبار، سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو اٹھا کر آسمان کی طرف لے جاتی ہیں اور جس وقت طوفان کا دباؤ کم ہوتا ہے تو ایک ہی مرتبہ ان چیزوں کو کسی دوسری جگہ پھینک دیتی ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہاں حکم خدا سے گرد آلود آندھی اس بات پر مامور ہو کہ بیابان کے سنگریزوں اور خاک کے تودوں کو فضائے آسمانی کی طرف اُٹھا کر لے جائے اور تباہ و ویران کر دینے والے زلزلے کے بعد انہیں قوم لوطؑ کے شہروں پر پھینک دے اور اس کے کچ مٹیوں کو ان کے نیچے دفن کر دے اس حد تک کہ ان کے شہروں کے ویرانے بھی صفحۂ زمین سے مٹ جائیں تاکہ یہ صُورت حال ہمیشہ کے لیے دوسرے لوگوں کے واسطے درس عبرت بن جائے۔[1]

اُوپر والی آیت ضمناً یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت لُوطؑ کے خاندان کی نجات صبح کے وقت ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ستم شعار قوم پر نازل ہونے والے عذاب کا وعدہ بھی صبح کے وقت کا تھا۔ اس لیے یہ خانوادہ، جو صاحب ایمان تھا، آخر شب میں (سوائے لوطؑ کی بیوی کے کہ جس نے اپنا راستہ لوطؑ سے علیحدہ اختیار کیا تھا) شہر سے باہر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ پہلے زلزلہ آیا، اس کے بعد پتھروں کی بارش شروع ہوئی جیسا کہ سُورۂ ھُود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے۔ فاسر باھلك بقطع من الیل ولا یلتفت منکم احد الا امرأتك انه مصیبها ما اصابهم ان موعدهم الصبح الیس الصبح بقریب ۔" رات کے ایک حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر روانہ ہو جاؤ اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے مُڑ کر نہ دیکھے سوائے تمہاری بیوی کے کہ وہ بھی اسی بلا میں گرفتار ہوگی جس میں سب مُبتلا ہوں گے۔ ان کی وعدہ گاہ صبح ہے۔ کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟"

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض مفسّرین نے ارباب لُغت کی پیروی کرتے ہوئے سحر کے معنی بین الطلوعین کے لیے ہیں یہ معنی اُوپر والی آیت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔[2]

بعد والی آیت میں تاکید کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ " خاندان لوطؑ کی نجات ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ جی ہاں! اسی طرح

---

[1] اس سلسلہ میں دوسرے مباحث جلد ۹ تفسیر نمونہ سُورۂ ھُود کی آیت ۸۲ کے ذیل میں بیان ہو چکے ہیں۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے: (السحر اختلاط ظلام آخر اللیل بضیاء النهار) آخر شب کی تاریکی کا دن کی روشنی کے ساتھ مل جانا سحر کہلاتا ہے۔

اس شخص کو کہ جو شکر گزاری کرے ہم اُجر دیتے ہیں۔" (نعمة من عندنا کذالك نجزی من شکر)۔[1]

بعد والی آیت میں یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ لوطؑ نے پہلے سے ان پر اتمامِ حجت کر دیا تھا اور انہیں عذاب الٰہی سے آگاہ کیا تھا لیکن انہوں نے خدا کی طرف سے کی جانے والی تنبیہ میں شک کیا اور وہ لڑنے جھگڑنے پر آمادہ رہے۔ (ولقد انذرھم بطشتنا فتماروا بالنذر)۔ "بطش" بروزن "فرش" "کسی چیز کو طاقت کے ساتھ پکڑنے کے معنی ہیں اور چونکہ سزا دیتے وقت پہلے مجرم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ سزا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ "تماروا" کا مادہ "تماری" ہے۔ اس کے معنی شک کرنے کے اور حق کے مقابلے میں جھگڑنے والی گفتگو کے ہیں۔

اُنہوں نے درحقیقت ایک دوسرے کی مدد کی تھی اور مختلف طریقوں سے عام لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا کیے تھے تاکہ اس عظیم پیغمبر کی طرف سے جو تنبیہ کی جا رہی تھی اس کے اثرات کو زائل کر دیں۔ اُنہوں نے لوگوں کے دلوں میں اعتقادات سے متعلق شبہات پیدا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدکاری و بے شرمی میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ جس وقت عذاب پر مامور فرشتے خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں مہمانوں کی حیثیت سے حضرت لوطؑ کے گھر میں داخل ہوئے تو یہ بے شرم گروہ ان کے پاس آیا اور جیسا کہ بعد والی آیت کہتی ہے: "اُنہوں نے لوطؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے مہمان اُن کی تحویل میں دے دیں۔" (ولقد راودوہ عن ضیفہ)۔ حضرت لوطؑ اس بات پر بے حد پریشان ہوئے اور ان لوگوں سے اصرار کیا کہ وہ ان کی اتنی بے عزتی نہ کریں یہاں تک کہ سورہ حجر کی آیت ۷۱ کے مطابق ان سے وعدہ کیا کہ (ان بداعمالیوں سے توبہ کی صورت میں) اپنی لڑکیوں کی شادی ان سے کر دیں گے۔ یہ چیز اس مظلوم پیغمبر کی انتہائی مظلومیت کو ظاہر کرتی ہے کہ جو اس بے شرم اور بے ایمان قوم کی طرف سے ان کے لیے روا رکھی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس حملہ کرنے والے گروہ نے اپنی پہلی سزا پا لی جیسا کہ خدا اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "ہم نے ان کی آنکھوں کو اندھا ہی نہیں کیا بلکہ غائب کر دیا اور ان سے کہا کہ میرے عذاب اور میری تخویف کا مزہ چکھو۔" (فطمسنا اعینھم فذوقوا عذابی ونذر)۔

جی ہاں! یہ وہ مقام تھا کہ قادرِ مطلق نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا اور بعض مفسرین کے بقول جبرئیل کو حکم دیا کہ اپنے شہپر ان سرکشوں کی آنکھوں پر ماریں جس کے نتیجے میں وہ فوراً نابینا ہو گئے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بالکل غائب ہو گئیں۔

اگرچہ آیت میں گفتگو اس مفہوم کو واضح نہیں کرتی کہ وہ کون لوگ تھے کہ جو فرشتوں کے پیچھے پیچھے آئے تھے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ پوری قوم لوطؑ نہیں آئی تھی۔ وہ ایسے اوباش لوگ تھے جو بدکاری میں سب سے آگے تھے۔ اُنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی اور اس طرح ان کی سرگزشت دوسرے لوگوں کے لیے درسِ عبرت بنی کیونکہ وہ اسی حالتِ زار میں اپنے گروہ کے پاس لوٹ کر آئے لیکن ان میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں تھا کہ جو اس ابتدائی عذاب سے عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہوتا۔

یہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے ان پر نازل ہونے والے عذاب کو صبح تک روکے رکھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حادثہ ایک روز پہلے واقع ہوا اور اس طرح انہیں مہلت دی گئی کہ وہ ایک رات اور اپنے حالات کے بارے میں غور و فکر کر لیں اور ان بدبخت اندھے ہونے والے افراد کی شکلوں پر عذاب الٰہی کا نمونہ دیکھیں۔ ممکن ہے کہ اُنہیں ہوش آ جائے اور وہ توبہ کر لیں لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔

---

[1] نعمة ایک فعل مقدر کا کہ جو اس کی جنس سے ہے "مفعول بہ" ہے یا "نجینا" کے فعل کا کہ جو پہلے والی آیت میں آیا ہے مفعول لہ ہے۔

ایک روایت کے مطابق خود ان نابیناؤں نے بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ وہ جس وقت دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف لوٹے تو انہوں نے قسم کھائی کہ کل صبح وہ خاندانِ لوطؑ کا ایک فرد بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ [1]

آخر کار انتہائی عذاب ان پر نازل ہو گیا۔ ایک ایسا تباہ کن زلزلہ آیا کہ جس نے سورج کی پہلی شعاع کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی ان کی زمین کو متزلزل کر کے رکھ دیا جس کے نتیجے میں ان کے شہر منہدم ہو کر رہ گئے، جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ مٹی کے نیچے دب گئے۔ ان کے سروں پر پتھروں کی شدید بارش ہوئی یہاں تک کہ ان کے ویرانوں کے نشانات بھی باقی نہ رہے۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "آخر کار صبح کے وقت پائیدار اور واقعی عذاب ان پر نازل ہوا" (ولقد صبحھم بکرة عذاب مستقر)۔ جی ہاں! مختصر سے لمحات میں یہ سب چیزیں ختم ہو گئیں اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ "بکرة" (دن کا آغاز) کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ "صبحھم" بہت وسیع معانی رکھتا ہے۔ یہ صبح کے تمام معانی کا احاطہ کرتا ہے جب کہ مفہومِ کلام صبح کی بالکل ابتداء سے متعلق تھا۔ یہ واقعہ طلوعِ فجر کی بالکل ابتداء میں ہوا تھا یا طلوعِ آفتاب کے آغاز میں، صحیح طور پر معلوم نہیں ہے لیکن "بکرة" کا مفہوم طلوعِ آفتاب کے آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ لفظ "مستقر" ثابت و برقرار کے معنی میں ہے اور یہاں ہو سکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ یہ عذاب استدر سرکچلنے والا، قوی اور طاقتور تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

بعض مفسّرین نے ان معانی کی نشان دہی بھی کی ہے کہ چونکہ دنیاوی عذاب برزخ کے عذاب سے متصل ہو چکا تھا لہٰذا "مستقر" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے اور یہ دوبارہ ان سے کہا گیا ہے: "اب میرے عذاب اور میری تخویف کا مزہ چکھو" (فذوقوا عذابی ونذر)۔ تاکہ پھر کبھی پیغمبروں کی طرف کی ہوئی تنبیہ کو شک کی نظر سے نہ دیکھو۔ یہ جملہ اس واقعہ میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ بات معلوم ہے کہ پہلا جملہ تو اس ابتدائی عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کے نتیجے میں وہ لوگ نابینا ہو گئے تھے جنہوں نے لوطؑ کے گھر پر ہجوم کیا تھا۔ دوسرا جملہ عذابِ واقعی و اصلی یعنی ویران کرنے والے زلزلے اور پتھروں کی بارش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آخر میں زیرِ بحث آیات میں سے سب سے آخری آیت میں درج ذیل پُر معنی اور ہوش میں لانے والے جملے کی چوتھی مرتبہ تکرار ہوئی ہے:

"ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے آسان کیا ہے تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔" (ولقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدکر)۔ قومِ لوطؑ نے کوئی نصیحت حاصل نہیں کی، نہ تنبیہ سے نہ ابتدائی عذاب سے۔ کیا ایسے دوسرے لوگ کہ جو اس قسم کے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں ان آیاتِ قرآنی کی سماعت کے بعد اپنے ہوش میں آئیں گے اور گناہوں سے توبہ کریں گے!

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" ج ۵ ص ۱۸۵

۴۱۔ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۚ
۴۲۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ○
۴۳۔ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۚ
۴۴۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ○
۴۵۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ○
۴۶۔ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ○

ترجمہ

۴۱۔ تخویف اور تنبیہ آلِ فرعون کے لیے آئیں۔
۴۲۔ لیکن ان سب نے ہماری آیات کی تکذیب کی، ہم نے ان کی گرفت کی اور ان پر عذاب نازل کیا۔
۴۳۔ کیا تمہارے کفّار ان سے بہتر ہیں؟ یا تمہارے لیے کتبِ آسمانی میں امان نامہ نازل ہوا ہے؟
۴۴۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد قوی اور کامیاب ہے۔
۴۵۔ لیکن وہ جان لیں کہ ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائے گی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے۔

۴۶۔ (اس کے علاوہ) قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور قیامت کا عذاب زیادہ ہولناک اور تلخ ہے۔

تفسیر

کیا تم گزشتہ اقوام سے افضل و برتر ہو؟

اس سلسلۂ کلام میں پانچویں اور آخری جس قوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ قوم فرعون ہے لیکن چونکہ اس قوم کی سرگزشت قرآن کی مختلف سورتوں میں تفصیلی طور پر آئی ہے لہٰذا یہاں صرف ایک مختصر لیکن جچا تُلا اشارہ ان کی عبرت انگیز داستان کی طرف ہوا ہے۔ پروردگارِ عالم ارشاد فرماتا ہے: "ہماری تنبیہیں یکے بعد دیگرے آلِ فرعون کی طرف آئیں۔" (ولقد جاء اٰل فرعون النذر) آلِ فرعون سے مُراد صرف فرعون کا خاندان اور اس سے وابستہ افراد نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ ان کے تمام پیروکاروں پر حاوی ہے۔ لفظ "آل" عموماً اہلِ بیت اور خاندان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بعض اوقات، جیسا کہ ہم نے کہا ہے، ایک وسیع معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرینۂ کلام بتاتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے "نذر" (بروزن کتب) "نذیر" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ڈرانے والا۔ یہ ڈرانے والا خواہ کوئی انسان ہو یا حادثہ کہ جو انسانوں کو خبردار کرے، انہیں ان کے انجام کار سے ڈرائے اور بچنے کی تلقین کرے۔ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ اُوپر والی آیت کا اشارہ موسٰےؑ اور ہارونؑ کی طرف ہو۔ دوسری صورت میں ممکن ہے کہ حضرت موسٰےؑ کے نو معجزوں کی طرف اشارہ ہو۔ بعد والی آیت بتاتی ہے کہ یہاں دوسرے معنی مناسب ہیں۔ [۱]

خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں کے مقابلے میں اور ان کی تہدید و تنبیہ کے مقابلے میں آلِ فرعون کا جو ردِ عمل ہے، اس پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"اُنھوں نے ہماری سب آیات کی تکذیب کی۔" (کذبوا باٰیاتنا کلها) جی ہاں ان خود پسند مغرور اور ظالم و جابر لوگوں نے بلا استثناء خدا کی تمام آیتوں کی تکذیب کی۔ ان کو جھوٹ، سحر یا اتفاقی حوادث بتایا۔

لفظ "آیات" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ معجزات پر بھی حاوی ہے لیکن سورہ اسرا کی آیت ۱۰۱ کے قرینے سے "ولقد اٰتینا موسٰی تسع اٰیات بیّنات۔" "ہم نے موسٰی کو نو واضح معجزات عطا کیے"، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انہی نو معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ [۲]

---

[۱] توجہ کرنی چاہیئے کہ "نذر" "نذیر" کی جمع بھی ہے اور مصدر یا اسم مصدر کے معنی بھی رکھتا ہے اور چونکہ مصدر کا صفت کی حیثیت سے بھی اطلاق ہوتا ہے لہٰذا دونوں ایک ہی مفہوم کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔

[۲] "موسٰیؑ کے نو معجزات" قرآن کی مختلف آیتوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتے ہیں۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اگر انسان حقیقت کا متلاشی ہو تو ان معجزوں میں سے کسی ایک کا پہلے سے خوف محسوس کرتے ہوئے دیکھنا اور اس کے بعد خدا کے پیغمبر کی دُعا کے وسیلے سے مصیبت کا برطرف ہو جانا اس کے لیے کافی ہے لیکن جس وقت انسان بالکل ہی ہٹ دھرم بن جائے تو پھر آسمان و زمین سر سے پا تک آیت خدا بن جائیں تو بھی مؤثر نہیں ہو سکتے۔ صرف عذاب الٰہی کو اگر ایسے پُر غرور دماغوں کو کچلنا چاہیئے۔ چنانچہ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ہمیں ملتا ہے کہ "ہم نے ان کی گرفت کی اور انہیں سزا دی۔ گرفت اس کی کہ جو کبھی مغلوب نہیں ہوتا اور مقتدر و توانا ہے"۔ (فاخذناهم اخذ عزيز مقتدر)۔ "اخذ" پکڑنے اور گرفت کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ مجرم کو سزا دینے کے لیے پہلے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ سزا و عذاب کے کنائے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جو مفہوم اس واقعہ کے ذیل میں آیا ہے وہ تمام سرگزشتوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ وہ اس وجہ سے کہ فرعونی اپنی طاقت اور قوت پر سب سے زیادہ فخر و مباہات کرتے تھے اور ان کی اس قوت و طاقت کی ہر جگہ شہرت تھی۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے کہ ہم نے ان کی گرفت کی، اور گرفت بھی خوب مضبوط، تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ یہ عارضی اور مختصر سی طاقت خُدا کی عزت و قُدرت کے مقابلہ میں بالکل کھوکھلی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ باعثِ تعجب یہ ہے کہ وہی دریائے نیل جو ان کی طاقت ثروت اور آبادی و تہذیب کا سرچشمہ تھا ان کی بربادی پر مامور ہُوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہایت معمولی موجودات ٹڈی دل، جوئیں اور مینڈک ان پر مسلط ہوئے اور انہوں نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ لاچار کر کے رکھ دیا۔ گزشتہ قوموں کے واقعات اور سرکش و مجرم اُمتوں پر نازل ہونے والے عذاب کو بیان کرنے کے بعد اس سے اگلی آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "کیا تمہارے کفار گزشتہ کافروں سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی کتابوں میں امان نامہ نازل ہو چکا ہے"۔ (أكفاركم خير من اولٰئكم ام لكم برآءة في الزبر)۔[1]

قوم فرعون و نوح اور لوط و ثمود اور تمہارے درمیان فرق کیا ہے۔ اگر وہ کفر، سرکشی، ظلم اور گناہ کی وجہ سے طوفانوں زلزلوں اور صاعقوں میں گرفتار ہوئے تو پھر کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر تم ایسے مصائب کا شکار نہیں ہو سکتے۔ کیا تم ان سے بہتر ہو؟ یا پھر یہ کہ تمہارا طغیان اور عناد و کفر ان کے طغیان و عناد اور کفر سے کمتر ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے تو پھر کس طرح خود کو عذابِ الٰہی سے محفوظ سمجھتے ہو مگر اس صورت میں کہ امان نامہ تمہارے لیے آسمانی کُتب میں نازل ہوا ہو۔ یقیناً یہ دعویٰ جھوٹا ہے اور اس پر تم کسی قسم کی دلیل نہیں رکھتے۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں: "کہ ہم متحد، متفق اور طاقتور جماعت ہیں اور ہم اپنے مخالفوں سے انتقام لیں گے اور ان پر کامیابی حاصل کریں گے"۔ (ام يقولون نحن جميع منتصر)۔[2]

(حاشیہ بقیہ صفحہ)
(۱) عصا کا عظیم اژدہے میں تبدیل ہونا۔ (طٰہٰ ۔ ۲۰) (۲) "ید بیضاء" حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا مصدر نور کی طرح چمکنا۔ (طٰہٰ ۔ ۲۲) (۳) سرکوبی کرنے والا طوفان۔ (اعراف ۔ ۱۳۳) (۴، ۵، ۶، ۷) ٹڈی دل جو زراعتوں پر مسلط ہوئے اور جوئیں (ایک قسم کی نباتی مصیبت)، مینڈک جنہوں نے دریائے نیل سے نکل کر مختصر سی مدت میں ان کی سطح زندگی کو ڈھانک لیا اور خون دریائے نیل نے خون کا رنگ اختیار کیا (اعراف ۔ ۱۳۳) ۸، ۹ خشک سالی اور پھلوں کی کمی (اعراف ۔ ۱۳۰) جن میں سے ہر ایک کی تفصیل متعلقہ آیات کے ذیل میں دی گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)
[1] "اكفاركم" میں ضمیر کا ہر (ام لكم براءة في الزبر) کے قرینے سے کفارِ عرب کی طرف لوٹتی ہے۔

[2] باوجودیکہ نحن جمع کی ضمیر ہے اس کی خبر "جميع" مفرد کی شکل میں آئی ہے اور اسی طرح "منتصر" جو کہ خبر کے بعد خبر یا جمیع کی صفت ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ "جميع" اگرچہ لفظاً مفرد ہے لیکن معنی کے لحاظ سے جمع ہے۔

"جمع" "مجموع" کے معنوں میں ہے۔ یہاں اس سے مُراد ایسی جماعت ہے کہ جن کا کوئی مطلوبہ مقصد ہو اور وہ عمل کی صلاحیت رکھتی ہو۔ "منتصر" کا مفہوم انہی معانی کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ اس کا مادہ "انتصار" ہے جس کے معنی انتقام لینے کے اور کامیاب ہونے کے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت خطاب کی شکل میں تھی لیکن زیرِ بحث آیت اور آگے آنے والی آیات غائب کی صُورت میں کفار سے گفتگو کرتی ہیں اور یہ ان کی ایک قسم کی تحقیر ہے یعنی وہ اس قابل نہیں ہیں کہ اس سے زیادہ خطابِ الٰہی کے مستحق ہوں۔ بہرحال اگر وہ اس قسم کی قدرت کا دعویٰ کریں تو وہ بھی بے بُنیاد ہے۔ وہ اس لیے کہ آلِ فرعون اور قومِ عاد و ثمود اور انہی جیسے اور گروہ، جو ان سے زیادہ قوی تھے، عذابِ الٰہی کے عظیم طوفان کے مقابلے میں پرِکاہ کی طرح کمترین مقاومت بھی اپنی طرف سے نہیں دکھا سکے چہ جائیکہ یہ چھوٹا سا گروہ کہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اس کے بعد ایک قاطع اور دو ٹوک پیشین گوئی کے عنوان سے ان کی باتوں کو ردّ کرتے ہوئے پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے:

"وہ جان لیں کہ عنقریب ان کی جماعت شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوگی"۔ (سیھزم الجمع و یولون الدبر)۔[1]

جاذبِ توجہ یہ امر ہے کہ "سیھزم" کا مادہ "ھزم" بروزن "جزم" ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی خشک جسم کو اتنا دبانا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ یہاں اسی مناسبت سے لشکر کے تتر بتر اور درہم و برہم ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ بظاہر متحد و مربوط ہیں لیکن چونکہ ایسے موجودات کی طرح ہیں جو خشک ہوتے ہیں، لہٰذا وہ قوی دباؤ کے مقابلے میں درہم و برہم ہو جائیں گے۔ برخلاف مومنین کے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس میں مرکزیت بھی ہو۔ "دبر" کے معنی پشت کے ہیں یہ "قُبل" کی ضد ہے جس کے معنی اگلے حصّہ کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں مکمل طور پر میدانِ جنگ میں پُشت دکھانے کے مفہوم میں ہے۔ یہ پیشین گوئی میدانِ بدر میں اور دوسری جنگوں میں حُرف بہ حُرف صحیح ثابت ہوئی اور کفار کا مضبوط اور طاقتور گروہ میدانِ جنگ سے ہزیمت خوردہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زیرِ بحث موضوع کے متعلق آخری آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "صرف دُنیا ہی میں شکست و ناکامی ان کا حصّہ نہیں ہے بلکہ قیامت ان کی وعدہ گاہ ہے اور روزِ محشر کی سزائیں زیادہ سخت اور ہولناک ہیں"۔ (بل الساعة موعدھم والساعة ادھٰی وامر)۔ اس اعتبار سے انہیں اس دنیا میں بھی شکست کی تلخی کا مزہ چکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے اور آخرت میں ان کے لیے زیادہ تلخ اور وحشت ناک شکست ہے۔ "ادھٰی" کا مادہ "دھو" اور "دھاء" ہے اس کے معنی ایسی بڑی مصیبت اور عظیم حادثہ کے ہیں کہ جس سے چھٹکارہ ممکن نہ ہو۔ یہ لفظ کبھی انتہائی ہُشیاری کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں اس کے پہلے معنی ہیں۔ جی ہاں! وہ قیامت میں ایسی صُورت حال سے دوچار ہوں گے کہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں ہوگی۔

---

[1] اگرچہ مناسب ہے کہ "یولون الادبار" کہا جائے۔ اس کی جگہ "یولون الدبر" کہا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ جنس کے معنی رکھتا ہے کہ جو جمع کے حکم میں ہے۔

ایک نکتہ

ایک واضح اور معجزہ کی کیفیت رکھنے والی پیشین گوئی

اس میں شک نہیں کہ مکہ میں جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں تو مسلمان بالکل اقلیت میں تھے اور دشمن انتہائی طاقتور تھا مسلمانوں کی ان کے مقابلے میں جلدی کامیابی کی پیشین گوئی ہرگز قابلِ اعتبار نہ تھی لیکن تھوڑی سی مدت کے بعد مسلمانوں نے ہجرت کی اور اتنی طاقت جمع کر لی کہ میدانِ بدر میں دشمن کے ساتھ اپنے پہلے ٹکراؤ میں ایک خوفناک ضرب لگائی۔ اس صورتِ حال کی کفار کو قطعاً توقع نہیں تھی۔ پھر جنگِ بدر کے واقعہ کو چند سال بھی نہیں گزرے تھے کہ نہ صرف کفارِ مکہ بلکہ تمام جزیرۃ العرب مسلمانوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکا تھا۔ تو کیا مستقبل کے بارے میں غیب سے تعلق رکھنے والی خبر بالکل واضح طور پر ایک معجزہ نہیں ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی خبریں غیبت پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ زیرِ بحث آیت میں ہے۔

٭ ٭ ٭

۴۷۔ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝

۴۸۔ یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا
مَسَّ سَقَرَ ۝

۴۹۔ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝

۵۰۔ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ۝

۵۱۔ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَاۤ اَشْیَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

۵۲۔ وَكُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ۝

۵۲۔ وَكُلُّ صَغِیْرٍ وَّكَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝

۵۴۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝

۵۵۔ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝

ترجمہ

۴۷۔ مجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں۔

۴۸۔ جس دن وہ جہنم کی آگ میں مُنہ کے بل گرائے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا)
جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔

۴۹۔ ہم نے ہر چیز کو ایک مقدار میں پیدا کیا ہے۔

۵۰۔ اور ہمارا فرمان ایک امر سے زیادہ نہیں ہے، ایک چشم زدن کی مانند۔

۵۱۔ ہم نے ان لوگوں کو جو تمہارے مانند تھے ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے جو نصیحت پکڑے؟

۵۲۔ اور جو کام انہوں نے کیا ان کے نامہ اعمال میں تحریر ہے۔

۵۳۔ اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے۔

۵۴۔ پرہیزگار جنت کے باغات اور نہروں کے پاس جگہ رکھتے ہیں

۵۵۔ صدق کی جگہ خداوند مالک و مقتدر کے پاس۔

تفسیر

مقام صدق میں خداوند مقتدر کے پاس

ان آیتوں میں قیامت کے دن مشرکین اور مجرموں کی جو کیفیت ہوگی اور جس کی بحث گزشتہ آیتوں میں تھی اسی کے بیان کو جاری رکھا گیا ہے۔ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت نے اس حقیقت کو پیش کیا تھا کہ قیامت کا دن ان کی وعدہ گاہ ہے اور وہ دن مصیبت کا دن ہے اور تلخی لیے ہوئے ہے، ایسی تلخی کہ جو دُنیا کی مصیبتوں اور شکستوں سے زیادہ تلخ ہوگی۔ زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت میں اس امر کی علت کو پیش کرتے ہوئے خدا فرماتا ہے:

"مجرمین گمراہی اور آگ کے شعلوں میں ہیں": (ان المجرمین فی ضلال و سعر)[۱]۔

"قیامت کے دن وہ جہنم کی آگ میں اپنے منہ کے بل کھینچے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی آگ کا مزہ چکھو۔ وہ دوزخ جس کا تم ہمیشہ انکار کرتے تھے اور اسے محض جھوٹ تصور کرتے تھے": (یوم یسحبون فی النار علی وجوھھم ذوقوا مس سقر)۔ "سقر" بروزن "سفر" جسم کے رنگ کے متغیر ہونے اور دھوپ کی شدت سے یا ایسی ہی کسی دوسری

---

[۱] "سعر"، جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی آیت ۲۴ میں اشارہ کیا ہے دو معنی رکھتا ہے پہلا یہ کہ یہ جمع ہے "سعیر" کی جس کے معنی جلتی ہوئی آگ کے ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ جنون ہیجان اور اشتعال کے معنوں میں ہے کہ جو فکری اعتدال کے فقدان کے وقت ہوتا ہے۔ زیر بحث آیت میں ممکن ہے پہلے معنی میں ہو یا پھر دوسرے معنوں میں۔ اگر دوسرے معنوں میں ہو تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: "وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اپنے جیسے انسان کی پیروی کریں تو ہم گمراہ ہیں اور دیوانے ہیں"۔ قرآن کہتا ہے کہ قیامت کے دن سمجھ لیں گے کہ وہ انکار اور جنون کی وجہ سے گمراہی میں تھے۔

چیز سے تکلیف اُٹھانے کے معنی میں ہے۔ چونکہ جہنم تکلیف و آزار کا ایک ایسا ہی شدید تنوع رکھتا ہے اس لیے اس کا نام سقر ہے۔ اور "مس" سے مُراد چھُونا ہے۔ اسی بنا پر دوزخیوں سے کہا جائے گا اس جلانے والی آنچ کا مزہ چکھو جو جہنم کی آگ کے چھُونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے چکھو اور یہ نہ کہو کہ یہ چیزیں جھُوٹ، خرافات اور افسانے ہیں۔

بعض مفسّرین کا نظریہ یہ ہے کہ "سقر" تمام دوزخ کا نام نہیں ہے بلکہ دوزخ کا ایک خاص حِصّہ ہے جس میں حد سے زیادہ تپش ہے چنانچہ ایک روایت میں امام جعفر صادق سے نقل ہوا ہے کہ "سقر" ایک درہ ہے اور یہ متکبّر لوگوں کے لیے ہے۔ یہ درہ جس وقت سانس لیتا ہے تو جہنم کو جلا دیتا ہے۔[1]

چونکہ یہ ہو سکتا تھا کہ یہ خیال ہو کہ یہ عذاب اِن گناہوں سے متناسب نہیں ہے، اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے کہ "ہم نے ہر چیز کو مقدار اور اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" (انا کل شیء خلقناہ بقدر)۔ جی ہاں ان کے اس دنیا کے دردناک عذاب کا بھی حساب کتاب ہے اور ان کو آخرت میں پہنچنے والی سزائیں ہی نہیں بلکہ ہر چیز کو خدا نے حساب و کتاب کے ماتحت پیدا کیا ہے۔ زمین و آسمان، زندہ و بے جان وجود، انسانی جسم کے اعضا اور زندگی کے وسائل ہر ایک چیز حساب کتاب کے ماتحت اور ضروری مقدار کے مطابق ہے۔ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے اس لیے کہ خالق حکیم کی پیدا کردہ ہے۔
اس کے بعد فرماتا ہے: "نہ صرف ہمارے اعمال حکمت کی رُو سے ہیں بلکہ انتہائی قدرت و قاطعیت کے ساتھ بھی ہیں کیونکہ ہمارا فرمان ایک اَمر سے زیادہ نہیں ہے اور وہ اتنی تیزی کے ساتھ تکمیل پاتا ہے جیسے پلک کا ایک مرتبہ جھپکنا۔" (وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر)۔ جی ہاں جس چیز کے بارے میں ہم ارادہ کریں تو ہم کہتے ہیں "کن" ہو جا تو وہ بلا تاخیر ہو جاتی ہے۔ (حتیٰ کہ کُن کی اصطلاح بھی محض افہام کے لیے ہے ورنہ خدا کا ارادہ، مشیّت اور اس کی مُراد کا تحقق یہ سب ایک ہی چیز ہیں) اس بنا پر جس دن ہم قیامت کے برپا ہونے کا فرمان صادر کریں گے تو چشم زدن میں ہر چیز قیامت کی گرفت میں ہوگی اور جسموں کے ڈھانچوں میں نئی زندگی پھونک دی جائے گی۔ اس طرح جس روز ہم ارادہ کریں کہ مجرموں کو آسمانی بجلی کی چیخ یا زمین کے زلزلوں، طوفانوں اور تیز آندھیوں سے معذب کریں یا ان پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ رکھیں گے تو اس کے لیے ایک حکم سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں گنہگاروں کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ خدا حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ قطعی اور دو ٹوک فیصلے کرتا ہے اور وہ قاطعیت کے ساتھ حکیم بھی ہے۔ لہذا اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کریں۔ بعد والی آیت میں دوبارہ کفار و مجرمین کو مخاطب کرتے ہوئے اور گزشتہ اقوام کے حالات کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: "ہم نے گزشتہ زمانے میں کچھ افراد کو جو تمہارے ہی جیسے تھے، ہلاک کیا۔ کیا کوئی ہے کہ جو نصیحت حاصل کرے؟ (ولقد اهلكنا اشياعكم فهل من مدكر)۔
"اشیاع" جمع ہے شیعہ کی، ایسے لوگوں کے معنوں میں ہے کہ جو کسی فرد کی طرف سے چہار جانب جائیں اور اس فرد سے متعلق امور کی نشر و اشاعت کریں اور اس کو تقویت پہنچائیں۔ اگر شیعہ پیروکار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ یقیناً گزشتہ اقوام، مشرکین مکّہ کی پیروکار نہیں تھیں بلکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا لیکن چونکہ کسی فرد کے طرفدار اس کے شیعہ ہوتے ہیں، اس لیے یہ لفظ مانند اور مثل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ کفار مکّہ کا یہ گروہ گزشتہ لوگوں کے طرز عمل سے بھی قوت حاصل کرتا تھا اور ان

[1] تفسیر صافی در ذیل آیات زیر بحث

کے نظریات سے استفادہ کرتا تھا۔ اسی بنا پر گزشتہ اقوام پر " اشیاع " کا اطلاق ہوا ہے۔

بہر حال یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تاکید کرتی ہے کہ جب تمہارے اعمال، رفتار و گفتار اور عقائد ان کے عقائد وغیرہ مشترک ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو۔ بیدار ہو جاؤ اور نصیحت حاصل کرو۔ اس کے بعد اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گزشتہ اقوام کی موت کے ساتھ ان کے اعمال کالعدم نہیں ہو گئے بلکہ " جو کام انہوں نے انجام دیے ہیں وہ ان کے نامہ اعمال میں مندرج ہیں "۔ (وکل شیء فعلوہ فی الزبر)۔ اسی طرح تمہارے اعمال بھی مندرج و منضبط ہیں اور روز حساب کے لیے محفوظ ہیں۔ " زبر " جمع ہے " زبور " کی جو کتاب کے معنی میں ہے۔ یہاں انسانوں کے نامہ اعمال کے معنوں میں ہے۔ بعض نے اس احتمال کی تائید بھی کی ہے کہ اس سے مراد " لوح محفوظ " ہے۔ لیکن یہ معنی جمع کے معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید مزید کے لیے خدا فرماتا ہے : " اور ہر چھوٹا بڑا کام بلا استثنا لکھا جائے گا۔ (وکل صغیر وکبیر مستطر)۔ اس بنا پر اس روز جو اعمال کا حساب و کتاب ہوگا، وہ ایک جامع اور مکمل حساب ہوگا چنانچہ جس وقت مجرموں کا نامہ اعمال ان کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ فریاد کریں گے کہ " وائے ہو ہم پر یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج نہ ہو "۔ ویقولون یاویلتنا مال هذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها ۔ (سورہ کہف ۔ آیت ۴۹) ۔ " مستطر " کا مادہ سطر ہے۔ اس کے معنی صف کے ہیں۔ وہ خواہ انسان ہوں کہ ایک صف میں کھڑے ہوں یا درخت ہوں جو ایک صف میں ایستادہ ہوں یا الفاظ ہوں کہ جو صفحہ کاغذ پر ایک ہی صف میں تحریر ہوں۔ چونکہ یہ زیادہ تر آخری معنوں میں استعمال ہوتا ہے لہذا یہی مفہوم عام طور پر اس سے ذہن میں آتا ہے۔

بہر حال یہ ایک دوسری تنبیہ ہے گنہگار، غافل اور بے خبر لوگوں کے لیے۔

قرآن مجید کی سنت یہ ہے کہ اس کے بیانات میں اچھے بُرے اور نیک و بد افراد ایک دوسرے کے موازنہ اور تقابل سے متعارف ہوتے ہیں اور موازنہ و تقابل کی صورت میں دونوں کا فرق بھی واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بھی کافر مجرموں کے احوال کے تذکرے کے بعد پرہیزگاروں کے مسرت بخش اور روح پرور احوال کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے : " پرہیزگار جنت کے باغوں میں نہروں کے قریب وسیع فضا اور خدا کے واضح فیض (کے مقام پر) جگہ رکھتے ہیں "۔ (ان المتقین فی جنات ونھر) " نہر " بر وزن " قصر " اور " نہر " بر وزن " قہر " دونوں بہت سے پانی کے بہنے کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے کبھی وسیع فضا، فیض عظیم یا پھیلی ہوئی روشنی کے لیے " نہر " بر وزن " قصر " کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ زیر بحث آیت میں (آئندہ آنے والی حدیث سے قطع نظر) ممکن ہے اسی اصلی معنی کے مطابق پانی کی نہر یا دریا ہو۔ اس کا مفرد ہونا کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ وہ جنس و جمع کے معنی رکھتا ہے۔ اسی لیے " جنات " جو " جنت " کی جمع ہے، اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فیض الٰہی کی وسعت، جنت کی وسیع روشنی اور اس کی وسیع فضا کی طرف اشارہ ہو یا دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو لیکن اس حدیث میں جو دُرِ منثور میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے ہم دیکھتے ہیں کہ (النھر الفضاء والسعة لیس بنھر جار) " نہر " کے معنی وسیع فضا کے ہیں، جاری نہر کے نہیں[1]۔

زیر بحث آیات کی آخری آیت نے کہ جو سورۂ قمر کی بھی آخری آیت ہے مُتقین کی رہائش گاہ کی مزید وضاحت کی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے : " وہ جائے صدق و حق اور راستی میں مالک و قادر خدا کے ہاں قرار و مقام رکھتے ہیں "۔ (فی مقعد صدق عند ملیك

---

[1] تفسیر " در المنثور " ج ۶ ۔ ص ۱۳۹

مقتدر)۔ اس آیت میں پرہیزگاروں کی رہائش گاہ کی کیسی پُرکشش اور جاذبِ توجہ توصیف ہے۔ اس میں دو خصوصیتیں ہیں جن میں تمام امتیازات جمع ہیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ صدق کی جگہ ہے۔ وہاں کسی قسم کی بے ہودگی یا باطل کا کوئی گزر نہیں ہے۔ وہ سراسر حق ہے جنت کے بارے میں خدا کے سارے وعدے حقیقت کا رُوپ دھارلیں گے اور ان کی سچائی بالکل واضح اور آشکار ہوگی۔ دوسری خصوصیت یہ کہ وہ خدا کے قُرب وجوار میں ہے۔ وہی چیز کہ جو "عند" سے ظاہر ہوئی ہے۔ یہ قربِ معنوی کی انتہا کی طرف اشارہ ہے۔ قربِ جسمانی کی طرف نہیں۔ اور پھر خدا کی نسبت کہ جو مالک بھی ہے اور قادر بھی ہر قسم کی نعمت و موہبت اس کے قبضہ میں ہے اور اس کی حکومت و ملوکیت کے زیرِ فرمان ہے۔ اس بنا پر وہ ان مہمانانِ گرامی کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے ان کے لیے کیا کیا نعمتیں فراہم کی ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان دو آیتوں میں کہ جہاں جنت کی نعمتوں اور جزاؤں کے بارے میں گفتگو ہے ان میں پہلے تذکرہ وسیع باغات اور جاری نہروں کا ہے۔ یہ مادی نعمتیں ہیں۔ پھر ان کے عظیم معنوی اجر کا ذکر ہے یعنی خُدائے مالک و قادر کی بارگاہ میں حضوری کا تذکرہ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ انسان کو حقائق کی طرف رفتہ رفتہ مائل کرے۔ اس کی رُوح کو پرواز کرائے اور عشق ونشاط میں مستغرق کرے۔ "ملیك مقتدر" اور "مقعد صدق" ایسے الفاظ ہیں کہ جو اللہ کے حضور اور اس کے قُربِ معنوی کے دوام و بقاء پر دلالت کرتے ہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ اس جہان کی تمام چیزیں حساب و کتاب کی تابع ہیں

(انا کل شیء خلقناه بقدر) کا جُملہ اختصار کے باوجود عالمِ تخلیق کی ایک اہم حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے ایسی حقیقت کہ جو پورے عالمِ امکان پر حکمران ہے اور وہ ساری کائنات میں ہر چیز کی مقدار کا نہایت باریک بینی کے ساتھ تعین ہے۔ انسان کا علم جس قدر ترقی کررہا ہے، وہ باریک بینی پر مبنی اس دقیق تعینِ مقدار سے زیادہ طور پر باخبر ہوتا جارہا ہے۔ تعینِ مقدار کے سلسلہ میں یہ دقتِ نظر نہ صرف زمینی موجودات میں کارفرما ہے بلکہ آسمان کے عظیم کُرّوں میں بھی جاری و ساری ہے۔ مثال کے طور پر ہم سُنتے ہیں کہ الیکٹرانکی دماغوں کی مدد سے سینکڑوں مخصوص ماہرینِ فن نہایت دقیق علمی حساب لگا کر اس امر پر قادر ہوئے ہیں کہ کُرّہ قمر کے اس علاقہ میں اُتریں کہ جہاں وہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ جن چند دنوں میں خلائی جہاز زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو تمام صورتِ حال اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ چاند اپنے گرد بھی گھوم رہا ہے اور زمین کے گرد بھی گردش کر رہا ہے اس طرح اس کی جگہ کمل طور پر بدل جاتی ہے۔ جبکہ خلائی جہاز کے ایک مصروف لمحے ہی کے دوران زمین اپنے گرد بھی گردش کرتی ہوتی ہوتی ہے اور سُورج کے گرد بھی گردش میں مصروف ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ مختلف قسم کی گردشیں ایسے حساب کے مطابق ہیں کہ جو بہت باریک بینی پر مبنی ہے اور جس میں ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا۔ اَب فضا نورد اس قابل ہو چکے ہیں کہ نہایت پیچیدہ حساب کے باوجود وہ اپنے پسندیدہ خطے میں جا اُتریں۔ علم نجوم کے ماہر اس قابل ہو گئے ہیں کہ دسیوں سال پہلے مکمل یا نامکمل چاند گہن اور سُورج گہن کے متعلق زمین کے مختلف

حصّوں کے حوالے سے صحیح طور پر پیشین گوئی کرسکیں۔ یہ تمام باتیں اس وسیع دنیا میں حساب کی انتہائی باریک بینی پر دلالت کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جانداروں میں، مثال کے طور پر ننھی منی چیونٹیوں میں، ان کے مختلف قسم کے جسموں، رگوں اور پٹھوں کے بارے میں یہ حساب انسان کو حیران کر دینے کے قابل ہے۔ جس وقت ہم زیادہ چھوٹے موجودات مثلاً مائیکروب، وائرس اور امیبا تک پہنچتے ہیں تو حساب کی عمدگی اور صحت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ملی میٹر کا ہزارواں حصہ بلکہ اس سے چھوٹا حصہ بھی مکمل طور پر حساب کے ماتحت ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم ایٹم کے دائرہ میں داخل ہوں تو پھر ان تمام اندازہ لگانے والے پیمانوں کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ اب حساب کے موضوعات اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی انسان کے دائرہ فکر میں نہیں آتے۔ یہ تخمینے صرف مقداروں کے بارے میں نہیں ہیں، ترکیبی کیفیتیں بھی اندازہ لگانے کے ان پیمانوں کی گرفت میں آجاتی ہیں۔ وہ نظام، کہ جو رُوحِ انسانی کے تقاضوں اور رجحانات و میلانات پر حاکم ہے، اس کا بھی حساب لگایا جا سکتا ہے حتیٰ کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی خواہشات کا وہ سلسلہ کہ جس میں ذرا سی بھی برہمی واقع ہو جائے تو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی درہم و برہم ہو جائے اس کو ناپنے کے بھی دقیق پیمانے موجود ہیں۔ عالمِ طبعی میں ایسی موجودات ہیں کہ جو ایک دوسرے کے لیے مصیبت کا باعث بھی ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں بھی ڈٹی ہوئی ہیں۔

شکاری پرندے چھوٹے پرندوں کے گوشت سے غذا حاصل کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہیں کرتے کہ تمام موجود ذخیرۂ غذا کیلئے نقصان دہ ثابت ہوں۔ نتیجتہً ان کی عمر طویل ہوتی ہے۔ یہ شکاری پرندے بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ ان کے بچّوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے یہ صرف خاص حالات میں تنہا زندگی گزارتے ہیں۔[۱] اس طویل عمر کے ساتھ ان کے بچے بھی زیادہ ہوتے تو دُنیا سے تمام چھوٹے پرندوں کی نسلیں ختم ہو کر رہ جاتیں۔ عالم حیوانات و نباتات میں اس موضوع کا دامن بہت وسیع ہے جس کا مطالعہ انسان کو (انا کل شیءٍ خلقناہ بقدر) کی گہرائی اور اس کے عمق سے زیادہ رُوشناس کراتا ہے۔

۲۔ تقدیرِ الٰہی اور اس کے اِرادہ کی آزادی

ہوسکتا ہے کہ زیرِ بحث آیت اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں سے یہ غلط تاثر پیدا ہو جائے کہ اگر ہر چیز کو خدا نے اندازے، مقدار اور حساب کے ساتھ پیدا کیا ہے تو پھر ہمارے افعال و اعمال بھی اس کی مخلوق ہیں، لہٰذا ہم کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں رکھتے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اگرچہ ہمارے افعال و اعمال مشیت و تقدیرِ الٰہی کے مطابق ہیں اور اس کی قدرت اور ارادہ کے احاطہ سے ہرگز خارج نہیں ہیں لیکن اس نے یہ بات مقدر کردی ہے کہ اپنے اعمال میں ہم مختار ہیں اور اسی بنا پر وہ ہمارے بارے میں ذمہ داری و جوابدہی کا قائل ہے۔ اگر ہم اپنے افعال میں بالکل بے اختیار ہوتے تو تکلیفِ شرعی اور ذمہ دارانہ جوابدہی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہتا۔ ہمارا اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار نہ رکھنا تقدیرِ الٰہی کے خلاف ہے۔

جبریوں کی افراط کے مقابلہ میں، اس کے برعکس، ایک گروہ تفریط اور تیز روی کا شکار ہے۔ وہ "قدری" یا "مفوضہ" کہلاتے ہیں۔ وہ بالکل وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے اختیار میں ہیں اور خدا کو ہمارے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے الٰہی حاکمیت کی حدود کو محدود کر دیا ہے، خود کو مستقل سمجھا ہے اور شرک کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توحید و عدل کی دونوں اصلوں کے درمیان جو نقطہ ہے اس کو سمجھنے کے لیے خاصی بصیرت درکار ہے۔ اگر ہم توحید کا مفہوم یہ لیں کہ ہر ایک شے حتیٰ کہ ہمارے اعمال کا خالق بھی خدا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کے سلسلہ میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے تو اس طرح ہم عدلِ الٰہی کے منکر ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایسی صورت میں خدا نے گنہگاروں کو بے اختیار رکھ کر مجبورِ محض کر دیا ہے پھر اس پر طرّہ یہ کہ انہیں سزا بھی دے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم عدل کے معنی یہ سمجھیں کہ خدا ہمارے اعمال میں بالکل مداخلت نہیں کرتا تو ہم نے اس کو اس کی حکومت سے خارج کر دیا اور اس طرح ہم شرک کے گڑھے میں جا گرے۔

"امر بین الامرین" ایک درمیانی خط ہے اور وہ صراطِ مستقیم بھی ہے اور عقیدہ صحیح بھی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ ہم صاحبِ اختیار ہیں لیکن ہمارا یہ صاحبِ اختیار ہونا بھی خدا کے ارادے سے ہے۔ جس وقت چاہے وہ ہمارے اختیار کو سلب کر سکتا ہے۔ یہ مکتبِ فکرِ اہل بیت علیہم السلام ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ زیرِ بحث آیات کے ذیل میں متعدد روایات مذکورہ بالا دونوں فرقوں کے بارے میں بصورتِ مذمت کُتبِ اہلِ سُنّت و شیعہ میں وارد ہوئی ہیں۔ منجملہ ان حدیثوں کے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

(صنفان من امتی لیس لهم فی الاسلام نصیب المرجئة والقدریة انزلت فیهم أیة فی کتاب الله ان المجرمین فی ضلال وسعر ...)

"میری اُمت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے " جبری " اور " قدری " اور ان کے بارے میں (ان المجرمین فی ضلال وسعر) " گنہگار اور مُجرم گراہی، جنون اور آگ کے شعلوں میں ہیں"۔ نازل ہوئی ہے[1]

"مرجئہ" کا مادّہ "ارجاء" ہے اس کے معنی تاخیر میں ڈالنے کے ہیں۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو جبریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ وہ اوامرِ الٰہی کی پرواہ نہیں کرتے اور معصیت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اس گمان میں ہیں کہ وہ مجبور ہیں یا یہ کہ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کے انجام کا معاملہ واضح نہیں ہے۔ وہ اسے قیامت پر چھوڑتے ہیں۔[2]

امام باقرؑ کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ (نزلت هذه فی القدریة ذوقوا مس سقر انا کل شیءٍ خلقناه بقدر) یہ آیات قدریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ قیامت میں ان سے کہا جائے گا "جہنم کی آگ کا مزہ چکھو"۔ ہم نے ہر چیز کو حساب اور اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔[3]

(یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اندازہ اور حساب سے مُراد یہ ہے کہ ہر گناہ کے لیے ہم نے معیّن سزا قرار دی ہے۔ یہ آیت کی ایک اور تفسیر ہے یا یہ کہ تم جو تقدیرِ الٰہی کے منکر تھے اور ہر چیز پر خود کو قادر سمجھتے تھے اور خدا کو اپنے اعمال کی قلمرو سے خارج سمجھتے تھے تو اب تم

۱۔ تفسیر رُوح المعانی میں یہ حدیث بخاری، ترمذی ابن ماجہ، ابن عدی اور ابن مردویہ سے ابن عباس سے نقل ہوئی ہے۔ ج ۲۷ ص ۸۱۔ اس کی نظیر حدیث قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ ج ۹، ص ۶۳۱۸

۲۔ "مجمع البحرین" مادہ "رجا"

۳۔ نورالثقلین، ج ۵ ص ۱۸۶

خدا کی قُدرت کو دیکھو اور اپنے انحراف کے عذاب کا مزہ چکھو)۔

۳۔ خُدا کا فرمان صِرف ایک ہی کلمہ ہے

ہم جانتے ہیں کہ "علّتِ تامہ" اور "معلول" کے درمیان کسی قسم کا زمانی فاصلہ نہیں ہے۔ اس لیے فلاسفہ کی اصطلاح میں علّت کے معلول پر تقدم کو "تقدم رتبی" سمجھتے ہیں اور خدا کے ارادے کے بارے میں ایجاد و خلقت کے اَمر کی نسبت کہ جو علّتِ تامہ کا واضح ترین مصداق ہے "یا" علتِ تامہ منحصر بہ فرد" کا مصداق ہے، یہ معنی زیادہ واضح ہیں۔ اس لیے اگر آیہ (وما امرنا الا واحدة) "ہمارا اَمر ایک کلمہ سے زیادہ نہیں ہے" کی لفظ "کن" سے تفسیر کی ہے تو یہ تنگی بیان کی وجہ سے ہے کیونکہ لفظ "کن" بھی مرکب ہے کاف و نون کا، اور وہ ایک زمانہ کا محتاج ہے۔ یہاں تک کہ "فیکون" میں "فا" جو عام طور پر ایک قسم کے زمانے کو بیان کرتا ہے، وہ بھی بیان کی تنگی کی بنا پر ہے۔ پھر (کلمح بالبصر) (چشم زدن) کی تشبیہ۔ سُورہ نحل کی آیت ۷۷ میں پروردگار عالم جس وقت امر الٰہی کی قیامت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس کو لمح بصر کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے تو مزید کہتا ہے کہ (او ھو اقرب) "چشم زدن سے بھی زیادہ قریب ہے"۔ بہر حال زمانہ کے بارے میں یہ گفتگو ہماری روزمرّہ کی تعبیر کے مطابق ہے اور اس وجہ سے ہے کہ قرآن ہم سے ہماری زبان میں بات کرتا ہے ورنہ خدا اور اس کے اوامر زمانہ سے مافوق ہیں۔ ضمنی طور پر "واحدة" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ ایک ہی فرمان کافی ہے اور اس میں تکرار کی ضرورت نہیں ہے "یا پھر اس طرف اشارہ ہے کہ اُس کا فرمان چھوٹے بڑے، صغیر و کبیر حتیٰ کہ تمام پھیلے ہوئے آسمانوں کی خلقت تک میں ذرہ برابر فرق نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر چھوٹا بڑا اور مشکل و آسان ہماری محدود فکر اور ناچیز قوت کے پیمانوں میں سے ہے۔ جہاں قدرتِ لامتناہی کے بارے میں گفتگو ہو یہ مفاہیم مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں اور سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی شکل کے نظر آتے ہیں۔ غور کیجیے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر اُوپر والے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ تمام چیزیں آناً فاناً وجود میں آتی ہیں تو یہ اَمر حوادث عالم کے تدریجی ہونے کے مشاہدہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا فرمان ہر جگہ ایک ہی کلمہ ہے جو چشم زدن سے بھی زیادہ سریع ہے لیکن فرمان کے مضمون اور موضوع میں فرق ہوتا ہے۔ اگر جنین (وہ بچہ جو شکم مادر میں ہوتا ہے) کو اس نے حکم دیا ہے کہ نو ماہ کے اندر اپنے دَور کی تکمیل کرے تو ایک لمحہ زیادہ یا کم نہیں ہوگا۔ اس کا فوراً ہونا اس طرح ہے کہ ٹھیک اس مدّت میں اس کی تکمیل ہو اور اگر کرۂ زمین کو حکم دیا ہے کہ چوبیس گھنٹے کے درمیان ایک مرتبہ اپنے گرد گردش کرے تو بھی اس کا فرمان تخلّف ناپذیر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فرمان کے اثرانداز ہونے کے لیے کسی قسم کے زمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فرمان کا مضمون و موضوع ہے کہ جو عالم مادّی کے تدریجی ہونے کی وجہ سے اور خاصیتِ طبیعت و حرکت کی سُنّت کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنے لیے زمانہ کو قبول کرتا ہے۔

۴۔ سُورہ قمر کا آغاز و اختتام

قابلِ توجہ اَمر یہ ہے کہ سُورہ قمر وحشت و اضطراب اور قُربِ قیامت کی تنبیہ کے ساتھ شروع ہوا ہے اور وہ سکون و آرامِ مطلق

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کہ جو سچے مومنین کے لیے ملیک مقتدر کے پاس مقامِ صدق میں ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ تربیت کا مرحلہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ جو وحشت و اضطراب سے شروع ہوتا ہے اور مکمل آرام و سکون پر ختم ہوتا ہے۔ وہ افکارِ پریشاں کو جمع کرنے کے بعد سرکش خواہشات کو رام کرتا ہے۔ انسان کے اندرونی خوف و اضطراب سے گمراہی و فنا کے عوامل کو دُور کرتا ہے اور اسے پروردگارِ عالم کے جوارِ ابدیت اور اس کی بارگاہِ رحمت و قُرب کے سکون و اطمینان سے ہم آغوشی کا شرف بخشتا ہے۔

حقیقی طور پر اس طرف توجہ کرنے سے کہ پروردگارِ عالم ہستی میں غیر متنازع فیہ مالک اور مختارِ کُل حاکم ہے اور اس پر توجہ کرنے سے کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے اور اس کی قُدرت ہر چیز میں نافع ہے، انسان کو بے مثل و بے نظیر سکون و اطمینان قلب میسّر آتا ہے۔

بعض مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ یہ دو مقدس نام "ملیک و مقتدر" اجابت دعا کے سلسلہ میں بہت گہری اور شدید تاثیر رکھتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق ایک راوی نقل کرتا ہے کہ مَیں اس گمان کے ساتھ مسجد میں وارد ہُوا کہ صبح ہوگئی ہے لیکن درحقیقت ابھی رات کا ایک حصّہ باقی تھا۔ میرے علاوہ مسجد میں کوئی اور نہیں تھا۔ میں بالکل تنہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے پیچھے ایک حرکت محسوس کی جس سے مَیں ڈر گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ کوئی اجنبی پکار رہا ہے: "اے وہ شخص کہ جس کا دل خوف سے لبریز ہے تو ڈر مت اور کہہ: اللّٰھم انك مليك مقتدر ماتشاء من امر يكون اس کے بعد تو جو چاہتا ہے اس کے لیے دُعا کر"۔ وہ شخص کہتا ہے کہ مَیں نے یہ مختصر سی دُعا پڑھی پھر کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا خدا سے مَیں نے سوال کیا ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔[۱]

خداوندا! تو ملیک و مقتدر ہے ہمیں اس طرح کی توفیق عطا فرما کہ ہم ایمان و عمل اور تقوٰے کے سائے میں مقامِ صدق میں تیرے جوارِ رحمت کے زیرِ سایہ قیام پذیر ہوں۔

پروردگارا! ہم ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت کا دن گنہگاروں کے لیے وحشت ناک تلخ اور ناگوار ہے۔ اس دن ہماری اُمید صرف تیرے لطف و کرم سے وابستہ ہے۔

بارالہا! ہمیں بیدار رُوح اور ہوشیار عقل مرحمت فرما تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کے حالات سے درسِ عبرت حاصل کریں اور اس راستے پر نہ چلیں جس پر چل کر وہ ہلاک ہوئے۔

سُورۂ قمر کا اختتام ۷ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ ق

۱۳۶۴/۹/۲۹ ش

اختتامِ ترجمہ
۳ شوال ۱۴۰۷ھ
قم بر مکانِ حقیر

حاشیہ گذشتہ صفحہ

۱۔ "لمح" (بروزن مسح) اصل میں بجلی کے کوندنے کے معنی میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ تیز نگاہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ رُوح المعانی، ج ۲۷، صفحہ ۸۳

سُورَۃُ الرحمٰن

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس کی ۷۸ آیتیں ہیں۔

۷ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ
۱۳۶۴/۹/۲۹ ش

سُورۂ الرحمٰن کا مضمُون

یہ سُورہ کلی طور پر خدا کی ان مختلف مادی و معنوی نعمتوں کو بیان کرتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے ارزانی فرمائی ہیں اور انہیں ان میں محصور کیا ہے۔ ان نعمتوں کا بیان اس انداز میں ہے کہ اس سُورہ کا نام "سُورہ رحمت" یا "سورہ نعمت" رکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سورہ "الرحمٰن" سے شروع ہوا کہ جو خدا کا اسم مبارک ہے اور اس کی رحمتِ واسعہ کو بیان کرتا ہے اور ختم ہوا خُدائے ذوالجلال کے اجلال واکرام پر۔ فبای آلاء ربکما تکذبان کا جملہ جس کے ذریعے خدا نے اپنی نعمتوں کا اپنے بندوں سے اقرار لیا ہے اکتیس مرتبہ اس سُورہ میں آیا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سارا سُورہ خداوند منّان کی مختلف نعمتوں کا باہم پیوستہ ایک ہی حصّہ ہے لیکن دوسرے لحاظ سے اس کے مضامین کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصّہ : جو سُورہ کا مقدمہ اور آغاز ہے۔ یہ خدا کی عظیم نعمتوں، خلقت، تعلیم و تربیت، حساب و میزان، انسان کے رفاہی وسائل و ذرائع اور اس کی جسمانی و رُوحانی غذاؤں کی گفتگو کرتا ہے۔

دُوسرا حصّہ : جن و انس کی خلقت کی کیفیت کے مسئلہ کی ایک وضاحت ہے۔

تیسرا حصّہ : زمین و آسمان میں جو خُدا کی آیات اور نشانیاں ہیں ان کو بیان کرتا ہے۔

چوتھا حصّہ : یہاں دُنیاوی نعمتوں سے آگے بڑھ کر دوسرے جہان کی نعمتوں کے بارے میں گفتگو ہے۔ اس میں دقّتِ نظر اور شیرینیٔ گفتار کے ساتھ جنّت کی نعمتوں کی تمام جزئیات، عام اس سے کہ وہ باغات ہوں یا چشمے، پھل ہوں یا خوبصورت و باوفا ازواج یا انواع و اقسام کے لباس، ان سب کی وضاحت کی ہے۔

اس سُورہ کے پانچویں اور آخری حصّہ میں مجرمین کے انجام کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے اور ان کی دردناک سزا کا ذکر ہے چونکہ اس سورہ کی اساس و بُنیاد رحمتِ الٰہی کا بیان ہے اس لیے اس آخری حصّہ کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جنّت کی نعمتوں کی تفصیل و تشریح اتنی وسعت کے ساتھ ہے کہ اس نے مومنین کے دلوں کو سرور و مسرّت سے ہمکنار کر دیا ہے اور غم و اندوہ کے غبار کو ان کے دلوں سے دھو ڈالا ہے اور کشتِ دل میں نہالِ شوق کی تخم ریزی کی ہے (فبای آلاء ربکما تکذبان) کی تکرار نے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہے اس سُورہ کو جاذبِ نظر اور خوبصورت آہنگ بخشا ہے۔ جب اس آہنگ کو اس کے خوبصورت مضامین کے ساتھ ملا دیا جائے تو حیران کن کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کوئی تعجب محسوس نہیں ہوتا جب پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ایک حدیث نظر کے سامنے آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا

(لکل شیء عروس و عروس القراٰن سُورۃ الرحمٰن جل ذکرہ)

"ہر ایک کے لیے عروس ہے اور عروس القرآن سورہ الرحمٰن ہے"۔[1]

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ لفظ عروس اگرچہ فارسی زبان میں صرف عورت کے لیے ہی بولا جاتا ہے لیکن لغتِ عرب میں عورت مرد دونوں کے لیے، جب تک وہ مراسم عروسی میں رہیں، ان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[2]

اور چونکہ عورت و مرد اس قسم کے مراسم میں بہترین حالات اور کامل ترین احترامات کے عالم میں ہوتے ہیں اس لیے یہ لفظ بہت ہی خوبصورت، محترم اور گرامی قدر موجودات کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس سورہ کے لیے "الرحمٰن" کا نام اس قدر موزوں اور مناسب ہے کہ جس کی لفظوں کے ذریعے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ——

❖ ❖ ❖

---

[1] "مجمع البیان" آغاز "سورہ رحمٰن" یہ حدیث "دُرالمنثور" ج ٦ ص ۱۴۰ پر مندرج ہے۔

[2] "لسان العرب" "مجمع البحرین" و "صحاح اللغات" و .....)

سورۂ الرحمٰن کی تلاوت کی فضیلت

چونکہ یہ سورہ نعمتوں کی شکرگزاری کے احساس کو انسانوں میں نہایت عمدہ انداز میں بیدار کرتا ہے اور دنیا و آخرت کے مادی و معنوی مواہب کے بیان سے انسان کے شوقِ بندگی و اطاعت میں اضافہ کرتا ہے اس لیے اس کی تلاوت کی فضیلتیں بھی بہت زیادہ بیان ہوئی ہیں۔ تلاوت وہ کہ جو انسانی رُوح کی گہرائیوں میں نفوذ کرے اور احساسِ حقائق کے لیے تحریک کی باعث ہو نہ کہ صرف زبان تک محدود رہے۔

رسولِ خداؐ کی ایک حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ: (من قرأ سورة الرحمٰن رحم الله ضعفه وادى شكر ما انعم الله عليه) " جو شخص سورہ رحمٰن کو پڑھے تو خدا نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں اس کی کمزوری پر رحم کرے گا اور نعمتوں کی شکرگزاری کا حق، کہ جو اسے عطا کی گئی ہیں، خود ادا کرے گا۔"[1]

ایک اور حدیث میں جو ثواب الاعمال کے بارے میں ہے امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ: " سورۂ الرحمٰن کی تلاوت اور اس کے ساتھ قیام کو ہرگز نہ چھوڑنا کیونکہ یہ سورہ منافقین کے دل میں ہرگز استقرار نہیں پاتا اور خدا اس سورہ کو قیامت کے دن ایک انسان کی شکل عطا کرے گا جو بہت ہی خوبصورت ہوگا اور جس میں سے بہت ہی عمدہ خوشبو آتی ہوگی۔ پھر وہ ایسی جگہ قیام کرے گا کہ جو خداوند متعال سے بہ اعتبارِ معنی بہت زیادہ قریب ہوگی تو خدا اس سورہ سے پوچھے گا کہ دُنیاوی زندگی میں کونسا شخص تیرے مضامین کے ساتھ قیام پذیر ہوتا تھا اور ہمیشہ تیری تلاوت کرتا تھا۔ وہ سورہ جواب میں کہے گا کہ پروردگار وہ فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ اس وقت ان افراد کے چہرے چمکنے لگیں گے۔ اب خدا ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہے گا کہ تم جس جس کے لیے چاہتے ہو بخشش کی سفارش کرو۔ وہ جتنی آرزو اپنے دل میں رکھتے ہوں گے اپنے لوگوں کی بخشش کی سفارش کریں گے اور ہر وہ شخص جس کی بخشش کی وہ سفارش کریں گے اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جا اور جہاں چاہتا ہے سکونت اختیار کرلے۔"[2]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: (من قرأ سورة الرحمٰن فقال عند كل فباى آلاء ربكما تكذبان لا بشىء من آلائك رب اكذب فان قرأها ليلاً ثم مات مات شهيداً وان قرأها نهاراً فمات مات شهيداً)

جو شخص سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کرے، جب وہ آیت فبای آلاء ربکما تکذبان پڑھے تو کہے لا بشیء من آلائک رب اکذب یعنی "خداوندا! میں تیری کسی نعمت کا انکار نہیں کرتا"۔ اگر وہ رات کو تلاوت کرے اور اسی شب انتقال کر جائے تو وہ شہید قرار پائے گا اسی طرح اگر دن کو تلاوت کی ہو اور وہ اسی دن انتقال کر جائے تو بھی شہید قرار پائے گا۔

۞ ۞ ۞

---

[1] نور الثقلین، ج ۵، ص ۱۸۷

[2]، [3] بحار الانوار ج ۹۲، ص ۳۰۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ اَلرَّحۡمٰنُ ۙ

۲۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ

۳۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ

۴۔ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ ○

۵۔ اَلشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ بِحُسۡبَانٍ ۙ

۶۔ وَّالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ يَسۡجُدٰنِ ○

ترجمہ :

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ خداوند رحمٰن نے

۲۔ قرآن کی تعلیم دی

۳۔ انسان کو خلق کیا

۴۔ اور اُسے بیان کی تعلیم دی

۵۔ سورج اور چاند منظم حساب کے تحت گردش کرتے ہیں۔

۶۔ اور ستارے اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں ۔

تفسیر

خُدا کی نعمتوں کا آغاز

چونکہ یہ سُورہ خدائے عظیم کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے رحمٰن کے اس مقدس نام سے شروع ہوتا ہے کہ جو اس کی رحمتِ واسعہ کی رمز ہے ۔ اگر اس میں رحمانیت کی صفت نہ ہوتی تو بلا امتیاز دوست و دشمن وہ اس قسم کا خوانِ نعمت نہ بچھاتا ۔ اسی لیے فرماتا ہے : " خداوندِ رحمٰن نے " (الرحمٰن)[1]۔ " قرآن کی تعلیم دی " (علّم القراٰن)۔

پروردگارِ عالم اس طرح سب سے پہلے اپنی اہم ترین نعمت یعنی تعلیم قرآن کو بیان کرتا ہے ۔ یہ بہت ہی پُرکشش اور پُرمعنی تعبیر ہے ۔ اگر ہم صحیح فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ قرآن مجید تمام نعمتوں کا سرچشمہ بھی ہے اور ہر نعمت تک پہنچنے کا ذریعہ بھی ۔ ہم اس کے ذریعہ مادّی اور معنوی نعمتوں سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔ وہ چیز جو بہت زیادہ قابل توجہ ہے ، یہ ہے کہ پروردگارِ عالم تعلیم قرآن کی نعمت کے بیان کو " خلقتِ انسان " اور " تعلیم بیان " ان دونوں سے پہلے بیان فرماتا ہے ۔ حالانکہ ترتیب طبیعی کے لحاظ سے پہلے " خلقتِ انسان " کا پھر تعلیم بیان کا اور پھر " تعلیم قرآن " کی نعمت کا ذکر ہونا چاہیئے تھا لیکن عظمتِ قرآن کا یہ تقاضا تھا کہ ترتیب طبیعی کے برخلاف سب سے پہلے تعلیم قرآن کو موضوعِ گفتگو بنائے ۔ یہ آیت مشرکینِ عرب کے جواب کے طور پر ہے ۔ جب پیغمبر اسلام نے مُشرکین سے کہا کہ خدائے رحمٰن کو سجدہ کریں تو انہوں نے یہ بہانہ بنایا کہ : (وما الرحمٰن) " رحمٰن کیا ہے " (فرقان ۔ ۶۰)۔ قرآن کہتا ہے : " خداوندِ رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی ، انسان کو پیدا کیا اور پھر اُسے بیان کی تعلیم دی " بہرکیف رحمٰن کا نام پروردگار عالم کے تمام ناموں کے مقابلہ میں " اللہ " کے بعد سب سے زیادہ مفہوم کا حامل ہے ۔

ہمیں معلوم ہے کہ خدا دو قسم کی رحمتوں کا مالک ہے ایک " رحمتِ عام " دوسری " رحمتِ خاص " ۔ رحمٰن کا نام اُس کی اُس رحمت عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو اہل ایمان و اطاعت کے حال پر ہے اور صرف ان کے لیے مخصوص ہے ۔ اس وجہ سے رحمٰن کے نام کا اطلاق کبھی غیر خدا پر نہیں ہوتا سوائے اس صُورت کے کہ وہ لفظ عبد کے ساتھ ہو ۔ لیکن رحیم کی صفت دُوسروں کے لیے بھی بولی جاتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی بھی رحمتِ عامہ کا مالک نہیں ہے ۔ جہاں تک رحمتِ خاص کا تعلق ہے تو وہ کمزور شکل ہی میں سہی لیکن انسانوں اور دوسرے موجودات میں پائی جاتی ہے ۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ (الرحمٰن اسم خاص بصفة عامة والرحیم اسم عام بصفة خاصة) " رحمٰن ایک خاص اسم ہے جو صفتِ عمومیت رکھتا ہے یعنی ایسا نام ہے کہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن اس کی رحمت سب کے شاملِ حال ہے ۔ "

---

[1] " الرحمٰن " مبتدا ہے اور " علّم القراٰن " اس کی خبر ہے اور " خلق الانسان " خبر کے بعد خبر ہے ۔ اس جملے کی ترکیب میں اور احتمالات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے لیکن چونکہ قابلِ توجہ نہیں تھے لہٰذا ان کے ذکر سے پہلو تہی کی گئی ہے ۔

"رحیم" ایک عام اسم ہے لیکن خاص صفت کے ساتھ ۔ یہ ایک ایسی صفت ہے کہ جو خدا اور غیر خدا دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کو "رؤف رحیم" کہا ہے۔ (سورہ توبہ ـ ۱۲۸) لیکن یہ رحمت مخصوص و معین ہے ۔
یہ سوال کہ خدا نے قرآن کی تعلیم کیسے دی، مفسرین نے اس کی مختلف قسم کی تفسیریں کی ہیں۔ کبھی جبرئیل اور دوسرے فرشتوں کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے کبھی پیغمبر اسلامؐ کی ذات والاصفات کو کبھی تمام انسانوں کو حتیٰ کہ جنات کو بھی چونکہ یہ سورہ جن و انس پر ہونے والی خدا کی نعمتوں کو بیان کرتا ہے اس لیے اکتیس مرتبہ ان نعمتوں کے مباحث پیش کرنے کے بعد جن و انس سے سوال کرتا ہے کہ: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے": سب سے مناسب یہی تفسیر ہے کہ خدا نے اپنے عظیم پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے جن و انس کو قرآن کی تعلیم دی [1]

قرآن کی بے مثال نعمت کے تذکرے کے بعد اہم ترین نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "انسان کو پیدا کیا" (خلق الانسان)۔ یہاں انسان سے مراد نوع انسان ہے نہ کہ حضرت آدمؑ کیونکہ چند آیتوں کے بعد ان کے بارے میں علیحدہ گفتگو کرتا ہے اس سے مراد پیغمبر اسلامؐ بھی نہیں ہیں اگرچہ آنحضرتؐ اس کے بہترین اور عمدہ ترین مصداق ہیں۔ دوسری نعمت جو نعمتِ بیان ہے اور جس کا تذکرہ اس کے بعد ہے وہ بھی اس امر کی شاہد ہے کہ "الانسان" سے مراد عالم نوع انسانی ہے۔ باقی دوسری تفسیریں صحیح نظر نہیں آتیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ انسان ایک عجیب مجموعۂ عالم ہستی بھی ہے اور خلاصۂ موجودات بھی۔ ایسا عالم اصغر کہ جس میں عالم اکبر موجود ہے اس کی خلقت ایک بے نظیر و بے مثل نعمت ہے۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا ہر جزء بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اگرچہ اپنے وجود کے آغاز میں وہ ایک بے قیمت نطفہ ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں ایک حقیر سا وجود ہے کہ جو اس نطفہ میں تیرتا ہے لیکن پروردگار عالم کی ربوبیت کے سائے میں وہ اپنی تکمیل کے مراحل اس طرح طے کرتا ہے کہ عالم خلقت کے شریف ترین مقام پر ارتقا پذیر ہو جاتا ہے۔ "قرآن" کے بعد "انسان" کے نام کا ذکر بھی قابل غور ہے کیونکہ قرآن تدوینی صورت میں اسرار ہستی کا مجموعہ ہے اور انسان تکوینی صورت میں ان اسرار کا خلاصہ ہے اور ان میں سے ہر ایک اس وسیع و عظیم عالم کا ایک نسخہ "کتاب" ہے۔ بعد والی آیت خلقتِ انسان کی نعمت کے بعد ایک اہم ترین نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "خدا نے اسے بیان کی تعلیم دی" (علمہ البیان)۔
بیان لغوی مفہوم کے اعتبار سے ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے بولا جا سکتا ہے جو دوسری چیز کی مبیّن اور واضح و آشکار کرنے والی ہو۔ اس بنا پر نہ صرف نطق اور سخن کے معنوں میں ہے بلکہ اس سے مراد کتابت، تحریر اور انواع و اقسام کے عقلی و منطقی استدلال بھی ہیں جو مختلف اور پیچیدہ مسائل کے واضح کرنے والے ہیں، وہ سب کے سب بیان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگرچہ معانی کے اس مجموعہ کی طرف اشارہ کرنے والی چیز وہی بات کرنا ہے۔ ہم کو عادت ہے کہ ہم بات کرنے کو ایک سادہ سی بات سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات کرنا انسانی اعمال میں سے ایک پیچیدہ ترین اور خوب ترین عمل ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی کام بھی ایسی پیچیدگی اور ذہانت پر مبنی نہیں ہے جتنا کہ بات کرنا۔ اور وہ اس لیے کہ ایک طرف مختلف قسم کی آوازیں نکالنے کے لیے آواز سے تعلق رکھنے

---

[1] یہ کہ علم کا پہلا مفعول محذوف ہے یا دوسرا مفعول مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلا مفعول حذف ہوا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (علم الانس والجن القرآن) بعض مفسرین نے جو یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ علم کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور علامت قرار دینے کے معنی میں ہے، یہ مفہوم بہت بعید ہے۔

والے کل پرزے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ پھیپھڑے ہوا کو اپنے اندر جمع کر کے اس کو بتدریج نرخرہ سے باہر بھیجتے ہیں اور آواز سے تعلق رکھنے والے تاروں میں آواز پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ آوازیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی رضامندی کی نشانی ہوتی ہے تو کوئی غیظ و غضب کی، کوئی عام گفتگو کی کوئی مدد طلب کرنے کی کوئی محبت کی علامت ہوتی ہے کوئی عداوت کی۔ پھیپھڑے ان آوازوں کو وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد آواز، زبان، ہونٹ، دانتوں اور فضائے دہن کی مدد سے حروف و الفاظ کو نہایت تیزی کے ساتھ وجود میں لاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ طویل اور ایک طرح کی آواز جو نرخرہ سے باہر آتی ہے اس کی مختلف طریقوں سے قطع و برید ہوتی ہے جس سے حروف تشکیل پاتے ہیں۔

دُوسری طرف لغتوں کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ انسان فکری ترقی کے زیر اثر اپنی مادی و معنوی ضرورتوں کے ماتحت مختلف قسم کی زبانیں بناتا ہے۔ اس کی اس زبان سازی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ دُنیا میں موجود زبانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ صحیح طور پر ان کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی زبانیں اور لُغتیں بتدریج تشکیل پاتی رہتی ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک دنیا میں رائج زبانوں کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور بعض کے نزدیک زبانوں کی یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔[1]

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ وہ صرف بُنیادی اور اصولی زبانوں کو شمار کریں ورنہ اگر مقامی بولیوں پر بھی نظر کی جائے تو زبانوں کی تعداد کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔ بعض اوقات قریب قریب واقع دو دیہات کے باشندے دو مختلف مقامی بولیوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔

سوم عقل و فکر کے مطابق احساسات کے بیان اور استدلال و جملہ سازی کی تنظیم کا وہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ جو بیان اور نطق کی رُوح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو انسان سے وابستہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مختلف قسم کے جانور اپنی ضرورتوں کو سمجھانے کے لیے مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں لیکن ان آوازوں کی تعداد بہت ہی کم اور غیر واضح ہے۔ جب کہ غیر محدود اور وسیع شکل کا جو بیان ہے وہ انسان ہی کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ خدا نے گفتگو کرنے کی قدرت زیادہ تر اسی کو بخشی ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر ہم بیان کے نقوش اور اس کے اثرات، انسانی زندگی کے بتدریج ارتقا اور تمدنوں کی تخلیق کو پیش نظر رکھیں تو ہم اس بات کا یقین حاصل کر لیں گے کہ اگر بیان کی نعمت نہ ہوتی تو انسان اپنے علوم و تجربات کو آسانی کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل نہ کر سکتا اور وہ علم و دانش تمدن اور اخلاق کی ترقی کا باعث نہ بنتا۔ اگر کبھی یہ نعمت انسان سے سلب کر لی جائے تو انسانی معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ تنزل کا شکار ہو جائے۔

اگر بیان کو اس کے وسیع معانی میں لیا جائے کہ جو تحریر و کتابت، انواع و اقسام کے ہنر اور فنون پر حاوی ہے تو انسانی زندگی میں اس کے اثرات نہایت اہم انداز میں واضح ہوں گے۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ سُورۂ الرحمٰن میں جو پروردگارِ عالم کی نعمتوں کے حوالوں کا مجموعہ ہے۔ نعمتِ خلقتِ انسان کے بعد تعلیم بیان کی گفتگو کیوں ہوئی ہے۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم نے اپنی نعمتوں میں سے چوتھی نعمت کو موضوعِ گفتگو بنا کر فرمایا ہے: "چاند اور سُورج ایک منظم حساب کے ماتحت گردش کرتے ہیں" (الشمس والقمر بحسبان)۔[2]

---

[1] "دائرۃ المعارف" فرید وجدی جلد ۸ ص ۳٦۲ مادہ "لغت"

[2] "حسبان" بروزن "غفران" مصدر ہے جو حساب اور نظم و ترتیب کے معنی میں ہے اور آیت میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (الشمس والقمر تجریان بحسبان) سُورج اور چاند کا سفر حساب کے ساتھ جاری ہے۔

خود سُورج کا وجود انسان کے لیے عظیم ترین نعمت ہے اور وہ اس لیے کہ اس سے حرارت اور نور حاصل کیے بغیر نظام شمسی میں زندہ رہنا غیر ممکن ہے۔ اس سے قبل ہم عرض کر چکے ہیں کہ کرۂ خاکی میں جو بھی جُنبش و حرکت صورت پذیر ہے اس کا اصل سرچشمہ سُورج کی حرارت اور اس کی روشنی ہے۔ گھاس کا اُگنا، بڑھنا، غذائی ذخیرے، بارشیں، ہواؤں کا چلنا، یہ سب اسی نعمت کی برکت کی وجہ سے ہے۔ چاند بھی حیاتِ انسانی کے سلسلہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے، وہ قوتِ جاذبہ کہ جو سمندروں کے مدّ و جزر کا سرچشمہ ہے سمندر سے متعلق زندگی کے باقی رہنے کا ایک بڑا سبب ہے اور بہت سے ساحلوں کو سیراب کرنے کا باعث ہے کہ دریا جن کی مجاورت میں سمندر میں گر جاتے ہیں۔

اس سب پر مستزاد یہ کہ یہ طے شدہ ہے کہ چاند اور سُورج کی حرکت کا نظام (بالفاظِ دیگر چاند کی گردش زمین کے گرد اور زمین کی گردش سُورج کے گرد) رات اور دن، مہینے اور سال اور مختلف موسموں کی مرتب و منظم تخلیق کا باعث ہے اور انسانوں کی زندگی، ان کے صنعتی، زرعی اور تجارتی امور کے لیے پروگرام بنانے کے نظم و ضبط کا سبب ہے۔ اگر یہ منظم سفر نہ ہوتا تو انسانی زندگی کا نظام ہرگز تشکیل نہ پاتا۔

نہ صرف یہ کہ ان آسمانی کُرّوں کی حرکت بہت دقیق نظام رکھتی ہے بلکہ ان کے اجسام اور قوتِ جاذبہ، زمین سے ان کا فاصلہ اور آپس میں ایک دوسرے سے فاصلہ، یہ سب از رُوئے حساب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چیزیں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں تو نظامِ شمسی میں عظیم انقلابات برپا ہو جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی بھی درہم برہم ہو جائے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس وقت اس نظام کے اجزا کرۂ خورشید سے جُدا ہوئے تو بہت ہی بکھرے ہوئے اور غیر مرتب نظر آتے تھے۔ آخر کار ان کی موجودہ ترتیب صورت پذیر ہوئی۔ اس سلسلہ میں امورِ طبیعی کے ایک ماہر کا کہنا ہے کہ: ہمارا نظامِ شمسی بظاہر ایک ایسے مخلوط درہم و برہم مواد سے وجود میں آیا ہے کہ جو سُورج سے بارہ ہزار درجہ کی حرارت لیے ہوئے جُدا ہُوا اور ناقابلِ تصور تیزی کے ساتھ فضائے لامحدود میں بکھر گیا۔ لیکن اس ظاہری بے ترتیبی اور فضائی انقلاب سے اس قسم کی دقیق ترتیبِ عالم وجود میں آئی ہے کہ ہم آج آئندہ حادثات کے منٹ اور سیکنڈ کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔ اس نظام و ترتیب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اوضاعِ فلکی ہزار ملین سال گزر جانے کے باوجود اسی حالت پر باقی ہیں۔[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ سُورج اگرچہ نظامِ شمسی کے وسط میں بظاہر بغیر کسی حرکت کے قائم ہے لیکن یہ نہیں بھُولنا چاہیے کہ وہ بھی اپنے تمام چاند ستاروں کے ہمراہ اسی کہکشاں کے اندر جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، معین نقطہ کی طرف حرکت کر رہا ہے اور اس کی یہ حرکت بھی ایک معیّن تیزی و تنظیم رکھتی ہے۔

پانچویں عظیم نعمت کے سلسلہ میں پروردگارِ عالم آسمان سے زمین کی طرف رُخ کر کے فرماتا ہے: "گھاس اور درخت اس کے لیے سجدہ کرتے ہیں"۔ (والنجم والشجر یسجدان)۔ نجم کبھی تو ستارہ کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ایسی گھاس کے معنی میں آتا ہے جس کا کوئی تنا نہ ہو اور یہاں شجر کے قرینہ سے دوسرے معنی ہی مُراد ہیں یعنی وہ گھاس جو تنے کے بغیر ہو۔[2]

---

[1] "راز آفرینش انسان" ص ۴۸

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ النجم مالاساق لہ من النبات۔ جس نبات کا تنا نہ ہو وہ نجم ہے۔

اصولی طور پر یہ لفظ طلوع کے معنی میں ہے اور گھاس کو اگر "نجم" کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ زمین سے سر نکالتی ہے اور ستارے کو نجم کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر کہ وہ طلوع ہوتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ انسانوں کا تمام موادِ غذائی اس امتیاز کے ساتھ نباتات سے لیا گیا ہے کہ بعض کو تو انسان براہِ راست اپنے مصرف میں لاتا ہے اور بعض نباتات ایسے جانوروں کی غذا بنتے ہیں جو انسانوں کے غذائی مواد کا جُزو ہیں۔ یہ معنی دریائی جانوروں کے سلسلہ میں بھی صحیح طور پر منطبق ہوتے ہیں کیونکہ وہ بھی بہت سے ایسے چھوٹے نباتات سے غذا حاصل کرتے ہیں جو کروڑوں کی تعداد میں سمندر کے گوشہ کنار میں سُورج کی روشنی کے پَرتو میں اُگتے ہیں اور سمندروں کی موجوں کے درمیان چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح نجم مختلف قسم کے چھوٹے اور رینگنے والے نباتات وغیرہ (مثلاً کدو اور کھیرے کے بوٹے) کو کہتے ہیں اور شجر مختلف قسم کے تنہ دار نباتات کو کہتے ہیں جیسے نخلے اور میوہ دار درخت وغیرہ۔

اور (یسجدان) "یہ دونوں سجدہ کرتے ہیں" کا مفہوم قوانینِ آفرینش کے مقابلہ میں انسانوں کی منفعت کے لیے ان دونوں کا بغیر کسی قید و شرط کے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے کہ جو خدا نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اور یہ اس پر بلا چون و چرا مصروفِ سفر ہیں۔ ضمنی طور پر یہ ان کے سرِ وحدت کی طرف بھی اشارہ ہے اور وہ اس طرح کہ نبات کے ہر پتے اور ہر دانہ پر پروردگارِ عالم کی عظمت اور اس کے علم کی عجیب و غریب نشانیاں موجود ہیں اور ہر ورق معرفتِ پروردگار کا دفترِ بے پایاں ہے۔ [1]

مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اُوپر والی آیت میں "النجم" سے مراد آسمان کے ستارے ہیں لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر کہا ہے آیت میں موجود قرائن کی بنا پر زیادہ مناسب ہے۔

ایک نکتہ

چند روایات پر ایک نظر

مذکورہ بالا آیات کے ذیل میں اسلامی سرچشموں میں ایسی روایات موجود ہیں جو تفسیر کُلی کی حیثیت سے روشن ہونے کے مصداق ہیں اور ہر ایک تفسیرِ آیات کے ایک حصّہ کو واضح کرتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے (علمه البیان) کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا: (البیان الاسم الاعظم الذی به علم کل شیء) "بیان وہی اسم اعظم ہے کہ جس کے ذریعے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔" [2]

اسم اعظم اور اس کی تفسیر کے بارے میں جلد ۷ پر (سُورہ اعراف کی آیت ۱۸۰ کے ذیل میں) ہم نے بحث کی ہے۔ ایک اور حدیث میں امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے مروی ہے کہ: (الرحمٰن علم القراٰن) سے مُراد یہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کو قرآن کی تعلیم دی اور خلق الانسان سے مُراد امیر المومنینؑ کی تخلیق ہے اور (علمه البیان) ان تمام امور کا بیان ہے کہ جن کے لوگ محتاج ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ مذکورہ روایتیں ان آیتوں کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتیں بلکہ ان کے واضح مفہوم کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

---

1. عالم ہستی کے مختلف موجودات کے سجود کے بارے میں ہم تفصیل کے ساتھ جلد ۱۴ (سُورہ حج کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) بحث کر چکے ہیں۔ اس طرح جلد ۱۲ (سُورہ اسریٰ کی آیت ۴۴ کے ذیل میں) ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔
2. تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۹۷

۷۔ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ
۸۔ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝
۹۔ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝
۱۰۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ
۱۱۔ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۖ
۱۲۔ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۚ
۱۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۷۔ اور آسمان کو بلند کیا اور (اس میں) میزان و قانون رکھا۔
۸۔ تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو۔
۹۔ وزن کو عدل کی بُنیاد پر قائم کرو اور میزان کو کم نہ رکھو۔
۱۰۔ اور زمین کو اس کے لوگوں کے لیے پیدا کیا
۱۱۔ جس میں پھل اور شگوفوں سے پُر درخت ہیں۔
۱۲۔ اور ایسے دانے کہ جن میں تنے اور پتّے ہیں جو کاہ اور خوشبودار گھاس کی شکل میں نکلتے ہیں۔

۱۳۔ اے گروہ جن و انس ! تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قرار دی

یہ آیتیں گزشتہ بیان شدہ آیتوں کے ذکر کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان آیتوں میں پروردگار عالم پانچ ایسی عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہم ترین ہیں۔ یہاں پہلی آیت میں چھٹی نعمت کی طرف، کہ جو خلقتِ آسمان ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے آسمان کو بلند کیا" (والسماء رفعھا)۔ آسمان سے اس آیت میں مراد چاہے اس کی اُوپر والی جہت ہو چاہے ستارے یا زمین کی فضا (وہ عظیم فضائی کھال کہ جس نے اس کرہ زمین کے اطراف کو گھیر رکھا ہے اور عالمی شعاؤں اور آسمانی پتھروں کے مقابلے میں سپر کی طرح اس کی حفاظت کرتی ہے۔ نیز سُورج کی گرمی اور سمندر سے اُٹھنے والی رطوبت کو بادلوں کی تشکیل اور بارش کے نزول کے لیے اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے) کچھ بھی ہو وہ اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے زندگی گزارنا یا ناقص ہے یا محال ہے۔

جی ہاں نور و روشنی جو گرمی، ہدایت، حیات اور حرکت کا سبب ہیں آسمان کی طرف سے آئے ہیں۔ بارش آسمان کی طرف سے آئی ہے۔ نزولِ وحی بھی آسمان کی طرف سے ہے (اس صُورت میں آسمان مادی اور معنوی اعتبار سے ایک مفہوم رکھتا ہے)۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر بلند شدہ آسمان اپنے تمام معانی و مفاہیم کے ساتھ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور اس کی معرفت کے راستے میں انسان کی بہترین مدد کرتی ہے۔ جس وقت اربابِ دانش اس میں غور کرتے ہیں تو بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں: ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً "پروردگار تُو نے اس عظیم کارخانہ کو بیکار پیدا نہیں کیا"۔ (آل عمران - ۱۹۱)

اس کے بعد پروردگارِ عالم ساتویں نعمت کا حوالہ دے کر فرماتا ہے: "خُدا نے میزان قرار دی" (ووضع المیزان)۔ میزان ہر قسم کی ناپ تول کے پیمانے کو کہتے ہیں۔ باطل سے حق کا تقابل، ظلم و ستم سے عدالت کا تقابل، قیمتوں کا تعین اور مختلف اجتماعی مرحلوں میں حقوقِ انسانی کا تعین، یہ سب چیزیں میزان ہیں۔ میزان قانونِ تکوینی اور دستورِ تشریعی کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب وسیلۂ تقابل و توازن ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لغت کے اعتبار سے میزان ترازو کو کہتے ہیں جو اجسام کے وزن کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جس میزان کی طرف اس آیت میں خلقتِ آسمان کے ذکر کے بعد اشارہ ہوا ہے وہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو ناپ تول کے ہر ذریعہ اور تمام تشریعی و تکوینی قوانین کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس سے نہ صرف اجناس کے وزن کو معین کرنے والا پیمانہ مراد ہے بلکہ اصولی طور پر آسمان کا بلند ہونا اور وہ دقیق نظم و ضبط کہ جو کروڑوں آسمانی کُروں پر حاکم ہے، وہ سب کچھ مُراد ہے۔ اس لیے کہ یہ سب طے شدہ میزان و قوانین کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ بعض عبارتوں میں میزان، قرآن، عدل، شریعت، یا ترازو کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو حقیقت میں ان میں سے ہر ایک اس مکمل اور وسیع مفہوم کا ایک صحیح مصداق ہے۔

پروردگارِ عالم بعد والی آیت میں اس موضوع سے ایک پُرکشش اور عُمدہ نتیجہ نکالتے ہوئے فرماتا ہے: (الّا تطغوا فی المیزان)

عالمِ ہستی میں میزان کے قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھی میزان کی رعایت کرو اور اس میں سرکشی نہ کرو۔ تم بھی اس عظیم عالم کا ایک حصّہ ہو اور اس وسیع جہان میں تم ایک بے جوڑ ٹکڑے کی طرح ہرگز زندگی نہیں گزار سکتے۔ تمام عالم کا ایک میزان و حساب ہے۔ تمہارا بھی ایک میزان و حساب ہونا چاہیئے۔

اگر اس عالمِ عظیم سے میزان و قانون کو ختم کر دیا جائے تو یہ تمام کا تمام فنا ہو جائے اور اگر تم بھی نظم و میزان سے بے بہرہ ہو جاؤ تو تم بھی منزلِ فنا کے راہی بن جاؤ گے۔ کتنی پُرکشش اور عمدہ تعبیر ہے جو کل عالمِ ہستی سے انسان کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور عالمِ کبیر پر حکم چلانے والے قانون کو عالمِ صغیر یعنی انسانی زندگی پر جو حاکم ہیں اُن قوانین سے ہم آہنگ کر رہی ہے۔ یہ ہے حقیقتِ توحید کہ تمام عالم پر حکومت کرنے والے اصول ایک ہی جیسے ہیں۔ دوبارہ مسئلہ عدالت اور وزن پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے: "تم وزن کو عدالت کی بنیاد پر قائم کرو اور میزان میں کسی قسم کی کمی نہ رکھو": (واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان)۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان تین آیتوں میں تین مرتبہ میزان کا ذکر ہوا ہے حالانکہ دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں ضمیر سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ میزان ان تین آیتوں میں الگ الگ معنی لیے ہوئے ہے۔ محض ضمیر کے حوالے سے صحیح معنی واضح نہیں ہو سکتے تھے نیز آیتوں کا تناسب بھی اسی امر کو قبول کرتا ہے، کیونکہ پہلے مرحلہ میں گفتگو ایسی میزان اور ایسے معیار و قوانین سے ہے جو خدا نے سارے عالمِ ہستی میں قرار دیے ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں گفتگو انسانوں کے انفرادی و اجتماعی تمام موازینِ حیات میں طغیان و سرکشی نہ کرنے کی ہے جو فطرۃً زیادہ محدود دائرہ رکھتے ہیں۔ تیسرے مرحلہ میں وزن کے خاص معنی پر زور دیتے ہوئے حکم نافذ کرتا ہے کہ چیزوں کی ناپ تول اور وزن کرتے وقت کسی قسم کی کمی نہ کرو اور کوئی کسر باقی نہ چھوڑو۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ محدود ہے۔ اس طرح تینوں آیتوں میں میزان اور ناپ تول کے مسئلہ میں ایک نہایت پُرکشش اور خوبصورت سلسلۂ مراتب استعمال ہوا ہے کہ جو بڑے دائرہ سے چھوٹے دائرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔[۱]

انسانی زندگی میں میزان کی اہمیت اپنے تمام معانی کے اعتبار سے اس طرح ہے کہ محدود ترین مصداق یعنی ترازو چیزوں کے تبادلے کے سلسلہ میں اگر ایک دن کے لیے درمیان سے ہٹا دیں تو ہم جھگڑوں اور قضیوں کے کتنے دردِ سر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے اس لفظ میزان کے جو لامحدود مفاہیم ہیں، اگر وہ اپنی جگہ باقی نہ رہیں تو ہمیں لامحدود پریشانیاں لاحق ہو جائیں۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض روایات میں میزان سے مُراد وجودِ امام لیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام کا وجودِ مبارک حق و باطل کے تقابل و تعین اور تشخیصِ حقائق کا معیار ہے اور ہدایت کے لیے ایک مؤثر عامل ہے۔[۲]

اسی طرح میزان سے مُراد اگر قرآن لیا جائے تو وہ بھی انہی معانی کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال اس طرف توجہ دیتے ہوئے کہ یہ تمام آیتیں اللہ کی نعمتوں کے ذکر سے متعلق ہیں، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ میزان کا وجود، خواہ سارے نظامِ عالم میں ہو، خواہ انسانی معاشرہ کے اجتماعی روابط میں اور خواہ وہ معاملاتِ تجارت میں ہو، یہ سب خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔

اس کے بعد پروردگار عالمِ آسمان سے ہٹ کر زمین کو موضوع بناتا ہے اور فرماتا ہے: "خدا نے زمین کو انسانی زندگی کے لیے پیدا کیا ہے"

---

[۱] "فخر رازی" اپنی تفسیر میں کہتا ہے کہ میزان پہلی آیت میں اسم آلہ ہے۔ (ناپ تول کے پیمانوں کے معنی میں) اور دوسری آیت میں مصدری معنی رکھتا ہے (وزن کرنا) اور تیسری آیت میں مفعول معنی رکھتا ہے اور جنس موزوں کے معنی میں ہے۔

[۲] یہ حدیث "تفسیر علی بن ابراہیم" میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے مروی ہے اور یہ حدیث مفصل ہے ہم نے اس کے صرف ایک حصّہ کے مضمون کو نقل کیا ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۴۳

(والارض وضعھا للانام) ۔ " انام " کی بعض مفسرین نے انسانوں کے معنی میں اور بعض نے جن و انس کے معنی میں اور بعض نے ہر ذی روح کے معنی میں تفسیر کی ہے ۔ البتہ ارباب لغت اور مفسرین کی ایک جماعت اسے خلق مطلق کے معنی میں لیتی ہے لیکن سورہ میں موجود قرائن اور جن و انس سے مخاطبت دونوں یہ بتاتے ہیں کہ اس سے یہاں مراد جن و انس ہی ہیں

جی ہاں یہ کرۂ خاکی کہ جسے اس آیت میں ایک عظیم نعمت الٰہی قرار دیا گیا ہے اور دوسری آیتوں میں اسے " مہاد " یعنی گہوارے کے طور پر یاد کیا گیا ہے وہ ایک اطمینان بخش اور آرام دہ مقام ہے ۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ عام حالات میں اس کی اہمیت کو محسوس نہیں کر سکتے لیکن جب ایک چھوٹا سا زلزلہ زمین کی ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیتا ہے یا ایک آتش فشاں کسی شہر کو عذاب کے مواد ، دھوئیں اور آگ کے نیچے دفن کر دیتا ہے تو پھر ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ ساکن و آرام دہ زمین اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے ۔ خصوصاً جب ہم اس چیز پر غور کریں کہ جو ماہرین نے زمین کی اپنے گرد چکر لگانے والی حرکت کی تیزی کے طور پر تجویز کی ہے اور سورج کے گرد اس کی حرکت بتاتی ہے تو نہ صرف اس سریع اور لرزہ براندام کرنے والی حرکت بلکہ انواع و اقسام کی حرکتوں کے باوجود اس کے سکون و آرام کی اہمیت ہم پر زیادہ واضح ہو جاتی ہے ۔[1]

زمین کے بارے میں " وضع " کا لفظ ہے اور آسمان کے بارے میں " رفع " استعمال ہوا ہے ۔ اس تقابل میں جو لطافت ہے اس کے علاوہ اس میں ایک معنی خیز اشارہ ہے اور وہ زمین اور اس کے ان ذرائع کی طرف ہے کہ جو انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں جیسا کہ سورہ " ملک " کی آیت ۱۵ میں ہمیں ملتا ہے ۔ ھو الذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ " وہ وہی ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اس کے مختلف راستوں پر چلو پھرو اور جو رزق الٰہی کے طور پر اس میں پیدا ہوا ہے اُس سے فائدہ اُٹھاؤ ۔ اس طرح پروردگار اس سلسلہ کی آٹھویں نعمت کو معین فرماتا ہے ۔ اس کے بعد کی آیت میں نویں اور دسویں ان نعمتوں کی طرف جو انسان کے موادِ غذائی کے ایک حصہ کو تشکیل دیتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " زمین میں پھل اور شگوفوں سے پُر نخلستان ہیں " (فیھا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام) ۔ " فاکھۃ " ہر قسم کے پھل کے لیے استعمال ہوتا ہے ، جیسا کہ راغب نے " مفردات " میں کہا ہے ۔ اور یہ جو بعض نے اسے خرما اور رطب کے علاوہ تمام پھلوں کے معنی میں لیا ہے اس کی سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں ہے کہ " نخل " علیحدہ شکل میں آیت میں موجود ہے جب کہ ممکن ہے کہ یہ تکرار ہو اور اس اہمیت کی بنا پر ہو کہ جو کھجور کو حاصل ہے ۔ " سورہ نحل " کی آیت ۱۱ اور سورہ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ہم نے ایک تفصیلی بحث خرما کے موادِ غذائی کے حیات بخش فوائد کے بارے میں کی ہے ۔[2]

" اکمام " جمع " کم " (بروزن جن) کی ہے ۔ یہ اس غلاف کو کہتے ہیں جو پھل کو چھپاتا ہے اور " کم " (بروزن قم) اس آستین کے معنی میں ہے جو ہاتھ کو چھپاتی ہے اور " کمہ " (بروزن قبہ) شب کلاہ ہے (رات کو پہننے والی ٹوپی) جو سر کو ڈھانپتی ہے ۔[3]

---

[1] ماہرین نے زمین کی سرعتِ حرکت سورج کے گرد (حرکت انتقالی) ایک منٹ میں ۳۵ کلومیٹر بیان کی ہے اور اس کی اپنے محور کے گرد تیزی کی رفتار ایک گھنٹے میں ۱۶۰۰ کلومیٹر (استوائی منطقوں میں) بتلائی ہے ۔

[2] تفسیر نمونہ کی جلد ۱۳ ص ۵۸ سے آگے اور اسی طرح جلد ۱۱ ص ۱۵۰ سے آگے رجوع فرمائیں

[3] اس سلسلہ میں جلد ۲۰ میں ہم نے تفصیل بیان کی ہے (سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۴۷ کے ذیل میں) ۔

کھجور کے درخت کے بارے میں اس صفت کا انتخاب کہ شروع میں وہ غلاف میں پنہاں ہوتا ہے، اس کے بعد غلاف کو چیر کر خوشہ نخل کو ایک پرکشش انداز میں باہر نکالتا ہے، ممکن ہے کہ اس کی حیران کردینے والی خوبصورتی کی بنا پر ہو یا ان منفعتوں کے باعث ہو کہ جو اس غلاف میں پوشیدہ ہیں اور جو اس مخصوص مادہ کے نچوڑ کا حامل ہے۔ یہ غذا کے طور پر بھی کام آتا ہے اور دوا کے طور پر بھی۔ ان سب سے قطع نظر یہ غلاف شکم مادر کی طرح ہے جو کھجور کے بچوں کو ایک مدت تک اپنے اندر پرورش کرتا ہے۔ اور آفات سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور جس وقت وہ ہوا اور روشنی کے مقابلہ کے قابل ہو جاتے ہیں تو پھر غلاف ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اس درخت کی ایک خاص وضع اور کیفیت ہے کہ پہلے یہ غلاف میں ہوتا ہے پھر خوشہ کی شکل میں باہر آتا ہے یہ کیفیت اس پھل کے توڑنے اور چننے کو آسان کر دیتی ہے اور اگر اس طرح ہوتا کہ کھجور کے درخت کے طویل القامت ہونے کے باوجود ان کے پھل سیب کے درخت کے پھلوں کی طرح مختلف اطراف میں بکھرے ہوئے ہوتے تو ان کا توڑنا اور چننا بہت مشکل ہو جاتا۔

آخر میں اپنی گیارہویں اور بارہویں نعمت کے بارے میں یوں گفتگو فرماتا ہے: "اور زمین میں دانے ہیں، ڈنٹھل اور پتوں کے ہمراہ جو کاہ کی شکل میں نکلتے ہیں اور اسی طرح خوشبودار گیاہ و نباتات"۔ (والحب ذوالعصف والریحان)۔ غذائی دانے انسانوں کی خوراک ہیں اور ان کے خشک و تر پتے ان حیوانوں کی خوراک ہیں کہ جو انسان کی خدمت پر مامور ہیں۔ جن کے دودھ، گوشت، کھال اور اون سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ تو اس طرح کوئی چیز بھی بیکار اور پھینک دینے کے قابل نہیں ہے۔ دوسری طرف خوشبو، گیاہ اور پھولوں کو بھی زمین سے پیدا کیا ہے کہ جو مشام جاں کو معطر کرتے ہیں اور روح کو سکون و نشاط و آرام و سرخوشی عطا کرتے ہیں اور اس طرح اس نے انسان پر اپنی نعمتیں تمام کی ہیں۔ "حب" ہر قسم کے دانہ کو کہتے ہیں اور "عصف" (بروزن اسپ) پتوں اور گھاس کے ان اجزا کے معنی میں ہے کہ جو گھاس سے الگ ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہواؤں کی وجہ سے ہر طرف بکھر جاتے ہیں۔ "حب" کٹی ہوئی گھاس کو بھی کہتے ہیں "ریحان" کے بہت سے معنی ہیں۔ اس کے ایک معنی خوشبودار گھاس اور نباتات کے بھی ہیں۔ ہر قسم کی روزی کو بھی ریحان کہتے ہیں لیکن اس جگہ پہلے معنی ہی مناسب ہیں۔ ان مادی اور معنوی مختلف قسم کی نعمتوں کے ذکر کے بعد آخری آیت میں جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔ وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک دوسری سے گرانبہا اور قیمتی ہے اور وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہاری ساری زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک تمہارے پروردگار کی قدرت و لطف و کرم اور مہربانی کی نشانی ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ تم اس کی تکذیب کرو۔ یہ استفہام، استفہام تقریری ہے جسے اقرار لینے کے وقت زبان پر لاتے ہیں۔ ایک روایت جسے سورہ کی ابتداء میں ہم نے پیش کیا ہے، اس میں حکم دیا گیا ہے کہ اس جملے کے بعد ہم عرض کریں "پروردگار ہم تیری نعمتوں میں سے کسی کی تکذیب نہیں کرتے"۔ (لا بشیء من آلائك رب اكذب)

گزشتہ آیتوں میں گفتگو اگرچہ انسانوں کے بارے میں ہوئی تھی اور گروہ جن کے بارے میں بالکل نہیں تھی لیکن بعد والی آیت بتاتی ہے کہ "کما" کی ضمیر میں یہ دونوں گروہ مخاطب ہیں۔ بہرحال خدا اس جملے کے ساتھ جن و انس دونوں گروہوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان مسائل کے بارے میں غور کریں اور اس کے بعد بغیر اس کے کہ کسی دوسرے کی تعلیم کی ضرورت ہو اپنی عقل سے یہ سوال کریں کہ کیا خدا کی ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت قابل انکار ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو پھر اپنے ولی نعمت کو وہ کیوں نہ پہچانیں اور شکر منعم حقیقی کو کیوں نہ اس کی معرفت کا وسیلہ قرار دیں اور اس کے آستان اقدس پر سر تسلیم کیوں نہ خم کریں۔

"آلاء" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان نعمتوں میں سے ہر ایک پروردگار کے مقام ربوبیت کی اور اس کے لطف و کرم کی دلیل ہے چہ جائیکہ ان کا مجموعہ۔

چند نکات

۱۔ نعمتوں کی شناخت خدا کی معرفت کا زینہ ہے

مذکورہ بالا نعمتوں (قرآن، خلقتِ انسان، تعلیمِ بیان، زمانہ کا منظم حساب، مختلف درخت اور گھاس کی پیدائش، آسمان کی تخلیق، قوانین کی حاکمیت، زمین کی خلقت اس کی خصوصیات کے ساتھ، پھلوں کی تخلیق، کھجور کی خلقت، حیوانات کی خلقت، خوشبودار گھاس اور پھولوں کی تخلیق) کے بارے میں تھوڑا سا غور و خوض، ان جزئیات، خصوصیات اور اسرار کے ساتھ کہ جو ان میں سے ہر ایک میں چھپے ہوئے ہیں، اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ انسان میں احساس شکرگزاری پیدا کرے اور انہیں نعمتوں کے سرچشمے کی معرفت کرائے اس بنا پر خداوند متعال اپنے بندوں سے ان نعمتوں کے بیان کے بعد۔ ایک ایک لطف و کرم کا اقرار لیتا ہے اور اس جملے کی آنے والی آیتوں میں بھی دوسری نعمتوں کے ذکر کے بعد تکرار کرتا ہے۔ اس جملے کو اس نے ۳۱ بار دُہرایا ہے۔ یہ تکرار فصاحت کو مجروح نہیں کرتی بلکہ خود فصاحت کا ایک انداز ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے کوئی باپ اپنے فرائض سے غافل بیٹے کو مخاطب کرکے کہے: کیا تُو بھول گیا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا کمزور بچہ تھا۔ تیری پرورش کے لیے میں نے کیسے کیسے خون جگر پیئے ہیں۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ جب تُو بیمار تھا تو میں نے بہترین ڈاکٹر اور حکیم تیرے علاج کے لیے مہیا کیا اور تیرے علاج کے لیے میں نے کونسی زحمتیں نہیں اٹھائیں۔ کیا تُو بھول گیا ہے کہ جب تُو نے منزل شباب میں قدم رکھا اور تجھے بیوی کی ضرورت ہوئی تو تیرے لیے میں نے پاک و پاکیزہ بیوی منتخب کی۔ کیا تو بھول گیا ہے کہ جب تو مکان، زندگی اور وسائل زندگی کی احتیاج رکھتا تھا تو میں نے یہ تمام چیزیں تیرے لیے فراہم کیں۔ تو پھر یہ سرکشی و نافرمانی، بے مروتی، بے وفائی کس لیے ہے۔"

خداوند منان بھی اپنی انواع و اقسام کی نعمتیں اپنے ان غفلت شعار بندوں کو یاد دلاتا ہے اور ان نعمتوں کے ہر حصّہ کے ذکر کے بعد ان سے سوال کرتا ہے کہ "ان میں سے کن کن نعمتوں کا تم انکار کرتے ہو"۔ پس یہ نافرمانی اور سرکشی کس بنا پر ہے جب کہ میری اطاعت بھی خود تمہارے تدریجی ارتقا اور ترقی کی ضمانت ہے اور تمہارے پروردگار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۲۔ زندگی میں نظم و حساب کا مسئلہ

ہمارے جسم میں بیس سے زیادہ دھاتیں اور دھاتوں سے مشابہت رکھنے والی چیزیں استعمال ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک معین کیفیت و مقدار میں ہے اور جس وقت ان کی معین و مقررہ مقدار و کیفیت میں تھوڑی سی بھی تبدیلی واقع ہو تو ہماری سلامتی خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جب انسان کو زیادہ پسینہ آتا ہے تو وہ گرمی کی شدت کا شکار ہوجاتا ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی اور بیماری اسے لاحق ہو یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو جائے۔ حالانکہ اس بیماری کا سبب اور اس کی علت ایک بہت ہی آسان اور سادہ مسئلہ ہے یعنی پانی اور خون کے نمک کی کمی۔ اور اس کا علاج زیادہ پانی پینے اور نمک کھانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے ہمارے بدن کی عمارت میں

نظم و حساب کا ایک سادہ سا نمونہ سمجھیے۔ بعض اوقات مخلوقات کے ڈھانچے کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ بہت ہی عجیب و پُر لطف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیل یا ایٹم جو اس قدر مختصر ہیں کہ ان کا ہزارواں حصہ اور کبھی ایک ملین ملی میٹر یا ملی گرام ہی اس کا سب کچھ ہوتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ماہرین مجبور ہیں کہ ان کے دقیق اور باریک حسابات کے سلسلہ میں الیکٹرانکی دماغوں سے استفادہ کریں۔ یہ تو نظام تکوین میں ہے۔ اجتماعی حالات میں بھی قانون عدالت سے انحراف بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ پُوری قوم کو ہلاکت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے ان مفاہیم کے حوالے سے جو مندرجہ بالا آیات میں ہم تک پہنچے ہیں، اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اور (والسماء رفعها و وضع الميزان الّا تطغوا فى الميزان) کے جملوں میں اس نے کہنے کی تمام باتیں کہہ ڈالی ہیں اور شرعی قوانین کی نافرمانی اور ان سے انحراف و رُوگردانی کو احکام تکوینی سے سرکشی کے برابر قرار دیا ہے کہ جو آسمانوں پر حاکم ہیں قرآن ان آیتوں میں جہان ہستی اور عالم انسانیت کی ایک قابل توجہ اور عمدہ تصویر پیش کرتا ہے وہاں یہ بھی بتاتا ہے کہ یہی جہان نہیں دُوسرا جہان بھی یوم الحساب ہے اور موازین کے نصب ہونے کا دن ہے بلکہ وہاں کا حساب اور اس کی میزان تو یہاں کے حساب اور میزان سے کہیں زیادہ باریک ہے۔ اسی بنا پر اسلامی روایات میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس سے قبل کہ ہم سے حساب لیا جائے ہم خود اپنا حساب کریں اور اس سے پہلے کہ ہمارا وزن کیا جائے ہم اپنا وزن کرلیں۔ (حاسبوا انفسكم قبل ان تحاسبوا ووزنوا قبل ان توزنوا)۔

❖ ❖ ❖

١٤۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ

١٥۔ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ

١٦۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

١٧۔ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۚ

١٨۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

ترجمہ

١٤۔ انسانوں کو ٹھیکری جیسے خشک شدہ گارے سے پیدا کیا۔

١٥۔ اور جنوں کو آگ کے ملے جلے متحرک شعلے سے پیدا کیا۔

١٦۔ تو تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

١٧۔ وہ دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔

١٨۔ تو تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

انسان کی خلقت ٹھیکری جیسی خاک سے ہوئی ہے

خدا نے گزشتہ نعمتوں کے ذکر کے بعد جن میں انسان کی خلقت بھی تھی اور جسے سربستہ شکل میں پیش کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں پہلے انسان اور جن کی خلقت کے بارے میں تشریح کی ہے۔ تشریح بھی ایسی کہ جو اس کی قدرت کاملہ کی نشان دہی بھی ہے اور سب کے لیے درس عبرت بھی۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: (انسان کو ٹھیکری جیسے خشک شدہ گارے سے پیدا کیا)

(خلق الانسان من صلصال کالفخار)۔

"صلصال" اصل میں (خشک جسم میں آواز کے آنے جانے) کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس خشک ہو جانے والی مٹی کی طرف اگر اشارہ کریں اور وہ آواز دے تو اُسے صلصال کہا جاتا ہے۔ برتن میں بچے ہوئے پانی کو بھی "صلصلہ" کہتے ہیں کیونکہ وہ اِدھر اُدھر حرکت دینے سے صدا دیتا ہے۔ بعض مفسرین کا یہ قول ہے کہ "صلصال" کے معنی بدبُودار کیچڑ (لجن) کے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مشہور ہیں۔ "فخار" کا مادّہ "فخر" ہے اس کے معنی اس شخص کے ہیں جو بہت زیادہ فخر کرتا ہو اور چونکہ اس قسم کے افراد اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور باتیں زیادہ بناتے ہیں اس لیے یہ لفظ کوزہ اور ہر اس قسم کی ٹھیکری کے لیے کہ جس میں سے زیادہ آواز نکلتی ہے، بولا جاتا ہے۔[1]

قرآن میں درج مختلف آیتوں اور ان مفاہیم سے جو انسان کی ابتدائے آفرینش کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ انسان شروع میں خاک تھا (سورہ حج - ۵) پھر اس کی پانی کے ساتھ آمیزش ہوئی اور یہ کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا (انعام - ۲) اور پھر لجن بدبُودار کیچڑ ہو گیا، (حجر - ۲۸) اس کے بعد چپک جانے کی صورت اختیار کی (صافات - ۱۱) پھر منجمد شے کی شکل اختیار کی اور صلصال کالفخار بن گیا (آیہ زیر بحث)۔ ان مرحلوں نے بعد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کس قدر طول کھینچا اور انسان نے ہر مرحلہ میں کس قدر توقف کیا اور یہ منتقل ہونے والے حالات کن اسباب و عوامل کے نتیجے میں وجود میں آئے، یہ ایسے مطالب ہیں کہ جو ہمارے علم و دانش سے پوشیدہ ہیں۔ اس کو صرف خدا ہی جانتا ہے اور بس۔ جو کچھ مُسلّم ہے وہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ مفاہیم ایک ایسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو انسان کے ترقیتی مسائل کے ساتھ نہایت اہم تعلق رکھتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کا اوّلین مادّہ بہت ہی بے قیمت و کم مقدار تھا اور یہ زمین کی حقیر ترین شے سے تھا لیکن خدا نے اس قسم کے بے قیمت مادّہ سے ایسی بیش بہا مخلوق پیدا کی کہ جو گلستان آفرینش کا گل سرسبد بن گیا۔

اِن تعبیرات و مفاہیم سے ضمنی طور پر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی حقیقی قدر و قیمت کو وہی "رُوح الٰہی" اور "نفخۂ ربانی" کہ جو قرآن کی دوسری آیتوں (مثلاً سورہ حجر کی آیہ ۲۵) میں آیا ہے، تشکیل دیتا ہے تاکہ انسان اس حقیقت کو پہچاننے کے بعد اپنی راہ ارتقا کو اچھی طرح پالے اور یہ سمجھ لے کہ کس راستے پر چل کر اسے سفرِ حیات طے کرنا ہے تاکہ وہ بزم ہستی میں اپنی حقیقی قدر و قیمت کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کے بعد پروردگار، عالم جنات کی خلقت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جنوں کو آگ کے مخلوط اور متحرک شعلوں سے پیدا کیا" (وخلق الجان من مارج من نار)۔ "مارج" اصل میں "مرج" (بروزن مرض) سے بنا ہے جس کے معنی اختلاط و آمیزش کے ہیں۔ یہاں اس سے مُراد آگ کے مختلف شعلوں کا اختلاط و امتزاج ہے۔ آگ جس وقت شعلہ فشاں ہوتی ہے تو کبھی سُرخ ہوتی ہے کبھی زرد اور کبھی آبی کبھی سفید۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس "مرج" میں تحرک کے معنی بھی ہیں (امرجت الدابۃ) "میں نے جانور کو چراگاہ میں چھوڑ دیا" کیونکہ "مرج" کے ایک معنی چراگاہ کے بھی ہیں۔ پھر ہمارے لیے یہ بات واضح نہیں ہے کہ "جن" کی خلقت اس رنگ برنگی آگ سے کس طرح ہوئی جب کہ اس کی دوسری خصوصیتیں "صبح صادق" یعنی قرآن مجید اور وحی الٰہی کے حوالے سے ہم پر ثابت ہوئیں۔ مجہولات کے مقابلے میں ہماری معلومات کا محدود ہونا ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ان حقائق کا، اس کے بعد کہ وہ وحی الٰہی سے ثابت ہو جائیں، انکار کریں یا انہیں نظر انداز کریں۔ خواہ ہمارا علم ان تک رسائی حاصل کرے یا نہ کرے (انشاء اللہ جن کی خلقت اور اس کی

---

[1] مفردات راغب۔

خصوصیتوں کے بارے میں مزید تشریح سورۂ جن کی تفسیر میں درج کی جائے گی)۔ بہرحال زیادہ تر مخلوق جس سے ہمارا سروکار ہے وہ پانی، مٹی، ہوا اور آگ ہے۔ ہم انہیں چاہے قدماء کی طرح عنصر اور بسیط سمجھیں یا موجودہ ماہرین کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے مختلف الاجسام اجزاء سے مرکب خیال کریں لیکن ہر صورت میں انسان کی خلقت کا مبداء مٹی اور پانی ہے جب کہ "جن" کا مبداء خلقت ہوا اور آگ ہے۔ مبداء آفرینش کی یہ دورنگی ان دونوں مخلوقوں کے درمیان بہت سے اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

پھر ان نعمتوں کے بعد کہ جو خلقتِ انسان کی ابتداء میں تھیں اس جملہ کی تکرار ہے کہ: "پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرتے ہو"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد والی آیت میں ایک اور نعمت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ دو مشرقوں اور دو مغربوں کا پروردگار ہے"۔ (رب المشرقین و رب المغربین)۔ یہ درست ہے کہ سورج سال کے ہر روز ایک نقطہ سے طلوع ہو کر دوسرے نقطہ پر غروب ہوتا ہے اور اس ترتیب کے اعتبار سے ایک مشرق اور ایک مغرب ہی بنتی ہے لیکن سورج کے حوالے سے زمین کے شمالی جھکاؤ اور جنوبی جھکاؤ کی حد اکثر کی طرف توجہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ فی الحقیقت دو مشرق ہیں اور دو مغرب اور باقی ان دونوں کے درمیان کا حصہ ہے۔[1]

یہ نظام کہ جو حقیقت میں چار قسم کے بہت بابرکت موسموں کی خلقت کا سرچشمہ ہے، حقیقت میں ان آیتوں کی تکمیل و تاکید ہے کہ جو پہلے آچکی ہیں۔ اس مقام پر کہ جہاں چاند اور سورج کی گردش کے متعلق گفتگو ہے اسی طرح آسمانوں کی خلقت میں میزان کے وجود کی بات مجموعی اعتبار سے وہ آیتیں زمین، چاند اور سورج کی خلقت اور حرکت کے دقیق نظاموں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ان میں ان نعمتوں اور برکتوں کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو ان وسائل سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے یہاں دو مشرقوں اور دو مغربوں کی تفسیر سورج کے طلوع و غروب اور چاند کے طلوع و غروب کے اعتبار سے کی ہے اور اسے گزشتہ آیت (الشمس والقمر بحسبان) کے مطابق سمجھے ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بعض اسلامی روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ایک حدیث ہماری نظر کے سامنے آئی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"ان مشرق الشتاء علی حدہ و مشرق الصیف علی حدہ اما تعرف ذالک من قرب الشمس و بعدھا"

سردیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے اور گرمیوں کے آغاز کا مشرق اور ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ سورج ان دو موسموں میں قریب و دور ہوتا ہے؟ گرمیوں کے موسم میں آسمان پر سورج کے اوپر آنے اور سردیوں کے موسم میں اس کے نیچے چلے جانے کی طرف اشارہ ہے۔[2]

---

[1] اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ چونکہ زمین کا محور اس کی سطح مدار کی بہ نسبت جھکا ہوا ہے اور تقریباً ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہے اور زمین اس حالت میں سورج کے گرد گردش کرتی ہے لہذا سورج کا طلوع و غروب ہمیشہ متغیر نظر آتا ہے اور ۲۳ درجہ تم اعظم شمالی سے (گرمیوں کے شروع میں) ۲۳ درجہ تم اعظم جنوبی (سردیوں کے شروع میں) تک متغیر رہتا ہے کہ جس کے پہلے مدار کو مدار راس السرطان اور دوسرے مدار کو مدار راس الجدی کہتے ہیں۔ یہ ہیں سورج کے دو مشرق اور دو مغرب۔ باقی جتنے مدار ہیں وہ ان دونوں مداروں کے درمیان ہیں۔

[2] تفسیر "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹۰

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے کہ بعض آیات قرآنی میں یہ کیوں آیا ہے۔ "فلا أقسم برب المشارق والمغارب" مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم (معارج - ۴۰) کیونکہ اس میں پورے سال کے تمام مشرقوں اور مغربوں کی طرف اشارہ ہے، جب کہ زیر بحث آیت میں صرف اس کی انتہائی قوس صعودی و نزولی کی طرف اشارہ ہے۔ بہر حال اس نعمت کے ذکر کے بعد پھر اس نے جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے" (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

✧ ✧ ✧

۱۹۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ۙ

۲۰۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ۚ

۲۱۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۲۲۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ۚ

۲۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۲۴۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۝ۚ

۲۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ۧ

ترجمہ

۱۹۔ دو مختلف دریاؤں کو ایک دُوسرے کے قریب قرار دیا در آنحالیکہ وہ ایک دُوسرے سے مِل رہے ہیں۔

۲۰۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے کہ وُہ ایک دُوسرے پر غلبہ نہیں کرتے۔

۲۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کا انکار کرو گے؟

۲۲۔ اِن دونوں میں سے لولو اور مرجان نکلتے ہیں۔

۲۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کِس کِس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۲۴۔ اور اس کے لیے بنی ہُوئی کشتیاں ہیں کہ جو پہاڑ کی طرح سمندر میں چلتی ہیں۔

۲۵ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے ؟

تفسیر

سمندر اپنے گراں بہا ذخائر کے ساتھ

پروردگار عالم اپنی نعمتوں کے تذکرے کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے سمندروں کی بات کرتا ہے لیکن سب سمندروں کی نہیں بلکہ چند سمندروں کی ایک کیفیت خاص کی بات کہ جو ایک عجیب سی چیز ہے اور خدا کی لامحدود قدرت کی نشانی بھی ہے اور بعض مفید انسانیت چیزوں کے ظاہر ہونے کا وسیلہ بھی فرماتا ہے : " دو مختلف سمندروں کو ایک دوسرے کے پاس قرار دیا کہ جو ایک دوسرے سے مل رہے ہیں : (مرج البحرین یلتقیان)۔ " لیکن ان دونوں کے درمیان ایک دیوار ہے کہ جو ایک دوسرے پر غلبہ کی راہ میں رکاوٹ ہے : (بینھما برزخ لا یبغیان)۔ " مرج " (بروزن فلج) کا مادہ خلط ملط کرنے یا بھیجنے اور چھوڑنے کے معنی میں ہے اور یہاں " بینھما برزخ لا یبغیان " کے جملے کے قرینے سے بھیجنے اور ایک دوسرے کے ساتھ قرار دینے کے معنی میں ہے۔ ان دو سمندروں سے مراد ، سورۂ فرقان کی آیت ۵۳ کی گواہی کے مطابق ، میٹھے اور کھاری پانی والے دو سمندر ہیں ، جہاں پروردگار عالم فرماتا ہے " وھوالذی مرج البحرین ھٰذا عذب فرات وھٰذا ملح اجاج وجعل بینھما برزخا وحجرا محجورا " وہ وہی ہے کہ جس نے دو سمندر ایک دوسرے کے پاس قرار دیے جن میں سے ایک کا پانی میٹھا ہے اور دوسرے کا کھاری ۔ اس نے ان دونوں کے درمیان ایک برزخ قرار دیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مل نہ جائیں ۔ باقی رہا یہ کہ یہ دو سمندر میٹھے اور کھاری کہاں ہیں جو ایک دوسرے پر غلبہ نہیں کرتے اور یہ برزخ جو ان دونوں کے درمیان قرار پایا ہے وہ کیا ہے اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں ۔ بعض افراد ایسے مفہوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں سمندروں کی کیفیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے ۔ منجملہ اس کے ان مفسرین نے کہا ہے کہ ان دو سمندروں سے مراد بحر فارس و بحر روم ہیں ۔ حالانکہ اب اس زمانے میں ہم خوب جانتے ہیں کہ ان دونوں سمندروں کا پانی کھاری ہے اور پھر ان کے درمیان کوئی برزخ بھی نہیں ہے ۔ یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد آسمان کا سمندر اور زمین کا سمندر ہے جس میں سے پہلا شیریں اور دوسرا تلخ ہے ۔ ہمیں معلوم ہے کہ آسمان میں کوئی سمندر نہیں ہے ۔ سوائے ان بادلوں اور بخارات کے جو زمین کے سمندروں سے اٹھتے ہیں ۔ یا پھر انہوں نے کہا ہے کہ شیریں سمندر سے مراد وہ پانی ہے جو زیر زمین ہے اور وہ سمندر کے پانی سے مل جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان جو خزانوں کی دیواریں ہیں وہ ان کا برزخ ہے ۔ حالانکہ اب ہر کوئی جانتا ہے کہ زیر زمین سمندر کی شکل میں کوئی چیز بہت ہی کم پائی جاتی ہے البتہ پانی کے قطرات ، مرطوب مٹی اور ریت کے ذروں کے درمیان ضرور پوشیدہ ہوتے ہیں ۔ جس وقت کسی جگہ کنواں کھودتے ہیں تو یہ رفتہ رفتہ جمع ہو جاتی ہیں اور اس طرح پانی نکل آتا ہے ۔ علاوہ ازیں لؤلؤ و مرجان کہ جن کی طرف بعد کی آیات میں اشارہ ہوا ہے عام زیر زمین پانیوں سے حاصل نہیں ہوتے ۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو دریاؤں سے کیا مراد ہے ؟

پہلے ہم سُورہ فرقان میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ آبِ شیریں کے بڑے دریا اور نہریں جس وقت سمندروں میں گرتے ہیں تو عام طور پر ساحل کے قریب آبِ شیریں کا سمندر تشکیل پاتا ہے اور وہ آبِ تلخ کو پرے دھکیل دیتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ دو میٹھے اور کھاری سمندر پتلے گاڑھے ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ایسے علاقوں میں کہ جہاں یہ دریا سمندر میں گرتے ہیں ایسے میٹھے اور کھاری سمندروں کا منظر، جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں اور اس کے باوجود ایک دُوسرے سے جُدا ہیں، بلندی سے صاف طور پر نظر آتا ہے۔ جس وقت ان پانیوں کے کنارے ایک دوسرے سے مخلوط ہوتے ہیں تو تازہ میٹھا پانی ان کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح ان دو الگ رہنے والے سمندروں کو ہمیشہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ سمندر میں مدو جزر کے موقع پر جب کہ سمندر کا نیچے کا پانی اُوپر آجاتا ہے تو میٹھا پانی دھکیل دیا جاتا ہے بغیر اس کے کہ کھاری پانی اس میں مخلوط ہو (مگر خشک سالی اور پانی کی کمی کے موقع پر) اور وہ خشکی کے کافی حصّہ کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس لیے ساحل کے قریب رہنے والے لوگ ان علاقوں میں میٹھے پانی کو کنٹرول میں رکھ کر ساحلی علاقوں میں بہت سی نہریں بنا لیتے ہیں جن کے ذریعے بہت سی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ نہریں کہ جو ساحلی مدو جزر کی برکت اور ان نہروں کے پانی پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں، چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ میٹھے پانی سے خالی ہو کر لبریز ہوتی ہیں اور ان علاقوں کی سیرابی کا بہت ہی مؤثر ذریعہ ہیں۔

ان دو سمندروں کے بارے میں بعض علماء کی طرف سے ایک بہت ہی پُرکشش تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ اس سے مراد "گلف سٹریم" کا بہاؤ ہو۔ ہم اس کی تفصیل انشاء اللہ انہی آیتوں کے ذیل میں بیان ہونے والے نکات کی بحث میں پیش کریں گے۔

پروردگارِ عالم ایک مرتبہ پھر اپنے بندوں کو مخاطب کر کے ان نعمتوں کے حوالے سے ان سے سوال کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ پھر اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "ان دونوں سمندروں سے لؤلؤ و مرجان نکلتے ہیں" (یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان)۔ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔" (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ لؤلؤ و مرجان پُرکشش زینت کے دو وسیلے ہیں۔ از رُوئے طب ان دونوں سے بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی ایک بات ہے کہ وہ اچھے اسبابِ زندگی اور مالِ تجارت ہیں جن سے بہت سا منافع حاصل ہوتا ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر گزشتہ آیتوں میں دو نعمتوں کی حیثیت سے ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ رہا لؤلؤ کہ جسے فارسی میں مروارید کہتے ہیں، وہ صاف و شفاف قیمتی موتی ہوتا ہے کہ جو دریا کی تہہ اور سمندروں کی گہرائی میں بطنِ صدف میں پرورش پاتا ہے۔ وہ جتنا موٹا ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ طب میں اسے مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم اطباء اس سے اعصاب کی تقویت، خفقان، خوف و وحشت، جگر کی قوت، منہ کی بدبُو، گردہ مثانہ کی پتھری اور یرقان کے لیے دوائیں تیار کرتے تھے حتّٰی کہ آنکھ کی بیماریوں میں بھی اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔[1]

"مرجان" کی تفسیر بعض مفسّرین نے یہ کی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے لؤلؤ ہوتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ "مرجان" درخت کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کی مانند ایک زندہ وجود ہوتا ہے جو سمندروں کی گہرائی میں درخت کی طرح اُگتا ہے۔ ماہرین ایک عرصہ تک اسے ایک قسم

---

[1] "تحفہ حکیم مومن" اور دائرۃ المعارف دہ خدا و دیگر منابع۔

کی گھاس سمجھتے رہے لیکن بعد میں واضح ہوا کہ وہ ایک قسم کا جانور ہے۔ اگرچہ وہ سمندروں کے جھاگ کے پتھروں سے چپک جاتا ہے اور بعض اوقات وسیع جگہ کو گھیر لیتا ہے، بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور جزیروں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے جو جزائر مرجان کہلاتے ہیں۔

"مرجان" عام طور پر ٹھہرے ہوئے پانی میں نشو و نما پاتا ہے۔ جو اس کے شکاری ہیں وہ اسے دریائے احمر کے ساحلوں اور میڈی ٹرینین اور بعض دوسرے علاقوں میں اس کا شکار کرتے ہیں۔ وہ مرجان جو زیب و زینت کے کام آتا ہے، سُرخ رنگ کا ہوتا ہے، وہ جتنا زیادہ سُرخ ہو اتنا ہی زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ شاعر جو اس کو تشبیہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں وہ اس کی سُرخی ہی کی بنا پر ہے۔ اس کی سب سے خراب قسم مرجان سفید ہے۔ یہ بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک مرجان سیاہ بھی ہوتا ہے۔ مرجان زیب و زینت کے علاوہ دوا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ طبیبوں نے اس کے بہت سے خواص بیان کیے ہیں۔ منجملہ ان کے اس سے دوائیں تیار کی جاتی ہیں جو دل کو تقویت دینے، سانپ کے زہر کی تاثیر کو دُور کرنے، اعصاب کو قوت بخشنے، اسہال کو ٹھیک کرنے اور زخم سے بہنے والے خون کو بند کرنے میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری کے لیے بھی مفید ہوتا ہے۔[1]

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ لؤلؤ و مرجان صرف کھاری پانی میں پرورش پاتے ہیں لہٰذا وہ آیہ (یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان) کی تفسیر میں، کہ ان دونوں میں سے لؤلؤ و مرجان نکلتے ہیں، اُلجھ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ان دو میں سے مُراد صرف ایک ہے (سورہ زخرف کی آیت ۳۱) لیکن ہمارے پاس ان معانی کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ لؤلؤ و مرجان میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

نعمتوں کی بحث کے اس حصّہ کو جاری رکھتے ہوئے کشتیوں کی طرف، کہ جو گزشتہ زمانے میں بھی اور زمانۂ حال میں بھی انسانوں کے لیے حمل و نقل کے وسائل میں سب سے اہم ذریعہ ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا ہی کے لیے ہیں وہ کشتیاں جو سمندر میں چلتی ہیں اور پہاڑ معلوم ہوتی ہیں" (وله الجوار المنشآت فی البحر کالاعلام)۔ "جوار" جمع ہے "جاریہ" کی، وہ صفت ہے "سفن" کی جس کے معنی ہیں کشتیاں۔ اختصار کی وجہ سے اس لفظ کو حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جو چیز زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ کشتیاں نہیں بلکہ ان کا پانی میں چلنا ہے۔ اس وجہ سے صرف اس صفت پر انحصار کیا گیا ہے (غور فرمائیے)۔ کنیز کو "جاریہ" کہتے ہیں وہ بھی اس کے چلنے پھرنے اور خدمات بجا لانے کے لیے دوڑ دھوپ کی بنا پر ہے اور اگر جوان لڑکی کو جاریہ کہا جاتا ہے تو وہ اس کے وجود میں نشاطِ جوانی کے تحرک کی بنا پر ہے۔ "منشآت" جمع ہے "منشا" کی جو اسم مفعول ہے اس کے معنی ایجاد کے ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ عین اس وقت کہ جب منشآت کی تعبیر کے سلسلہ میں انسان کے ہاتھ سے کشتی بنائے جانے کی بات کر رہا ہے تو فرماتا ہے: (وله) "خدا کے لیے ہے"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کشتی کے ایجاد کرنے والے اور بنانے والے خدا کی عطا کی ہوئی ان مختلف خصوصیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو کشتی سے استفادہ کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح وہ دریاؤں اور سمندروں کے سیال ہونے کی خاصیت سے اور ہواؤں کے چلنے کی قوت سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان چیزوں میں یعنی سمندر میں اور ہوا میں یہ خواص و آثار ودیعت کیے ہیں۔ اسی لیے ایک دوسرے مقام پر قرآن میں لفظ "تسخیر" آیا ہے: (وسخر لکم

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی اور دوسری کتب۔

الفلك لتجري في البحر بامره) " خدا نے کشتی کو تمہارا فرماں بردار بنایا کہ جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہے (ابراہیم ۳۲)۔
بعض مفسرین نے " منشآ " کو " انشاء" کے مادہ سے بلند کرنے کے معنی میں تفسیر کی ہے اور وہ اس سے بادبانی کشتی مُراد لیتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بادبانوں کے بلند کرنے سے اور انہیں ہوا کے راستے میں نصب کرنے سے لوگ کشتیوں کے چلانے کا کام لیتے تھے۔ " اعلام" جمع "علم" (بروزن قلم) کے معنی پہاڑ ہیں۔ اگرچہ اصل میں اس کے معنی علامت کے ہیں جو کسی چیز کی نشان دہی کرتی ہے۔ چونکہ پہاڑ دُور سے نمایاں ہوتے ہیں، لہذا انہیں علَم سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح جھنڈے کو بھی علَم کہتے ہیں۔ اس طرح قرآن نے بڑی بڑی کشتیوں پر کہ جو سمندروں وغیرہ میں چلتی ہیں، انحصار کیا ہے۔ بعض لوگ ایسا خیال کرتے ہیں لیکن بڑی کشتیاں اور اسٹیمر وغیرہ زمانۂ حال کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں۔ یونانیوں کی جنگ کی داستانوں میں ہمیں ملتا ہے کہ وہ نہایت عظیم اور بڑی کشتیوں سے کام لیتے تھے۔ دوبارہ اسی پُر معنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے: " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ سمندر خُدا کی نعمتوں کے مرکز:

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے آیتوں کے اس حصہ میں سمندر اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت پر گفتگو ہوئی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سمندر زمین کے تین چوتھائی حصہ کا احاطہ کیے ہوئے اور وہ اسباب غذا، دواؤں اور سامان زینت کے لیے منبعِ عظیم ہے۔ انسانوں اور ان کے مال و متاع کے لیے حمل و نقل کے سلسلہ میں اہم وسیلہ ہے۔ اور سب سے زیادہ اہم بارش کا برسنا۔ ہواؤں کا اعتدال یہاں تک کہ ہواؤں کا چلنا یہ سب سمندروں کی برکتوں میں سے ہے۔ اگر سمندروں کی سطح جیسی اب ہے اس سے کچھ کم یا زیادہ ہوتی یا کرۂ زمین خشکی کی طرف مائل ہوتا یا زیادہ مرطوب ہوتا تو زندگی کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لیے قرآن بارہا مختلف تعبیروں کے ذریعے انسانوں کی اس طرف توجہ مبذول کراتا ہے اور انہیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی کہتا ہے: " خدا نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کیا" (سخر لکم البحر) (جاثیہ ۔ ۱۲) کبھی کہتا ہے: "کشتیوں کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے"۔ (سخر لکم الفلك) (ابراہیم) کبھی کہتا ہے: " جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کیا ہے"۔ (سخر لکم ما فی الارض) (حج ۔ ۶۵) ان سب سے قطع نظر سمندر عجائباتِ عالم میں سے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی خوردبین سے نظر آنے والی گھاس اور دُنیا کے بہت بڑے بڑے درخت سمندروں میں اُگتے ہیں۔ اسی طرح چھوٹے سے چھوٹا جانور اور عظیم ترین، دیو قامت حیوانات سمندروں میں زندگی بسر کرتے ہیں سمندروں کی گہرائی میں زندگی گزارنا جہاں نہ روشنی ہے نہ غذا اس قدر تعجب خیز و حیرت انگیز ہے کہ انسان اس کے مطالعہ سے سیر نہیں ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہاں جانور خود اپنے اندر سے روشنی نکالتے ہیں اور جو چیزیں ان کو غذا کے لیے درکار ہوتی ہیں وہ پانی کی سطح پر تیار ہوتی ہیں اور تہ نشیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے جسم اس قدر مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں اور اندرونی دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ پانی کے اس عظیم دباؤ کے مقابلے میں اگر انسان کو عام حالات میں وہاں رکھا جائے تو اس کی ہڈیاں آٹے میں تبدیل

۲۔ بطونِ آیات میں سے ایک تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے مرج البحرین یلتقیان... کی تفسیر میں فرمایا :

علی و فاطمه بحران عمیقان ، لایبغی احدهما علی صاحبه یخرج منهما اللؤلؤ والمرجان ، قال : الحسن والحسین :

علیؑ و فاطمہؑ دو عمیق سمندر ہیں کہ جن میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز نہیں کرتا اور ان دو دریاؤں سے لؤلؤ و مرجان یعنی حسنؑ و حسینؑ برآمد ہوئے ہیں۔[1]

تفسیر دُرِ منثور میں یہی معنی بعض اصحاب پیغمبر کی زبانی بیان ہوئے ہیں۔[2]

مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں اسی چیز کو مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قرآن مجید کے کئی بطون ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہی آیت متعدد معانی رکھتی ہو۔ اور جو کچھ اس حدیث میں آیا ہے بطونِ قرآن میں سے ہے کہ جو اس کے ظاہری معنی سے متصادم نہیں ہوتا۔

۞ ۞ ۞

---

[1] تفسیر قمی جلد ۲ ص ۳۴۴ ۔

[2] دُرِ منثور ج ۶ ص ۱۴۲ ۔

۲۶۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ

۲۷۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۚ

۲۸۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ○

۲۹۔ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ
فِي شَأْنٍ ۚ

۳۰۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ○

ترجمہ

۲۶۔ وُہ تمام لوگ کہ جو اس زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے۔

۲۷۔ اور صرف تیرے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہ جائے گی۔

۲۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۲۹۔ تمام وُہ لوگ جو آسمان اور زمین میں ہیں اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ ہر روز
ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

۳۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

تفسیر

ہم سب فانی ہیں اور بقا صرف تیرے لیے ہے :

اپنی نعمت کو جاری رکھتے ہوئے ان آیتوں میں مزید فرماتا ہے : " تمام وہ لوگ کہ جو زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں فنا ہو جائیں گے" (کل من علیھا فان)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ فنا اللہ کی نعمتوں میں کس طرح شمار ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس اعتبار سے ہو کہ اس فنا سے مُراد فنائے مطلق نہیں ہے بلکہ یہ عالم بقا کے لیے ایک دریچے کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دالان اور گزرگاہ ہے کہ جس کو عبور کرنا سرائے بقاء تک پہنچنے کے لیے ضروری و لابدی ہے۔ دُنیا اپنی تمام نعمتوں کے باوجود مومن کے لیے زندان ہے اور اس دُنیا سے جانا تنگ و تاریک زندان سے نکلنے کے مترادف ہے۔

یا پھر فنا کا ذکر اس نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے کہ گزشتہ نعمتوں کا بیان، ممکن ہے ایک گروہ کے لیے اکل و شرب کی چیزوں لوؤ و مرجان اور سواریوں میں مستغرق ہونے کا باعث بن جائے۔ لہٰذا یاد دلاتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان چیزوں میں دل لگا بیٹھو اور اپنے رب کی راہ میں ان سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاؤ۔ یہ یاد دلانا بھی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ " علیھا " کی ضمیر زمین کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف گزشتہ آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن سے بھی واضح ہے۔ " من علیھا " سے مُراد (وہ لوگ کہ جو زمین پر ہیں) جنّ و انس ہیں۔ اگرچہ بعض مفسّرین نے اس احتمال کو تقویت دی ہے کہ یہ حیوانات اور دوسری چلنے والی مخلوق کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن " من " کے لفظ کے پیش نظر کہ جو ہمیشہ ذوی العقول کے لیے استعمال ہوا ہے پہلی تفسیر ہی مناسب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فنا کا مسئلہ جنّ و انس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قرآن کی تصریح کے مطابق تمام اہل آسمان و زمین بلکہ تمام موجودات عالم فنا ہو جائیں گے۔ (کل شیء ھالك الّا وجھہ) (قصص۔ ۸۸) لیکن چونکہ گفتگو ساکنان زمین سے تھی لہٰذا صرف انہی کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے : " صرف تیرے پروردگار کی ذات ذوالجلال والاکرام باقی رہ جائے گی (ویبقٰی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام)۔ لغت کے اعتبار سے وجہ کے معنی چہرے کے ہیں۔ کسی شخص سے جب ہمارا آمنا سامنا ہو اور ہم اس سے ملاقات کریں تو ہم اس کے رُوبرو ہوتے ہیں لیکن جب یہ لفظ خدا کے لیے استعمال ہو تو پھر مراد اس کی ذات پاک ہی ہوتی ہے۔ مفسّرین نے " وجہ ربّك " کو یہاں پروردگار کی صفات کے معنی میں لیا ہے کہ جن کی وجہ سے انسان پر برکتیں اور نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ مثلاً: علم، قدرت، رحمت اور مغفرت۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس سے مُراد وہ اعمال ہیں جو خدا کے لیے انجام دیے جاتے ہیں۔ تو اس بنا پر سب فنا ہو جائیں گے لیکن وہ اکیلی چیز یعنی وہ اعمال باقی رہ جائیں گے کہ جو خلوص نیت سے اس کی رضا کے لیے انجام دیے گئے ہیں۔ لیکن پہلے معنی سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ باقی رہا ذوالجلال والاکرام کہ جو " وجہہ " کی صفت ہے اس سے خدا کی صفاتِ جلال و جمال کی طرف اشارہ ہے۔ " ذوالجلال " ایسی صفات کی خبر دیتا ہے کہ جن سے خدا اجل و برتر ہے (صفات سلبیہ) اور " اکرام " ایسی صفتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو کسی چیز کے حُسن اور قدر و قیمت کو واضح کرتی ہیں اور وہ خدا کی صفات ثبوتیہ ہیں مثلاً اس کا علم، قدرت اور حیات۔ تو اس بنا پر اس مجموعے کے معنی یہ ہوں گے کہ صرف خدا

کی وہ ذات پاک، کہ جو صفات ثبوتیہ سے متصف اور صفات سلبیہ سے مبرّا و منزّہ ہے، اس عالم میں برقرار رہے گی۔

بعض مفسّرین خدا کے صاحب اکرام ہونے کو صاحب الطاف و نعمات ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جن کے ذریعہ وہ اپنے اولیا کا اکرام کرتا ہے اور انہیں گرامی قدر بناتا ہے۔ مذکورہ بالا آیتوں میں ان سب معانی کا جمع ہونا ممکن ہے۔ ایک حدیث میں منقول ہے کہ ایک شخص بارگاہ پیغمبر میں نماز میں مصروف تھا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح دُعا کی: اللّٰھم انی اسئلك بان لك الحمد لا الٰہ الّا انت المنان بدیع السماوات والارض ذوالجلال والاکرام یا حیّ یا قیوم پیغمبر نے اپنے اصحاب و انصار سے کہا: جانتے ہو اس نے خدا کو کس نام سے پکارا ہے؟ انہوں نے کہا: خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: والذی نفسی بیدہ لقد دعا اللہ باسمہ الاعظم الذی اذا دعی بہ اجاب و اذا سئل بہ اعطی: "قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس نے خدا کو اس کے اسم اعظم کے حوالے سے پکارا ہے جس وقت کوئی خدا کو اس نام سے پکارے تو وہ اس کی دُعا قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعے سے سوال کرے تو وہ عطا فرماتا ہے۔[1]

پروردگار عالم پھر ایک مرتبہ اپنی مخلوق کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس سے بعد والی آیت کا نفس مضمون قبل کی آیتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے: "وہ تمام کہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں اپنی حاجتیں اسی سے طلب کرتے ہیں اور اسی سے سوال کرتے ہیں"۔ (یسئلہ من فی السماوات والارض)۔ ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ سب فنا ہونے والے ہیں اور خدا باقی ہے۔ یہ نہیں کہ اس جہاں کے اختتام پر ساری کائنات سوائے پروردگار کی پاک ذات کے راہ فنا طے کرے گی بلکہ اس وقت بھی اُس کے مقابلے میں فانی ہیں اور ان کی بقا اس کی بقا اور مشیت سے وابستہ ہے اگر ایک ایک لمحے کے لیے وہ اپنا لُطف و کرم کائنات سے اُٹھالے "تو سب فنا ہو جائیں"۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی ہے کہ جس سے اہل زمین اور اہل آسمان سوال کریں۔ "یسئلہ" کی تعبیر فعل مضارع کی شکل میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سوال اور تقاضا دائمی ہے۔ سب کے سب زبان حال سے اس مبدأ فیاض سے ہمیشہ فیض کے طالب ہیں، زندگی چاہتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کا سوال کرتے ہیں اور یہ ممکن الوجود کی ذات کا اقتضا ہے کہ نہ صرف حدوث میں بلکہ اپنی بقا میں بھی وہ واجب الوجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا ہر روز ایک نئی شان اور نئے کام میں ہے"۔ (کل یوم ھو فی شأن)۔ جی ہاں اس کی تخلیق دائم و مستمر ہے۔ اور سوال کرنے والوں اور صاحبانِ حاجات کو جواب دینا بھی اسی طرح ہے اور وہ ہر روز ایک نئی طرح ڈالتا ہے۔ ایک دن وہ کچھ زمروں کو طاقت و قدرت عطا کرتا ہے، دوسرے دن انہیں زوال کا شکار بنا دیتا ہے۔ ایک روز صحت و سلامتی و جوانی عطا فرماتا ہے دوسرے دن ضعف و ناتوانی۔ ایک دن دل سے غم و اندوہ دُور کرتا ہے، دوسرے دن غم و اندوہ کا سبب پیدا کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر روز حکمت و نظام احسن کے مطابق کوئی نئی مخلوق "نیا موجود اور نیا حادثہ" وجود میں لاتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اگر توجہ کی جائے تو وہ ہم پر یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ ایک تو ہماری حاجتیں دائمی طور پر اس کی ذات پاک سے وابستہ ہیں۔ دوسرے اس طرح ہمارے دل مایوسی کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ توجہ ہماری غفلت اور غرور کو ختم کرتی ہے جی ہاں اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے اور وہ ایک نئے کام میں مصروف ہے۔ اگرچہ مفسّرین میں سے ہر ایک نے ان وسیع معانی کے کسی ایک گوشہ کو آیت کی تفسیر

---

[1] تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۹۵

کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ بعض نے صرف گناہوں کی بخشش، غم و اندوہ کو دور کرنے اور اقوام کی بلندی و زوال کو عنوان بنایا ہے۔ بعض نے صرف مسئلہ آفرینش، رزق، زندگی، موت اور عزت و ذلت کو، بعض نے صرف انسانوں کی خلقت اور موت کو عنوان کلام بنایا ہے اور کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر روز تین لشکر ہیں۔ ایک لشکر باپوں کے صلبوں سے ماؤں کے رحموں کی طرف کوچ کرتا ہے، دوسرا لشکر ماؤں کے رحموں سے اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اور تیسرا لشکر دنیا سے قبر کی طرف جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ اس دنیا کی ہر نئی تخلیق پیدائش اور انقلاب اپنے اندر تحول لیے ہوئے ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت منقول ہے کہ آپ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: الحمد لله الذی لا یموت ولا تنقضی عجائبه لانه کل یوم هو فی شأن من احداث بدیع لم یکن۔ "حمد و ستائش مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو ہرگز نہیں مرتا، اس کے عجائبات خلقت ختم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے اور وہ ایک نیا موضوع پیدا کرتا ہے کہ جو پہلے ہرگز نہیں تھا"[1]

ایک اور حدیث ہے جو رسول خدا سے منقول ہے: آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: من شأنه ان یغفر ذنبا و یفرج کربا و یرفع قوما و یضع آخرین۔ "اس کے کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ گناہ کو بخشتا ہے، رنج و تکلیف کو برطرف کرتا ہے، ایک گروہ کو بلند کرتا ہے اور دوسرے کو گرا دیتا ہے"[2]

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں "یوم" اس دن کے معنوں میں نہیں ہے جو رات کے مقابلہ میں ہے بلکہ ایک طولانی دور پر حاوی ہے اور ساعات و لمحات پر بھی۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ہر زمانے میں ایک نئی شان ہے اور وہ ایک نیا کام کرتا ہے بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شان نزول بھی بیان کی ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے قول کی تردید کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہودیوں کا نظریہ یہ ہے کہ خدا ہفتہ کو کوئی کام نہیں کرتا۔ اس روز وہ تعطیل کرتا ہے۔ کوئی حکم اور فرمان جاری نہیں کرتا[3]

قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی تخلیق اور تدبیر امور کا پروگرام ایک لمحے کے لیے بھی تعطیل کا متحمل نہیں ہوتا۔ پروردگار عالم پھر اس نعمت مستقل اور تمام مخلوقات آسمان و زمین کی حاجتوں کی جواب دہی کے بعد فرماتا ہے: "تم خدا کی کس کس نعمت کی تکذیب کرتے ہو۔" (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

چند نکات

۱۔ فنا کی کیا حقیقت ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیتوں میں پڑھا ہے کہ خدا کے علاوہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ یہ فنائے مطلق کے معانی میں نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ روح انسانی بھی نابود ہو جائے گی یا انسان کے جسم سے حاصل ہونے والی مٹی بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ قرآن کی آیتیں

---

[1] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نورالثقلین جلد ۵ ص ۱۹۳

[2] مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث۔ یہ حدیث روح المعانی میں بھی صحیح بخاری سے نقل ہوئی ہے۔

[3] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۰۲

قیامت کے دن تک کے لیے عالم برزخ کی تصریح کرتی ہیں۔[1]

دوسری جانب وہ بارہا کہتا ہے: مُردے قیامت میں قبروں سے اٹھیں گے۔[2]

بوسیدہ ہڈیاں خدا کے حکم سے اپنے جسم پر لباس حیات پہنیں گی۔[3]

یہ سب چیزیں اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ اس آیت میں اور اس سے مشابہت رکھنے والی آیتوں میں فنا نظام جسم و جاں کے درہم برہم ہونے، رشتوں کے قطع ہونے اور عالم خلقت کے نظم و ترتیب کے درہم برہم ہو کر ایک نئے عالم کی جگہ لینے کے معنوں میں ہے۔

۲۔ وہ ہر روز ایک نئی چیز کی تخلیق کرتا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ (کل یوم ھو فی شأن) والی آیت اُمید آفریں بھی ہے اور غرور شکن بھی نیز یہ استمرار آفرینش و دوام خلقت کی نشانی بھی ہے اسی وجہ سے بعض اوقات پیشوایان اسلام افراد بشر کو اُمید دلانے کے لیے خصوصیت کے ساتھ اس آیت پر انحصار کرتے ہیں جیسا کہ حضرت ابوذر کی "ربذہ" کی طرف جلاوطنی کے واقعہ میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت علیؑ نے بہت ہی گہرے اور پراز معانی جملوں کے ساتھ حضرت ابوذر کی مشایعت کے موقع پر ان کی دلداری کی اور انہیں تسلی دی۔ اس کے بعد امام حسنؑ فرزند رشید امیر المومنین نے حضرت ابوذر کو چچا کہہ کر کچھ جملے فرمائے۔ اس کے بعد شہیدوں کے سالار حضرت امام حسین علیہ السلام نے لب کشائی کی اور فرمایا: یاعماہ ان اللہ تعالیٰ قادر ان یغیر ما قد تری اللہ کل یوم ھو فی شأن وقد منعك القوم دنیا ھم ومنعتھم دینك ..... فاسئل اللہ الصبر والنصر۔ چچا جان! خداوند متعال قادر ہے کہ ان حالات کو بدل دے اس کی ہر روز ایک نئی شان ہے۔ انہوں نے آپ کو اپنی دنیا میں مزاحم دیکھا اور آپ کو روک دیا۔ آپ نے انہیں اپنے دین میں مداخلت کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے انہیں روکا۔ خدا سے نصرت اور صبر و شکیبائی کی دُعا کیجیے۔[4]

ہمیں تاریخ میں ملتا ہے کہ امام حسینؑ جس وقت کربلا کی طرف آرہے تھے تو جب آپ صفاح نامی منزل پر پہنچے تو فرزدق نامی شاعر نے آپ سے ملاقات کی امامؑ نے فرمایا: بین لی خبر الناس من خلفك۔ "مجھے بتاؤ کہ لوگوں کو تم نے کس حال میں چھوڑا ہے۔" (عراق کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے)۔ فرزدق نے عرض کیا: (الخبیر سئلت قلوب الناس معك و سیوفھم مع بنی امیہ والقضاء ینزل من السماء واللہ یفعل مایشاء)۔ "آپ نے ایک آگاہ شخص سے سوال کیا۔ لوگوں کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں بنی اُمیہ کے ساتھ ہیں۔ البتہ فرمان الٰہی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور خدا، جو اس کی مصلحت ہوتی ہے اور ارادہ کرتا ہے، اسے انجام دیتا ہے۔" اس پر امام حسینؑ نے فرمایا:

---

[1] (مومنون - ۱۰۰)

[2] (یٰسین - ۵۱)

[3] (یٰسین - ۷۹)

[4] الغدیر جلد ۸، صفحہ ۳۰۱۔

(صدقت للہ الامر یفعل ما یشاء وکل یوم ربنا فی شأن)

"تُو نے سچ کہا۔ خُدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور ہمارے پروردگار کی ہرروز نئی شان ہے اور اس کا نیا کام ہے۔" [1]

یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت مومنین کے لیے حوصلہ افزا آیت ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک امیر نے اپنے وزیر سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں سوال کیا لیکن اس نے بے خبری کا اظہار کیا اور دوسرے دن تک مہلت مانگی۔ وزیر جس وقت مایوسی کی حالت میں اپنے گھر پہنچا تو اس کے ایک غلام نے جو صاحب معرفت تھا پوچھا: کیا بات ہے؟ وزیر نے سارا ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا آپ امیر کے پاس جائیں اگر وہ اجازت دے تو میں اس کی تفسیر اُس کے سامنے پیش کروں گا۔ بہرحال امیر نے اس غلام کو طلب کیا اور اس سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا: "اے امیر شأنہ یولج الّیل فی النھار و یولج النھار فی الّیل و یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی ولیشفی سقیماً و یسقم سلیماً و یبتلی معافاً و یعافی مبتلی و یعز ذلیلاً و یذل عزیزاً و یفقر غنیاً و یغنی فقیراً۔" خدا کی شان یہ ہے کہ دن اور رات کو ایک دوسرے کے بعد لاتا اور لے جاتا ہے، مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے، بیمار کو شفا دیتا ہے، صحیح سالم کو بیمار کرتا ہے، تندرست کو مبتلا کرتا ہے، مبتلا کو عافیت بخشتا ہے، ذلیل کو عزت دیتا ہے، عزت دار کو ذلیل کرتا ہے، دولت مند کو فقیر بناتا ہے اور فقیر کو دولت مند بناتا ہے"۔ امیر نے کہا: فرجت عنی فرج اللہ عنک "تُو نے میری مشکل حل کی خدا تیری مشکل حل کرے گا"۔ اس کے بعد اس غلام کو انعام و اکرام سے نوازا۔ [2]

۳۔ حرکتِ جوہری:

"حرکتِ جوہری" کے بعض طرفداروں نے قرآن کی چند آیتوں سے استدلال کیا ہے، یا کم از کم اُسے اپنے مقصود کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ایک یہ آیت بھی ہے۔ (کل یوم ھو فی شأن) اس کی وضاحت یہ ہے:۔ قدیم فلسفیوں کا نظریہ یہ تھا کہ حرکت صرف چار عرضی مقولوں میں ممکن ہے (مقولہ این، کم، کیف اور وضع) زیادہ آسان اور سادہ مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ایک جسم، مکان کے لحاظ سے، تغیر کرے یا اس طرح اس کی نشوونما ہو کہ اس جسم کی مقدار میں اضافہ ہو جائے یا اس کے رنگ و بُو اور ذائقہ میں تبدیلی پیدا ہو جائے (مثلاً ایک سیب کے جو درخت پر لگا ہوا ہے)۔ یا اپنی جگہ پر اپنے گرد گردش کرے (زمین کی حرکتِ وضعی کی طرح)۔ لیکن ان کا نظریہ یہ تھا کہ جسم کا جوہر اور اس کی ذات میں حرکت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کیونکہ حرکت میں ذاتِ متحرک کو ثابت و برقرار ہونا چاہیئے۔ اس کے محض عوارض دگرگوں ہوں۔ بصورتِ دیگر حرکت کا کوئی مفہوم نہ ہوگا۔ لیکن فلاسفۂ متاخرین نے اس نظریہ کو رد کیا ہے اور وہ حرکتِ جوہری کے معترف ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ حرکت کی اساس اور بُنیاد خود جوہر میں ہے جس کے آثار عوارض میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلا شخص جس نے اس نظریہ کو معقول شکل میں پیش کیا۔ "ملا صدرائے شیرازی" تھا اس نے

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۴۰

[2] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۳۷

کہا کہ تمام ذراتِ کائنات اور دُنیا مادۂ حرکت کا ایک مجموعہ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں اجسام کا مادہ ایک سیال وجود ہے جس کی ذات ہمیشہ متغیر ہوتی رہتی ہے اور اس کا ہر لمحے ایک نیا وجود ہے جو قبل کے لمحے سے مختلف ہے۔ لیکن چونکہ یہ تبدیلیاں ایک دوسرے سے متصل ہوتی ہیں اس لیے ایک ہی شے شمار کی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کی بنا پر ہم ہر روز ایک نیا وجود ہیں لیکن یہ وجود متصل و مستمر ہیں اور ایک ہی صُورت رکھتے ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں مادہ چار جہتیں رکھتا ہے۔ طول، عرض، عمق اور بُعد۔ یہ بُعد وہ ہے جسے زمان کا نام دیتے ہیں اور یہ زمان جوہری حرکت کے علاوہ دوسری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ غور کیجئے۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حرکتِ جوہری ایٹموں کی اندرونی حرکت کے مسئلہ سے ارتباط نہیں رکھتی۔ کیونکہ وہ حرکت مکان میں ہے اور عرضی حرکت ہے۔ حرکتِ جوہری ایک زیادہ عمیق اور گہرا مفہوم رکھتی ہے کہ جو جسم کی ذات اور اس کی انفرادیت پر حاوی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں متحرک عینِ حرکت ہو جاتا ہے اور چیزیں خود اپنے داخل ہونے کی جگہ بن جاتی ہیں۔ غور کیجئے۔

ان کے پاس اس مقصد کے اثبات کے لیے مختلف دلائل ہیں جن کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن یہ امر معیوب نہیں ہے کہ ہم یہاں اس فلسفیانہ عقیدہ کے نتیجے کی طرف اشارہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خدا شناسی کے مسئلہ کا ہر گزشتہ لمحے سے زیادہ واضح طور پر ادراک کریں کیونکہ خلقت اور آفرینش صرف دنیا کے آغاز ہی میں نہیں تھی بلکہ ہر ساعت اور ہر لمحے اس کا آغاز ہے اور خدا ہمیشہ نئی خلقت و آفرینش میں مصروف ہے اور ہم ہر وقت اس سے وابستہ اور اس کے فیضِ ذات سے مستفیض ہیں۔ انہوں نے: (کل یوم ھوفی شأن) کی تفسیر انہی معانی میں کی ہے البتہ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی آیت کے وسیع مفہوم کا ایک جز ہو۔

❖ ❖ ❖

۳۱۔ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ ○

۳۲۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۳۳۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ
اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ ○

۳۴۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۳۵۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ڏ وَّنُحَاسٌ
فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ ○

۳۶۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

ترجمہ

۳۱۔ اے گروہِ جن و انس عنقریب ہم تمہارا احتساب کریں گے۔

۳۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۳۔ اگر تم سے ہو سکے تو زمین و آسمان کی سرحدوں سے نکل جاؤ مگر تم ہرگز قدرت نہیں رکھتے مگر سوائے (خدائی) قوت کے ساتھ۔

۳۴۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۳۵۔ وہ دُھویں سے خالی آگ کے اور متراکم دُھویں والی آگ کے شعلے تمہاری طرف بھیجے گا
اور تم کسی سے مدد طلب نہیں کر سکو گے ۔

۳۶۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

اگر قُدرت رکھتے ہو تو آسمانوں کی سَرحدوں سے آگے نکل جاؤ

جو نعمتیں اَب تک اس سورہ میں پیش کی گئی ہیں وہ اسی دُنیا سے تعلق رکھتی تھیں لیکن زیرِ بحث آیتوں میں قیامت کے حساب کتاب اور معاد کی بعض دوسری ضرورتوں کے بارے میں گفتگو ہے جو مُجرموں کے لیے تہدید ہے اور مومنین کے لیے نہ صرف تربیت آگاہی اور بیداری کا وسیلہ ہے بلکہ تشویق و حوصلہ افزائی کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی بنا پر یہ نعمت شمار ہوتی ہے۔ اس لیے ہر ایک کے بیان کے بعد، اسی سوال کی کہ جو نعمتوں کے بارے میں ہے، پروردگارِ عالم تکرار کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے :

"اے جن و اِنس ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے"۔ (سنفرغ لکم ایه الثقلان)[۱، ۲]

جی ہاں اس دن خداوندِ قادر جن و اِنس کے تمام اعمال، گفتار اور نیتوں کا نہایت باریک بینی سے حساب کرے گا اور ان کے لیے مناسب جزاو سزا تجویز کرے گا۔ خدا جس وقت کسی چیز میں مصروف ہو تو دوسری چیزوں سے غافل نہیں ہوتا اور ہر آن واحد میں تمام کائنات پر علمی احاطہ رکھتا ہے اور کبھی بھی کوئی چیز اسے دوسری چیز سے غافل نہیں کرتی۔ (لا یشغله شأن عن شأن) لیکن اس کے باوجود "سنفرغ" کے الفاظ جاذبِ توجہ ہیں کیونکہ گفتگو کی یہ صُورتِ حال وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں ایک شخص اپنے تمام کام چھوڑ دیتا ہے تاکہ پوری تن دہی اور ہوش و حواس سے اس کام کو انجام دے۔ لیکن یہ چیز صرف مخلوقات کے بارے میں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی محدودیت کی بنا پر جب ایک چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو دوسری چیز سے غافل ہو جاتی ہیں۔ خدا کے بارے میں اس تعبیر کا استعمال حساب و کتاب کی تحقیق و تفتیش کے معاملہ میں تاکید کے علاوہ کچھ اور معانی نہیں رکھتا۔ ذرہ برابر کوئی شے اس کے قلم

۱۔ توجہ کرنی چاہیئے کہ قرآن مجید کے قدیم رسم الخط میں چند موارد میں "ایھا" ایہ کی صورت میں لکھا ہوا ہے کہ جو زیرِ بحث آیت اور دو دوسری (سورہ نور کی آیت ۳۱ اور زخرف کی آیت ۴۹) آیتوں میں ہے جب کہ دوسری آیتوں میں ایھا کا رسم الخط آخری کشیدہ الف کے ساتھ تحریر ہوا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ قدیم رسم الخط کے ضابطہ اور بنیاد پر تھا۔

۲۔ باوجودیکہ "الثقلان" تثنیہ ہے لیکن لکم میں ضمیر جمع کی آئی ہے اس بنا پر کہ دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔

انصاف کی زد سے نہیں بچے گی ۔کس قدر عجیب بات ہے کہ خداوند بزرگ و عظیم اپنے حقیر بندوں کا حساب و کتاب اپنے ذمے لے اور کس قدر وحشت ناک اور ہولناک ہے اس قسم کی جانچ پڑتال اور محاسبہ۔

"ثقلان" کا مادہ "ثقل" (بروزن کبر) ہے جس کے معنی بار سنگین کے ہیں۔ یہ وزن کے معنی میں بھی آتا ہے باقی رہا "ثقل" (بروزن خبر) عام طور پر یہ لفظ مال و متاع اور مسافر کے سامان کے لیے بولا جاتا ہے ۔جن و انس کے گروہ پر اس کا اطلاق ان کی معنوی سنگینی کی بنا پر ہے۔ کیونکہ خدا نے انہیں عقل و شعور اور علم و آگہی کے لحاظ سے مخصوص وزن اور قدر عطا کی ہے۔ جسمانی طور پر بھی مجموعی حیثیت سے قابلِ ملاحظہ سنگینی کے حامل ہیں۔ اسی لیے سورہ "زلزال" کی آیت ۲ میں ہم دیکھتے ہیں۔ واخرجت الارض اثقالها ۔ جس کے ایک معنی قیامت کے دن انسانوں کا قبروں سے خروج ہے لیکن بہرحال زیرِ بحث آیت کا یہ مفہوم زیادہ تر جنبۂ معنوی رکھتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ گروہ جن کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص وزنی جسم نہیں رکھتے ۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دو گروہوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ وہ عمدہ گروہ جو تکلیف شرعی سے مکلف ہیں یہی وہ دونوں ہیں۔ اس مفہوم کو بیان کرنے کے بعد دوبارہ اس سوال کی تکرار کرتا ہے! "تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے": (فبای الآء ربکما تکذبان)۔

گزشتہ آیت کہ جو خدا کی طرف سے کیے جانے والے احتساب کے مسئلہ کو پیش کرتی ہے اس کے بعد پروردگارِ عالم ایک مرتبہ جن و انس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم چاہو کہ خدا کی طرف سے دی جانے والی سزا سے بچ سکو تو اگر ایسی قوت رکھتے ہو تو آسمان اور زمین کی سرحدوں سے نکل جاؤ اور خدا کے احاطۂ قدرت سے باہر ہو جاؤ لیکن تم اس کام پر ہرگز قادر نہیں ہو سوائے اس کے کہ خدائی قوت و طاقت تمہیں حاصل ہو اور یہ خدائی قوت تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ (یا معشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوات والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطان)۔ اس طرح تم ہرگز خدا کی عدالت، انصاف اور اس کے حکم سے صادر شدہ سزاؤں سے فرار کی قدرت و توانائی نہیں رکھتے۔ جہاں کہیں جاؤ گے خدا کا ملک ملے گا اور جہاں کہیں رہو گے وہ اس کی حکومت کا مقام ہے۔ جی ہاں یہ ضعیف و ناتواں مخلوق قدرت خدا کے میدان سے بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے۔ حضرت امیر المومنین علیؑ دعائے کمیل میں فرماتے ہیں: ولا یمکن الفرار من حکومتک ۔ "معشر" "عشر" سے لیا گیا ہے جس کے معنی "دس" ہیں۔ چونکہ دس کا عدد ایک کامل عدد ہے اس لیے لفظ "معشر" ایک مکمل جمعیت کے لیے بولا جاتا ہے کہ جو مختلف صنفوں اور گروہوں سے تشکیل پائے۔ "اقطار" "قطر" کی جمع ہے۔ یہ کسی چیز کے اطراف کے معنی میں ہے۔ "تنفذوا" کا مادہ "نفوذ" ہے جس کے معنی کسی چیز کو ٹکڑے کرنے کے بعد اس کو عبور کر جانے کے ہیں اور "من اقطار" کے الفاظ اس طرف اشارہ ہیں کہ آسمانوں کے اطراف و جوانب کو چیر کر ان سے نکل جاؤ اور ان کے باہر سفر کرو۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ "جن" کو جو مقدم کیا گیا ہے ہو سکتا ہو کہ وہ اس بنا پر ہو کہ وہ آسمانوں کی سیر پر زیادہ آمادہ رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت، قیامت کے ساتھ مربوط ہے یا دنیا سے، مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ چونکہ اس کے قبل و بعد کی آیتیں دارِ آخرت کی روداد سے متعلق ہیں لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی قیامت میں عدالتِ الٰہی کے چنگل سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے متعلق ہے لیکن "لا تنفذون الا بسلطان" "تم نہیں گزر سکتے مگر قوت کے ساتھ" کو نظر میں رکھ کر بعض مفسرین

اسے انسانی ہوائی سفروں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن نے علمی وصنعتی تسلط کو اس کی شرط قرار دیا ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ قیامت کی طرف بھی نظر ہے اور دُنیا کی طرف بھی یعنی تم نہ یہاں قدرت رکھتے ہو کہ قدرتِ الٰہی کے بغیر اطرافِ آسمان میں نفوذ کر جاؤ اور نہ آخرت میں۔ البتہ دنیا میں محدود وسیلہ اور ذریعہ تمہارے اختیار میں ہے لیکن وہاں تو کوئی بھی ذریعہ یا وسیلہ نہ ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس کی ایک چوتھی تفسیر بھی کی ہے کہ آسمان کے اطراف میں نفوذ سے مراد فکری وعلمی نفوذ ہے کہ جو استدلال کی قوت کی وجہ سے انسان کے لیے ممکن ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ بعض اخبار وروایات اس کی تائید بھی کرتے ہیں جو منابع اسلامی میں مندرج ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن خدا تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع کرے گا اور آسمانِ اوّل کے فرشتوں کو حکم دے گا کہ نیچے اُتر آؤ۔ وہ فرشتے جو روئے زمین پر بسنے والے جن وانس سے تعداد میں دو گنے ہیں نیچے اُتر آئیں گے۔ اس کے بعد دوسرے آسمان کے فرشتے بھی کہ جو اتنی ہی تعداد میں ہیں نیچے اُتر آئیں گے۔ اس طرح سات کے سات آسمانوں کے فرشتے اُتر آئیں گے اور سات پردوں کی مانند جن وانس کا چاروں طرف سے احاطہ کرلیں گے۔ یہ وہ مقام ہے کہ منادی ندا دے گا کہ اے جن وانس کی جمعیت اگر ہوسکتا ہو تو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے نکل جاؤ۔ تم قدرتِ الٰہی کے بغیر ہرگز نہیں نکل سکتے۔ اور تم یہاں دیکھ رہے ہو کہ ان اطراف کو فرشتوں کے سات عظیم گروہوں نے گھیر رکھا ہے۔ (اب عدالت کے شکنجے سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے)۔[1]

مختلف تفسیروں کے معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ یہاں پھر دونوں گروہوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤگے": (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ یہ ٹھیک ہے کہ مذکورہ بالا تہدید بظاہر سزا و عذاب الٰہی کے سلسلہ کی بات ہے لیکن چونکہ اس کا ذکر تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے اور اصلاح وتربیت کا سبب ہے، لہٰذا قدرتی طور پر نعمت ہے۔ بنیادی طور پر حساب وکتاب کا وجود کسی بھی نظام میں ایک نعمت ہی ہے کیونکہ اس کی بنا پر سب کا حساب کتاب ہوگا۔

اس کے بعد والی آیت جن وانس کے عدالتِ الٰہی کے شکنجے سے فرار کے سلسلہ میں اور ان کے عدم اختیار کے بارے میں جو کچھ قبل کی آیت میں آیا تھا، اس کی تاکید کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "بغیر دھوئیں کی آگ اور بہت سا تہ بہ تہ دھواں تمہاری طرف بھیجے گا: (اور اس طرح سے تمہیں ہر طرف سے گھیر لے گا کہ کوئی راہ فرار نہیں ہوگی)۔ اس وقت تم کسی سے مدد طلب نہیں کرسکوگے۔ (یرسل علیکما شواظ من نار ونحاس فلا تنتصران)۔ ایک طرف تمہارا فرشتوں نے احاطہ کر رکھا ہے اور دُوسری طرف آگ کے گرم اور جلانے والے شعلوں اور تیرہ وتار دَم گھونٹنے والے دھوئیں نے اطرافِ محشر کو گھیرا ہُوا ہے اور بھاگنے کے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔ "شواظ" "راغب کی مفردات" اور "ابن منظور" کی "لسان العرب" اور دُوسرے مفسرین کے مطابق بغیر دُھوئیں والی آگ کے شعلوں کے معنی میں ہے اور بعض نے آگ کے ان شعلوں کو اس کے معنی بتایا ہے کہ جو بظاہر خود آگ سے الگ ہوجائیں گے اور سبز رنگ کے ہوں گے۔ بہرکیف اس تعبیر میں آگ کی شدّتِ حرارت کی طرف اشارہ ہے۔

"نحاس" کے معنی دُھواں ہے۔ (سُرخ شعلوں اور دُھوئیں سے پُر آگ)۔ کہ جو تانبے کا رنگ اختیار کرے گی۔

---

[1] تفسیر صافی ص ۵۱۷، تفسیر مجمع البیان ج ۹ ص ۲۰۵

بعض نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگی۔ یہ معنی بظاہر زیر بحث آیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے کیونکہ گفتگو ایسے موجود کے بارے میں ہے کہ جو قیامت میں انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور اسے عدالتِ الٰہی سے فرار سے روکے۔

قیامت کی عدالتِ انصاف کتنی عجیب ہے۔ اس وقت انسان جلانے والی آگ اور دم گھونٹنے والے دھویں اور منجانب اللہ مامور فرشتوں کے حصار میں ہوگا اور اس کے لیے اس عدالت کے حکم کے ماننے کے علاوہ کوئی جادۂ گریز نہیں ہوگا پھر ایک مرتبہ فرماتا ہے: اے گروہِ جن و انس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ یہاں بھی ان آیات کو مبنی بر نعمت کہنا اسی استدلال کی بنا پر ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔

❖ ❖ ❖

۳۷۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ

۳۸۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۳۹۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ

۴۰۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۴۱۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ
وَالْاَقْدَامِ ۚ

۴۲۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○

۴۳۔ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۘ

۴۴۔ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ

۴۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۧ

ترجمہ

۳۷۔ جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور پگھلے ہوئے روغن کی طرح گلگوں ہو جائے گا
(تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جس کے تحمل کی تم میں تاب نہیں ہوگی)۔

۳۸۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۳۹۔ اس دن جن و انس میں سے کسی سے اس کے گناہوں کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

۴۰۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۱۔ بلکہ مجرمین اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ اس وقت ان کے سر کے اگلے بال اور پاؤں پکڑ لیے جائیں گے (اور وہ دوزخ میں پھینک دیے جائیں گے)۔

۴۲۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۳۔ یہ وہی دوزخ ہے کہ مجرم جس کا انکار کرتے تھے۔

۴۴۔ آج دوزخ اور اس جلانے والے پانی کے درمیان وہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔

۴۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے

گزشتہ آیتوں کے تتبع میں کہ جو قیامت کے بعض حوادث کو بیان کرتی تھیں یہ آیتیں بھی اسی طرح اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے قیامت کے منظر کی کچھ خصوصیات اور حساب و کتاب کی کیفیت اور عذاب و سزا کے بیان پر مبنی ہیں۔ پروردگارِ عالم پہلے فرماتا ہے: "جس وقت کہ آسمان شگافتہ ہو کر پگھلے ہوئے روغن کی طرح گلگون ہو جائے تو ہولناک حوادث واقع ہوں گے جن کے تحمل کی کسی میں طاقت نہیں ہوگی"۔ (فاذا انشقت السماء فکانت وردة کالدھان)[1]

قیامت سے تعلق رکھنے والی تمام آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن دنیا کا موجودہ نظام کلی طور پر درہم و برہم ہو جائے گا اور دنیا میں بہت ہی ہولناک حوادث رونما ہوں گے۔ ستارے، سیارے، زمین آسمان سب تلپٹ ہو جائیں گے اور وہ مسائل کہ جن کا تصور آج ہمارے لیے مشکل ہے، درپیش ہوں گے۔ منجملہ ان مسائل کے کہ جو مذکورہ بالا آیات میں کہے گئے ہیں یہ ہے کہ آسمانی کُرّے

[1] یہ کہ "اذا" اس جملہ میں شرطیہ ہے یا فجائیہ یا ظرفیہ کئی ایک احتمال دیے گئے ہیں بہتر یہی پہلا احتمال ہے اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تقدیرِ عبارت اس طرح ہو فاذا انشقت السماء فکانت وردة کالدھان کان اھوال لا یطیقھا البیان جب آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے تیل کی طرح ہوگا تو ایسے خوفناک منظر ہوں گے کہ جو بیان نہیں ہو سکتے۔

شق ہو جائیں گے اور سُرخ رنگ کے روغن کی طرح پگھلی ہوئی شکل اختیار کر لیں گے۔ "وردۃ" اور "ورد" کے معنی پھول ہیں اور چونکہ پھول عام طور پر سُرخ رنگ کے ہوتے ہیں لہذا یہاں سُرخ رنگ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ سُرخ گھوڑوں کے لیے بھی آیا ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کے گھوڑے مختلف موسموں میں اپنا رنگ بدل لیتے ہیں۔ فصلِ بہار میں وہ زردی مائل ہو جاتے ہیں اور سردی کے موسم میں سُرخ رنگ کے اور زیادہ سردی پڑے تو سیاہ رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ لہذا وہ تبدیلیاں جو قیامت کے دن آسمان میں واقع ہوں گی، ان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ کبھی آسمان آگ کے شعلوں کی طرح سُرخ و سوزاں کبھی زرد کبھی دھویں سے آلودہ سیاہ ہوگا۔ "دھان" (بروزن کتاب) پگھلے ہوئے روغن کو کہتے ہیں۔ کبھی اس تلچھٹ کے لیے آتا ہے جو روغن میں تہ نشیں ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تشبیہ اس وجہ سے ہو کہ آسمان کا رنگ پگھلے ہوئے روغن کی شکل میں سُرخ نکل آئے گا یا پھر اس سے آسمانی کُرّوں کے پگھل جانے کی طرف اشارہ ہے یا اس کے مختلف رنگوں کی طرف۔ بعض مفسرین نے "دھان" کی سُرخ رنگ کے چمڑے سے بھی تفسیر کی ہے۔ بہرصُورت یہ تمام تشبیہات اس ہولناک منظر کا صرف ایک ہیولا پیش کر سکتی ہیں کیونکہ وہ صورتِ حال دُنیا کے کسی واقعہ سے حقیقی مشابہت نہیں رکھتی اور وہ ایسے منظر ہیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھ نہ لے سمجھ نہیں سکتا۔ چونکہ میدانِ قیامت میں یا اس سے پہلے ان ہولناک حوادث کے وقوع کی خبر دینا مجرمین و مومنین کے لیے تنبیہ ہے، لہذا الطافِ الٰہی میں سے ایک لطف ہے۔ اسی بنا پر سابقہ جُملے کی تکرار ہوتی ہے اور پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے": (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس سے بعد کی آیت میں قیامت کے حوادث گوئی کی وجہ سے اس روز گنہگار انسان کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: اس دن جنّ و انس میں سے کسی شخص سے بھی اس کے گناہ کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ (فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان)۔

سوال کیوں نہیں ہوگا؟ اس لیے کہ ہر چیز اس دن واضح اور آشکار ہوگی۔ وہ یوم البروز ہے۔ ہر انسان کے اعمال اس کے چہرے سے ظاہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی یہ سوچے کہ یہ آیت ان آیتوں سے متصادم ہے جو قیامت میں بندوں کے سوال کے مسئلہ پر تاکید کرتی ہیں مثلاً سورہ صافات کی آیت ۲۴ (وقفوھم انھم مسئولون) انہیں روکو تاکہ ان سے سوال کیا جاسکے؛ اور سُورہ حجر کی آیت ۹۲، ۹۳ (فوربک لنسئلنھم اجمعین عما کانوا یعملون) "تیرے پروردگار کی قسم ان سب سے سوال کریں گے ان کاموں کے متعلق کہ جنہیں وہ انجام دیتے تھے"۔ لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ قیامت ایک بہت طویل دن ہے اور انسان کو متعدد مواقف اور گزرگاہوں میں سے گزرنا ہے اور ہر منظر و موقف میں ایک مُدت تک ٹھہرنا ہے۔ بعض روایات کے مطابق پچاس مواقف ہیں۔ ان میں سے بعض موقفوں میں بالکل سوال نہیں ہوگا بلکہ رخسار کا رنگ اندرونی کیفیت کا پتہ دے گا، جیسا کہ اس سے بعد والی آیت میں آئے گا۔ بعض مواقف میں انسان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضائے بدن شہادت دینے کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔[۱]

اور بعض مواقف میں انسانوں سے نہایت باریک بینی کے ساتھ سوال ہوں گے۔[۲]

۱۔ سورہ یٰسین - ۶۵

۲۔ مثلاً آیت زیرِ بحث اور دو وہ آیتیں جن کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔

بعض دُوسرے مواقف میں انسان اپنے دفاع کے لیے لڑائی جھگڑا کرنے لگیں گے[1]

خلاصہ یہ کہ ہر منظر کے کچھ تقاضے ہیں اور ہر منظر دُوسرے منظر سے زیادہ خوفناک ہے۔ پھر اس کے تتبع میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔ جی ہاں اس دن سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ مجرم اپنی علامتوں سے پہچانے جائیں گے۔ (یعرف المجرمون بسیماھم)۔[2]

ایک گروہ ایسا ہوگا کہ جن کے چہرے نورانی اور درخشاں ہوں گے جو ان کے ایمان و عمل صالح پر دلالت کرتے ہوں گے دُوسرا گروہ سیاہ، تاریک اور قبیح چہروں والا ہوگا جو ان کے کفر اور گناہ کی علامتیں ہیں جیسا کہ سورہ " عبس " کی آیت ۳۸ تا ۴۱ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ و وجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ) اس دن نورانی اور درخشاں چہرے بھی ہوں گے اور تاریک چہرے بھی کہ جنہیں خاص قسم کی سیاہی نے گھیر رکھا ہوگا۔ اس کے بعد فرماتا ہے : " اس کے بعد سر کے آگے کے بال اور پاؤں پکڑے جائیں گے اور انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (فیؤخذ بالنواصی والاقدام)۔ " نواصی" " ناصیہ " کی جمع ہے جیسا کہ " راغب مفردات میں کہتا ہے کہ ناصیہ اصل میں سر کے آگے کے بالوں کے معنی میں ہے۔ اس کا مادّہ " نصأ" (بروزن نصر) ہے جس کے معنی اتصال و پیوستگی کے ہیں اور " اخذ بہ ناصیہ " سر کے اگلے بالوں کے پکڑنے کے معنی میں ہے اور کبھی کسی چیز پر مکمل قبضہ کے کنایے کے طور پر بھی آتا ہے۔ " اقدام " جمع ہے "قدم " کی جس کے معنی پاؤں ہے۔ مجرموں کے سروں کے اگلے بالوں اور ان کے پاؤں کا پکڑنا ہو سکتا ہے کہ حقیقی معانی کے اعتبار سے ہو کہ مامورین من اللہ ان دو چیزوں کو پکڑ کر زمین سے اٹھا کر نہایت ذلّت و خواری کے ساتھ دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یا یہ مجرمین کے انتہائی ضعف و ناتوانی کے ساتھ مامورین من اللہ کی گرفت میں آنے کا کنایہ ہے کیونکہ وہ مجرمین کے اس گروہ کو انتہائی ذلّت سے جہنم کی طرف لے جائیں گے اور وہ منظر کیا ہی دردناک اور وحشت ناک ہوگا۔

چونکہ معاد کے سلسلہ میں ان چیزوں کا یاد دلانا تنبیہ ہونے کی وجہ سے سب کے لیے ایک نوازش ہے، لہٰذا سب کو مخاطب کر کے مزید کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے : " یہ وہی دوزخ ہے کہ جس کا مجرم ہمیشہ انکار کرتے ہیں"۔ (ھٰذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون)۔ چونکہ مخاطب محشر میں موجود ہوں گے اور قیامت میں ان سے یہ بات کہی جائے گی' یا مخاطب ذات پیغمبر ہے اور دُنیا میں اس سے کہا گیا ہے اس لیے مفسّرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں۔ لیکن آیت میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جو دوسرے معانی کو تقویت دیتے ہیں کیونکہ فعل مضارع " یکذب " کا استعمال اور جملہ غائب کا مجرموں کے عنوان سے استفادہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبرؐ سے کہتا ہے کہ یہ اوصاف اس دوزخ کے ہیں جس کا مجرمین ہمیشہ انکار کرتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ مخاطب تمام جن و انس ہیں کہ جنہیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ جہنم جس کا مجرم انکار کرتے ہیں وہ اس قسم کے اوصاف کا حامل ہے کہ جنہیں تم سُن رہے ہو۔ لہٰذا خبردار

---

[1] نحل - ۱۱۱

[2] " سیما " اصل میں علامت و نشانی کے معنی میں ہے اور ہر قسم کی علامت کہ جو ان کے چہرے یا بدن کے دوسرے حصّہ میں جو اس پر حاوی ہے لیکن چونکہ عام طور پر خوشحالی و بدحالی کی علامتیں چہرہ ہی پر نمایاں ہوتی ہیں لہٰذا اس لفظ کے بیان سے چہرہ ہی سامنے آتا ہے

رہو۔ تمہارا انجام تمہیں وہاں تک نہ لے جائے۔ دوبارہ جہنم کی تصریح اور اس کے دردناک عذاب کے سلسلہ میں مزید کہتا ہے:
"مجرم دوزخ اور جلانے والے پانی کے درمیان آمدورفت رکھتے ہیں"۔ (یطوفون بینها و بین حمیم اٰن)۔ "اٰن" اور "اٰنی" یہاں اس پانی کے معنوں میں ہے کہ جو کھولتا ہوا ہو اور اصل میں "انا" (بروزن رضا) کے مادہ سے وقت کے معنی دیتا ہے کیونکہ جلانے والا پانی اپنی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔ تو اس طرح ایک طرف تو جہنم کے جلانے والے شعلوں کے درمیان چلیں گے اور پیاسے ہوں گے اور پانی کی تمنا کریں گے دوسری طرف انہیں کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا (یا ان پر پھینکا جائے گا)۔ اور یہ دردناک سزا و عذاب ہے۔

بعض آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ "حمیم" نامی جلانے والا چشمہ جہنم کے قریب ہے کہ پہلے دوزخیوں کو ان میں لے جائیں گے اور پھر انہیں جہنم کی آگ میں پھینکیں گے۔ (یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون) (مؤمن ۷۱،۷۲) (یطوفون بینها و بین حمیم اٰن) کی تعبیر زیر بحث آیت میں انہی معنوں سے مناسبت رکھتی ہے۔ پھر اس شدید خطرے بیدار کرنے کی حالت کو اور اس تنبیہ کو جو بجائے خود ایک لطفِ پروردگار ہے، بیان کر کے کہتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

❖ ❖ ❖

۴۶۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ

۴۷۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۙ

۴۸۔ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۚ

۴۹۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۵۰۔ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۚ

۵۱۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۵۲۔ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ۚ

۵۳۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۵۴۔ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ
وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ۚ

۵۵۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۴۶۔ اور اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار سے ڈرے جنت کے دو باغ ہیں

۴۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۴۸۔ وہ جنّت کے ان دو باغوں میں انواع و اقسام کی نعمتیں اور طراوت رکھنے والے درخت رکھتے ہیں ۔

۴۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۰۔ ان میں مسلسل دو چشمے جاری ہیں ۔

۵۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۲۔ ان دونوں باغوں میں ہر پھل کی دو دو قسمیں موجود ہیں ۔

۵۳۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۵۴۔ یہ اس حالت میں ہے کہ وہ ایسے فرشوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں کہ جن کے استر ریشم کے ہیں اور ان دونوں باغوں کے پکے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہیں ۔

۵۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

یہ دونوں جنتین خائفین کے انتظار میں ہیں

ان آیتوں میں دوزخیوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر پروردگار عالم نے جنّتیوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے ۔ اس طرح اللہ نے جنت کی دلپذیر اور شوق انگیز نعمتوں کا شمار کرایا ہے تاکہ ان نعمتوں کا دوزخیوں پر نازل ہونے والے عذابوں اور سزاؤں سے موازنہ کرکے دونوں میں سے ہر ایک کی اہمیت کو واضح کرے ۔ وہ فرماتا ہے : " اس شخص کے لیے کہ جو اپنے پروردگار کے مرتبے سے خائف ہے جنت کے دو باغ ہیں :(ولمن خاف مقام ربہ جنّتان)۔" مقام پروردگار سے خوف :" اس سے مراد قیامت کے مختلف موقعوں میں قیام کا خوف ، حساب کی غرض سے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے کا خوف یا خدا کے اس علم اور دائمی نگہبانی کا خوف ہے جو وہ تمام انسانوں کے بارے میں رکھتا ہے[1]۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسری تفسیر اس بات سے مناسبت رکھتی ہے جو سورہ" رعد" کی آیت ۳۳ میں آئی ہے جہاں خدا فرماتا ہے:

(افمن ھو قائم علیٰ کل نفس بما کسبت) "کیا وہ جو سب کے سرہانے موجود ہے اور سب کے اعمال کا نگہبان و نگران ہے، اس شخص کی مانند ہے جو یہ صفتیں نہیں رکھتا"۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: من علم ان اللہ یراہ ویسمع مایقول ویعلم مایعملہ من خیر او شر فیحجزہ ذالک عن القبیح من الاعمال فذالک الذی خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ "جو شخص جانتا ہے کہ خدا اس کو دیکھتا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے وہ سنتا ہے اور خیر و شر میں سے جو کچھ یہ انجام دیتا ہے اُسے وہ جانتا ہے اور یہ توجہ اس انسان کو اعمال قبیح سے روکتی ہے تو یہی وہ شخص ہے جو اپنے رب کے مقام سے خائف ہے اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس سے باز رکھا ہے۔" [2]

ایک تیسری تفسیر اور بھی ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد صرف خدا کا خوف ہے نہ جہنم کی آگ کا، نہ نعمات جنت کے لالچ کی وجہ سے کوئی خوف ہے بلکہ صرف مقام پروردگار اور اس کے جلال کا خوف ہے۔

ایک چوتھی تفسیر بھی ہے کہ "مقام پروردگار" سے مراد عدالت الٰہی کا مقام ہے کیونکہ اس کی ذاتِ مقدس خوف کا باعث نہیں ہے بلکہ خوف اگر ہے تو اس کی عدالت سے ہے اور عدالت سے خوف کی بازگشت بھی خود انسان کے اپنے اعمال کی طرف ہے کیونکہ جس کا حساب پاک ہے اُسے محاسبہ سے کیا باک ہے۔ مجرم جس وقت عدالت یا زندان کے پاس سے گزرتے ہیں تو ڈرتے ہیں لیکن بے گناہ لوگوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہاں عدالت ہے یا کوئی اور جگہ۔ پروردگار سے خائف ہونے کے مختلف سرچشمے ہیں۔ کبھی تو اپنے ناپاک اعمال اور غلط افکار کی وجہ سے خوفِ خدا لاحق ہوتا ہے اور کبھی مقربین بارگاہِ الٰہی کے لیے، اس کے قُرب کی بنا پر، کبھی چھوٹا سا ترکِ اُولیٰ اور معمولی سی غفلت بھی خوفِ خُدا کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی ان سب سے ہٹ کر جب اس کی لامحدود ذات اور لامتناہی عظمت کا تصور کرتے ہیں تو اس کے مقابلے میں اپنی حقارت کا احساس کرنے . . . خوف طاری ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خوف ہے جو پروردگار کی انتہائی معرفت کے وقت حاصل ہوتا ہے اور اس کی بارگاہ کے مخصوص عارف اور مخلص فرد کو لاحق ہوتا ہے۔ یہ چاروں تفسیریں آپس میں تضاد نہیں رکھتیں اور یہ ممکن ہے کہ مفہوم آیت میں ان سب کا اجتماع ہو۔ باقی رہیں دو جنتیں (بہشت کے دو باغ) تو ہوسکتا ہے کہ پہلی بہشت مادی و جسمانی ہو اور دوسری بہشت معنوی و رُوحانی ہو۔ جیسا کہ سُورہ آل عمران کی آیت ۱۵ میں آیا ہے: للذین اتقوا عند ربھم جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا و ازواج مطھرۃ و رضوان من اللہ۔ اس آیت میں جسمانی جنت کے علاوہ، کہ جس کے درختوں کے نیچے سے نہریں گزرتی ہیں اور اس میں پاکیزہ بیویاں ہیں معنوی بہشت کہ جو خوشنودی خدا ہے اس کا بھی بیان ہے۔ یا یہ کہ پہلی جنت انہیں ان کی نیک اعمالی کے صلہ میں دی جائے گی اور دوسری بہشت

گزشتہ صفحے کا حاشیہ:

[1] پہلی صورت میں لفظ "مقام" اسم مکان ہے۔ دوسری صورت میں مصدر ہے۔ (حاشیہ صفحہ ہذا)

[2] "اصول کافی" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹۷۔ تشریح حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام نے یہ گفتگو سورہ نازعات کی آیت ۴۰ (واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ) کی تفسیر میں فرمائی اگرچہ دونوں آیات کا مفہوم ایک ہی ہے۔

بطور تفضل عطا کی جائے گی ۔ جیسا کہ سورہ نور کی آیت ۳۸ میں آیا ہے : لیجزیھم اللہ احسن ما عملوا و یزیدھم من فضلہ) مقصد یہ ہے کہ خدا ان کو ان کے بہترین اعمال کا اجر دے گا اور اپنے فضل کا اس پر اضافہ کرے گا ۔ یا یہ کہ ایک جنت اطاعت کی بنا پر اور دوسری معصیت کے ترک کرنے کی بنا پر ہے ۔ یا ایک ایمان و عقیدہ کی وجہ سے ہے اور دوسری اعمال صالح اور اسی قسم کے دوسرے امور کے صلہ میں ہے ۔ یا یہ کہ چونکہ مخاطب جن و انس ہیں تو ان دونوں جنتوں میں سے ہر ایک الگ گروہ سے تعلق رکھتی ہے ان تفاسیر میں سے کسی کے حق میں بھی کوئی خاص دلیل نہیں ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ آیت سے یہ سب کی سب تفسیریں مراد ہوں ۔ وہ چیز جو طے شدہ اور یقینی ہے کہ خدا جنت کے کئی باغات اپنے صالح بندوں کے اختیار میں دے گا جن میں ان کی آمد و رفت ہوگی اور دوزخی آگ اور جلانے والے پانی کے درمیان مقیم ہوں گے ۔ یہ تھے جنت کے دو باغ ۔ پھر اس عظیم نعمت کے بعد سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے " (فبای اٰلاء ربکما تکذبان) ۔

اس کے بعد ان دونوں بہشتوں کی تعریف و توصیف میں مزید ارشاد فرماتا ہے : وہ انواع و اقسام کی نعمتوں اور طراوت رکھنے والے شاخ دار درختوں کی حامل ہیں ۔ (ذواتا افنان) ۔ " ذواتا " " ذات " کا تثنیہ ہے جس کے معنی صاحب و حامل کے ہیں [1]

" افنان " جمع ہے " فنن " (بروزن قلم) کی ۔ یہ ترو تازہ شاخوں اور ٹہنیوں کے معنی میں ہے جن میں خوب پتے لگے ہوئے ہوں ، یہ لفظ بعض اوقات " نوع " کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور زیر بحث آیت میں اس بات کا امکان ہے کہ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہو ۔ پہلی صورت میں جنت کے درختوں کی طراوت رکھنے والی ترو تازہ شاخوں کی طرف اشارہ ہو برخلاف دنیا کے درختوں کی شاخوں کے کہ جو پرانی اور نئی دونوں قسم کی شاخوں کے حامل ہوتے ہیں ۔ دوسری صورت میں بہشت کی نعمتوں کے تنوع اور اس کی مختلف نعمتوں کی طرف اشارہ ہے ان دونوں معانی کے اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ جنت کے درخت اس قسم کے ہیں کہ ایک ہی درخت کی بہت سی شاخیں ہیں اور ہر شاخ پر مختلف قسم کے پھل ہیں ۔ اس نعمت کے بیان کے بعد پھر اسی سوال کی تکرار ہے کہ " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے " (فبای اٰلاء ربکما تکذبان) ۔

چونکہ ایک سرسبز ، پر مسرت اور طراوت رکھنے والے باغ میں درختوں کے علاوہ پانی کے چشمے بھی جاری ہونے چاہئیں لہٰذا بعد والی آیت میں کہتا ہے : " ان دو بہشتوں میں دو چشمے ہیں کہ جو ہمیشہ جاری رہتے ہیں " (فیھما عینان تجریان) ۔ پھر اس نعمت کے مقابلے میں وہی سوال کرتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے " (فبای اٰلاء ربکما تکذبان) ۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں ان دونوں چشموں کی کیفیت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہے صرف اس کے متعلق " نکرہ " کے عنوان کے ماتحت ایک تعبیر نظر آتی ہے کہ جو اس قسم کے مواقع پر عظمت و اہمیت کی دلیل ہے لیکن بعض مفسرین نے ان دو چشموں کو " سلسبیل " اور " تسنیم " نام کے دو چشمے جو بالترتیب سورہ " دھر " کی آیت ۱۸ اور " مطففین " کی آیت ۲۸ میں بیان کیے گئے ہیں بطور تفسیر پیش کیے ہیں کبھی کہا ہے کہ ان دونوں چشموں میں سے ایک شراب طہور اور دوسرا عسل مصفّیٰ کا ہے ۔ ان دونوں کا ذکر سورہ " محمّد " کی آیت ۱۵ میں ہے ۔

---

[1] بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق ذات کی اصل جو کہ مفرد مؤنث ہے " ذوات " تھی کہ جس کی واؤ تخفیف کی وجہ سے حذف ہوگئی اور ذات کی شکل میں رہ گئی ، چونکہ تثنیہ الفاظ کو ان کی اصل کی طرف پلٹا دیتا ہے تو یہاں ذواتان ہوگیا ہے اور اضافت کی وجہ سے اس کا نون حذف ہوگیا ہے ۔ مجمع البحرین میں آیا ہے کہ " ذو " بروزن عصا تھی تو اس بنا پر تعجب کی بات نہیں کہ اس کی مؤنث ذوات ہو ۔

اور اگر ہم "جنتان" کی تفسیر گزشتہ آیتوں میں موجود معنوی اور مادّی جنتوں کے اعتبار سے کریں تو قدرتاً یہ دونوں چشمے بھی ایک معنوی (چشمہ معرفت) اور دوسرا مادّی چشمہ (آبِ زلال، دُودھ، شرابِ طہور یا شہد کا) ہوگا۔ لیکن ان تفسیروں کے لیے ہمارے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں جب گفتگو بہشتی باغوں کے پھلوں میووں تک پہنچ جاتی ہے تو فرماتا ہے: "ان میں ہر ایک پھل کی دو قسمیں موجود ہیں": (فیھما من کل فاکھۃ زوجان)۔ ایک وہ قسم جس کا نمونہ دنیا میں انہوں نے دیکھا ہے اور دوسری وہ قسم جس کی مثل و نظیر اس دنیا میں ہرگز نہیں دیکھی۔ بعض مفسرین دو قسم کی تفسیر گرمی اور سردی کے پھلوں، خشک و تر یا چھوٹے بڑے پھلوں کے اعتبار سے کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ اتنی بات طے شدہ ہے کہ جنت کے پھل مکمل طور پر متنوع اور گوناں گوں ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ پُرکشش اور عمدہ ہے۔ اس کے بعد، پروردگارِ عالم پھر فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے": (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔

گزشتہ آیتوں میں جنت کے ان دونوں باغوں کی خصوصیات کے تین حصے بیان ہوئے ہیں۔ اب ہم اس کی چوتھی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "یہ اس حالت میں ہیں کہ جنتی فرش پر بیٹھے ہیں اور تکیے لگائے ہوئے ہیں کہ جن کے استر ریشم اور استبرق کے ہیں": (متکئین علیٰ فرش بطائنھا من استبرق)۔[1]

عام طور پر انسان تکیہ اس وقت لگاتا ہے کہ جب انتہائی آرام دہ اور امن کے ماحول میں ہو۔ یہ تعبیر بہشتیوں کی رُوح کی مکمل تسکین و آرام کی نشان دہی کرتی ہے۔ "فرش" (بروزن شتر) جمع اس کی "فراش" ہے جس کے معنی ہیں ایسے فرش جو بچھائے جاتے ہیں۔ "بطائن" جمع ہے "بطانہ" کی جس کے معنی استر کے ہیں اور استبرق موٹے اور ضخیم ریشم کے معنوں میں ہے۔ قابلِ توجہ اور پُرکشش بات یہ ہے کہ یہاں بہت قیمتی پارچہ جس کا دنیا میں تصور ہو سکتا ہے اس کا اُن فرشوں کے استر کے طور پر ذکر ہوا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اُوپر والا حصہ ایسی چیز ہے کہ جس کی لطافت و زیبائی اور جاذبیت تعریف و توصیف سے ماورا ہے۔ کیونکہ عام طور پر دنیا میں استر کو اس وجہ سے کہ وہ دکھائی نہیں دیتا، کم قیمت جنس سے تیار کرتے ہیں تو اس طرح اس جہاں کی کم قیمت اجناس کی جگہ اُس جہان میں نہایت قیمتی جنس مستعمل ہے۔ تو اب سوچنا چاہیئے کہ اس جہاں کی بیش قیمت چیزیں کیسی ہوں گی۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ پروردگارِ عالم کی ان نعمتوں میں سے کہ جو دوسرے جہان سے متعلق ہیں کوئی نعمت ایسی نہیں کہ جو الفاظ میں بیان ہو سکے یا یہ کہ ہم ان کے تصور کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہمارے ذہنوں پر صرف ایک تصوراتی پیکر دُور ہی سے متجلّی ہوتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ جنتی "ارائک" یعنی سائبان والے تخت اور بغیر سائبان کے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے لیکن یہاں فرماتا ہے: کہ فرش پر تکیہ لگائے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لذاتِ بہشتی کے تنوع کی بنا پر ہو کہ کبھی تخت پر اور کبھی فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان بیش قیمت فرشوں کو ان تختوں پر بچھا دیں۔ یا پھر اس سے زیادہ معاملات کی طرف اشارہ ہو جن کا ادراک اس دنیا میں رہنے والوں کے لیے ممکن نہیں ہے۔ آخر میں پانچویں نعمت کے سلسلہ میں اسی بہشتی باغ کی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان دونوں بہشتوں کے پکے ہوئے پھل ان کی دسترس میں ہوں گے (وجنا الجنتین دان)۔ جی ہاں وہ زحمت و تکلیف کہ جو عام طور پر دنیا کے پھلوں کے حاصل کرنے میں ہوتی ہے وہاں کسی بھی طرح نہیں ہے۔

---

[1] "متکئین" حال ہے ان بہشتیوں کا گزشتہ آیتوں میں جنہیں (ولمن خاف مقام ربہ جنتان) کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

"جنیٰ" (بروزن بقا) اس پھل کو کہتے ہیں کہ جس کو توڑنے کا وقت آن پہنچا ہو اور "دان" اصل میں "دانی" ہے اس کے معنی نزدیک کے ہیں۔ پھر سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

✣ ✣ ✣

۵۶۔ فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا
جَآنٌّ ۝

۵۷۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۵۸۔ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۝

۵۹۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

۶۰۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝

۶۱۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

ترجمہ

۵۶۔ جنّت کے باغوں میں ایسی خواتین ہیں کہ جو سوائے اپنے شوہروں کے کسی سے محبت نہیں رکھتیں اور اس سے پہلے کسی جن و انس نے انہیں مَس نہیں کیا۔

۵۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۵۸۔ وہ یاقوت و مرجان کی مانند ہیں۔

۵۹۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۶۰۔ کیا نیکی کا بدلہ نیکی کے علاوہ کچھ اور ہے ؟

۶۱۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

پروردگارِ عالم فرماتا ہے : " بہشت کے محلوں میں ایسی عورتیں ہیں کہ جنہوں نے اپنے شوہروں کے علاوہ کبھی کسی دوسرے مرد کی طرف نہیں دیکھا اور ان کے علاوہ کبھی کسی دوسرے فرد سے محبت نہیں کی " (فیھن قاصرات الطرف)[۱]

" اور کسی جن یا انسان نے اس سے پہلے ان سے ملاقات نہیں کی " (لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان)[۲]

اس وجہ سے وہ دوشیزہ ہیں، کسی نے ان کو ہاتھ نہیں لگایا یا وہ ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہیں۔ حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے کہ جنت والی بیوی اپنے شوہر سے کہے گی کہ مجھے پروردگار کی عزت کی قسم ہے کہ میں جنت میں تجھ سے بہتر کوئی چیز نہیں پاتی۔ حمد و سپاس مخصوص ہے اس خدا کے لیے جس نے مجھے تیری بیوی اور تجھ کو میرا شوہر قرار دیا۔[۳]

"طرف" (بروزن حرف) کے معنی پلک کے ہیں۔ چونکہ دیکھنے کے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں، لہذا یہ کنایہ ہیں دیکھنے کا۔ اس بنا پر " قاصرات الطرف " کے الفاظ ایسی عورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جن کی نگاہ کوتاہ ہے یعنی وہ صرف اپنے شوہروں سے ہی لگاؤ رکھتی ہیں۔ اور یہ ایک بیوی کا عظیم ترین امتیاز ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی دوسرے کا تصور بھی نہ کرے اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ پروردگارِ عالم اس نعمت بہشتی کے بعد پھر فرماتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے " (فبای الاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان بہشتی عورتوں کی اور تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے : " وہ یاقوت و مرجان کی طرح ہیں " (کانھن الیاقوت والمرجان)۔ سرخی صفائی اور آب و تاب میں یاقوت اور خوبروئی و سفیدی میں مرجان اس وقت کہ جب یہ دونوں رنگ سفید اور صاف سرخ ، آپس میں ملتے ہیں تو ایک نہایت خوبصورت رنگ بنتا ہے۔ " یاقوت " ایک معدنی پتھر ہے جو عام طور پر سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور مرجان ایک دریائی جانور ہے کہ جو درخت کی شاخ سے مشابہ ہوتا ہے جو کبھی سفید کبھی تیز سرخ یا مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔

۱۔ " فیھن " میں جمع کی ضمیر ممکن ہے قصورِ بہشتی کی طرف لوٹے یا ان دو جنتوں کے مختلف باغات کی طرف یا ان کی نعمتوں کی طرف۔

۲۔ " لم یطمثھن " کا مادہ " طمث " ہے جس کے معنی ماہواری کا خون ہے۔ یہ زوالِ بکارت کے معنوں میں بھی آیا ہے اور یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ جنت کی باکرہ عورتیں ہرگز شوہر نہیں رکھتیں۔

۳۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۰۸

یہاں بظاہر مراد اس کی سفید قسم ہے[1]۔

بار دگر جنّت کی اس نعمت کے بیان کے بعد فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای اٰلاء ربکما تکذبان)۔ اس بحث کے آخر میں فرماتا ہے: "کیا نیکی کی جزا نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز ہو سکتی ہے"؟ (هل جزاء الاحسان الا الاحسان)[2]۔

وہ افراد کہ جنہوں نے دُنیا میں نیک کام کیے ہیں کیا خدا کی طرف سے اُن کے لیے عُمدہ جزا کے علاوہ کسی اور شے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اسلامی روایات میں یا مفسرین کی تفسیروں میں احسان سے مراد توحید ہے یا توحید و معرفت ہے یا اسلام۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ کوئی سی بھی نیکی جو عقیدہ، گفتار اور عمل میں ہو یہ اس کے مفہوم پر حاوی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

"ایة فی کتاب الله مسجلة، قلت وما هی؟ قال قول الله عز وجل: "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" جرت فی الکافر والمؤمن، والبر والفاجر، ومن صنع الیه معروف فعلیه ان یکافئ به ولیس المکافاة ان تصنع کما صنع حتی تربی، فان صنعت کما صنع کان له الفضل بالابتداء"۔

قرآن میں ایک آیت ہے کہ جو عمومیت کامل رکھتی ہے۔ راوی نے عرض کیا کہ وہ کونسی آیت ہے فرمایا: خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ (هل جزاء الاحسان الا الاحسان) کہ جو کافر و مومن اور نیک و بد کے بارے میں ہے۔ (کہ نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیئے) جس شخص کے ساتھ نیکی کی جائے اسے نیکی سے بدلہ ادا کرنا چاہیئے اور بدلہ یہ نہیں ہے کہ اس کی نیکی کی مقدار کے برابر نیکی کی جائے بلکہ اس سے زیادہ نیکی کرنی چاہیئے۔ اگر نیکی کی اتنی ہی مقدار ہوگی تو اس کی نیکی افضل و برتر ہوگی کیونکہ اس نے ابتدا کی ہے[3]۔

اسی وجہ سے بندہ کے نیک اعمال کے بدلہ میں خدا کی طرف سے جو سلوک ہوگا وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ اس استدلال کی بنا پر ہے کہ جو امام نے مندرجہ بالا حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "احسان" ایک ایسی شے ہے جو انصاف سے بہتر ہے کیونکہ انصاف یہ ہے کہ انسان، جو کچھ اس کے ذمّہ واجب ہے، اسے ادا کردے اور جو اس کا دوسرے پر ہے وہ لے لے۔ لیکن احسان یہ ہے کہ انسان اس سے زیادہ کہ جس کا وہ ذمّہ دار ہے عطا کرے اور جتنا اس کا حق ہے اس سے کم لے۔

پروردگارِ عالم پھر اپنے بندوں کو مخاطب کرکے فرماتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای اٰلاء ربکما

---

[1] مرجان کے بارے میں اس سورہ کے اوائل میں آیت ۲۲ کے ذیل میں ہم نے تشریح کی ہے۔

[2] "هل" اس آیت میں استفہام انکاری کے طور پر ہے۔ حقیقت میں یہ آیت ان گزشتہ آیتوں کی دلیل ہے کہ جن میں جنّت کی چھ نعمتوں کا ذکر تھا۔

[3] تفسیر عیاشی مطابق نقل" نور الثقلین" ج ۵ ص ۱۹۹ اور تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۰۸

تکذبان)۔ وہ اس لیے کہ یہ قانون کہ " احسان کا بدلہ احسان ہے " بجائے خود ایک عظیم نعمت ہے جو خداوندِ عظیم کی طرف سے ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ اپنے نیک بندوں سے جو سلوک ہوگا وہ اس کے اپنے کرم کی بنا پر ہوگا نہ کہ ان کے اعمال کے مطابق۔ اب اگر وہ اطاعت کرتے ہیں اور نیک عمل بجالاتے ہیں تو وہ بھی اس کی دی ہوئی توفیق کی نعمت کی بنا پر ہے۔ خدا کی برکتیں بندوں ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔

ایک نکتہ

نیکی نیکی کی جزا ہے

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا ، (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان) قرآنی منطق کی رو سے ایک عمومی قانون ہے کہ جو خدا ، مخلوق اور تمام بندگان خدا پر حاوی ہے ۔ اس قانون کی عمومیت تمام مسلمانوں کو یہ درس دیتی ہے کہ جس شخص کے ساتھ جو نیکی ہو وہ اس کے بدلہ میں ضرور نیکی کرے اور امام جعفر صادق ؑ کے ارشاد کے مطابق اس کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ ویسی ہی نیکی کی جائے بلکہ اس سے بہتر و برتر نیکی بروئے کار لائی جائے ورنہ جس نے احسان کرنے میں پہل کی ہے اس کی برتری اپنی جگہ مسلّم ہے ۔ بارگاہِ خداوندی میں ہمارے اعمال کا مسئلہ ایک اور رُخ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ خدا خود ایسا کریم ہے کہ جس کی رحمت کی موجوں نے تمام عالم امکان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اس کا انعام و اکرام وہ ہے جو اس کی ذات کو زیب دیتا ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کے برابر ہو ۔ اس وجہ سے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تاریخ اُمم میں ہمیں متعدد بار ایسا ملتا ہے کہ پُرخلوص افراد کو چھوٹا سا کام انجام دینے کے نتیجے میں بڑے انعامات سے نوازا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ کہ بعض مفسّرین نے تحریر کیا ہے کہ ایک مسلمان نے ایک کافر بڑھیا کو دیکھا جو پرندوں کے لیے سردی کے موسم میں دانے ڈال رہی تھی ۔ تو اُس مسلمان نے بڑھیا سے کہا کہ تجھ جیسی فرد کا یہ عمل بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہے اس بُڑھیا نے کہا : " میں یہ عمل ضرور کروں گی چاہے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو "۔ بات آئی گئی ہوئی ۔ ایک مدت کے بعد اسی مسلمان کو اس بُڑھیا نے حرم کعبہ میں دیکھا اور کہا کہ اے بندۂ خدا پرندوں کے لیے مُٹھی بھر دانے ڈالنے کی برکت نے مجھے نعمت اسلام سے نوازا ہے [1]۔

✣ ✣ ✣

---

[1] " رُوح البیان " جلد ۹ ص ۳۱۰

۶۲۔ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۚ

۶۳۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۙ

۶۴۔ مُدْهَآمَّتٰنِ ۚ

۶۵۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

۶۶۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ۚ

۶۷۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

۶۸۔ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ۚ

۶۹۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

ترجمہ

۶۲۔ اور ان سے بہت نیچے دو اور بہشت ہیں۔

۶۳۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۶۴۔ دونوں مکمل طور پر پُرمسرت و سرسبز ہیں۔

۶۵۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

۶۶۔ ان میں دو چشمے جوش کی حالت میں ہیں۔

۶۷ ۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۶۸ ۔ ان میں پھل کثرت سے ہیں اور کھجور اور انار کے درخت ہیں ۔

۶۹ ۔ تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

تفسیر

دو اور جنتیں اپنے حیران کن اوصاف کے ساتھ

گزشتہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے جس میں خوف خدا رکھنے والوں کو نصیب ہونے والی عالی قدر بہشتوں کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا پروردگار عالم ان آیتوں میں دو اور جنتوں کی بات کرتا ہے جو پست درجہ میں ہیں اور قدرتاً ایسے افراد کے لیے ہیں کہ جو ایمان اور خوف الٰہی کی بہت نچلی سطح پر فائز ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں ایمان اور عمل صالح کے اعتبار سے مختلف مراتب آتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے : " اور ان سے نیچے دو اور بہشت ہیں " (ومن دونھما جنّتان) ۔ مفسرین نے اس جملے کی دو تفسیریں کی ہیں ایک تو وہی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ من دونھما کے الفاظ یعنی ان دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں ان مومنین کے لیے ہیں جو نئی نئی اشیاء کے اشتیاق میں بہشت کے ان باغات میں سیر کر رہے ہیں ۔ انسان کی طبیعت اور اس کا مزاج نئی نئی اشیاء میں دلچسپی کا عادی ہے اور اس سے اس کو لطف حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن ان آیتوں کے لب و لہجہ سے اور ان روایتوں کی رو سے جو اس تفسیر میں وارد ہوئی ہیں پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے ۔ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفہیم کے بارے میں فرمایا : " جنتان من فضة وأبنيتهما وما فيهما وجنتان من ذهب أبنيتهما وما فيهما "

" دو جنتیں جن کی عمارت اور جو اشیاء ان میں ہیں وہ سب چاندی کی ہیں اور دو جنتیں ایسی ہیں کہ جن کی عمارت اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب سونے کا ہے " ۔

سونے اور چاندی کی تعبیر ممکن ہے کہ ان دونوں نعمتوں کے فرق کی طرف اشارہ ہو[1]

ایک اور حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے اس میں ہمیں ملتا ہے کہ آپ نے فرمایا :

الا تقولن الجنة واحدة ، ان الله يقول " ومن دونهما جنتان " ولا تقولن درجة واحدة ان الله يقول " درجات بعضها فوق بعض " انما تفاضل القوم بالاعمال

" یہ نہ کہو کہ ایک جنت ہے کیونکہ خدا کہتا ہے " ان دو جنتوں کے علاوہ دو اور جنتیں ہیں "

[1] " مجمع البیان " آیات زیر بحث کے ذیل میں ۔

اور یہ بھی نہ کہہ کہ ایک درجہ ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے :

"کئی درجات ہیں جن میں سے بعض بعض سے بہتر ہیں" اور یہ فرق اعمال کی بنیاد پر ہے۔[1]

اسی وجہ سے پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے :

جنتان من ذهب للمقربين وجنتان من ورق لاصحاب اليمين .

"دو سونے کی جنتیں ہیں کہ جو مقربین بارگاہ کے لیے ہیں اور دو جنتیں چاندی کی ہیں کہ جو اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔"[2]

اس کے بعد پھر فرماتا ہے : "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔ اس کے بعد ان دونوں جنتوں کی وہ پانچ خصوصیتیں کہ جن میں سے کچھ اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں جو سابقہ دو جنتوں کے بارے میں بتائی گئیں اور کچھ اُن سے مختلف ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "وہ دونوں پُرمسرت و سرسبز ہیں"۔ (مدھامتان)۔ مدھامتان کا مادہ "ادھیمام" ہے اور "دھمہ" (بروزن تہمہ) کی جڑ سے سیاہی اور رات کی تاریکی کے معنوں میں ہے۔ خوش رنگ سبز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور چونکہ اس قسم کا رنگ گھاس اور درختوں کی انتہائی شادابی کی علامت ہوتا ہے لہذا یہ تعبیر ان دونوں جنتوں کی انتہائی سرسبزی و شادابی کو بھی واضح کرتی ہے۔ اس مقام پر پھر اضافہ کرتا ہے۔ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک اور صفت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے : "ان دونوں جنتوں میں دو چشمے ہیں جو جوش مارہے ہیں" (فیھما عینان نضاختان)۔ "نضاختان" کا مادہ "نضخ" ہے جس کے معنی پانی کے اُبل کر نکلنے کے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر جن و انس سے استفہام انکاری کی صورت میں پوچھتا ہے۔ "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد کی آیت ان دونوں جنتوں کے پھلوں کے بارے میں کہتی ہے : "اُن میں پھل کثرت سے ہیں اور خرما اور انگور کے درخت ہیں" (فیھما فاکھة ونخل ورمان)۔ اس میں شک نہیں کہ "فاکھة" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس سے تمام قسم کے پھل مُراد ہوتے ہیں لیکن کھجور اور انار کی اہمیت اس کا سبب بنی ہے کہ ان دو پھلوں کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔ اور یہ جو بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ مذکورہ دونوں پھل "فاکھة" کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں، یہ غلط ہے۔ کیونکہ علمائے لغت نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ اصولاً "عام" پر "خاص" کا عطف ایسے مواقع پر جب کوئی خاص امتیاز نہ رکھتا ہو معمول میں داخل ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۹۸ میں ہے (من کان عدوا للہ وملائکته ورسله وجبریل ومیکال فان اللہ عدو للکافرین) "جو شخص خدا اس کے ملائکہ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو (اور کافر ہو) تو خدا کافروں کا دشمن ہے"۔ یہاں جبرئیل و میکائیل کو جو خدا کے عظیم فرشتوں میں سے دو فرشتے ہیں ملائکہ کے بیان کے بعد، بطور عام مورد توجہ قرار پائے ہیں۔ پھر اس سوال کی تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے : "تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے"۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

---

[1] "مجمع البیان" آیات زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۱۴۶ (جیسا کہ ہم نے کہا کہ سونے اور چاندی کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ ان دونوں جنتوں کے مرتبہ کے فرق کی طرف اشارہ ہو۔

ایک نکتہ

پھلوں کی قدر و قیمت

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیتوں میں جنت کی غذاؤں کے سلسلہ میں صرف پھلوں پر انحصار کیا گیا ہے اور تمام پھلوں میں سے خرما اور انار کا نام لیا گیا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ کھجور کے درخت کو نخل کہا گیا ہے لیکن انار کے بارے میں خود پھل کا نام لیا ہے۔ یقیناً ہر ایک میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہے۔ جنت کی غذاؤں کے سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ پھلوں کا ذکر اس اہمیت کی بنا پر ہے کہ جو غذائیت کے سلسلہ میں پھلوں کو حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انسانوں کو پھل کھانے والی مخلوق کہا جاتا ہے۔ پھلوں کا نقش اور ان کا اثر انسان کی خوشی اور شادابی کے سلسلہ میں نہ صرف علمی نقطہ نظر سے بلکہ عام تجربات کی رُو سے بھی نمایاں ہے۔ باقی رہا کھجور کے درخت کا ذکر، اس کے پھل کی بجائے، تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ کھجور کا درخت اپنے پھل کے علاوہ بھی کئی حیثیتوں سے فائدہ مند ہے، جب کہ انار کا درخت ایسا نہیں ہے۔ کھجور کے پتوں سے مختلف قسم کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً فرش، ٹوپی، حمل و نقل کے مختلف ذرائع حتیٰ کہ اس سے سونے کے لیے چارپائی بھی بنائی جاتی ہے۔ اس کے چھلکوں سے مختلف فائدے اُٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعض اجزا بطور دوا کام آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے تنوں سے بعض مکانوں کے ستون کا کام لیا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں کسی چھوٹی نہر کو عبور کرنے کے لیے پل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ جنت کے پھلوں میں سے صرف دو کا ذکر کیوں ہوا تو یہ ان دونوں کے تنوع کی وجہ سے ہے۔ ان میں سے ایک، عام طور پر، گرم علاقوں میں اُگتا ہے دُوسرا سرد علاقوں میں۔ ایک میں قند و شکر کا مادّہ ہے دوسرے میں تیزابی۔ ایک مزاج و طبیعت کے اعتبار سے گرم ہے، دوسرا سرد۔ ایک غذا ہے اور دوسرا پیاس کو دُور کرتا ہے۔ کھجور میں موجود موادِ حیاتی اور اس کے کئی وٹامن کہ جو موجودہ زمانے میں معلوم ہوئے ہیں، ان کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ کھجور میں تیرہ سے زیادہ حیاتیاتی مادّہ اور پانچ قسم کے وٹامنز ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اور دوسرے خواص ہیں جن کے بارے میں ہم سورۂ مریم کی آیت ۲۵ کے ذیل میں ایک قوت بخش غذا کے عنوان کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔[1]

باقی رہا انار تو وہ بعض اسلامی روایات میں "سیّد الفاکھۃ" یعنی بہترین پھل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔[2]

وہ ماہرین جو غذا شناسی میں امتیازِ خاص رکھتے ہیں، انہوں نے اس سلسلہ میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ منجملہ دوسری خصوصیات کے انہوں نے کھجور میں خون صاف کرنے کی صلاحیت کا انکشاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں وٹامن (ث) کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ انار کے بارے میں بھی بہت سے فوائد کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ معدہ کو تقویت دیتا ہے، پُرانے زخم کو اچھا کرتا ہے، یرقان اور صفرا کے بخار کو دُور کرتا، دفع خارش کے لیے مفید ہے، نظر کو تقویت دیتا ہے، مسوڑھوں کے لیے قوت بخش ہے اور اسہال کو ختم کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

---

1. "تفسیر نمونہ" جلد ۱۳ ص ۶۹
2. یہ تعبیر ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے "بحار الانوار" جلد ۶۶، ص ۱۶۳

اطعموا صبیانکم الرمان فانه اسرع لشبابهم۔

اپنے بچوں کو انار کھلاؤ یہ ان کو جلد جوان کرتا ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے: (فانه اسرع لالسنتهم)۔ انار کھانے سے بچے زیادہ جلدی بولنے لگتے ہیں۔[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

ما علی وجه الارض ثمرة کانت احب الی رسول الله من الرمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انار سے زیادہ رُوئے زمین کا کوئی پھل پسند نہیں تھا۔[3]

۞ ۞ ۞

---

1. "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۶۴
2. "بحار الانوار" جلد ۶۶ ص ۱۶۵۔
3. کافی جلد ۶ ص ۳۵۴

۷۰. فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۚ

۷۱. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ

۷۲. حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۚ

۷۳. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ

۷۴. لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۚ

۷۵. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۚ

۷۶. مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۚ

۷۷. فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

۷۸. تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۚ

ترجمہ

۷۰. ان بہشت کے باغوں میں اچھے اخلاق والی خوبصورت عورتیں ہیں۔

۷۱. پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے ؟

۷۲. ایسی حُوریں کہ جو جنّت کے مستور خیموں میں ہیں۔

۷۳. پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤگے ؟

۷۴۔ ایسی عورتیں کہ جن سے کبھی پہلے کسی انسان یا جن نے ملاقات نہیں کی۔

۷۵۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا انکار کروگے ؟

۷۶۔ یہ اس حالت میں ہے کہ جنتی لوگ تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر بہترین اور خوبصورت ترین سبز رنگ کے فرش بچھائے گئے۔

۷۷۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟

۷۸۔ بابرکت اور زوال نا آشنا ہے تیرے صاحبِ جلال و جمال پروردگار کا نام۔

تفسیر

جنت کی بیویوں کا دوسری مرتبہ تذکرہ

ان دونوں جنتوں کی نعمتوں کی تشریح کو جاری رکھتے ہوئے کہ جن کا ذکر سابقہ آیتوں میں ہوا ہے ان آیتوں میں بھی ان نعمتوں کے ایک اور حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ان دونوں جنتوں میں بھی عورتیں ہیں جو اچھے اخلاق والی اور خوبصورت ہیں"۔ (فیھن خیرات حسان)[1]

ایسی عورتیں کہ جن میں حُسنِ سیرت اور حُسنِ صورت دونوں ہیں۔ اس لیے کہ "خیر" عام طور پر اچھی صفات اور معنوی خوبصورتی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور حُسن زیادہ تر خوبصورتی یعنی جمالِ ظاہر کے لیے آتا ہے۔ ان روایتوں میں کہ جو اس آیت کی تفسیر میں آئی ہیں، جنت کی بیویوں کی بہت سی خوبیاں گنوائی گئی ہیں، جو دُنیا کی عالی صفت عورتوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے تاکہ وہ تمام عورتوں کے لیے نمونہ بنیں۔ منجملہ دیگر خوبیوں کے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ خوش بیان ہیں۔ ان میں پاکیزگی ہے۔ وہ تکلیف نہیں پہنچاتیں، غیروں کی طرف نہیں دیکھتیں وغیرہ وغیرہ۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان میں جمال و کمال کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک عمدہ بیوی میں ہونی چاہئیں۔ اور جو خوبیاں تمام عورتوں میں ہوں وہ ان میں سے ہر ایک میں ہیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید مختصر اور پُرمعنی الفاظ میں انہیں "خیرات حسان" قرار دیتا ہے۔[2]

---

[1] "فیھن" کی ضمیر جمع مؤنث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان چاروں جنتوں کی طرف پلٹ رہی ہو کہ جن کا گزشتہ آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخری دو جنتوں کی طرف مختلف قسم کے محل اور باغات کی بنا پر لوٹے اور یہ تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس سے ان کے معاملے کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے۔

[2] "خیرات" کے بارے میں بعض نے کہا ہے کہ "خیّرہ" (بر وزن سیّدہ) کی جمع ہے جسے تخفیف کی بنا پر "خیرات" پڑھا گیا ہے۔ بعض مفسرین اسے "خیرہ" (بر وزن خیرہ) کی جمع سمجھتے ہیں۔ بہر حال وہ وصفی معنی رکھتا ہے نہ کہ افعل التفضیل کے معنی کیونکہ افعل التفضیل کی جمع نہیں بنائی جاتی۔

اس نعمت کے تذکرہ کے بعد پھر اعادہ کرتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ۔ (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد بہشت کی ان عورتوں کی تعریف و توصیف کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے : " وہ ایسی حُوریں ہیں جو جنت کے خیموں میں مستور ہیں "۔ (حور مقصورات فی الخیام)۔ حُور جمع ہے " حوراء " اور احور کی۔ اس کے معنی ہیں ایسی عورت جس کی آنکھ سیاہ ہو اور اس کا سفید صاف و شفاف رنگ ہو۔ یہ لفظ بعض اوقات ان عورتوں کے لیے بھی بولا گیا ہے جن کا چہرہ بالکل گورا ہو۔ "مقصورات" کی تعبیر اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے شوہروں سے تعلق رکھتی ہیں اور دوسروں سے بالکل پوشیدہ ہیں۔ " خیام " خیمہ کی جمع ہے لیکن جیسا کہ مسلم روایات میں مندرج ہے جنت کے خیمے دنیا کے خیموں سے مشابہت نہیں رکھتے ۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین اور ارباب لُغت کے نزدیک خیمہ صرف وہ نہیں ہے جو کپڑے سے بنا ہوا ہے جیسا کہ ہم لوگوں میں مشہور ہے بلکہ لکڑی سے بنے ہوئے گھروں کو بھی خیمہ کہتے ہیں۔ ہر مدوّر گھر کو خیمہ کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیمہ ہر اس گھر کو کہتے ہیں جو اینٹ پتھر وغیرہ سے نہ بنا ہو۔[1]

پھر اس پُر معنی سوال کی تکرار کرتے ہوئے کہتا ہے : " تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

اس کے بعد کی آیت میں جنت کی حُوروں کی تعریف کا ایک اور پہلو ہے۔ (لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان)۔[2]

البتہ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ عورتیں اور مرد جن کی اس دنیا میں شادی ہوئی ہے اگر دونوں صاحبان ایمان اور جنّتی ہوئے تو وہاں ایک دوسرے سے ملحق ہوں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہترین حالت اور کیفیت میں زندگی بسر کریں گے ۔[3]

روایات سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کا مرتبہ جنت کی حُوروں سے زیادہ ہوگا۔[4] ان اعمال صالح اور عبادتوں کی بنا پر جو دنیا میں انہوں نے انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد پھر فرماتا ہے :۔ " تم دونوں اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے ": (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

جنت کی عورتوں کی آخری توصیف جو ان آیتوں میں ہے وہ یہ ہے کہ : " اس بہشت کے رہنے والے اس حالت میں ہیں کہ تخت اور پلنگ پر تکیے لگائے ہوئے ہیں جن پر سبز رنگ کے پارچوں کا بہترین فرش بچھایا گیا ہے "۔ (متکئین علیٰ رفرف خضر و عبقری حسان)۔ " رفرف " دراصل درختوں کے بڑے اور چوڑے پتوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد رنگ برنگ کے ان خوبصورت پارچوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باغات کے منظر سے مشابہت رکھتے ہیں۔[5]

عبقری اصل میں ہر بے نظیر شے کے لیے ہے یا ایسی چیز جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے ۔ اسی لیے ایسے علماء اور دانشوروں کو جو

---

[1] " لسان العرب "، " مجمع البحرین " اور " المنجد "۔

[2] " طمث " کے معنی کے سلسلہ میں اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے ذیل میں کافی وضاحت ہو چکی ہے۔

[3] (رعد ۲۳ ۔ مومن ۸)۔

[4] " دُرالمنثور " ص ۱۵

[5] بعض مفسرین نے یہاں نوشیرواں کے نگارستان کے مشہور فرش کا بطور مثال تذکرہ کیا ہے۔ وہی فرش تھا کہ جو حد سے زیادہ بیش قیمت تھا اور ایک باغ کے منظر کو پیش کرتا تھا۔

نادر الوجود ہوں "عباقرۃ" کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ لفظ عبقر ابتدا میں ایک نام تھا جسے عربوں نے پریوں کے شہر کے لیے منتخب کیا تھا اور چونکہ یہ شہر ایسا تھا جسے کسی نے دیکھا نہ تھا اور اپنے ساتھ ایک ندرت کا تصور رکھتا تھا لہٰذا وہ ہر بے مثل چیز کو اس سے منسوب کرتے ہیں اور عبقری کہتے ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے کہ عبقر ایک شہر ہے جس میں ریشم کے بہترین پارچے تیار کیے جاتے ہیں۔[1]

بہرحال اس کی اصل عملی طور پر متروک ہو چکی ہے اور عبقری ایک مستقل لفظ کی شکل میں نادر الوجود یا عزیز الوجود کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ مفرد ہے کبھی کبھی جمع کے معنوں میں بھی آتا ہے (مثلاً زیر بحث آیت) "حسان" جمع "حسن" (بروزن چمن) کے معنی اچھے اور خوبصورت کے ہیں۔ بہرحال یہ سب تعبیریں اس چیز کو بیان کرتی ہیں کہ جنت کی تمام چیزیں ممتاز ہیں۔ اس کے پھل کھانے محل اور فرش، قصہ مختصر یہ کہ اس کی ہر شے اپنی نوع کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ الفاظ بھی ان بے نظیر مفاہیم کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکتے۔ یہ ہمارے ذہن میں ان کا ایک ہلکا سا نقشہ بناتے ہیں۔ اس کے بعد آخری مرتبہ اور اکتیسویں مرتبہ جن و انس کے تمام افراد سے سوال کرتا ہے: "تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" (فبای آلاء ربکما تکذبان)۔

تم معنوی نعمتوں کے منکر ہو یا مادی نعمتوں کے؟ اس جہان کی نعمتوں کے منکر ہو یا جنتوں کی نعمتوں کے منکر ہو؟ وہ نعمتیں کہ جنہوں نے تمہارے وجود کا احاطہ کر رکھا ہے اور تم ان میں مستغرق ہو اور کبھی غرور و غفلت کی بنا پر ان سب کو فراموش کر دیتے ہو اور ان سب نعمتوں کو بخشنے والے اور آئندہ جس کی نعمتوں کے منتظر ہو تم اس کی کون سی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ اس سورہ کی آخری آیت میں فرماتا ہے: "بابرکت اور زوال ناپذیر ہے تیرے پروردگار کا نام کہ جو صاحب جلال و اکرام ہے": (تبارک اسم ربک ذی الجلال والاکرام)۔ "تبارک" "برک" (بروزن درک) کی اصل سے ہے اور اونٹ کے سینے کے معنی میں ہے۔ اونٹ جب کسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں تو اپنا سینہ زمین کے ساتھ چپکا لیتے ہیں اس بنا پر یہ لفظ ثابت قدم رہنے اور پائیدار ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز زوال ناآشنا ہونے کی صورت میں چونکہ سرمائے سے بہت فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس لیے مفید چیز کو مبارک کہا جاتا ہے اور ان معانی کی سب سے زیادہ مستحق جو ذات ہے وہ خدائے پاک ہے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس سورہ میں چونکہ پروردگارِ عالم کی انواع و اقسام کی نعمتوں کا ذکر ہے ایسی نعمتیں جو زمین و آسمان میں نوعِ بشر کی خلقت اور دنیا و آخرت سے تعلق رکھتی ہیں اور پروردگارِ عالم کے بابرکت وجود سے ان کا فیضان جاری ہے لہٰذا مناسب ترین تعبیر وہی ہے کہ جو اس آیت میں آئی ہے کیونکہ اسم سے یہاں مراد پروردگارِ عالم کے اوصاف ہیں؛ بالخصوص صفتِ رحمانیت کہ جو ان تمام برکتوں کا منشا ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کے افعال کا سرچشمہ اس کی صفات ہیں۔ اگر عالمِ ہستی کو اس نے ایک نظام کے تحت پیدا کیا ہے اور ہر چیز میں ایک میزان رکھی ہے تو یہ اس کی حکمت کا ایک تقاضا ہے۔ اور اگر قانون عدالت کو ہر چیز میں جاری و ساری کیا تو یہ اس کے علم و عدل کا تقاضا ہے، اور اگر وہ مجرموں کو مختلف قسم کی سزائیں دیتا ہے اور ان پر عذاب نازل کرتا ہے تو اس کے منتقم ہونے کا یہی اقتضا ہے۔ اور اگر صالحین کو اس دنیا میں اور دوسری دنیا میں انواع و اقسام کی معنوی اور مادی نعمتوں سے بہرہ ور فرماتا ہے تو یہ اس کے فضل و کرم اور رحمتِ واسعہ کا ایک تقاضا ہے۔ اس بنا پر اس کا اسم اس کی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کی صفات عین ذات ہیں۔ ذی الجلال والاکرام کے الفاظ اس کی تمام صفات جلال و جمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ (ذی الجلال سے صفاتِ سلبیہ کی طرف اور ذی الاکرام

[1] تفسیر "ابوالفتوح رازی" زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

سے صفاتِ ثبوتیہ کی طرف اشارہ ہے)۔ پُرکشش بات یہ ہے کہ یہ سُورہ خدا کے نام یعنی لفظ رحمٰن سے شروع ہوا ہے اور ذی الجلال والاکرام پر ختم ہو رہا ہے اور یہ دونوں (آغاز و انجام) سُورہ کے تمام مضامین کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

چند نکات

۱۔ اس سُورہ کی آیت ۲۷ میں دنیا کی مختلف مادی اور معنوی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرماتا ہے: (ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام) اور سُورہ کے آخر میں انواع و اقسام کی بہشتی نعمتوں کے بعد فرماتا ہے: (تبارك اسم ربك ذی الجلال والاکرام) یہ دونوں جُملے اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ تمام خطوط اس کی ذاتِ پاک پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور جو کچھ ہے اس کی ہی طرف سے ہے۔ دُنیا بھی اسی کی طرف سے ہے اور عقبیٰ بھی اسی کی طرف سے ہے اور اس کے حلال و حرام نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

۲۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے دُعا کر رہا تھا اور کہتا تھا یاذاالجلال والاکرام "وہ خدا جو صاحب جلال و اکرام ہے"۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (قد استجیب لك فاسئل) اب جب کہ خدا کو تُو نے اس نام سے پکارا ہے تو تیری دُعا مستجاب ہے جو کچھ چاہتا ہے اس سے سوال کر۔[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرد کو دیکھا کہ نماز میں مشغول ہے اس نے رکوع و سجود و تشہد کے بعد دُعا میں اس طرح کہا: اللّٰھم انی اسئلك بان لك الحمد لا اله الا انت وحدك لاشریك لك المنان بدیع السماوات والارض یاذاالجلال والاکرام یاحیّ یا قیوم انی اسئلك ...... تو پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا: لقد دعا الله باسمه العظیم الذی اذا دعی به اجاب واذا سئل به اعطی "اس شخص نے خدا کو اس کا عظیم نام لے کر پکارا ہے۔ جب اس نام سے اس کو پکارا جائے اور دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اور اگر اس کے ذریعے وہ سوال کریں تو عطا کرتا ہے"۔[2]

۳۔ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے آیہ تبارك اسم ربك ذی الجلال والاکرام کی تفسیر میں فرمایا: نحن جلال الله وکرامته التی اکرم الله العباد بطاعتنا۔ "ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں کہ جس نے بندوں کو ہماری اطاعت کی عزت بخشی ہے"۔[3]

یہ امر واضح رہے کہ اہلبیتِ پیغمبر خداؐ کے علاوہ کسی اور کی طرف رہنمائی نہیں فرماتے تھے اور سوائے اس کی اطاعت کے کسی اور چیز کی طرف نہیں بلاتے تھے۔ وہ ہادیانِ راہ ہیں اور زندگی کے اس متلاطم سمندر میں نجات کی کشتیاں ہیں۔ اس بنا پر خدا کے جلال و اکرام کا ایک مصداق شمار ہوتے ہیں کیونکہ خدا اپنے اولیا کے ذریعے بندوں کو نعمت ہدایت عطا فرماتا ہے۔

۴۔ بعض علما نے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید کا پہلا حصّہ جو مکّہ میں قریش کے سامنے پڑھا گیا ہے وہ اسی سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات

---

[1] تفسیر "درالمنثور" جلد ۶ ص ۱۵۳

[2] تفسیر درالمنثور ج ۶ ص ۱۵۳

[3] تفسیر برہان ج ۴ ص ۲۶۲

تھیں۔ عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ جمع ہوئے اور کہا کہ ابھی تک قریش نے قرآن کا کوئی حصہ نہیں سُنا تو ہم میں سے کون شخص ہے کہ جو ان کے سامنے کھلم کھلا قرآن پڑھے میں نے کہا کہ وہ شخص میں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خوف ہے کہ وہ تجھے ایذا پہنچائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا شخص یہ کام اپنے ذمہ لے کہ جس کا قبیلہ طاقتور ہو کہ جو اس کا دفاع کر سکے۔ میں نے کہا کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ دیں خدا میرا دفاع کرے گا اور مجھے بچائے گا۔

دوسرے دن ابن مسعودؓ دوپہر کے وقت مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہوئے اُس وقت وہاں قریش اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بلند آواز میں کہنا شروع کیا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الرحمٰن علم القرآن ...... وہ اسی طرح پڑھتے رہے قریش خاموشی سے سُنتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے یہ فضول شخص کیا کہتا ہے تو اُن میں سے بعض نے کہا کہ یہ ان باتوں کے کچھ حصے بیان کر رہا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لایا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ابن مسعودؓ کے مُنہ پر تھپڑ مارنے لگے لیکن ابن مسعودؓ نے اس سُورہ کی تلاوت اسی طرح جاری رکھی اور اُسے اتنا پڑھا جتنا کہ خدا نے چاہا۔ اس کے بعد ابن مسعودؓ رسول اللہؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف لَوٹ آئے۔ ان کے چہرہ پر زخموں کے نشان نمایاں تھے۔ یہ دیکھ کر اُنہوں نے کہا کہ ہمیں تو اس چیز کا تیرے بارے میں پہلے ہی سے خوف تھا۔ ابن مسعودؓ نے کہا: مجھے معلوم نہ تھا کہ دشمنانِ خدا اتنے گھٹیا نکلیں گے۔ اگر تم لوگ کہو تو میں کل بھی اس کام کو جاری رکھوں۔ اب مجھے کسی قسم کا خوف لاحق نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں اتنا ہی کافی ہے جو ان کی مرضی کے بغیر تو نے ان کے سامنے پڑھا۔[1]

اسی بنا پر ابن مسعودؓ پہلے شخص شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے مشرکینِ مکہ کے سامنے کھلم کھلا قرآن پڑھا۔[2]

خداوندا! تُو ذوالجلال والاکرام ہے۔ تجھے تیرے جلال واکرام کی قسم ہمیں بہشت کی نعمتوں سے محروم نہ رکھیو۔ پروردگارا! تیری رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اگرچہ ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو تیری رحمت کے شایانِ شان ہو پھر بھی تو ہمارے ساتھ وہ سلوک کر جو تیرے مقامِ رحمت کے شایانِ شان ہے۔

بارالٰہا! ہم تیری کسی نعمت کی کبھی تکذیب نہیں کرتے اور اپنے آپ کو تیرے احسان میں ہمیشہ محصور و مستغرق جانتے ہیں۔ ہمیں ان نعمتوں سے ہمیشہ بہرہ ور فرما۔ آمین یا ربّ العالمین!

۸ / ج ۱ / ۱۴۰۶ ہجری قمری
۲۹ / ۱۰ / ۱۳۶۴ شمسی

ترجمہ کا اختتام
۱۰ شوال ۱۴۰۷ھ ، ۷ جون ۱۹۸۷ء
قم بر مکان حقیر محل سلطان محمد شریف
کوچۂ جمشیدی بلاک

⁂

[1] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۳۶

[2] اسد الغابہ جلد ۳ ص ۲۵۷

سُورَہ وَاقِعَہ

- یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔
- اس میں ۹۶ آیتیں ہیں۔

تاریخ آغاز
۸/ ج ۱ / ۱۴۰۶ھ
۲۹/ ۱۰/ ۱۳۶۴ ش

سُورہ واقعہ کے مضامین

"تاریخ القرآن" میں ابن ندیم سے منقول ہے کہ سُورہ "واقعہ" چوالیسواں سُورہ ہے جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔[1]

اس سے پہلے سُورہ طٰہٰ اور اس کے بعد سورہ شعرا نازل ہوا۔ یہ سُورہ جیسا کہ اس کے لب و لہجے سے واضح ہے اور مفسرین نے بھی تصریح کی ہے، مکہ میں نازل ہوا۔ اگرچہ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی آیت ۸۲ ، ۸۱ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن اس کے ثبوت کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور مذکورہ بالا آیتوں میں اس دعویٰ کی کوئی علامت بھی نہیں ہے۔ سُورۂ واقعہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، قیامت اور اس کی خصوصیات کے مضامین پر مشتمل ہے اور یہ مسئلہ اس سُورہ کی ۹۶ آیتوں کا بنیادی موضوع ہے لیکن، ایک لحاظ سے اس سُورہ کے مضامین کو آٹھ حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ ظہورِ قیامت کا آغاز اور اس سے ملحق سخت وحشت ناک حوادث۔
۲۔ اس دن اِنسانوں کی اصحاب الیمین ، اصحاب الشمال اور مقربین میں تقسیم۔
۲۔ مقاماتِ مقربین کے بارے میں ایک تفصیلی بحث اور جنّت میں انواع و اقسام کے ثواب اور سزائیں۔
۴۔ پہلے گروہ یعنی اصحاب الیمین کے بارے میں تفصیلی بحث اور انواع و اقسام کی الٰہی نعمتیں۔
۵۔ مسئلہ معاد کے سلسلہ میں مختلف دلائل کا بیان ، خدا کی قدرت اور انسان کی حقیر و ناچیز نطفہ سے خلقت ، نباتات میں تجلی حیات ، نزولِ بارش اور آگ کا روشن ہونا کہ یہ سب توحید کی علامتوں کے ذیل میں آتا ہے۔
۶۔ اصحاب الشمال کے بارے میں قابلِ توجہ بحث اور دوزخ میں ان کی دردناک سزائیں۔
۷۔ حالتِ احتضار کی تصویر کشی اور اس دُنیا سے دُوسری دنیا کی طرف انتقال کہ جو قیامت کے مقدمات میں سے ہے۔
۸۔ مومنین کی جزا و ثواب اور کفار کے عذاب پر ایک اجمالی نظر۔ آخر میں سُورہ پروردگار کے عظیم نام پر ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] "تاریخ القرآن" ابو عبداللہ زنجانی ص ۵۹۔

اِس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت :

اس سورہ کی تلاوت کے بارے میں اسلامی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں۔ ان حدیثوں میں سے ایک حدیث رسول اللہؐ سے منقول ہے: من قرأ سورة الواقعة كتب ليس من الغافلين ۔ جو شخص سورہ واقعہ کی تلاوت کرے گا تو اس کے بارے میں لکھا جائے گا کہ یہ غافلین میں سے نہیں ہے۔[1]

اس سُورہ کی آیتیں اس قدر دل ہلا دینے والی اور چونکا دینے والی ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد ہر انسان کے لیے غفلت کی گنجائش نہیں رہتی اسی بنا پر پیغمبرِ اسلامؐ کی ایک اور حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ جس وقت پیغمبرِ اسلامؐ سے یہ سوال ہوا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر بڑھاپے کے آثار اس قدر جلد کیوں نمایاں ہوگئے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: شيبتني هود، والواقعة والمرسلات وعم يتسائلون ۔ " سُورہ ھُود، واقعہ، المرسلات اور عم یتساءلون نے مجھے بوڑھا کر دیا۔[2] کیونکہ ان سُورتوں میں قیامت کے دل ہلا دینے والے واقعات ہولناک حادثوں اور مجرموں کی سزاؤں کا بیان ہے۔ اس طرح گزشتہ قوموں کے لرزہ براندام کر دینے والے واقعات اور وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں کہ جو ان پر نازل ہوئیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے کہ: من قرأ في كل ليلة جمعة الواقعة احبه الله وحببه الى الناس اجمعين ولم يرفي الدنيا بؤسا ابدا ولا فقرا ولا فاقة ولا آفة من آفات الدنيا وكان من رفقاء امير المؤمنين ۔ " جو شخص ہر شب جمعہ سورہ واقعہ کی تلاوت کرے تو خدا اس کو دوست رکھتا ہے اور اُسے لوگوں کا محبوب بنا دیتا ہے اور وہ دنیا میں ہرگز ناراضی اور تکلیف نہیں دیکھتا اور فقر و فاقہ و آفاتِ دُنیا میں سے کوئی آفت اس پر نہیں آئے گی اور وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے رفقا میں شمار ہوگا۔[3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ عثمان ابن عفانؓ عبداللہ ابن مسعودؓ کی عیادت کے لیے گئے۔ اس بیماری میں کہ جس میں عبداللہ ابن مسعودؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان سے پُوچھا کہ تم کس بات پر پریشان ہو۔ اُنہوں نے کہا کہ اپنے گناہوں کی وجہ سے پریشان ہوں انہوں نے کہا تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟ عبداللہ ابن مسعودؓ نے جواب میں کہا کہ اللہ کی رحمت۔ عثمانؓ نے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں تمہارے علاج کے لیے طبیب لے آؤں۔ وہ کہنے لگے مجھے طبیب ہی نے بیمار کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ اگر تمہارا دل چاہے تو میں حکم دوں کہ تمہارا عطیہ بیت المال سے لے آئیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کی جس وقت مجھے ضرورت تھی اس وقت تم نے وہ مجھے نہیں دیا۔ آج جب کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو تم مجھے دیتے ہو۔ حضرت عثمانؓ کہنے لگے اگر وہ رقم تمہاری بیٹیوں کے کام آئے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ میری لڑکیوں کو بھی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے انہیں نصیحت کی ہے کہ سُورہ واقعہ پڑھا کریں۔ میں نے رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سُنا ہے کہ:

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۱۲، تفسیر "برہان" جلد ۴ ص ۲۷۳

[2] خصال صدوق باب الاربعہ حدیث ۱۰

[3] "ثواب الاعمال" مطابق نقل "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۲۰۳

"من قرأ سورة الواقعة كل ليلة لم تصبه فاقة ابداً"

"جو شخص رات کو سورہ واقعہ پڑھے تو وہ کبھی بھی افلاس کا شکار نہیں ہو گا۔"[1]

اسی بنا پر سورۂ واقعہ کو ایک روایت میں سورۂ غنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔[2]

یہ امر بخوبی واضح ہے کہ صرف زبان سے ادا کر لینے سے یہ تمام برکتیں حاصل نہیں کی جا سکتیں بلکہ ضروری ہے کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ تفکر ہو اور تفکر کے ساتھ عمل بھی ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

---

1. مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۱۲

2. روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۱۱

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝

۲۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝

۳۔ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝

۴۔ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝

۵۔ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝

۶۔ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا ۝

۷۔ وَّكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝

۸۔ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝

۹۔ وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝

۱۰۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝

۱۱۔ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

۱۲۔ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝

۱۳۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۱۴۔ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ ہو گا۔

۲۔ تو کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکے گا۔

۳۔ ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے دُوسرے کو اُوپر لائیں گے۔

۴۔ یہ اس وقت ہو گا کہ جب زمین میں شدید زلزلہ آئے گا۔

۵۔ اور پہاڑ درہم وبرہم ہوں گے۔

۶۔ اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے۔

۷۔ اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

۸۔ پہلا گروہ اصحاب میمنہ، اور اصحاب میمنہ کیا ہیں۔

۹۔ دُوسرا گروہ اصحاب شوم ہیں اور اصحاب شوم کیا ہیں۔

۱۰۔ اور تیسرا گروہ وہ ہے جو سبقت کرنے والے اور پیش قدمی کرنے والے ہیں۔

۱۱۔ وہی مقرب ہیں۔

۱۲۔ جو بہشت کے پُر نعمت باغوں میں رہتے ہیں۔

۱۳۔ بہت سے گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہیں۔

۱۴۔ اور تھوڑے آخری اُمت میں سے۔

تفسیر

عظیم واقعہ

قیامت سے ربط رکھنے والے مسائل قرآن مجید میں عام طور پر عظیم انقلاب برپا کرنے والے اور سرکوبی کرنے والے حادثات کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور یہ قرآن کی ان بہت سی صورتوں میں نظر آتے ہیں جو قیامت کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ اس سورۂ واقعہ میں، جس کا مرکزی خیال معاد ہے اس کی ابتدائی آیات میں یہی واضح نظر آتا ہے۔ پروردگار عالم آغاز ہی میں فرماتا ہے: "جس وقت قیامت کا عظیم واقعہ رونما ہوگا" (اذا وقعت الواقعۃ)[1]

کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ (لیس لوقعتها كاذبة)[2] کیونکہ اس کے رونما ہونے سے پہلے کے حوادث اس قدر شدید اور ہولناک ہوں گے کہ ان کے اثرات دنیا کے ذرہ ذرہ پر نمایاں ہوں گے۔ "واقعۃ" اجمالی طور پر قیامت کے برپا ہونے اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور چونکہ اس کا واقع ہونا قطعی اور یقینی ہے اس لیے اسے واقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مفسرین نے "واقعہ" کو قیامت کے ناموں میں سے ایک نام بتایا ہے۔ "کاذبۃ" کے لفظ کو بعض مفسرین نے یہاں مصدری معنوں میں لیا ہے جو کہ اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا وقوع اس طرح ظاہر اور آشکار ہوگا کہ کسی قسم کی تکذیب اور اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بعض مفسرین نے اس کی اس کے ظاہری معنوں کے ساتھ تفسیر کی ہے، اس اعتبار سے کہ یہ اسم فاعل ہے، اور کہا ہے کہ قیامت کے وقوع کے سامنے کوئی تکذیب کرنے والا موجود نہیں ہوگا۔[3]

بہرحال قیامت نہ صرف یہ کہ کائنات کی تباہی کے ساتھ لازم ہے بلکہ اس کے نتیجے میں انسان بھی درہم برہم ہو جائیں گے جیسا کہ بعد کی آیتوں میں پروردگار عالم فرماتا ہے: "ایک گروہ کو نیچے لے جائیں گے اور دوسرے کو اوپر لے آئیں گے (خافضة رافعة)[3] تکبر کرنے والے، اکڑنے والے اور صدرنشین ظالم نیچے گرا دیے جائیں گے اور کمزور مومن اور نیک افراد اوج افتخار پر متمکن ہوں گے۔ خواہ مخواہ بنے ہوئے عزت دار ذلیل ہوں گے اور بلاوجہ محروم کیے گئے افراد عزیز ہوں گے۔ ایک گروہ قعر جہنم میں رہے گا۔ دوسرا گروہ بہشت کے اعلیٰ علیین میں قیام پذیر ہوگا۔ اور یہ خدائی عظیم و وسیع انقلاب کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے امام زین العابدینؑ سے منسوب ایک روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا: "خافضة خفضت واللہ باعداءاللہ

---

[1] "اذا" ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا ناصب لفظ "لیس" ہے کہ جو دوسری آیت میں آیا ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں۔ "یوم الجمعۃ لیس لی شغل" جمعہ کے دن میرا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس کا ناصب "اذکر" مقدر ہو یا کان کذا وکذا کا جملہ (کشاف زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔ لیکن پہلا احتمال سب سے زیادہ مناسب ہے۔

[2] ضمیر کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ تقدیر عبارت میں "نفس کاذبۃ" یا "قضیۃ کاذبۃ" ہے (ضمنی طور پر "لوقعتها" کے لام کو بعض مفسرین نے توقیت سمجھا ہے۔)

[3] "خافضة رافعة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور اصل میں ھی خافضة رافعة تھا۔

فی النار "رافعة" رفعت والله اولیاء الله الی الجنة " قیامت خافضہ ہے کیونکہ خدا کی قسم وہ دشمنانِ خدا کو جہنم کی آگ میں گرا دے گی اور رافعہ خدا کی قسم اولیاء اللہ کو بہشت میں لے جائے گی۔[1]

اس کے بعد اسی سلسلہ میں توصیف کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے : " یہ اس وقت ہوگا کہ جس وقت زمین شدت کے ساتھ لرزنے لگے گی" (اذا رجت الارض رجًا)۔ یہ زلزلہ اس قدر عظیم و شدید ہوگا کہ پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ (و بست الجبال بسًا)۔ " اور غبار کی شکل میں بکھر جائیں گے": (فکانت هباءً منبثًا)۔ " رجت " کا مادہ " رج " (بروزن حج) ہے۔ جس کے معنی شدید حرکت کرنے کے ہیں اور اضطراب کو " رجرجة " کہا جاتا ہے۔ " بست " کا مادہ " بس " ہے اور دراصل آٹے کو پانی سے نرم کرنے کے معنی میں ہے۔ " هباء " غبار کے معنی میں ہے اور " منبثا " پراگندہ اور منتشر کے معنوں میں ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ " هباء " بہت ہی چھوٹا غبار ہے جو فضا میں معلق ہو اور عام حالات میں نظر نہ آتا ہو مگر اس وقت کہ جب سورج کی روشنی کسی سوراخ کے ذریعے اندھیرے کی جگہ داخل ہو جائے۔ اب سوچنا چاہیئے کہ وہ زلزلہ کس حد تک سنگین ہوگا جو ایسے بڑے بڑے پہاڑوں کو جو اپنے استحکام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں اس طرح تتر بتر کر دے گا کہ وہ بکھرے ہوئے غبار میں بدل جائیں گے اور جو آواز اس عظیم دھماکے کی وجہ سے بلند ہوگی وہ اس سے بھی زیادہ وحشت ناک ہوگی۔ بہرحال قرآنی آیات میں قیامت کے قریب پہاڑوں کی وضع اور ان کی کیفیت کے بارے میں طرح طرح کی تعبیریں بیان ہوئی ہیں جو حقیقت میں پہاڑوں کے مختلف مرحلوں میں بہت بھیانک انداز میں پھٹنے کی خبر دیتی ہیں۔ پروردگارِ عالم کبھی فرماتا ہے : " پہاڑ حرکت میں آجائیں گے": (و تسیر الجبال سیرًا) (طور۔ ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے : " پہاڑ اپنی جگہ سے اکھاڑ دیے جائیں گے"۔ (واذا الجبال نسفت) (مرسلات۔ ۱۰) اور کبھی فرماتا ہے : " انہیں اٹھا دیا جائے گا اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے": (فدکتا دکة واحدة) (حاقہ۔ ۱۴)۔ اور کبھی فرماتا ہے : " ریت کے تہہ بہ تہہ ٹیلوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (و کانت الجبال کثیبًا مهیلًا) (مزمل۔ ۱۴)۔ کبھی فرماتا ہے : " وہ غبار کی شکل میں پراگندہ ہو جائیں گے"۔ (زیر بحث آیت) اور آخر میں فرماتا ہے " دھنکی ہوئی روئی کی طرح ایسے فضا میں بکھر جائیں گے کہ صرف ان کا رنگ نظر آئے گا": (و تکون الجبال کالعهن المنفوش) (قارعہ۔ ۵)

ہاں البتہ خدا کے علاوہ کوئی پورے طور پر نہیں جانتا کہ ان حادثوں کا کون سا راستہ ہے اور یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جو ہمارے الفاظ کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن یہ تمام پُر معنی اشارے اس دھماکے کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس عظیم واقعہ یعنی قیامت کے وقوع کے بیان کے بعد اس دن لوگوں کی جو حالت ہوگی اس کو پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قرآن انہیں تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے : " اس روز تم تین گروہ ہو جاؤ گے" (و کنتم ازواجًا ثلاثة)۔ ہمیں معلوم ہے کہ لفظ " زوج " مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ ان معاملات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو باہم قریب ہوں؛ چونکہ آدمیوں کی مختلف صنفیں قیامت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں گی۔ لہٰذا ان کے لیے ازواج استعمال ہوا ہے۔ پہلے گروہ کے بارے میں فرماتا ہے : " پہلے اصحاب میمنہ ہیں کیا ہیں اصحاب میمنہ" (فاصحاب المیمنة ما اصحاب المیمنة)۔[2]

---

[1] خصال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ، ص ۲۰۴
[2] اپنی ترکیب کے اعتبار سے اس جملہ میں کئی احتمال ہیں جن میں سب سے مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ " اصحاب المیمنة " مبتدا ہے اور " ما " استفہامیہ دوسرا مبتدا اور اصحاب المیمنہ اس کی خبر ہے اور مجموعۃً یہ دونوں پہلے مبتدا کی خبر ہیں اور " فا " جملے کے آغاز میں تفسیر کے عنوان کی حیثیت سے ہے۔

اصحاب میمنہ سے مُراد وہ لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال ان کے سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور یہ صُورت حال قیامت میں نیکوکار، اہلِ نجات مومنین کی نشانی ہوگی۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں اس طرف بارہا اشارہ ہوا ہے۔ یا پھر یہ کہ "میمنہ" "یُمن" سے مشتق ہے جس کے معنی سعادت اور خوش بختی کے ہیں اس اعتبار سے پہلا گروہ سعادت مند اور خوش قسمت افراد کا ہے۔ اس کے بعد والی آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس میں دوسرے گروہ کو "اصحاب المشئمۃ" (شوم سے مشتق) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ آخری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔[۱]

"ما اصحاب المیمنۃ" "کیا کہنے اس خوش قسمت گروہ کے" یہ تعبیر اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ان لوگوں کی خوش قسمتی کی کوئی انتہا نہیں ہے اور یہ بہترین تعریف ہے جو اس گروہ سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص انسان ہے اور انسان بھی کیسا۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اصحاب شوم اور کیا ہیں اصحاب شوم"، (واصحاب المشئمۃ ما اصحاب المشئمۃ)۔ بدبخت، بے چارہ اور بے نوا گروہ، ایسے لوگ جن کا نامہ اعمال ان کے اُلٹے ہاتھ میں دیا جائے گا، جو ان کی بدبختی اور ان کے جرم کی بجائے خود نشانی ہوگا۔ ما اصحاب المشئمۃ "کی تعبیر یہاں بھی ان کی بدبختی اور شقاوت کو ظاہر کرتی ہے۔

آخر میں تیسرے گروہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے "اور سبقت کرنے والے سابقین"۔ (والسابقون السابقون)۔[۲]

"وہی مقرب ہیں"۔ (اولٰئک المقربون)۔ "سابقون" وہ لوگ ہیں جو نہ صرف ایمان میں پیش قدمی کرتے ہیں بلکہ انسانی صفاتِ اخلاق میں بھی سبقت کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے نمونہ ہیں اور مخلوق کے لیے امام و پیشوا ہیں اور اسی وجہ سے خدائے بزرگ و برتر کے مقربین بارگاہ ہیں۔ اس بنا پر اگر بعض مفسرین نے ان کے سابق ہونے کو اطاعتِ خداوندی یا پنجگانہ نماز یا جہاد یا ہجرت یا توبہ سے متعلق کیا ہے تو ہر ایک نے اس وسیع مفہوم کے صرف ایک گوشہ کی طرف توجہ کی ہے ورنہ یہ لفظ دوسری نیکیوں اور برکتوں کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور پھر اسلامی روایات میں اگر کبھی "السابقون" کا مصداق ان چار افراد کو قرار دیا گیا ہے یعنی اوّل ہابیل دوسرے مومن آلِ فرعون، تیسرے حبیب نجار کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اُمت کے مقابلے میں پیش قدمی کی ہے اور چوتھے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام جو مردوں میں سب سے پہلے صاحب ایمان تھے۔ یہ ایک واضح اور صحیح مصداق کی نشان دہی ہے اور مصداق آیت کو محدود کرنے کے معنی میں نہیں ہے۔[۳]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسُولِ خدا نے فرمایا کہ: اتدرون من السابقون الی ظل اللہ یوم القیامۃ "کیا تم

---

[۱] اگرچہ بعد والی آیت میں اصحاب المشئمۃ کی جگہ اصحاب الشمال آیا ہے۔

[۲] اس آیت کی اور اس کے بعد والی آیت کی ترکیب کے بارے میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ پہلا "السابقون" مبتدا ہے اور دوسرا اس کی صفت یا تاکید ہے اور "اولٰئک المقربون" مبتدا اور خبر ہو کر مجموعہ خبر ہے السابقون اوّل کی۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ "السابقون السابقون" مبتدا و خبر ہیں۔ "ابوالنجم" کے مشہور شعر کی طرح جس میں وہ کہتا ہے: انا ابوالنجم وشعری شعری، "میں ابوالنجم ہوں اور میرا شعر صرف میرا ہی شعر ہے" یہ واقعی ایک عالی تعریف و توصیف ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلے "السابقون" کے معنی ہیں ایمان میں سبقت کرنے والے اور دوسرے السابقون کے معنی ہیں جنت کی طرف سبقت کرنے والے اس صورت میں بھی یہ مبتدا و خبر ہی ہوں گے۔

[۳] یہی معنی ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہیں۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۱۵۔

جانتے ہو کہ قیامت میں لطفِ پروردگار کے سایہ میں کون لوگ ہوں گے اصحاب نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسولؐ زیادہ آگاہ ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

الذین اذا اعطو الحق قبلوه واذا سألوه بذلوه وحكموا للناس كحكمهم لانفسهم ۔

"وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں حق دیا جائے تو اُسے قبول کر لیتے ہیں اور جب ان سے حق کا سوال کیا جائے تو وہ اسے مسائل تک پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کے بارے میں اسی طرح حکم کرتے ہیں جس طرح اپنے بارے میں حکم کرتے ہیں"[1]

بعض روایتوں میں السابقون کا مفہوم مرسل و غیر مرسل پیغمبر بتایا گیا ہے[2]

ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ ابنِ عباس کہتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے اس طرح کہا ہے: (ذالك علی وشیعته هو السابقون الی الجنة، المقربون من الله بكرامته لهم)" وہ علیؑ اور ان کے پیروکار ہیں جو بہشت کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں اور وہ مقربین بارگاہِ خدا ہیں۔ اس احترام کی بنا پر جو خدا کی نظر میں ان کا ہے"[3]

یہ بھی درحقیقت مذکورہ بالا مفاہیم کے واضح مصداقوں کا بیان ہے، ایسا مفہوم کہ جس میں ہر ملت و اُمت کے تمام سابقین شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک مختصر سے جملہ میں مقربین کے مقام بلند کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "مقربین جنت کے پُر نعمت باغات میں ہیں" (فی جنات النعیم)[4]

جنات النعیم کے مفہوم میں بہشت کی مادی و معنوی تمام اقسام کی نعمتیں شامل ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ صرف جنت کے باغات ہی نعمتوں کا مرکز ہیں، برخلاف باغات دنیا کے جو کبھی کبھی وسیلۂ زحمت بھی ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ مقربین کی آخرت کی حالت ان کی دنیا کی حالت سے مختلف ہے کیونکہ دُنیا میں ان کا مقام بلند اپنے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا پہلو بھی رکھتا ہے جب کہ آخرت میں صرف نعمت کا سبب ہے۔ واضح رہے کہ یہاں قرب سے مُراد "قرب مقامی" ہے نہ کہ "قرب مکانی"۔ اس لیے کہ خدا مکان نہیں رکھتا اور وہ ہم سے ہماری نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس کے بعد والی آیت میں گزشتہ اُمتوں اور اس اُمت کے افراد کی تقسیم کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "بہت سے گروہ گزشتہ اُمتوں میں سے ہیں" (ثلة من الاولین)۔" اور ایک چھوٹا سا گروہ آخری اُمت میں سے ہے" (و قلیل من الاخرین)۔ "ثلة" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے۔ اصل میں پشم کے مجتمع ٹکڑوں کے معنی میں ہے اور اس کے بعد جماعت یا گروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے "ثل عرشه" "اس کا تخت گر پڑا اور اس کی حکومت ختم ہو گئی" سے مشتق سمجھا ہے۔ اور وہ اسے قطعہ کے معنی میں سمجھتے ہیں یہاں مقابلہ کے قرینہ کے ماتحت (قلیل من الاخرین) کے ساتھ قطعہ عظیم کے معنی میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مطابق مقربین کے

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۱۳۲

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۰۶

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۰۹

[4] فی جنات النعیم (جار و مجرور) ہو سکتا ہے مقربین سے متعلق ہوں یا ایک محذوف سے متعلق ہو جو حال ہے مقربین کے لیے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ کائنین فی جنات النعیم۔ یا خبر کے بعد خبر ہے۔

زیادہ گروہ گزشتہ اُمتوں میں سے ہیں اور ان میں سے صرف تھوڑے سے اُمتِ محمدیہؐ میں سے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہاں یہ سوال درپیش ہو کہ یہ صورتِ حال اُمتِ اسلامیہ کی حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ کس طرح مطابقت رکھتی ہے، جب کہ خدا انہیں بہترین اُمت کے خطاب سے نوازتے ہوئے فرماتا ہے: کنتم خیر امۃ۔ (آل عمران۔ ۱۱۰)۔ اس سوال کا جواب دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ پہلا یہ کہ مقربین سے مُراد وہی سابقین اور ایمان میں پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ اُمتِ اسلامی میں صدرِ اوّل میں اسلام کو قبول کرنے کی طرف پیش قدمی کرنے والے تھوڑے سے افراد تھے۔ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ اور عورتوں میں حضرت خدیجہؑ تھیں جب کہ گزشتہ پیغمبروں کی کثرت اور ان کی اُمتوں کی تعداد اور ہر اُمت میں پیش قدمی کرنے والوں کا موجود ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ تعداد میں زیادہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ عددی کثرت کیفی کثرت کی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس اُمت کے سابقین کی تعداد کم ہو لیکن مرتبہ و مقام کے لحاظ سے بہت ہی افضل و برتر ہو جیسا کہ خود پیغمبروں میں بھی فرق ہے۔ (تلک الرسل فضلنا بعضھم علٰی بعض) "ہم نے بعض رسولوں کو دوسرے بعض پر فضیلت و برتری دی۔" (بقرہ۔ ۲۵۳) اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض مومنین ایمان میں سبقت کرنے والوں کے زمرے میں نہ ہوں لیکن دوسری صفات و خصوصیات کے حامل ہوں جو انہیں سابقین کے ہم پلّہ قرار دیں اور اجر و جزا کے اعتبار سے وہ السابقون کے برابر ہوں۔ اسی لیے بعض روایات میں امام محمد باقرؑ سے اس طرح منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن السابقون السابقون ونحن الاٰخرون "ہم السابقون السابقون ہیں اور ہم آخرون بھی ہیں۔"[۱]

ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے پیروکاروں کی ایک جماعت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

(انتم السابقون الاولون والسابقون الاٰخرون والسابقون فی الدنیا الٰی ولایتنا وفی الاٰخرۃ الی الجنۃ) "تم پہلے سابقون اور آخری سابقون ہو۔ تم دنیا میں ہماری ولایت کی طرف سبقت کرنے والے ہو اور آخرت میں جنّت کی طرف سبقت کرنے والے۔"[۲]

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض مفسرین اوّلین و آخرین کا مصداق اوّلینِ اُمتِ اسلام اور آخرینِ اُمتِ اسلام کو بتاتے ہیں۔ لہٰذا اس تفسیر کے مطابق تمام مقربین اُمتِ اسلامی میں سے ہیں۔ لیکن یہ نقشہ نہ تو ظاہرِ آیات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ان روایات کے ساتھ ہی جو ان آیتوں کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں جو گزشتہ اُمتوں کے افراد کو بھی خصوصیت کے ساتھ سابقین و اوّلین کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔

۞ ۞ ۞

---

[۱] تفسیر صافی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر صافی زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

١٥۔ عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ ۙ

١٦۔ مُّتَّكِـِٕیۡنَ عَلَیۡهَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ۝

١٧۔ یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۙ

١٨۔ بِاَكۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۙ۬ وَ كَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ۙ

١٩۔ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡهَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ۙ

٢٠۔ وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ۙ

٢١۔ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ ؕ

٢٢۔ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ۙ

٢٣۔ كَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُـؤِ الۡمَكۡنُوۡنِ ۚ

٢٤۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

٢٥۔ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ۙ

٢٦۔ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝

ترجمہ

۱۵۔ وہ صف کشیدہ اور ایک دُوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہیں ۔

۱۶۔ ان پر تکیہ لگائے ہوئے ایک دُوسرے کے رُوبرو ہیں ۔

۱۷۔ نوجوانانِ جاودانی (شکوہ اور طراوت ہیں) ہمیشہ ان کے گرد پھرتے ہیں۔

۱۸۔ پیالوں کوزوں اور بہشت کی جاری نہروں کے جام لیے ہوئے ۔

۱۹۔ لیکن ایسی شراب کہ نہ جس سے دردِ سر ہوتا ہے نہ وُہ مست ہوتے ہیں ۔

۲۰۔ اور ہر قسم کے پھل جس کی طرف وہ مائل ہوں ۔

۲۱۔ اور ہر قسم کے پرندہ کا گوشت جسے وہ چاہیں ۔

۲۲۔ اور حور العین میں سے بیویاں

۲۳۔ صدف میں پنہاں مروارید کی مانند ۔

۲۴۔ یہ سب جزا ہے ان اعمال کی جنہیں وہ انجام دیتے تھے ۔

۲۵۔ بہشت کے ان باغوں میں وہ نہ کوئی بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ گناہ سے آلودہ باتیں ۔

۲۶۔ تنہا وہ چیز جسے وہ سُنیں گے سلام ہی سلام ہے ۔

تفسیر

جنّت کی وہ نعمتیں جو مقربین کی منتظر ہیں

یہ آیتیں انواع و اقسام کی نعمتوں کو جو تیسرے گروہ یعنی مقربین کا نصیب ہوں گی بیان کرتی ہیں ، وہ نعمتیں جن میں سے ہر ایک

دُوسری سے زیادہ شوق انگیز و رُوح پرور ہے وہ نعمتیں جنہیں سات حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے : "وہ صف کشیدہ اور ایک دوسرے سے پیوستہ پلنگوں پر بیٹھے ہوں گے"۔ (علیٰ سرر موضونۃ).
ان پر تکیہ لگائے ایک دوسرے کے رُوبرو محبت اور خوشی سے پُر۔ (متکیین علیھا متقابلین)۔ "سرر" جمع ہے "سریر" کی جس کا مادہ "سرور" ہے۔ اس کے معنی ایسے پلنگ اور تخت ہیں کہ جن پر صاحبانِ نعمت محفلِ مسرت میں بیٹھے ہوں گے[1]
"موضون" کا مادہ "وضن" ہے (بروزن وزن) اس کے معنی زرہ بُننے کے ہیں۔ اس کے بعد اس کا ہر اس بُنی ہوئی چیز پر اطلاق ہوا ہے جس کے تار و پود محکم ہوں یہاں اس سے مُراد پلنگ اور تخت ہیں جو ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں ملے ہوئے ہوں یا پھر یہ کہ یہ پلنگ ایک خاص قسم کی بافت رکھتے ہوں گے اور لولو و یاقوت وغیرہ سے بنے ہوئے ہوں گے جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ بہر حال ان پلنگوں کی ساخت اُن کے بچھائے جانے کی جگہ اور وہ مجلس اُنس وہاں تشکیل پائے گی اور سرور و شادمانی کی لہر جو اس میں موجزن ہوگی، ہر قسم کی تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ قرآن مجید میں بار ہا جنّت کے پلنگوں کی اور اہلِ بہشت کی اجتماعی محفلوں کی نہایت عُمدہ تعریف ہوئی ہے، جو بتاتی ہے کہ ان لذتوں میں سے ایک لذت یہی محافل اُنس و محبت ہیں۔ رہا یہ کہ وہاں موضوعِ سخن کیا ہوگا اسے کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیا وہ اسرارِ آفرینش کے بارے میں گفتگو کریں گے اور خدا کی تخلیق کے عجائبات کو موضوعِ سخن بنائیں گے یا اصولِ معرفت اور اسمائے حُسنیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ یا وہ حوادث جو اس دنیا میں رُونما ہوئے عنوانِ کلام ہوں گے یا وہ جانکاہ مصائب، جن کے سبب سے انہیں راحت و آسودگی ملی۔ یا کچھ اور ہوں گے جن کے ادراک کی ہم اس دنیا میں طاقت نہیں رکھتے، کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔

اس کے بعد ان کی دُوسری نعمت کے سلسلہ میں فرماتا ہے : "ایسے نوجوان جو ہمیشہ جوانی کے بانکپن اور اس کی تازگی سے بہرہ ور رہتے ہیں ان کے گرد و پیش مصروفِ خدمت ہوں گے"۔ (یطوف علیھم ولدان مخلدون)۔ "یطوف" کا مادہ طواف ہے اس سے ان کی مُستقل خدمت کی طرف اشارہ ہے۔ "مخلدون" کی تعبیر اس صورت میں کہ تمام اہلِ بہشت جاودانی ہیں، ان کے نشاطِ جوانی تازگی اور خوبصورتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ بات کہ یہ نوجوان کون ہیں، اس کے بارے میں مختلف تفسیریں ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ دُنیا کے وہ فرزند ہیں جو بلوغ سے پہلے راہیٔ مُلکِ عدم ہو گئے اور چونکہ انہوں نے کوئی نیکی یا بُرائی نہیں کی اس لیے اللہ کے کرم کے نتیجے میں انہیں یہ منصب ملا ہے۔ وہ اپنے اس کام میں بہت لذّت محسوس کرتے ہیں کہ وہ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ بات ایک حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے لیکن ایک تفسیر میں ملتا ہے کہ وہ مشرکین کے بچے ہیں جو بے گناہ ہونے کی بنا پر اس مرتبہ پر فائز ہوئے ہیں کیونکہ مومنین کے بچے تو اپنے ماں باپ کے پاس ہوں گے۔ تیسری تفسیر یہ بتاتی ہے کہ وہ جنّت کے خدمت گار ہیں جنہیں خدا نے اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ خوبصورت نوجوان شرابِ طہور سے لبریز، ایسے پیالے، کُوزے اور جام لیے ہوئے ہوں گے جو جنّت کی نہروں کے مشروبات سے بھرے ہوں گے۔ یہ اہلِ بہشت کے گرد پھریں گے اور انہیں سیراب کریں گے۔
(باکواب واباریق وکأس من معین)[2]

---

[1] مفردات راغب مادہ "سر"
[2] "اکواب" "کوب" کی جمع ہے اس کے معنی پیالہ یا دستہ دار ظرف ہے۔ "اباریق" "ابریق" کی جمع ہے۔ "آب ریز" فارسی سے لیا گیا ہے۔ یہ ایسے برتنوں کے معنی میں ہے جن میں دستہ او ٹونٹی ہوتی ہے۔ "کأس" لبریز جام کو کہا جاتا ہے۔ "معین" کا مادہ "معن" (بروزن صحن) ہے جس کے معنی جاری ہیں۔

لیکن یہ شراب ایسی نہ ہوگی جو ہوش اُڑا دے اور مست کر دے۔ جس وقت جنت میں رہنے والے اسے پئیں گے تو انہیں نہ دردِ سر لاحق ہوگا نہ وہ مست و بے ہوش ہوں گے۔ (لا یصدعون عنہا ولا ینزفون)[1]

ان پر صرف ایک ایسے رُوحانی نشہ کی کیفیت طاری ہوگی جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ یہ ان کے وجود کو بے مثل لذت سے ہمکنار کرے گی۔

اس کے بعد بہشت میں حاصل ہونے والی مادّی نعمتوں کے چوتھے اور پانچویں حصّہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: بہشتی نوجوان ہر قسم کے وہ پھل جن کی طرف اہلِ بہشت مائل ہوں گے ان کی خدمت میں پیش کریں گے: (وفاکھة مما یتخیرون)[2]۔

اور ہر قسم کے پرندے کا گوشت جسے وہ چاہیں گے: (ولحم طیر مما یشتھون)۔ پھل کو گوشت پر مقدم رکھنا اس وجہ سے ہے کہ غذائیت کے اعتبار سے وہ بہتر اور قیمتی ہے۔ علاوہ ازیں کھانے سے قبل پھل کھانا ایک کیفیت خاص رکھتا ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درختوں کی شاخیں مکمل طور پر اہلِ بہشت کی دسترس میں ہوں گی، اس طرح کہ وہ ہر قسم کا پھل بہ آسانی حاصل کر کے تناول کریں گے۔ یہ معنی دوسری بہشتی غذاؤں پر بھی صادق آتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جس وقت خدمت گار یہ نعمتیں لے کر ان کے سامنے آئیں گے تو اس کا لُطف کچھ اور ہی ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بہشت میں رہنے والے افراد کا ایک قسم کا احترام ہے اور ان کی محافلِ انس کی رونق میں اضافہ کا باعث ہے۔ خود اس دنیا کی تمام محفلوں میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ باوجودیکہ پھل اور دیگر ماکولات مہمانوں کی دسترس میں ہوتے ہیں پھر بھی میزبان خود ان اشیا کا تعارف کراتا ہے اور یہ ایک قسم کا احترام شمار ہوتا ہے۔ گوشت کی اقسام میں سے پرندوں کا گوشت چونکہ بہتر ہوتا ہے لہٰذا صرف اسی پر انحصار کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ پھل کے بارے میں "یتخیرون" "انتخاب کریں گے" اور گوشت کے بارے میں "یشتھون" "اشتہار رکھتے ہیں" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بعض مفسّرین ان دونوں تعبیروں کے درمیان فرق محسوس کرتے ہیں لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ دونوں ہم معنی ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ اہلِ جنت جس قسم کی غذا پسند کریں گے وہ ان کے خدمت گاروں کے اختیار میں دے دی جائے گی۔ اس کے بعد چھٹی نعمت یعنی پاک و پاکیزہ بیویوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: "اور حورالعین میں سے بیویاں رکھتے ہیں": (وحور عین)[3]

"مثل صدف میں پنہاں مروارید" (کامثال اللؤلؤ المکنون)۔ حور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے "حوراء" کی جمع ہے اور "احور" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کی آنکھ کی پتلی مکمل طور پر سیاہ ہو اور باقی حصّہ کی سفیدی بالکل صاف و شفاف ہو اور "عین" "عیناء"

---

[1] "یصدعون" "صداع" (بروزن حباب) کے مادہ سے ہے اس کے معنی دردِ سر کے ہیں۔ یہ لفظ اصل میں "صدع" یعنی چیرنے کے معنی میں ہے۔ انسان جب شدید درد سے دوچار ہو تو دردِ سر کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سر پھٹ جائے گا اس لیے یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "ینزفون" "نزف" کے مادہ سے ہے اس کے معنی ہیں کنویں کا تمام پانی آہستہ آہستہ نکال لینا۔ یہ مستی اور عقل کی گم شدگی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] "فاکھة" اور "لحم" دونوں اکواب پر معطوف ہیں اور اس طرح وہ ایسی چیزوں میں سے ہیں کہ جو (ولدان مخلدون) کے ذریعے مقربین کے لیے ہدیہ بنیں گے۔

[3] اگرچہ بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ "حور عین" "غلمان مخلدون" پر عطف ہے اس لیے وہ بھی جنتیوں کے گرد گھومتے رہتے ہیں لیکن اس کے پیشِ نظر کہ یہ معنی اہلِ بہشت کی محفلوں سے مناسبت نہیں رکھتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے (ولھم حور عین) اور ان کے لیے حورالعین ہیں۔

اور "اعین" جس کی جمع ہے موٹی آنکھ کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان کی خوبصورتی زیادہ تر اس کی آنکھوں کی وجہ سے ہوتی ہے لہٰذا اس بات پر خصوصیت کے ساتھ انحصار کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حور کا مادہ "حیرت" ہے یعنی وہ اتنی خوبصورت ہیں کہ جنہیں دیکھ آنکھیں حیران رہ جائیں گی۔[1]

مکنون کے معنی پوشیدہ کے ہیں یہاں مُراد صدف میں پوشیدہ ہونا ہے کیونکہ مروارید جب تک صدف میں ہوں انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا اور وہ سدا خوبصورت اور صاف و شفاف رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ وہ دوسروں کی آنکھوں سے مکمل طور پر مستور ہوں نہ انہیں کسی کا ہاتھ لگا ہے اور نہ ان پر کسی کی نظر پڑی ہے۔ ان چھ مادّی نعمتوں کے بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے: "یہ سب کچھ جزا ہے ان اچھے اعمال کی جو انہوں نے انجام دیے ہیں"۔ (جزاءً بما کانوا یعملون)۔ تاکہ یہ تصور نہ ہو کہ یہ تمام نعمتیں اہل بہشت کو کسی حساب و کتاب کے بغیر دی جائیں گی، یا یہ کہ صرف ایمان و عمل صالح کا دعویٰ کرنا ان کے حصول کے لیے کافی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ مسلسل خالص عمل کی ضرورت ہے تاکہ خدا کی یہ مہربانیاں انسان کو نصیب ہو سکیں۔ (توجہ فرمایئے "یعملون" فعل مضارع ہے اور استمرار کے معنی رکھتا ہے)۔

ساتویں اور آخری نعمت جو معنوی پہلو رکھتی ہے یہ ہے کہ وہ جنت کے باغات میں لغو، بے ہودہ اور گناہ آلودہ باتیں نہیں سُنیں گے۔ (لا یسمعون فیہا لغوًا ولا تأثیمًا)۔ نہ وہاں جھوٹ تہمت اور افتراء کا وجود ہے، نہ غیبت ہے، نہ تمسخر، نہ تکلیف دہ گفتگو، نہ تلخ کلمات اور نہ لغو و بے ہودہ اور بے بُنیاد باتیں ہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ لطف و کرم ہے، خوبصورتی ہے، متانت و ادب اور پاکیزگی ہے۔ کیا ہی عمدہ ہو گا وہ ماحول کہ جس میں بُری باتیں نہ ہوں۔ اگر ہم ٹھیک طرح غور کریں تو ہماری اس دُنیاوی زندگی کی زیادہ تر ناراضی و پریشانی کا سبب یہی لغو بے ہودہ تکلیف دہ اور گناہ آلود باتیں ہیں جو دلوں کو دُکھاتی ہیں اور ان پر زخم لگاتی ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "واحد بات جو وہاں وہ سُنیں گے وہ سلام ہی سلام ہے": (الّا قیلًا سلامًا سلامًا)۔[2]

یہ سلام خدا کی طرف سے ہے، یا فرشتوں کی طرف سے ہے، یا خود اہل بہشت کی طرف سے ہے، یا ایک دوسرے کے لیے، یا یہ سب صورتیں مُراد ہیں۔ مناسب ترین تفسیر آخری تفسیر ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات قرآنی میں خدا اور اہل بہشت کے ایک دوسرے کو سلام کرنے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[3]

جی ہاں وہ سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں سُنیں گے۔ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کا سلام و درُود اور ایک دوسرے کو خود ان کا سلام و درُود اور ان پاکیزہ محفلوں میں جو دوستی اور محبت سے معمور ہیں ان کا ماحول سلامتی سے پُر ہے اور یہی معنی ان کے پُورے

---

[1] ابو الفتوح رازی جلد ۱۱ آیہ زیر بحث کے ذیل میں۔

[2] "سلامًا" مفعول بہ ہے "قیلًا" کے لیے جو مصدر ہے قول کی طرح یعنی ان کی گفتگو وہاں سلام ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "سلامًا" "قیلًا" کے لیے صفت ہو یا مفعول بہ (یا مفعول مطلق) ہے فعل محذوف کے لیے اور تقدیر عبارت میں "یسلمون سلامًا" ہے لیکن پہلے معنی سب سے بہتر ہیں۔ دوسرا سلامًا تاکید کے لیے ہے۔

[3] یٰسین آیت ۵۸۔ رعد ۲۴ یونس ۱۰۔

وجود پر حاوی ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ اسی محور کے گرد گھومتا ہے اور ان کی عام گفتگو اور تکلم کا نتیجہ سلام وصلح و صفا پر منتہی ہوتا ہے۔ اصولی طور پر بہشت دارالسلام ہے اور سلامتی و امن کا گھر ہے جیسا کر سورہ انعام کی آیت ۱۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں۔

"لهم دار السلام عند ربهم"[1]

✣ ✣ ✣

---

[1] آپ کی توجہ ہونی چاہیئے کہ "الا قیلا سلاما سلاما" میں استثناء، استثنائے منقطع ہے اور تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

۲۷۔ وَاَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ ۙ۬ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ ؕ

۲۸۔ فِىۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ۙ

۲۹۔ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ۙ

۳۰۔ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ۙ

۳۱۔ وَّمَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ ۙ

۳۲۔ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ ۙ

۳۳۔ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ ۙ

۳۴۔ وَّفُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ ؕ

۳۵۔ اِنَّاۤ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً ۙ

۳۶۔ فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا ۙ

۳۷۔ عُرُبًا اَتۡرَابًا ۙ

۳۸۔ لِّاَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ؕع

۳۹۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِيۡنَ ۙ

۴۰۔ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ؕ

ترجمہ

۲۷۔ اور اصحاب یمین کیا ہیں اصحاب یمین ؟

۲۸۔ وہ بیری کے بے خار درخت کے سائے میں مقیم ہیں ۔

۲۹۔ اور پُر برگ درخت طلح کے سائے میں رہتے ہیں ۔

۳۰۔ اور لمبے اور وسیع سائے ہیں ۔

۳۱۔ اور آبشاروں کے پاس ۔

۳۲۔ اور فراواں پھل ۔

۳۳۔ جو کبھی مقطوع ہوتے ہیں نہ ممنوع ۔

۳۴۔ اور گراں قدر ہمسران (بیوی یا شوہر) ۔

۳۵۔ ہم نے انہیں نئی تخلیق عطا کی ہے ۔

۳۶۔ اور ہم نے سب کو بکر قرار دیا ۔

۳۷۔ ایسی بیویاں جو اپنے شوہروں سے عشق رکھتی ہیں اور خوش زبان، فصیح و بلیغ اور ہم سن ہیں ۔

۳۸۔ یہ سب اصحاب یمین کے لیے ہے۔

۳۹۔ جن کا ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے۔

۴۰۔ اور ایک گروہ آخری اُمت میں سے ہے ۔

تفسیر

وہ نعمتیں جو اصحاب یمین کو حاصل ہوں گی

ان مادی اور معنوی نعمتوں کے بیان کے بعد (جو مقربین بارگاہ الٰہی کو حاصل ہوں گی) بات اصحاب الیمین تک جا پہنچی ہے۔ وہ سعادت مند جماعت جن کا نامہ اعمال امتحانات الٰہی میں کامیابی کی علامت کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ یہاں پروردگار عالم اپنی نعمتوں میں سے چھ کی طرف اشارہ کرکے فرماتا ہے: مقربین کے لیے جو نعمتیں بیان ہوئیں وہ سات تھیں یہ چھ ہیں یعنی ایک نعمت کم ہے۔ سب سے پہلے ان کے مرتبہ کی بلندی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اصحاب الیمین، کیا کہنا اصحاب الیمین کا" (واصحاب الیمین ما اصحاب الیمین)[1]

یہ افضل ترین تعریف ہے جو ان کی ہوئی ہے کیونکہ ایسی تعبیر ان مواقع پر ہوتی ہے جب کسی کے اوصاف بیان سے باہر ہوں۔ بہر کیف یہ تعبیر اصحاب الیمین کے بلند مرتبہ کو بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد کی آیت اس گروہ کو حاصل ہونے والی پہلی نعمت کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ "وہ ایسے بیر کے درخت کے نیچے جگہ پائیں گے جس میں کانٹے بالکل نہیں ہیں"۔ (فی سدر مخضود)[2]

حقیقت میں یہ بہترین تعریف ہے جو جنت کے درختوں کے لیے ہمارے دُنیاوی الفاظ کے قالب میں ڈھل سکتی ہے۔ "سدر" بعض ارباب لغت کے بقول ایک تناور درخت ہوتا ہے جس کی بلندی بعض اوقات چالیس میٹر تک پہنچ جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر دو ہزار سال تک ہوتی ہے۔ (اس کا سایہ بہت گھنا اور پُر لطف ہوتا ہے)۔ اس درخت میں صرف ایک عیب ہے کہ اس میں کانٹے ہوتے ہیں لیکن "مخضود" کا لفظ "خضد" کے مادہ سے ہے۔ (بروزن مجد) اس کے معنی ہیں کانٹوں کا قطع کردینا۔ اس لفظ کے استعمال کے بعد جنت کے "سدر" نامی درخت کی یہ مشکل بھی حل ہوگئی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قرآن کے بعض الفاظ اصحاب پیغمبر کے لیے مشکل ہو جاتے تو وہ کہتے کہ بادیہ نشین عربوں کے سوالات کی برکت سے پروردگار ہم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دن ایک صحرا نشین عرب پیغمبر کی خدمت میں آیا اور عرض کیا اے خدا کے رسولؐ خدا نے قرآن میں ایک تکلیف پہنچانے والے درخت کا نام لیا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جنت میں اس قسم کا درخت کیسے ہوگا۔ فرمایا کونسا درخت؟ اس نے کہا "سدر" کا کیونکہ اس میں تو کانٹے ہوتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: کیا خدا نے نہیں فرمایا؟ فی سدر مخضود۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے کانٹے دُور کردیے گئے ہیں اور ہر کانٹے کی جگہ پھل لگا دیا گیا ہے اور پھل بھی ایسا کہ جس میں بہتر[3] قسم کا غذائی مادہ ہے جن میں سے ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتا

دوسری نعمت یہ ہے کہ وہ "طلح متراکم" کے درختوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے ہیں (وطلح منضود)[4] "طلح" ایک ایک سبز خوش رنگ اور خوشبودار درخت ہے۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ وہ کیلے کا درخت ہے جس کے چوڑے سبز اور خوبصورت پتے ہوتے ہیں

---

[1] اس جملہ کی ترکیب اس سورہ کی آیت ۸ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

[2] جار مجرور مقدر عامل سے متعلق ہے اور مجموعہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح تھی۔ (ھم فی سدر مخضود)

[3] رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۲۰۔ درالمنثور جلد ۶ ص ۱۵۶

اور اس کا پھل خوش ذائقہ اور شیریں ہوتا ہے۔ "منضود" کا مادہ "نضد" ہے جس کے معنی تہ بر تہ ہونے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس کے پتوں یا پھلوں کے تہ بہ تہ ہونے کی وجہ سے ہو یا دونوں کی وجہ سے ہو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ درخت پھلوں سے اس طرح لدے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کا تنا اور ٹہنیاں پھلوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس امر کے پیش نظر کہ سدر کے درخت کے پتے کافی چھوٹے ہوتے ہیں اور کیلے کے پتے بڑے ہوتے ہیں، ان دو درختوں کا ذکر جنت کے تمام درختوں کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو ان دونوں درختوں کے درمیان قرار پاتے ہیں۔[1]

تیسری بہشت کی نعمت کو پروردگار عالم اس طرح بیان فرماتا ہے: "اور طویل و عریض سایہ" (وظل ممدود)۔ بعض مفسرین اس سائے کو بین الطلوعین (طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک) کی حالت سے مشابہ قرار دیتے ہیں جب سایہ ہر جگہ کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ مذکورہ معانی ایک حدیث میں جو روضہ کافی میں ہے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہوتے ہیں۔[2]

مقصود کلام یہ ہے کہ سورج کی گرمی اور اس کی تپش اہل بہشت کو کبھی پریشان نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ پسندیدہ، محبوب، وسیع اور روح پرور سائے میں رہیں گے۔

چوتھے مرحلہ میں جنت کے پانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اہل بہشت آبشار کی مانند پانی (جو خوبصورت اور دلربا منظر رکھتا ہے) کے پاس رہتے ہیں" (وماء مسکوب)۔ "مسکوب" کا مادہ "سکب" (بروزن کبک) ہے اس کے اصل معنی گرنے کے ہیں چونکہ آبشار کی صورت میں پانی کا اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف گرنا بہترین منظر پیش کرتا ہے اور اس کے زمزمے دل کے کانوں کو نوازتے ہیں اور اس کا منظر آنکھوں کو فروغ اور روشنی بخشتا ہے۔ اس لیے یہ امر جنت کی ایک نعمت قرار دیا گیا ہے اور چونکہ یہ درخت اور آب رواں ہمیشہ اپنے ہمراہ انواع و اقسام کے پھل لیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے پانچویں نعمت کے بیان میں مزید فرماتا ہے: "اور فراواں پھل" (وفاکھۃ کثیرۃ)۔ "جو نہ کبھی منقطع ہوتے ہیں نہ ممنوع ہوتے ہیں" (لامقطوعۃ ولاممنوعۃ)۔ جی ہاں وہ پھل اس جہان کے پھلوں کی مانند نہیں ہیں جو صرف اپنی فصل میں آتے ہوں اور سال بھر میں صرف چند مہینے یا چند ہفتے درختوں پر لگتے ہوں اور یہ بھی نہیں کہ کانٹے ان کے حصول کی راہ میں حائل ہوں اور درخت کی بہت زیادہ بلندی (جیسے کھجور کے درخت کی بلندی) بھی ان کے حصول میں مانع نہیں ہے اور خود انسان کے وجود میں کوئی ایسا تقاضا موجود نہیں ہے کہ جو ان کے استعمال سے روکتا ہو اور پھر جنت کا اصل میزبان خداوند منان ہے وہ یا اس کے مامور منتظمین نہ کسی قسم کا بخل رکھتے ہیں نہ ان پھلوں کے استعمال کو منع کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر کوئی امر ایسا نہیں ہے جو ان پھلوں کے استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہو بلکہ صورت حال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہر وقت موجود ہے اور اس کے حصول کی راہ میں جو رکاوٹ ہو سکتی ہے وہ ہر وقت مفقود ہے۔

اس کے بعد ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "وہ گراں قدر اور ہمسر بیویاں رکھتے ہیں" (وفرش مرفوعۃ)۔ "فرش" جمع ہے "فراش" کی جس کے معنی ہر وہ فرش ہے جو بچھایا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے کبھی کبھی بطور کنایہ زوج کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (خواہ مرد ہو یا عورت)۔ اسی بنا پر ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔ الولد للفراش

---

[1] فخر رازی تفسیر کبیر میں در ذیل آیہ زیر بحث جلد ۲۹ ص ۱۶۲

[2] روضہ کافی مطابق نقل نورالثقلین ج ۵ ص ۲۱۶

وللعاهر الحجر)۔ " وہ بچّہ جو شوہردار عورت سے پیدا ہو وہ ہی اس کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اگر درمیان میں کوئی فاسق زناکار مرد ہو تو اس کے حصّہ میں صرف پتھر ہے۔ (اور اس کے نطفہ سے فرزند کے انعقاد کا احتمال قابلِ قبول نہیں ہے)۔ بعض مفسّرین نے فرش کی تفسیر اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے کی ہے۔ (کنایے کے طور پر جو معنی بنتے ہیں انھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہے)، اور انھوں نے اس کو جنّت کے بہت ہی بیش قیمت فرش کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ لیکن اس صورت میں بعد میں آنے والی آیتوں سے ارتباط ختم ہو جائے گا جن میں جنّت کی حوروں اور بیویوں کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد جنّت کی بیویوں کی اور خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے انھیں نئی خلقت و آفرینش بخشی ہے"۔ (انا انشأناهن انشاءً)۔ اس جملے سے ممکن ہے اس دنیا کی مومن بیویوں کی طرف اشارہ مقصود ہو جنہیں خدا قیامت میں نئی خلقت عطا کرے گا اور وہ سب انتہائی شباب کے عالم میں ظاہر و باطنی جمال کے ساتھ جنّت میں داخل ہوں گی اور اگر مُراد حوریں ہوں تو خدا ان کو نئی خلقت عطا کرتے ہوئے اس طرح بنائے گا کہ ضعیفی و ناتوانی کا گرد و غبار ان کے دامنِ حیات کو ہرگز نہیں چھو سکے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مومن بیویوں اور حوروں دونوں کی طرف اشارہ ہو۔ "ہم نے ان سب کو باکرہ قرار دیا ہے"۔ (فجعلناهن ابكارًا)۔ شاید یہ صفت ان کے لیے ہمیشہ باقی رہے جیسا کہ بہت سے مفسّرین نے اس کی تصریح کی ہے نیز روایات میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ مرد سے اختلاط کے باوجود ان کی جسمانی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔[1]

ان بیویوں ہی کی خصوصیات کے بارے میں مزید فرماتا ہے: "وہ اپنے شوہروں سے محبّت رکھتی ہیں اور خوش گفتار و فصیح ہیں"۔ (عربًا)۔ عرب کی جمع عروبة (بروزن ضرورة) ہے یہ اس عورت کے معنی میں ہے جو اپنے مرد سے محبّت کرتی ہے اور پاکدامن ہوتی ہے۔ کیونکہ "اعراب" (بروزن اظہار) آشکار اور ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ فصیح اور خوش گفتار ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ آیت میں دونوں معنی موجود ہوں۔ ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ "وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہیں اور ظاہری و باطنی خوبی اور حُسن و جمال میں ایک دوسرے کے مانند ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بہتر ہے"۔ (اترابًا)۔ "اتراب" جمع ہے "ترب" کی جو "ذہن" کے وزن پر ہے اور اس کے معنی مثل و مانند کے ہیں۔ بعض مفسّرین کے خیال کے مطابق یہ معنی "ترائب" سے لیے گئے ہیں جو سینے کی ہڈیوں کے پنجرے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈیاں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ مشابہت اور برابری ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ ان سب کا سن و سال ان کے شوہروں سے مطابقت رکھتا ہوگا تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات کو مکمل طور پر سمجھ سکیں اور ان کی آپس کی زندگی زیادہ لذّت بخش ہو جائے۔ اگرچہ بعض اوقات سن و سال کا فرق ہوتے ہوئے بھی زندگی لذّت بخش ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ کہ وہ خوبصورتی اور ظاہری و باطنی حُسن و جمال میں ایک جیسے ہوں۔ مشہور و معروف تعبیر کے مطابق "وہ سب اچھے ہیں اور ایک سے ایک بہتر ہے"۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "یہ سب نعمتیں اصحاب الیمین کے لیے ہیں"۔ (لاصحاب اليمين)۔ یہ مذکورہ چھ نعمتوں کے ان کے ساتھ مخصوص ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ مفسّرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ جملہ (انا انشأناهن انشاءً) کے جملہ کی تکمیل ہے۔[2]

---

[1] رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۴۳۔ ضمنًا توجہ کرنی چاہیئے کہ اس حالت کا "فا" تفریع کے ساتھ گزشتہ آیت پر عطف ہوا ہے۔

[2] پہلی صورت میں اصحاب الیمین مبتدا کے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ (هذه كلها لاصحاب اليمين) یہ سب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس گفتگو کے آخر میں فرماتا ہے ان میں سے ایک گروہ پہلی اُمتوں میں سے ہے۔ (ثلة من الاولین)۔ " اور ایک گروہ آخری اقوام میں سے ہے ": (وثلة من الأخرين)۔ " ثلة " کے معنی بپشم کا ایک مجتمع ٹکڑا۔ اس کے علاوہ یہ اس کثیر جماعت کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو باہم ملی جلی ہو۔ تو اس طرح اصحاب الیمین کے عظیم گروہ میں گزشتہ اُمتوں کے افراد بھی شامل ہیں اور اس میں اُمتِ اسلامی کے بھی بہت سے افراد شامل ہیں، کیونکہ اس اُمت میں بہت سے صالحین و مومنین موجود ہیں۔ اگرچہ ملتِ اسلامی میں ایمان قبول کرنے کے سلسلہ میں سبقت کرنے والے افراد کی تعداد سابقہ اُمتوں اور ان کے انبیا کی کثرت کی وجہ سے ان کے سابقین کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصحاب الیمین کے دونوں گروہ اُمتِ اسلامی میں سے ہیں۔ ایک گروہ ان کے اولین میں سے ہے اور ایک گروہ ان کے آخرین میں سے ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

❖ ❖ ❖

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) کچھ اصحاب یمین کے لیے ہے اور دُوسری صُورت میں جار و مجرور انشأناھن کے ساتھ متعلق ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

۴۱۔ وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ۬ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ؕ

۴۲۔ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ۙ

۴۳۔ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ۙ

۴۴۔ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ۝

۴۵۔ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ۚۖ

۴۶۔ وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ۚ

۴۷۔ وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ
عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ۙ

۴۸۔ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ۝

۴۹۔ قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَ الۡاٰخِرِیۡنَ ۙ

۵۰۔ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۬ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝

ترجمہ

۴۱۔ اور اصحاب شمال کیسے اصحاب شمال ہیں (کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے جُرم کی
بنا پر ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔

۴۲۔ وہ مار ڈالنے والی ہواؤں اور جلانے والے پانیوں کے درمیان ہوں گے ۔

۴۳۔ اور تہہ بہ تہہ اور آتش زا دھویں کے سائے میں ۔

۴۴۔ ایسا سایہ جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فائدہ مند ۔

۴۵۔ وہ اس سے پہلے دُنیا میں مَست اور مغرور تھے ۔

۴۶۔ اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے ۔

۴۷۔ اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مَر گئے اور مٹی اور ہڈی ہو گئے تو کیا پھر قبروں سے نکالے جائیں گے ؟

۴۸۔ یا ہمارے پہلے آباء و اجداد ؟

۴۹۔ کہہ دے کہ اوّلین و آخرین ۔

۵۰۔ سب کے سب معیّن دن کی وعدہ گاہ میں جمع ہوں گے ۔

تفسیر

اصحابِ شمال کو مِلنے والی سزائیں اور ان پر نازل ہونے والے دردناک عذاب

گروہ مقربین و اصحاب الیمین کو حاصل ہونے والی عظیم نعمتوں کے تذکرے کے بعد ایک تیسرے گروہ پر نازل ہونے والے دردناک عذاب کا تذکرہ کرتا ہے تاکہ تقابل کی صورتِ حال کے موجود ہونے کی وجہ سے تینوں گروہوں کی کیفیت اور ان کا حال واضح ہو جائے فرماتا ہے ؛ " اصحاب الشمال اور کیا ہیں اصحاب الشمال " (و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال) وہی کہ جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گناہ گار ہیں، ستمگر ہیں اور اہلِ دوزخ ہیں ۔ اور جس طرح ہم نے مقربین اور اصحاب یمین کے بارے میں کہا ہے کہ ما اصحاب الیمین کہنے کا یہ اندازہ بتاتا ہے کہ یہ کسی کی انتہائی اچھی یا بُری حالت کے بیان کے لیے ہے ۔ مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ سعادت نے ہماری طرف رُخ کیا ہے ۔ کیسی سعادت نے یا مصیبت نے ہماری طرف رُخ کیا ہے ، کیسی مصیبت نے ۔

اس کے بعد ان پر نازل ہونے والی تین سزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ زہریلی ہواؤں اور جلانے والے پانی کے درمیان رکھے گئے ہیں" (فی سموم وحمیم)۔ "اور شدید دھویں اور آگ کے سایہ میں" (وظل من یحموم)۔ جلانے والی زہریلی ہوا ایک، جھلسا کر مارنے والا کھولتا ہوا پانی دو اور گرم اور گھونٹنے والا دھواں تین۔ یہ تینوں چیزیں انہیں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اُن کی قوت چھین لی ہے اور اگر وہ ان تینوں مصیبتوں کے علاوہ کوئی اور مصیبت نہ بھی رکھتے ہوں تو یہی تین مصیبتیں ان کی شامت اعمال کیلیے کافی ہیں۔ "سموم" کا مادہ "سم" ہے جس کے معنی زہر ہیں۔ یہاں زہر سے جلانے والی ہوا مراد ہے جو انسان کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ (اصولی طور پر زہر کو "سم" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بدن کے تمام اجزا میں نفوذ کر جاتا ہے) "حمیم" گرم چیز کے معنی میں ہے اور یہاں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے جس کی طرف قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ حج کی آیت ۱۹ میں ہے۔ یصب من فوق رءوسھم الحمیم ۔ ان کے سروں پر گرم اور جلانے والا پانی ڈالا جائے گا۔ "یحموم" بھی اسی مادہ سے ہے اور یہاں "ظل" کی مناسبت سے گاڑھے، سیاہ اور گرم دھویں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے "وہ سایہ جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہے نہ فائدہ" (لا بارد ولا کریم)۔

سائبان کبھی انسان کی سورج کی تمازت سے حفاظت کرتا ہے اور کبھی ہوا اور بارش سے یا پھر اور دوسری منفعتیں لیے ہوئے ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ سائبان ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ "کریم" کی تعبیر "کرامت" کے مادہ سے ہے اور فائدہ کے معنوں میں ہے اس لیے عربوں میں معمول ہے کہ جس وقت وہ چاہتے ہیں کہ کسی چیز یا شخص کو غیر مفید بتائیں تو وہ کہتے ہیں لا کرامة فیه ۔ یقینی امر ہے کہ وہ سایہ جو سیاہ ہے اور گلا گھونٹنے والے دھویں سے بنا ہے، سوائے برائی اور نقصان کے اُس سے کوئی اور توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ اگرچہ وہ عذاب جو دوزخیوں پر نازل ہوں گے ان کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن یہی تین قسمیں اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان باقی کا اندازہ خود لگا لے۔

اس کے بعد والی آیتوں میں اصحاب الشمال کی گرفتاری کے دلائل کا ان کی منحوس اور وحشت ناک داستان کے پہلے ہی تین جملوں میں خلاصہ کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ اس سے پہلے دنیا میں نعمت حاصل ہونے پر مست اور مغرور تھے۔ (انھم کانوا قبل ذالک مترفین)۔ "مترف" جس طرح لسان العرب میں "ترف" کے مادہ سے (بروزن سبب) ہے اس کے معنی عیش و عشرت میں وقت گزارنے کے ہیں۔ مترف اس شخص کو کہتے ہیں۔ جسے نعمتوں کی فراوانی نے مست و مغرور کر دیا ہو اور نافرمانی و سرکشی پر اُبھارا ہو۔[1]

یہ ٹھیک ہے کہ تمام اصحاب شمال مترفین کے زمرہ میں نہیں آتے۔ لیکن اس سے قرآن کا مقصود ان کے سرکردہ افراد ہیں۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشروں کا فتنہ و فساد مست و مغرور عیش پرستوں کی وجہ سے ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کی گمراہی کا سبب بھی ہیں۔ تمام لڑائیوں، خوں ریزیوں، مختلف قسم کے جرائم، شہوتوں کے مرکز اور باغیانہ سرگرمیوں کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن ہر چیز سے پہلے انہی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ نعمت کے معانی وسیع ہیں اور یہ صرف مال و دولت تک محدود نہیں ہے بلکہ جوانی اور سلامتی عمر بھی خدا کی نعمتوں میں سے ہیں کہ اگر غرور و غفلت کا باعث بنیں تو گناہوں کا اصلی سرچشمہ یہی ہیں۔ اور اصحاب شمال ان میں سے ہر ایک نعمت سے بہرہ ور تھے۔

---

[1] لسان العرب جلد ۹ ص ۱۱۷

اس کے بعد ان کے دوسرے گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے"۔ (وکانوا یصرون علی الحنث العظیم)۔ "حنث" اصل میں ہر قسم کے گناہ کے معنوں میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ عہد شکنی اور قسم کی مخالفت کے معنوں میں آتا ہے اس وجہ سے یہ واضح طور پر گناہ کے معنی رکھتا ہے۔ اصحاب شمال کی برائی یہی نہیں ہے کہ وہ گناہ کرتے تھے بلکہ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ گناہ ممکن ہے کہ اصحاب یمین سے بھی بعض اوقات سرزد ہو لیکن وہ اس پر کبھی اصرار نہیں کرتے اور جس وقت توفیق الٰہی شامل حال ہوتی ہے فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہاں "حنث العظیم" سے مراد شرک لیا ہے کیونکہ اس سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ (ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرك بہ و یغفر ما دون ذالك لمن یشاء) خدا ہر قسم کے گناہ کو بخش سکتا ہے لیکن وہ شرک کے گناہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔[1]

بعض مفسرین نے اس سے جھوٹ مراد لیا ہے جو تمام گناہوں سے بڑا ہے اور گناہوں کی کلید ہے خصوصاً جب وہ انبیاء کی تردید اور قیامت کی تکذیب کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ حقیقت حال یہ ہے کہ مذکورہ تمام گناہ حنث عظیم کے ذیل میں آتے ہیں۔

ان کا تیسرا غلط کام یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کیا ہم مرنے کے بعد جب محض ہماری ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم مٹی میں مل جائیں گے کیا دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے؟ (وکانوا یقولون ءاذا متنا وکنا ترابا و عظاما ءانا لمبعوثون)۔ اصحاب شمال کے دوسرے بہت سے گناہوں میں سے ان کا ایک بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ قیامت کے انکار پر مُصر تھے۔ یہاں دو مطالب قابل توجہ ہیں۔ پہلا یہ کہ جس وقت گفتگو مقربین اور اصحاب یمین کے بارے میں تھی تو وہاں ان کے ان اعمال کی تشریح نہیں کی گئی جو ان کے لیے باعث اجر و ثواب تھے (سوائے مختصر اشارہ کے جو مقربین کے بارے میں تھا)۔ لیکن جب اصحاب شمال کا ذکر آیا تو اس سلسلہ میں پروردگار عالم کافی تشریح سے کام لیتا ہے تاکہ اتمام حجت بھی ہو اور اس حقیقت کا بیان بھی ہو جائے کہ یہ سزائیں جو دی جا رہی ہیں وہ عدالت الٰہی کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ تین گناہ جن کا تذکرہ مذکورہ تین آیتوں میں ہوا ہے درحقیقت اصحاب شمال کی طرف سے دین کے تین اصولوں کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔ آخری آیت میں قیامت کی تکذیب تھی اور دوسری آیت میں توحید کا انکار تھا۔ اور پہلی آیت میں جہاں مترفین کی بات ہو رہی تھی انبیاء کی تکذیب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے سورہ زخرف کی آیت ۲۳ میں پڑھا ہے۔ وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا اٰبائنا علی امۃ و انا علی اٰثارھم مقتدون۔ اس طرح ہم نے کسی شہر اور آبادی میں تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے آباد و اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کے پابند ہیں۔ "ترابا و عظاما" کی تعبیر ممکن ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ ہمارے گوشت مٹی میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہماری برہنہ ہڈیاں رہ جائیں گی تو ایسی صورت میں نئی خلقت کس طرح ممکن ہے۔ چونکہ مٹی اور نئی زندگی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کا ابتدا میں ذکر ہوا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ معاد کے مناظر اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح اس دنیا کے بہت سے موجودات گھاس وغیرہ پرانے ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد پھر لباس حیات پہن لیتے ہیں۔ اصولی طور پر جس نے پہلی مرتبہ تخلیق کی ہے اس کے لیے اس کا اعادہ کس طرح مشکل ہے۔ بہرحال یہی کیفیت تھی جس میں وہ ہمیشہ معاد کی تکذیب کرتے تھے۔[2]

---

[1] نساء آیت ۴۸

[2] حرف استفہام کی تکرار اور ان کی تعبیر تاکید کے لیے ہے۔

انہوں نے صرف اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اظہار تعجب کے لیے مزید کہتے تھے کیا ہمارے پہلے آباو اجداد جن کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا دوبارہ زندہ ہوں گے۔ (او آباؤنا الاولون)[1]

وہ جن کی خاک کا ہر ذرہ یا تو کسی گوشہ میں پڑا ہے یا کسی اور وجود کا جزء بن چکا ہے۔ لیکن جیسا کہ سورہ یٰسین کے آخر میں تفصیل سے کہا جا چکا ہے کہ ان محکم دلائل کے مقابلے میں جو مسئلہ معاد پر دلالت کرتے ہیں یہ فقط چند فضول بہانے ہیں۔ اس کے بعد قرآن پیغمبر اسلام کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہہ دے "نہ صرف تم اور تمہارے آباو اجداد بلکہ تمام اولین و آخرین۔۔۔ (قل ان الاولین والاخرین) سب معین دن کی وعدہ گاہ میں (قیامت کے دن) جمع ہوں گے۔ (لمجموعون الیٰ میقات یوم معلوم)

میقات کا مادہ وقت ہے اس کے معنی ہیں جو کسی کام یا وعدہ کے لیے معین ہوا ہو۔ یہاں میقات سے مراد قیامت کا مقررہ وقت ہے جس میں تمام انسان میدان محشر میں اپنے حساب و کتاب کے واسطے جمع ہوں گے۔ بعض اوقات بطور کنایہ اس مکان کے لیے بھی جو کسی کام کی انجام دہی کے لیے مقرر ہوا ہو لفظ میقات استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حج کے میقات (مواقیت) جو خاص مقامات کے نام ہیں جہاں سے حاجی احرام باندھتے ہیں۔ آیت کی مختلف تعبیروں سے ضمنی طور پر استفادہ ہوتا ہے قیامت کے بارے میں بہت سی تاکیدوں کا (ان۔ لام۔ مجموعون اسم مفعول کی شکل میں اور یوم کی توصیف معلوم ہونے کے معنوں میں) اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کا قبروں سے نکل کر مبعوث ہونا ایک ہی دن انجام پائے گا اور یہی معنی قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آئے ہیں۔[3]

یہاں یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جو قیامت کے برپا ہونے کو ہر اُمت کے اعتبار سے مختلف زمانوں میں خیال کرتے ہیں وہ قرآنی آیات سے مکمل طور پر ناآشنا ہیں۔ شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ قیامت کے معلوم ہونے سے مراد اس کا پروردگار عالم کو معلوم ہونا ہے ورنہ کوئی شخص حتیٰ کہ انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین بھی اس کے برپا ہونے کے وقت سے باخبر نہیں ہیں۔

۞ ۞ ۞

---

[1] او آباؤنا الاولون کا ہمزہ استفہام اور اس کی واو عاطفہ ہے جس پر ہمزہ کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

[2] الیٰ اس جملہ میں اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قیامت اس جہان کے آخر میں واقع ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں الیٰ لام کے معنوں میں ہو جیسا کہ بہت سی آیاتِ قرآنی میں لمیقات آیا ہے۔

[3] ھود آیت ۱۰۲ ۔ مریم ۹۵۔

۵۱۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ۝

۵۲۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝

۵۳۔ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝

۵۴۔ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ۝

۵۵۔ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ۝

۵۶۔ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝

ترجمہ

۵۱۔ پھر تم اے تکذیب کرنے والے گمراہ لوگو۔

۵۲۔ یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے۔

۵۳۔ اور اپنے شکموں کو اس سے پُر کرو گے۔

۵۴۔ اور اس پر سے جلانے والا پانی پیو گے۔

۵۵۔ اور پیاس کی بیماری میں مبتلا اُونٹوں کی طرح اس میں سے پیو گے۔

۵۶۔ یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ۔

تفسیر

ان گمراہ مجرموں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک اور حصہ

یہ آیتیں اسی طرح اصحاب شمال پر نازل ہونے والے عذاب کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پروردگارِ عالم اصحابِ شمال کو اسی انداز میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "پھر تم اے گمراہو اور تکذیب کرنے والو"۔ (ثم انکم ایھا الضالون المکذبون)۔ "زقوم" کے درخت میں سے کھاؤ گے"۔ (لاٰکلون من شجر من زقوم)[1]

"اپنے شکموں کو اُس سے پُر کرو گے"۔ فمالئون منھا البطون)۔ گزشتہ آیتوں میں اصحابِ شمال کی دوزخ میں بسر ہونے والی زندگی کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ یہاں ان کی غذا کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اصحابِ شمال، مقربین اور اصحابِ یمین کے بالکل متقابل ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں مخاطب وہ گمراہ ہیں جو تکذیب کرنے والے ہیں، وہ افراد جو ضلالت و گمراہی کا شکار ہونے کے علاوہ حق سے دشمنی اور اس کی خلاف ورزی کی رُوح اپنے وجود میں رکھتے ہیں اور اپنے اس غلط رویّہ کو برقرار رکھنے والے ہیں۔

"زقوم" جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ایک ایسی بدبودار گھاس ہے جس کا مزہ تلخ ہے اس میں ایسا لیس ہوتا ہے کہ اگر وہ انسان کے بدن پر لگ جائے تو اس سے جسم پر ورم ہو جاتا ہے اور یہ کبھی دوزخیوں کی ہر قسم کی ناقابلِ نفرت غذاؤں کے لیے بولا جاتا ہے۔[2]

زقوم کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے جلد ۱۹ سورۂ صافات کی آیت ۶۲ اور جلد ۲۱ سورہ دُخان کی آیت ۴۳ کے ذیل میں جو مندرجات ہیں ان کی طرف رجوع کیجیے۔ "فمالئون منھا البطون" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ پہلے انہیں بہت تیز بھوک لگے گی اتنی تیز کہ وہ اس نہایت ناگوار غذا کھائیں گے تو انہیں پیاس لگے گی۔ اب وہ پئیں گے کیا؟ تو بعد والی آیت میں قرآن بتاتا ہے۔ "تم اس ناگوار غذا کے بعد جلانے والا پانی پیو گے"۔ (فشاربون علیہ من الحمیم)[3]

"اس حریصانہ انداز میں پیو گے جس طرح وہ اُونٹ جو استسقا کی بیماری میں مبتلا ہوں"۔ (فشاربون شرب الھیم)۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے والا اُونٹ بہت پیاس محسوس کرتا ہے اور بار بار پانی پیتا ہے یہاں تک کہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جی ہاں یہ ہے بروزِ قیامت سرگزشت گمراہوں اور تکذیب کرنے والوں کی۔ "حمیم" حد سے زیادہ گرم اور جلانے والے پانی کے معنوں میں ہے۔ اسی بنا پر ایسے دوستوں کو جو محبت کی آگ میں جل رہے ہوں "ولی حمیم" کہتے ہیں۔ حمام بھی اسی مادہ سے مشتق ہے۔ "ھیم" (بروزن میم) ھائم کی جمع ہے۔ (اور بعض لوگ اسے اھیم اور ھیماء کی جمع جانتے ہیں)۔ اصل میں "ھیام" (بروزن قرات) پیاس کی اس بیماری کو کہتے ہیں جو

---

[1] "من شجر" کا "من" تبعیضیہ ہے اور "من زقوم" کا "من" بیانیہ ہے۔

[2] مجمع البحرین، مفردات راغب، لسان العرب اور تفسیر رُوح المعانی۔

[3] قابلِ توجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں ضمیر مؤنث (منھا) شجر من زقوم کی طرف لوٹتی ہے اور اس آیت کی ضمیر مذکر "علیہ" وہ اس وجہ سے کہ لفظ شجر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قرطبی۔ مجمع البیان در ذیل آیہ زیر بحث۔

اُونٹ کو لاحق ہوتی ہے۔ یہ تعبیر عشقِ سوزاں اور عاشقانِ بے قرار کے بارے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین ھیم کو ایسی زمین ریگزار کے معنوں میں جانتے ہیں جس پر جتنا پانی ڈالا جائے وہ سب اس میں جذب ہو جاتا ہے گویا وہ کبھی سیراب نہیں ہوتی۔ زیرِ بحث آیات میں سے آخری آیت میں ایک مرتبہ پھر اسی کھانے اور پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ ہے قیامت میں ان کی پذیرائی کا ذریعہ"۔ (ھٰذا نزلھم یوم الدّین)۔ یہ ایسی حالت میں ہے کہ جب دوسری طرف اصحابِ یمین بہت ہی لطیف و خوشگوار سایہ میں آرام و سکون سے ہیں، بہترین پھل کھاتے ہیں اور شرابِ طہور و آبِ خوشگوار پیتے ہیں اور عشقِ خدا میں مست ہیں۔ (ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا)۔ "نزل" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے اس وسیلہ اور ذریعہ کے معنوں میں ہے جس سے مہمان عزیز کی پذیرائی کرتے ہیں اور بعض اوقات مہمان کے لیے سب سے پہلے لائے جانے والے کھانے اور مشروب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ دوزخی نہ تو مہمان ہیں اور نہ زقوم و حمیم پذیرائی کے ذریعے شمار ہوتے ہیں۔ یہ ان پر ایک قسم کا طنز ہے تاکہ وہ اندازہ لگالیں کہ جب ان کی پذیرائی کا یہ عالم ہے تو پھر ان کی معذّب صورتِ حال کتنی عبرت ناک ہوگی۔

✧ ✧ ✧

۵۷۔ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ۝

۵۸۔ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ؕ

۵۹۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝

۶۰۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ۙ

۶۱۔ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝

۶۲۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۷۔ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، تو پھر نئی آفرینش کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟

۵۸۔ کیا اس نطفہ سے تم آگاہ ہو جو رحم میں ڈالتے ہو؟

۵۹۔ کیا تم اسے (جنینی دور میں) پے در پے آفرینش دیتے ہو یا ہم خلق کرتے ہیں؟

۶۰۔ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا ہے اور ہم پر کوئی سبقت نہیں رکھتا۔

۶۱۔ اس مقصد کے لیے کہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی جگہ لے آئیں اور تمہیں اس جہان میں کہ
جسے تم نہیں جانتے تمہیں نئی خلقت بخشیں۔

۶۲۔ تم نے پہلے عالم کو تو مان لیا تو کس طرح نہیں سمجھتے (کہ اس کے بعد بھی ایک جہان ہے)۔

تفسیر

عقیدہ معاد پر سات دلیلیں

گزشتہ آیتوں میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں کے ضمن میں گفتگو تھی - بنیادی طور پر اس سورہ میں مسئلہ معاد کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور ان آیتوں میں معاد سے متعلق دلیلوں کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ قرآن مجید اس اہم عقیدہ کے ثبوت میں مجموعی طور پر سات دلیلیں پیش کرتا ہے جو ایمان کی بنیادوں کو قوی کرتی ہیں اور انسان کے دل کو خدا کی طرف سے کیے گئے ان وعدوں کے بارے میں پختہ یقین دلاتی ہیں جو گزشتہ آیتوں میں اصحاب یمین اور اصحاب شمال کے بارے میں مذکور ہوئے۔ پہلے مرحلہ میں پروردگار عالم فرماتا ہے: "ہم نے تمہیں خلق کیا ہے تو نئی خلقت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے": (نحن خلقناکم فلولا تصدقون[1])

تم قبروں سے اٹھنے پر اور بدن کے خاک ہو جانے کے بعد معاد جسمانی پر کیوں تعجب کرتے ہو۔ کیا اس نے پہلی مرتبہ تمہیں مٹی سے پیدا نہیں کیا؛ کیا امثال و نظائر کا حکم ایک نہیں ہوتا؛ یہ استدلال حقیقت میں اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ یٰسین کی آیت ۷۸، ۷۹ میں آیا ہے جہاں قرآن ایک مشرک کے جواب میں؛ جس نے ایک بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لے رکھی تھی اور کہتا تھا کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا، کہتا ہے۔ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقه قال من یحی العظام وهی رمیم قل یحییها الذی انشأها اول مرة وهو بکل خلق علیم ۔" اس نے ہمارے لیے مثال پیش کی اور اپنی پہلی خلقت کو بھول گیا اور اس نے کہا کون ان بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، کہہ دے وہی جس نے انہیں ابتدا میں خلق کیا تھا وہ اپنی تمام مخلوق سے آگاہ ہے۔ پروردگار عالم بعد والی آیت میں دوسری دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا اس نطفہ سے جسے تم رحم میں ڈالتے ہو تم باخبر ہو؟" (افرءیتم ما تمنون[2])۔ کیا جنینی مراحل کے طول میں تم اسے بار بار کی خلقت دیتے ہو یا اس کے خالق ہم ہیں": (ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون)۔ کون ہے کہ جو اس بے قیمت نطفہ کو ہر روز ایک نئی شکل دیتا ہے اور خلقت کے بعد نئی خلقت سے نوازتا ہے۔ حقیقتاً یہ تدریجی تبدیلیاں جو نہایت تعجب انگیز ہیں اور جنہوں نے تمام فکر و دانش کو حیرت زدہ کر دیا ہے، کیا تمہاری طرف سے ہیں یا خدا کی طرف سے۔ کیا وہ ذات جو ان بار بار کی خلقتوں پر قدرت رکھتی ہے قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ آیت حقیقت میں سورۂ حج کی آیت ۵ سے مشابہت رکھتی ہے جہاں پروردگار عالم فرماتا ہے: یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة مخلقة وغیر مخلقة لنبین لکم

---

[1] "لولا" اصطلاح کے مطابق تحضیض اور کسی کام کی انجام دہی کی تحریک کے لیے ہے اور بعض کے قول کے مطابق اصل میں یہ لم اور لا سے مرکب تھا جو سوال اور نفی کے معنی دیتے ہیں اس کے بعد میم واؤ کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔ یہ لفظ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی فرد یا کچھ افراد کسی کام کے کرنے میں تساہل کریں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ کیوں اس طرح اور اس طرح نہیں کرتے۔

[2] "رءیتم" یہاں رویت سے علم کے معنوں میں ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھنے کے معنوں میں۔

ونقر فی الارحام ما نشاء الیٰ اجل مسمًّی ثم نخرجکم طفلاً ۔ اے لوگو! تم قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر بستہ شدہ خون سے، پھر مضغہ سے (چبائے ہوئے گوشت کی شکل کی ایک چیز) جن میں سے بعض کی شکل و صورت ہے اور بعض شکل و صورت کے بغیر ہیں۔ مقصود کلام یہ ہے کہ ہم تم پر واضح کریں کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں اور جن شکم مادر والے بچوں کو ہم چاہیں مدت معین تک شکم مادر میں رکھتے ہیں۔ (اور جسے چاہیں اسے ساقط کر دیتے ہیں) پھر تمہیں بچے کی شکل میں باہر بھیجتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر اگر اس چیز کو جسے موجودہ زمانے کے ماہرین نے اس بظاہر ناچیز پانی کے قطرہ کے بارے میں دریافت کیا ہے، پیش نظر رکھیں تو مطلب زیادہ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے کہ وہ چیز جو انسان کے نطفہ کی تولید کا باعث بنتی ہے وہ مرد کے نطفہ "سپرم" اور عورت کے نطفہ "اوول" کا مرکب ہے اور "اسپرم" یعنی مرد کا نطفہ بہت ہی چھوٹا خوردبین سے نظر آنے والا کیڑا ہے۔ مرد کے ایک مرتبہ کے انزال میں دو سو سے لے کر پانچ سو ملین "اسپرم" موجود ہوتے ہیں۔ (یعنی دُنیا کے کئی ممالک کی آبادی کے برابر)[1] اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت ہی چھوٹا وجود عورت کے نطفہ کے ساتھ مل کر نشو و نما پاتا ہے اور حیرت انگیز اضافہ کے ساتھ انسانی بدن کے سیل بناتا ہے اور باوجود اس کے کہ تمام سیل (CELL) ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور بہت جلد ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں، ان میں کا ایک گروہ انسان کے دل کی تشکیل کرتا ہے۔ دوسرا ہاتھ پاؤں کی اور ایک اور گروہ کان اور آنکھ کی۔ اور ہر ایک ٹھیک اپنی جگہ قرار پاتا ہے۔ نہ دل کے سیل گردہ کی جگہ جاتے ہیں نہ گردہ کے دل کی جگہ۔ کان کے لیے ظاہر ہونے والے سیل آنکھ کے لیے ظاہر ہونے والوں کی جگہ قرار نہیں پاتے اور نہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ نطفہ اپنے جنینی دور میں کئی پُر شور جہانوں کو طے کرتا ہے حتیٰ کہ ایک بچے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ سب خدا کی دوام رکھنے والی صفت خالقیت کے زیر سایہ ہے۔ جب کہ اس خلقت کے سلسلہ میں انسان کا ایک معمولی سا نقش ایک ہی لمحے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ (اور وہ رحم میں نطفہ ڈالنے کا لمحہ ہے اور بس. تو کیا یہ عقیدہ معاد پر ایک زندہ دلیل نہیں ہے کہ اس قسم کا قادر مطلق مُردوں کے زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے[2]

اس کے بعد تیسری دلیل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا اور کسی نے ہم پر سبقت نہیں کی (نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین)۔ جی ہاں ہم کبھی مغلوب نہیں ہوں گے۔ اور اگر موت کو ہم نے مقدر کیا ہے تو اس بنا پر نہیں کہ ہم عمر جاودانی نہیں دے سکتے بلکہ مقصد یہ تھا کہ تم میں سے ایک گروہ کو ہم اُٹھا لیں اور اس کی جگہ دوسرا گروہ لے آئیں اور انجام کار تمہیں ایسے جہان میں کہ جسے تم نہیں جانتے نئی خلقت بخشیں۔ (علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون)۔ ان دو آیتوں کی تفسیر میں اس نظریہ کے علاوہ جو ہم نے اوپر بیان کیا ایک اور نظریہ موجود ہے اور وہ یہ کہ دوسری آیت پہلی آیت کے مقصود کا بیان نہیں ہے بلکہ اس کا جزوِ آخر ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے؟ ہم ہرگز عاجز و مغلوب نہیں ہیں اس سے کہ ایک گروہ کو لے جائیں اور دوسرے گروہ کو اس کا جانشین بنا دیں[3]

---

[1] اولین دانش گاہ جلد ۱ (بحث جنین شناسی) ص ۱۴۱ ۔

[2] اس سلسلہ کی مزید وضاحتیں جلد ۱۴ سورہ حج کی آیت ۵ کے ذیل میں ہم نے جمع کر دی ہیں۔

[3] پہلی تفسیر کے مطابق "علیٰ ان نبدل" کا جار و مجرور "قدرنا" سے متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "مسبوقین" سے متعلق ہے (غور کیجیے)

دُوسری بات یہ کہ معاد کے منظر تم اس دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہو. ہر سال نباتات کی دُنیا میں قیامت کے منظر کی تکرار ہوتی ہے۔ پروردگارِ عالم مُردہ زمینوں کو بارش کے زندگی بخش قطروں کے نزول سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۳۹ میں فرماتا ہے: ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ ۔ " وہ جو ان مُردہ زمینوں کو زندہ کرتا ہے وہی ہے جو مُردوں کو زندہ کرے گا"۔ سُورہ حج کی آیت ۶ میں بھی ان معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

ایک نکتہ

ہمارے اصول فقہ میں یہ مسئلہ پیش کیا جاتا ہے کہ احکام شرعی کو قیاس کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا. مثلاً ہم کہیں کہ وہ عورت جسے حیض آرہا ہو چونکہ اپنے روزے قضا کرتی ہے لہٰذا نماز بھی قضا کرنی چاہیئے (اصطلاح کے مطابق ضروری ہے کہ کُلی سے جزئی تک راہ پیدا کرنی چاہیئے نہ کہ جزئی سے دوسرے جزئی تک)۔ زیادہ تر علمائے اہل سُنّت قیاس کو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں منابع تشریع میں سے ایک منبع تسلیم کرتے ہیں۔ ان علماء میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ جو قیاس کی حجیت کی نفی میں ہماری ہم نوا ہے۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ قیاس کے بعض طرفداروں نے مندرجہ بالا آیت (ولقد علمتم النشأۃ الاولیٰ فلولا تذکرون) سے یہ چاہا ہے کہ اپنے مقصود پر استدلال کریں اس لیے کہ خدا کہتا ہے: نشاۃ الاخریٰ یعنی قیامت کا نشاۃ الاولیٰ یعنی اس دُنیا پر قیاس کرو. مگر یہ استدلال عجیب ہے کیونکہ اوّلاً جو کچھ اُوپر والی آیت میں آیا ہے ایک عقلی استدلال اور منطقی قیاس ہے۔ چونکہ منکرینِ معاد کہتے تھے کہ خدا کس طرح قدرت رکھتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے وہی ذاتِ والاصفات جو ابتدا میں تمہیں پیدا کرنے کی قدرت رکھتی تھی، وہی بعد میں بھی اس قسم کی قدرت رکھتی ہے۔ احکام شرعی میں قیاس ظنی ہرگز اس طرح نہیں ہے کیونکہ ہم تمام احکام کے مفاد و مصالح پر احاطہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جو قیاس کو ممنوع سمجھتے ہیں انہوں نے "قیاس اولویت" کا استثنا کیا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے "ماں باپ کی نسبت معمولی سے معمولی خشونت آمیز بات بھی نہ کرو"۔ تو ہم یہ بدرجہ اولیٰ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں پہنچانی چاہیئے۔ زیر بحث آیت بھی "قیاسِ اولویت" کے قبیل میں سے ہے اور اس قیاس ظنی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی جو متنازع فیہ ہے۔ ابتدا میں کوئی چیز موجود نہیں تھی. خدا نے کرۂ زمین اور مٹی کو پیدا کیا اور انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا۔ آخرت کی تخلیق کے لیے کم از کم خاک تو موجود ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی سُورہ روم کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں کہ وھو الذی یبدؤا الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ ۔ وہی ہے جس نے آفرینش کا آغاز کیا اس کے بعد اسے لوٹائے گا اور یہ کام اس کے لیے بہت آسان ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہے: عجبًا کل العجب للمکذب بالنشأۃ الاخریٰ وھو یری النشاۃ الاولیٰ وعجبا للمصدق بالنشاۃ الاخرۃ وھو یسعی لدار الغرور ۔ بہت ہی حیران کُن ہے اس شخص کا معاملہ جو نشاۃ الاخریٰ یعنی آخرت کا انکار کرتا ہے جب کہ نشاۃ الاولیٰ یعنی دنیا کو وہ دیکھتا ہے اور بہت زیادہ تعجب ہے اس شخص پر جو نشاۃ اخریٰ پر ایمان رکھتا ہے لیکن اس کی ساری تگ و دَو اس دنیا کے لیے ہے۔[1]

---

[1] اس حدیث کو "رُوح البیان"، "روح المعانی"، "قرطبی" اور "مراغی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ خبر کے عنوان کے تحت پیغمبر اسلامؐ کے نام کی تصریح کے بغیر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی تعبیرات کا انداز یہ ہے کہ یہ حدیث پیغمبرؐ ہے۔ کتاب کافی میں اس حدیث کا پہلا حصہ امام علیؑ ابن الحسینؑ سے منقول ہے۔

۶۳۔ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝

۶۴۔ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ۝

۶۵۔ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝

۶۶۔ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ۝

۶۷۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝

ترجمہ

۶۳۔ کیا کبھی اس کے بارے میں غور کیا ہے جو تم کاشت کرتے ہو ؟

۶۴۔ کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں ؟

۶۵۔ اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک و کوبیدہ گھاس میں اس طرح تبدیل کردیں کہ تم حیران رہ جاؤ۔

۶۶۔ (اس طرح کہ تم کہو) واقعی ہمیں خسارہ ہوا ہے۔

۶۷۔ بلکہ ہم کُلی طور پر محروم ہیں۔

تفسیر

دانوں کو اُگانے والا خُدا ہے یا تم ہو؟

اس سُورہ میں جو سات دلیلیں معاد کے بارے میں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے اب تک چار دلیلیں پڑھی ہیں۔
زیرِ بحث آیت اور آگے آنے والی آیات میں تین اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں جن میں سے ہر ایک انسانی زندگی میں خُدا کی قدرتِ بے پایاں

کا نمونہ ہے۔ ان دلیلوں میں سے ایک غذا کے دانوں کی خلقت سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری پانی سے اور تیسری آگ سے متعلق ہے۔ انسانی زندگی کے تین بنیادی ارکان کو یہی چیزیں تو تشکیل دیتی ہیں۔ نباتات کے دانے انسانی غذا کا اہم ترین جز شمار ہوتے ہیں، پانی اہم ترین مشروب ہے اور آگ غذائی مواد اور دیگر امورِ زندگی کی اصلاح کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: کیا اس میں جسے تم کاشت کرتے ہو کبھی غور کیا ہے؟ (افرءیتم ما تحرثون)۔ "کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟" (ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون)۔ جاذبِ توجہ یہ کہ پہلی آیت میں "تحرثون" ہے جس کا مادہ "حرث" (بروزن درس) ہے جو کاشت کرنے کے معنی میں ہے (یعنی بیج بکھیرنا اور انہیں نشوونما کے لیے آمادہ کرنا)۔ دوسری آیت میں تزرعون کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جس کا مادہ "زراعت" ہے جو اگانے کے معنی میں ہے۔ واضح رہے کہ انسان کا کام صرف کاشت کرنا ہے اُسے اگانا خدا کا کام ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلامؐ سے منقول ہے: لا یقولن احدکم زرعت ولیقل حرثت فان الزارع ھو اللہ" تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے زراعت کی بلکہ یہ کہے کہ میں نے کاشت کی کیونکہ زارعِ حقیقی خدا ہے۔[1]

اس دلیل کی تشریح اس طرح ہے کہ انسان جو کام زراعت کے سلسلہ میں کرتا ہے وہ بچّے کے تولد کے سلسلہ میں جو اس کا کام ہے اس کچھ زیادہ غیر مشابہ نہیں ہے۔ یہ زمین میں صرف دانہ ڈالتا ہے پھر الگ ہو جاتا ہے۔ یہ خدا ہے جس نے دانہ کے اندر ایک بہت ہی چھوٹا سا زندہ سیل پیدا کیا ہے جو مساعد ماحول میں قرار پاتا ہے تو ابتدا میں خود دانہ میں موجود مواد غذائی سے استفادہ کرتا ہے۔ کونپل نکالتا ہے اور جڑ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر عجیب و غریب تیزی کے ساتھ زمین کے موادِ غذائی سے مدد حاصل کرتا ہے اور اس گھاس میں عجیب قسم کی مشینری حرکت میں آجاتی ہے جس سے وہ ایک حشر بپا کرتا ہے۔ تنے شاخ اور خوشہ بناتا ہے اور کبھی تو ایک بیج میں سے کئی سو یا کئی ہزار دانے نکلتے ہیں۔[2]

ماہرین کہتے ہیں کہ وہ ترتیبیں جو ایک گھاس کی ساخت اور اس کے ڈھانچے میں نظر آتی ہیں، ایک ایسے عظیم صنعتی شہر کی ترتیبوں کی طرح ہیں جس میں متعدد کارخانے ہوں اور یہ ترتیبیں بہ نسبت اس صنعتی شہر کی ترتیبوں کے زیادہ تعجب انگیز اور پیچیدہ ہیں۔ کیا وہ ہستی جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے مُردوں کو زندہ کرنے سے عاجز ہے؟ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ، نباتات کی نشوونما کے سلسلہ میں انسان سوائے دانوں کو زمین میں ڈالنے کے کوئی اور کام نہیں کرتا۔ بعد والی آیت مزید کہتی ہے: "اگر ہم چاہیں تو اس زراعت کو مٹھی بھر خشک و بیہودہ گھاس میں اس طرح تبدیل کردیں کہ تم حیران رہ جاؤ: (لو نشاء لجعلناه حطاماً فظلتم تفکھون)۔ جی ہاں ہم تیز زہریلی آندھی بھیج سکتے ہیں جو اسے دانوں کے لگنے سے پہلے ہی خشک کرکے درہم برہم کردے یا پھر کوئی اور آفت و مصیبت اس پر مسلط کردیں جو حاصل ہونے والے سرمایہ کو ختم کردے۔ ٹڈی دَل کا سیلاب اس کی طرف بھیج سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم بجلی کا ایک کوندا اس پر مسلط کردیں اس طرح کہ سوائے مٹھی بھر خشک روندی ہوئی گھاس کے اور کوئی چیز باقی نہ رہے اور تم اس منظر کے مشاہدہ سے حیرت و ندامت میں غرق ہو جاؤ۔

---

[1] اس حدیث کا پہلا حصہ تفسیر مجمع البیان میں آیات زیرِ بحث کے ذیل میں آیا ہے جب کہ دوسرا حصہ رُوح البیان میں نقل ہوا ہے۔

[2] اگرچہ عام طور پر گندم کی بالی میں کئی سو دانے بہت کم نظر آتے ہیں لیکن جیسا کہ اس تفسیر کی پہلی جلد میں مطبوعات کی صریح گواہی کے مطابق جنوبی ایران کے ایک شہر میں بعض کھیتوں میں گندم کے بوٹے بہت بلند اور پُرخوشہ دیکھے گئے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ایک بوٹے میں چار ہزار دانے موجود تھے۔

اگر حقیقی زراع تم لوگ خود ہوتے تو کیا یہ امور ممکن تھے؟ تو پھر جان لو کہ یہ سب برکتیں کسی اور جانب سے ہیں۔ "حطام" کا مادہ "حطم" ہے جو (بروزن ختم) ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے ٹوٹنے کے ہیں۔ زیادہ تر خشک چیزوں مثال کے طور پر، بوسیدہ ہڈی یا گھاس کے خشک تنکوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں مراد وہی گھاس ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ "حطام" سے مراد یہاں زمین کے نیچے بوسیدہ اور نہ اُگنے والا بیج ہے۔[1]

"تفکھون" "فاکھۃ" کے مادہ سے پھل کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد "فکاھت" مزاح، خوش طبعی اور ایسی لطیفہ گوئی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو محافل محبت کی جان ہوتی ہے۔ لیکن کبھی یہ مادہ حیرت اور تعجب کے معنوں میں بھی آیا ہے اور زیر بحث آیت میں اسی قبیل سے ہے۔ یہ احتمال بھی ہے جیسا کہ انسان کبھی غصہ کی حالت میں بھی ہنستا ہے جسے غصہ کا ہنسنا کہتے ہیں۔ وہ سخت اور بڑی مصیبت کے وقت بھی مزاح سے کام لیتا ہے۔ اس بنا پر اس سے یہاں مراد وہ مزاح اور خوش طبعی ہے جو مصیبت کے وقت ہو۔ جی ہاں تعجب کرتے ہو اور حیرت میں ڈوب کر کہتے ہو: "سچ مچ ہم نے نقصان اٹھایا ہے اور ہم سرمایہ کھو بیٹھے ہیں اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آیا"۔ (انا لمغرمون)[2،3]

بلکہ ہم تو کلی طور پر بے چارے اور محروم ہیں۔" (بل نحن محرومون)۔ اگر حقیقی زراع تم ہی ہوتے تو کیا اس قسم کی صورت حال ممکن تھی؟ یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ سب آوازیں اور صدائیں اُسی طرف سے ہیں اور وہی ہے جو ایک ناچیز دانہ سے کبھی سرسبز گھاس اور کبھی سینکڑوں یا ہزاروں دانے پیدا کرتا ہے۔ وہ گھاس اور وہ نباتات جن کے دانے انسانوں کی غذا ہیں اور ان کے شاخ و برگ جانوروں کی غذا ہیں اور کبھی ان کی جڑیں اور باقی اجزا انواع و اقسام کی بیماریوں کی دوائیں ہیں۔

۞ ۞ ۞

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی در ذیل آیات زیر بحث۔

[2]، [3] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: (وتقولون انا لمغرمون)۔ "مغرمون" غرامت کے مادہ سے ہے۔ زیادہ نقصان کرنے اور وقت و سرمایہ ضائع کرنے کے معنوں میں ہے۔

۶۸۔ أَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝

۶۹۔ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝

۷۰۔ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝

۷۱۔ أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝

۷۲۔ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝

۷۳۔ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ۝

۷۴۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ

۶۸۔ کیا اس پانی پر غور کرتے ہو جسے تم پیتے ہو؟

۶۹۔ کیا تم اسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں ؟

۷۰۔ اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار پانی کو تلخ کر دیں تو کیوں تم شکر نہیں کرتے ؟

۷۱۔ کیا اس آگ پر غور کیا ہے جسے تم روشن کرتے ہو؟

۷۲۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے کیا ہے ؟

۷۳۔ ہم نے اسے سب کے لیے یاد آوری اور مسافروں کے لیے مایۂ زندگی قرار دیا ہے ۔

۷۴۔ جب ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر (اور اس کی پاکیزگی کو بیان کر)

تفسیر

یہ پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں ؟

پروردگارِ عالم سورہ واقعہ کی ان آیتوں میں معاد کی چھٹی اور ساتویں دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ آیتیں اس قدرت و اختیار کو بیان کرتی ہیں جو اُسے ہر چیز پر حاصل ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچاتی ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے " کیا تم نے اس پانی پر غور کیا ہے جسے تم پیتے ہو"۔ (افرءیتم الماء الذی تشربون)" کیا تم اسے بادل سے نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں"۔ (ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون)۔ " مزن " (بروزن حزن) جیسا کہ " راغب " " مفردات " میں کہتا ہے " واضح بادلوں کے معنی میں ہے۔ بعض مفسّرین نے اس کے معنی برسنے والے بادل لیے ہیں۔

یہ آیتیں انسان کے وجدان میں سوالات کا ایک سلسلہ قائم کرتی ہیں اور اس سے اقرار لیتی ہیں اور درحقیقت کہتی ہیں : کیا اس پانی کے بارے میں جو تمہاری زندگی کا باعث ہے اور تم ہمیشہ اسے پیتے ہو کبھی غور کیا ہے ؟ کون ہے جو سُورج کو حکم دیتا ہے کہ سطح سمندر پر چمکے ؟ وہ کون ہے جو کڑوے اور نمکین پانیوں میں سے صرف خالص شیریں پانی کے اجزا کو، جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہیں، بخار کی شکل میں آسمان کی طرف بھیجتا ہے ؟ کون ہے جو ان بخارات کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اور ایک دوسرے میں سما کر پانی برسانے والے بادلوں کو تشکیل دیں ؟ ہواؤں کو چلنے کا حکم کون دیتا ہے ؟ بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے الگ کون کرتا ہے اور پھر انہیں خشک و مُردہ زمینوں کی بلندیوں پر بھیجتا ہے ؟ کس نے ہوا کے اُوپر والے حصّہ کو یہ خاصیت بخشی ہے کہ سرد ہونے کے موقع پر آہستہ آہستہ بخارات کو جذب کرنے کی قوت کھو بیٹھیں اور اس کے نتیجے میں موجود بخارات قطروں کی شکل میں نرم و ملائم صورت میں آہستہ آہستہ زمین پر گریں ؟ اگر سُورج اپنا کام چھوڑ دے، ہوائیں چلنے سے رُک جائیں، فضا کے اُوپر والے حصّے بخارات کو اصرار کر کے اپنے اندر روک لیں، آسمان زمین کے بارے میں بخیل ہو جائے اس انداز میں کہ زراعتیں اور نخلستان اپنے لب تر نہ کر سکیں تو تم سب شدتِ تشنگی سے ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارے جانور، باغات اور زراعتیں سب خشک ہو جائیں گے۔ تو پھر سوچو جو قدرت رکھتا ہے کہ اس قسم کے آسان ذرائع سے اس طرح کی برکتیں تمہارے لیے فراہم کرے کیا مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ؟ یہ تو خود ایک قسم کا مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ مردہ زمینوں کو زندہ کرنا توحید و عظمت خدا کی بھی دلیل ہے اور قیامت و معاد کی بھی۔ اور اگر ہم مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھتے ہیں کہ صرف پینے کے پانی پر انحصار کیا گیا ہے اور اس کی تاثیر سے جانوروں اور نباتات کی زندگی کے لیے پانی کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ آیتوں میں زراعت کے معاملہ پر گفتگو ہوئی تھی لہٰذا تکرار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ انسانی زندگی میں پانی کی اہمیت اور اس کے اثرات، نہ صرف یہ کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ، صنعتوں کے وجود میں آنے اور انسان کے علم و دانش کی ترقی کے باوجود، کم نہیں ہوئے بلکہ، اس کے برعکس، صنعتی انسان پانی کا زیادہ محتاج ہے۔ اسی لیے بہت سے عظیم صنعتی ادارے صرف بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے واقع ہیں اور ان کی کارکردگی انہی مقامات سے وابستہ ہے۔ آخر کار بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے : " اگر ہم چاہیں تو اس میٹھے اور خوشگوار پانی کو کڑوے اور نمکین پانی میں تبدیل کر دیں"۔ (لو نشاء جعلناہ اجاجا)۔[ل]

ل اس جملہ میں لام حذف ہو گیا ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے۔ (لو نشاء لجعلناہ)

"تو پھر کیوں اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے"۔ (فلولا تشکرون)۔ جی ہاں اگر خدا چاہتا تو پانی میں حل شدہ نمکیت کو اجازت دیتا کہ وہ پانی کے اجزا کے ساتھ بخار بنے اور اس کے ساتھ آسمان کی طرف چلی جائے اور کڑوے اور نمکین بادلوں کی شکل بنائے اور بارش کے قطرے شور و تلخ سمندر کے پانی کا ذائقہ لیے ہوئے اُوپر سے نیچے گریں۔ لیکن اس نے اپنی قدرت کاملہ سے نمکین پانی کو یہ اجازت نہیں دی۔ نہ صرف پانی کے نمکین حصّہ کو بلکہ ایذا رساں، مضر صحت اور تکلیف دہ جراثیم کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ پانی کے بخارات کے ہمراہ آسمان کی طرف بلندی پر جائیں اور بارش کے قطروں کو آلودہ کریں۔ اسی بنا پر بارش کے قطرے، جس وقت فضا آلودہ نہ ہو، زیادہ خالص پاکیزہ اور خوشگوار پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ "اجاج" کا مادہ "اج" (بروزن حج) ہے۔ یہ اصل میں "اجیج" سے لیا گیا ہے جس کے معنی آگ کے بھڑکنے اور جلانے کے ہیں۔ اس پانی کو جو کڑواہٹ، نمکیت اور حرارت کی وجہ سے منہ کو جلا دے "اجاج" کہتے ہیں۔ اس گفتگو کو ہم پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ ان النبی کان اذا شرب الماء قال الحمد للّٰہ الذی سقانا عذبًا فراتًا برحمتہ ولم یجعلہ ملحًا اجاجًا بذنوبنا۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی نوش فرماتے تو ارشاد فرماتے:

"حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنی رحمت سے ہمیں میٹھے اور خوشگوار پانی سے سیراب
کیا اور اسے ہمارے گناہوں کی وجہ سے نمکین اور کڑوا نہیں بنایا۔"[1]

انجام کار ہم اسی سلسلہ آیات میں ساتویں اور آخری دلیل تک پہنچتے ہیں۔ وہ ساتویں دلیل آگ کی خلقت ہے۔ آگ جو انسانی زندگی کے آلات و اسباب میں سب سے زیادہ اہم ہے اور تمام صنعتوں میں زیادہ مؤثر ذریعہ ہے اس کو موضوع بنا کر خدا فرماتا ہے: "کیا اس آگ کے بارے میں جسے روشن کرتے ہو کبھی تم نے غور و فکر سے کام لیا ہے"۔ (افرءیتم النار التی تورون)۔ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے پیدا کیا ہے"۔ (ءانتم انشأتم شجرتھا ام نحن المنشؤن)۔ "تورون" کا مادہ "وری" (بروزن نفی) ہے اس کے معنی چھپانا ہیں۔ وہ آگ جو آگ جلانے کے وسائل میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کو چنگاری سلگا کر باہر نکالیں تو اسے "وری" اور "ایراء" کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے۔ پہلی چنگاری پیدا کرنے اور آگ جلانے کے لیے موجودہ زمانہ میں ماچس اور لائٹر سے کام لیا جاتا ہے کبھی لوہے اور چقماق سے یہی کام لیتے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے رگڑتے تھے تو اس میں سے چنگاری نکلتی تھی لیکن حجاز کے دیہاتی دو قسم کے مخصوص درختوں سے جو صحرا میں اُگتے ہیں اور "مرخ" اور "عفار" کہلاتے ہیں ان سے وہ آگ جلانے والی لکڑیوں کے نام سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ پہلی لکڑی کو نیچے رکھ لیتے اور دوسری کو اس کے اُوپر پتھر اور چقماق کی مانند ان میں سے چنگاری نکلتی۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی انہی معانی میں تفسیر کی ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ آگ جو اس قسم کے درختوں میں چھپی ہوئی ہے اور اس سے ماچس یا چقماق کی طرح فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، پروردگار اسے اپنی انتہائی قدرت پر دلالت کرتا ہے کہ شجر اخضر (سرسبز درخت) میں آگ پیدا کی ہے حالانکہ پانی درخت کی جان ہے۔ پانی کہاں اور آگ کہاں۔ وہ ذاتِ پاک جو اس قسم کی قدرت رکھتی ہے کہ پانی اور آگ کو ایک دوسرے کے اندر محفوظ رکھے وہ مُردوں کو لباس حیات پہنانے سے کس طرح قاصر ہو سکتی ہے اور بروز قیامت انہیں کس طرح زندہ نہیں کر سکتی! معاد کے لیے اسی دلیل سے مشابہت رکھتی ہوئی دلیل سورہ یٰسین کی آخری آیات میں بھی آئی ہے۔ (الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارًا فاذا انتم منہ توقدون) "وہی ذات جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کی اور تم اس کے ذریعہ آگ

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۷ ص ۱۴۸۔ تفسیر "روح المعانی" جلد ۲۷ ص ۱۴۹

روشن کرتے ہو۔ (یٰسین ۔ ۸۰) لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ہم نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ قرآنی تعبیر ہوسکتا ہے ایک زیادہ لطیف دلیل یعنی قوتوں کی قیامت کی طرف اشارہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہاں گفتگو صرف ماچس اور لائٹر وغیرہ کی نہیں ہے بلکہ وہ چیزیں مُراد ہیں جو جلانے کے کام آتی ہیں یعنی لکڑیاں اور ایندھن وغیرہ جو جل کر یہ ساری طاقت اور حرارت بہم پہنچاتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے علمی لحاظ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ آگ جو آج ہم لکڑیوں کے جلنے کے وقت دیکھتے ہیں یہ وہ حرارت ہے جو درختوں نے طویل عرصہ کے درمیان سُورج سے حاصل کی ہے اور اپنے اندر اس کا ذخیرہ کرلیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سُورج کی پچاس سال کی چمک اور روشنی درخت کے تنے سے ختم ہوگئی ہے۔ ہم اس سے غافل ہیں کہ وہ حرارت درخت میں جمع ہے۔ جس وقت آگ کی چنگاری خشک لکڑیوں تک پہنچتی ہے اور وہ جلنے لگتی ہیں تو درخت وہ حرارت اور روشنی واپس کر دیتا ہے۔ یعنی اس طرح یہاں قیامت بپا ہوگی اور مُردہ طاقتیں از سرِنو زندہ ہو جائیں گی اور وہ ہم سے کہیں گی وہ خدا جس نے ہماری قیامت برپا کردی ہے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم انسانوں کی قیامت بھی برپا کردے۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفصیلی بحث جلد ۱۸ کی طرف رجوع کریں۔ "تورون" جس کے معنی آگ جلانا ہیں۔ اگرچہ یہاں عام طور پر اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد ماچس وغیرہ سے فائدہ اُٹھانا ہے لیکن اس میں کوئی شے مانع نہیں ہے کہ اس سے مُراد ایندھن ہو کیونکہ بہرحال اس میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے جو ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں تفسیریں ایک دوسرے سے متصادم بھی نہیں ہیں۔ پہلے معنی عام لوگ سمجھتے ہیں اور دوسرے معنی جو زیادہ دقیق ہیں وہ زمانے کے گزرنے اور علم و دانش کی ترقی کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعد والی آیت میں مذکورہ بالا مباحث کی تاکید کے لیے مزید فرماتا ہے: "ہم نے اس آگ کو جو درختوں سے خارج ہوتی ہے اوروں کے لیے یاددہانی کا ذریعہ اور مسافروں کے لیے زندگی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ (نحن جعلناھا تذکرۃ ومتاعا للمقوین)۔ سبز درختوں میں سے آگ کا ظاہر ہونا ایک طرف بے جان بدنوں میں قیامت کے دن رُوحوں کے واپس آنے کو یاد دلاتا ہے اور دوسری طرف آتش دوزخ کا احساس دلاتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث: "نارکم ھٰذہ التی توقدون جزء من سبعین جزءًا من نار جھنم۔

یہ آگ جو تم جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جُز ہے [1]

باقی رہی تعبیر (متاعًا للمقوین) کی تو وہ اس آگ کے دنیاوی فوائد کی طرف ایک مختصر اور پُرمعنی اشارہ ہے۔ کیونکہ مقوین کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ مادہ "قواء" (بروزن کتاب) سے مشتق ہے جس کے معنی خشک اور خالی بیابان کے ہیں۔ اس بنا پر مقوین ان افراد کو کہتے ہیں جو صحراؤں میں پھرتے ہیں اور چونکہ صحرانشین افراد عام طور پر فقیر ہوتے ہیں لہٰذا یہ تعبیر بعض اوقات فقیر کے معنی میں بھی آئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ قوت کے مادہ سے طاقتور کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر لفظ مذکور ایسے الفاظ میں سے ہے جو دو متضاد معانی میں استعمال ہوتے ہیں [2]

یہ ٹھیک ہے کہ آگ اور درخت (ماچس اور ایندھن وغیرہ) سب کے لیے ذریعۂ استفادہ ہیں لیکن چونکہ مسافر سردی کو دُور کرنے اور کھانا پکانے کے لیے خصوصاً پُرانے زمانے کے سفروں میں، جو قافلوں کے ذریعے ہوتے تھے، خصوصیت سے ان چیزوں کے حاجت مند تھے لہٰذا انہی کے ذکر پر انحصار کیا گیا۔ "اقویا" طاقتوروں کا آگ سے فائدہ اُٹھانا اپنی زندگی کی وسعت یعنی سہولتوں کی بنا

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۹۲ اور تفسیر رُوح المعانی جلد ۲۷، ص ۱۳۱

[2] توجہ کریں کہ متاع کا لفظ ہر اس ذریعہ کے لیے بولا جاتا ہے جس سے انسان اپنی زندگی میں فائدہ اُٹھائے۔

پر واضح ہے۔ خصوصاً اگر اس بحث کو ہم موجودہ زمانے تک لے آئیں کہ کس طرح وہ حرارت جو انواع و اقسام کی آگ سے پیدا ہونے والی ہے اور وہ دنیائے صنعت کو متحرک کرتی ہے اور کارخانوں کے عظیم پہیوں کو گردش میں لاتی ہے اگر یہ حرارت، یہ شعلۂ عظیم (جو سب کا سب درختوں سے متعلق ہے یہاں تک کہ وہ آگ جو پتھر کے کوئلہ یا مٹی کے تیل کے مواد سے حاصل کی جاتی ہے، وہ بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ درختوں ہی سے متعلق ہے) کسی دن بجھ جائے تو نہ صرف یہ کہ چراغ تمدن گل ہو جائے بلکہ انسانوں کی زندگی کا چراغ بھی خاموش ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ آگ انسانی انکشافات میں سے ایک بہت اہم چیز ہے جب کہ اس کے تمام اثرات کا سرچشمہ خلقت و آفرینش ہی ہے اور انسان کی کاوش کا دخل اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جس وقت سے آگ دریافت ہوئی ہے، بشریت نے اپنے تمدن کے ایک نئے مرحلہ میں قدم رکھا ہے۔ جی ہاں قرآن مجید نے اس ایک مختصر سے جملہ میں ان تمام حقائق کی طرف اجمالی اور سربستہ شکل میں اشارہ کیا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تو آگ کا معنوی فائدہ پیش ہوا ہے جو یقیناً قیامت کی یاددہانی تھا۔ اس کے بعد اس کا دنیاوی فائدہ بیان ہوا اور وہ اس لیے کہ پہلا فائدہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تین نعمتوں (غذائی اناج، پانی اور آگ) کے ذکر کے موقع پر ایک خاص ترتیب رکھی گئی ہے جو پورے طور پر ایک طبعی ترتیب ہے۔ سب سے پہلے انسان غذا میں استعمال ہونے والے دانوں کو لیتا ہے اس کے بعد ان دانوں میں پانی ملاتا ہے پھر اُسے آگ پر رکھ کر پکاتا ہے۔ اور اس قابل بناتا ہے کہ انہیں بطور غذا استعمال کیا جائے۔ آخری زیر بحث آیت میں نتیجہ پیش کرتے ہوئے پروردگار عالم فرماتا ہے: "اب جب کہ ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک و منزہ شمار کر"۔ (فسبح باسم ربك العظيم)[1]

جی ہاں وہ خدا جس نے یہ سب نعمتیں پیدا کی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کی توحید، قدرت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے اور قیامت کا ثبوت ہے۔ وہ ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرہ و منزہ ہے۔ وہ پروردگار بھی ہے، عظیم بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔ اس جملہ میں اگرچہ تنہا پیغمبر اسلامؐ سے خطاب ہے لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس سے مراد تمام انسان ہیں۔

ایک نکتہ

یہاں ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات سے متعلق ہم پیغمبر اسلامؐ اور امیر المومنین علیؑ کی چند حدیثیں پیش کریں۔

۱۔ تفسیر روح المعانی میں ایک حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ایک رات نماز کے بعد سورہ واقعہ کو پڑھتے ہوئے جب آپ (افرءيتم ما تمنون ءانتم تخلقونه ام نحن الخالقون) پر پہنچے تو آپ نے تین مرتبہ عرض کیا: (بل انت یارب) "بلکہ تو ہی (انسان کا خالق ہے)۔ اے پروردگار"۔ اور جس وقت (ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون) پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا: (بل انت یارب) "بلکہ زراعِ حقیقی اے پروردگار تو ہی ہے"۔ اس کے بعد جس وقت (ءانتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلون) پر آئے تو پھر تین مرتبہ عرض کیا: (بل انت یارب)۔ "اے پروردگار تو ہی ہے۔ (جو بادلوں سے مینہ برساتا ہے")۔ اس کے بعد (ءانتم انشأتم شجرتها ام نحن المنشئون) کی تلاوت فرمائی تو پھر تین مرتبہ عرض کیا

[1] "با" "باسم ربك" میں ہو سکتا ہے تعدیہ کے لیے ہو (اس طرح سے کہ (سبح) کا فعل متعدی بمنزلہ لازم لیا گیا ہو)۔ بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ یہاں "با" استعانت کے لیے ہے یا زائدہ ہے یا ملابست کے لیے ہے لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔

(بل انت یارب) "تو ہی ہے (جس نے آگ پیدا کرنے والے درختوں کو پیدا کیا)"۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ انسان ان جملوں کا اقتضائے حال کے مطابق جواب دے اس طرح جیسے خدا اُس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس حقیقت کو اپنی رُوح میں جاگزیں کرے اور صرف غور و فکر سے عاری بے جان تلاوت پر قناعت نہ کرے۔

۲۔ ایک دُوسری حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا تمنعوا عباد الله فضل الماء ولا کلاء ولا نارًا فان الله تعالٰی جعلها متاعًا للمقوین وقوة للمستضعفین۔ "تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اسے بندگانِ خدا کو استعمال کرنے سے کبھی نہ روکنا۔ اسی طرح اُس اضافی چراگاہ اور آگ کا معاملہ ہے جو تمہارے اختیار میں ہو، لوگوں کو اُس کے استعمال سے نہ روکنا، کیونکہ خدا نے انہیں مسافروں کی زندگی کا ذریعہ اور حاجت مندوں کی قوت کا سبب قرار دیا ہے"۔[۲]

۳۔ ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ جس وقت فسبح باسم ربك العظیم کی آیت پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: اجعلوها فی رکوعکم "اسے اپنا ذکر رکوع قرار دو" (اپنے رکوع میں سبحان ربی العظیم و بحمدہ کہا کرو)۔[۳]

۱۔ تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۳۰۔

۲۔ تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۱۔

۳۔ اس حدیث کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ایک صحیح حدیث کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے (جلد ۹ ص ۲۲۴) اور یہ حدیث کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی ہے۔ (مطابق تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۵) اور اسی طرح تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۸ پر بھی درج ہے۔

٧٥۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝

٧٦۔ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝

٧٧۔ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝

٧٨۔ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝

٧٩۔ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

٨٠۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

٨١۔ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝

٨٢۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝

ترجمہ

٧٥۔ قسم ہے ستاروں کی جگہ اور ان کے محل طلوع و غروب کی ۔

٧٦۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے ۔

٧٧۔ کہ وہ قرآنِ کریم ہے۔

٧٨۔ جو ایک محفوظ و مکنون کتاب میں ہے۔

٧٩۔ سوائے پاکیزہ لوگوں کے کوئی اسے مس نہیں کر سکتا ۔

۸۰ ۔ یہ ایسی چیز ہے جو پروردگار عالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

۸۱ ۔ کیا اس بات کو (اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتائے گئے ہیں) کمزور اور چھوٹا سمجھتے ہو؟

۸۲ ۔ اور جو رزق اس نے تمہیں دیا ہے بجائے شکر کے اس کی تکذیب کرتے ہو؟

تفسیر

صرف پاکیزہ افراد حریم قرآن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں

ان بہت سے مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں سات دلیلوں کے ساتھ آئے ان آیات میں گفتگو قرآن مجید کی اہمیت کے بارے میں ہے کیونکہ مسئلہ نبوت اور مسئلہ نزول قرآن مبدا" و معاد کے مسائل کے بعد اہم ترین اعتقادی ارکان کو تشکیل دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید توحید و معاد جیسے دو اصولوں کے پس منظر کے لیے عمیق بحث پیش کرتا ہے اور مسئلہ نبوت و نزول قرآن کے مرتبہ کا استحکام توحید و معاد کا استحکام شمار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ایک بڑی قسم کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قسم ہے ستاروں کی جگہ کی اور ان کے محل طلوع و غروب کی" (فلا أقسم بمواقع النجوم)۔ بہت سے مفسرین کا یہ عقیدہ ہے کہ "لا" یہاں نفی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ "زائدہ" ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں یہی تعبیر روز قیامت، نفس لوامہ، مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار اور پروردگار شفق کی قسموں کے سلسلہ میں آئی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین "لا" کو یہاں نفی کے معنوں میں لیتے ہیں اور اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ موضوع قسم اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی قسم کھائی جائے۔ جیسا کہ روزمرہ ہم دیکھتے ہیں کہ میں فلاں چیز کی قسم نہیں کھاتا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ قرآن میں خدا کی پاک ذات کی صراحت کے ساتھ قسم کھائی گئی ہے تو کیا ستارے خدا سے بہتر و برتر ہیں کہ ان کی قسم نہ کھائی جائے۔ مفسرین نے مواقع النجوم کے بارے میں متعدد تفسیریں پیش کی ہیں۔ پہلی وہی جو ہم نے ابھی بیان کی یعنی ستاروں کی جگہ اور ان کے مدار و گزرگاہ کی قسم۔ دوسرے یہ کہ مراد ان کا محل طلوع و غروب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے ستاروں کا قیامت میں گرنا مراد ہو۔ بعض نے اس کی صرف ستاروں کے غروب کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے، چند روایات کی پیروی کرتے ہوئے، اسے قرآن کے مختلف حصوں کے مختلف زمانی فاصلوں کے ساتھ نزول کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (کیونکہ نجوم جو نجم کی جمع ہے وہ تدریجی کاموں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے اور ان سب معانی کے درمیان منافات بھی نہیں ہے) ہو سکتا ہے کہ یہ سب معانی زیر بحث آیت کی تفسیر میں شامل ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان آیات کے نزول کے وقت اکثر لوگ اس قسم کی اہمیت کو نہیں جانتے تھے لیکن اس زمانہ میں ہم پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ آسمان کے ستاروں میں سے

ہر ایک کی ایک معین جگہ ہے اور اس کا مدار قانون جاذبہ و دافعہ کے مطابق معین و مقرر ہے اور بہت ہی دقیق حساب کے مطابق ہے اور ان میں سے ہر ایک کی سرعت رفتار ایک معین پروگرام کے مطابق طے پاتی ہے ۔ جو کُرّے زیادہ دُور واقع ہیں ان کا بالکل ٹھیک حساب لگانا اگرچہ ممکن نہیں ہے لیکن نظام شمسی، جو ہم سے قریب کے ستاروں کا خاندان تشکیل دیتا ہے اس میں صحیح مطالعہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے اس کے مداروں کا نظام اس حد تک قطعی اور صحیح حساب ہے کہ انسان کے دماغ کو حیران کر دیتا ہے ۔ جس وقت ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کریں کہ ماہرین کی گواہی کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں تقریباً ایک ہزار ملین ستارے موجود ہیں اور عالم میں اس کے علاوہ اور بہت سی کہکشائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص سمت ہے، تو ہمیں قرآن کی اس قسم کا اندازہ ہوتا ہے۔ "اللہ والعلم الحدیث" نامی کتاب میں ہم پڑھتے ہیں کہ ماہرین علم الافلاک کا نظریہ ہے کہ یہ ستارے جو اربوں سے زیادہ تعداد میں ہیں ان میں سے بعض کو بغیر کسی مددگار آلے کے صرف اپنی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اور ان میں سے بہت زیادہ حصہ کو سوائے ٹیلیسکوپ کی مدد کے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ ان ستاروں کا ایک حصہ تو ٹیلیسکوپ کے ذریعے بھی نہیں دیکھا جا سکتا ۔ صرف مخصوص قسم کے وسائل سے ان کی تصویر لی جا سکتی ہے ۔ یہ سب اپنے مخصوص مدار میں تیرتے ہیں اور اس بات کا کوئی بھی احتمال نہیں ہے کہ ان میں سے ایک کسی دوسرے کے ایسے علاقہ میں، جہاں اس کی کشش کام کر رہی ہو، موجود ہو، یا یہ کہ یہ ستارے ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں ۔ فی الحقیقت ان ستاروں کا ٹکراؤ ایسا ہی ہے جیسے ہم فرض کریں کہ ایک بحری جہاز جو ایک سمندر میں ہے وہ دوسرے اس جہاز سے جو دوسرے بڑے سمندر میں ہو ٹکرا جائے جب کہ دونوں جہاز ایک ہی سمت میں اور ایک ہی رفتار سے چل رہے ہوں ۔ اس قسم کا احتمال اگر محال نہیں تو بعید ضرور ہے [1]

ستاروں کی کیفیت اور وضع کے سلسلہ میں ان علمی انکشافات کی طرف توجہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا قسم کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اسی بنا پر بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے : " یہ بہت ہی بڑی قسم ہے اگر تم جان لو "۔ (وانہ لقسم لو تعلمون عظیم) "لو تعلمون" (اگر تم جان لو) کے الفاظ اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ انسان کا علم اور اس کی دانش اُس زمانے میں اس حقیقت کا مکمل طور پر ادراک نہیں کر سکتے تھے اور یہ خود قرآن کا ایک علمی اعجاز شمار ہوتا ہے کہ ایسے زمانے میں جب کہ شاید ایک گروہ یہ خیال کرتا تھا کہ ستارے چاندی کی میخیں ہیں جو آسمان کی چھت میں ٹھونکی گئی ہیں ۔ اس قسم کا بیان، اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو فی الحقیقت جہالت و نادانی سے مملو تھا، ممکن نہیں تھا کہ ایک عام انسان سے صادر ہو ۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ عظیم قسم کس مقصد کے لیے بیان ہوئی ہے ۔ بعد والی آیت اس کے رُخ سے پردہ اُٹھاتی ہے اور کہتی ہے : " جو کچھ محمدؐ لے کر آئے ہیں وہ قرآن کریم ہے " ۔ (انہ لقراٰن کریم) ۔ اور اس طرح ان کج فہم اور ضدی مشرکین کو جن کا ہمیشہ یہ اصرار تھا کہ یہ آیتیں ایک قسم کی کہانت ہیں، یا نعوذ باللہ جنون آمیز باتیں ہیں، یا شعراء کے اشعار کی طرح ہیں، یا پھر شیاطین کی طرف سے ہیں، یہ جواب دیتا ہے کہ یہ وحی آسمانی ہے اور ایسا کلام ہے جس کی عظمت کے آثار بالکل نمایاں ہیں اور اس کے موضوعات و مضامین اس کے مبداء نزول کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ یہ صورت حال اتنی واضح ہے کہ محتاج بیان نہیں ہے ۔ قرآن کی تعریف لفظ کریم کے ساتھ (اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ کرم جب خدا سے متعلق ہو تو اس کے معنی احسان و انعام کے ہیں اور انسان سے متعلق ہو تو قابلِ تعریف اخلاق و اعمال کے حامل ہونے کے معنی میں ہے)۔ مجموعی طور پر عظیم اوصاف کی طرف اشارہ ہے [2]

---

[1] اللہ والعلم الحدیث ص ۲۲ ۔

[2] راغب کے مفردات میں مادہ کرم ۔

اور قرآن کے فصیح و بلیغ لفظوں اور جملوں کے اعتبار سے اس کی ظاہری خوبصورتیوں اور پُرکشش موضوعات و مضامین کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے اور وہ ہر جمال و کمال اور خوبی و زیبائی و خوبصورتی کا مبداء و منشاء ہے۔ جی ہاں قرآن جس کا کلام ہے وہ بھی کریم ہے اور خود قرآن بھی کریم ہے اور اس کو لانے والا بھی کریم ہے اور اس کے مقاصد بھی کریم ہیں۔ اس کے بعد اس آسمانی کتاب کی دوسری صفت کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ آیات ایک مستور اور پوشیدہ کتاب میں ہیں": (فی کتاب مکنون)۔ اس لوحِ محفوظ (علمِ خدا) میں جو ہر قسم کی خطا و لغزش اور تغیر و تبدل سے مصئون ہے۔ واضح ہے کہ وہ کتاب جس کا اس قسم کا سرچشمہ ہے اور اس کا اصلی نسخہ وہاں ہے وہ ہر قسم کی تبدیلی، خطا اور شک و شبہ سے محفوظ ہے۔ تیسری صفت کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "اس کتاب کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مَس نہیں کر سکتا۔ (لا یمسہ الّا المطھرون)۔[1]

بہت سے مفسرین نے ان روایات کی پیروی کرتے ہوئے جو آئمہ معصومین سے منقول ہیں اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ غسل و وضو کے بغیر قرآن کی تحریر کو ہاتھ نہ لگایا جائے جب کہ دوسرا گروہ اس آیت کو ایک ایسا اشارہ سمجھتا ہے جو اُن پاک و پاکیزہ فرشتوں کی طرف ہے جو قرآن سے آگاہی رکھتے ہیں یا وہ قلبِ پیغمبر پر نزولِ وحی کا ذریعہ تھے۔ مشرکین جو کہتے تھے کہ یہ کلمات شیاطین نے آنحضرتؐ پر نازل کیے ہیں ان کے نقطۂ نظر کے مقابل بعض مفسرین اسے اس طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے بلند حقائق و مفاہیم کا پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی ادراک نہیں کر سکتا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲ میں پڑھتے ہیں۔ (ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین) اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے"۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ پاکیزگی کی کم سے کم حد، جو حقیقت جوئی کی رُوح ہے، وہ قرآن کے کمترین ادراک کے لیے لازمی ہے اور جس قدر پاکیزگی و طہارت زیادہ ہوگی موضوعات و مفاہیم قرآن کا ادراک انسان کے لیے اتنا ہی زیادہ ممکن ہوگا۔ ان تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے مفہوم آیت میں یہ سب شامل ہوں۔

پروردگارِ عالم قرآن مجید کی چوتھی اور آخری توصیف کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "یہ قرآن عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔ (تنزیل من رب العالمین)۔[2]

وہ جو تمام اہلِ جہان کا مربّی و مالک ہے اُس نے اس قرآن کو انسانوں کی تربیت کے لیے پیغمبرؐ کے پاکیزہ دل پر نازل کیا ہے اور جس طرح عالمِ تکوین میں وہی مالک و مربی ہے عالمِ تشریع میں بھی جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "کیا اس قرآن کو ان اوصاف کے ساتھ جو بتائے گئے ہیں کمزور اور چھوٹا شمار کرتے ہو۔ آسان ہے تو اس کی تکذیب کرتے ہو": (افبھذا الحدیث انتم مدھنون)۔ جب کہ اس سے صدق و حقانیت کی نشانیاں اچھی طرح واضح ہوتی ہیں۔ تو چاہیے کہ تم کلامِ خدا کو انتہائی کاوش کے ساتھ قبول کرو اور ایک حقیقت واقعی سمجھ کر اس کے سامنے جاؤ۔ "ھٰذا الحدیث" "یہ بات" قرآن کی طرف اشارہ ہے اور "مدھنون" "دھن" کے مادہ سے ہے جس کے معنی روغن اور تیل کے ہیں۔ چونکہ بدن کی کھال یا دوسری چیزوں کو نرم کرنے کے لیے روغن ملتے ہیں اس لیے لفظ "ادھان" نرمی سے پیش آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی سستی اور مقابلہ نہ کرنے کی کیفیت کے لیے بھی آتا ہے۔ چونکہ منافقین اور جھوٹے افراد کی عام طور پر ملائم زبان ہوتی ہے، اس بنا پر یہ لفظ کبھی کبھی تکذیب و انکار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

---

[1] "لا یمسہ" جملہ خبریہ ہے جو نہی یا نفی کے معنی میں ہو سکتا ہے۔

[2] تنزیل یہاں مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں یعنی منزل کے معنی میں اور مبتدائے محذوف کی خبر ہے یا خبر کے بعد خبر ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان دونوں معانی کا احتمال ہے۔ اصولی طور پر انسان جس چیز کو باور کرتا ہے اسے پوری قوت اور مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اگر مضبوطی سے نہ پکڑے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے باور نہیں کرتا۔ زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں فرماتا ہے:
"تم بجائے اس کے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں خصوصاً قرآن جیسی عظیم نعمت' کا شکر ادا کرو تم اس کی تکذیب کرتے ہو"۔ (وتجعلون رزقکم انکم تکذبون)[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن میں سے تمہارا حصہ صرف یہ ہے کہ تم اس کی تکذیب کرتے رہو یا تم نے تکذیب کو اپنا ذریعہ معاش قرار دے لیا ہے۔[2]

لیکن آخری دو تفسیروں میں سے پہلی تفسیر گزشتہ آیات کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اس شانِ نزول کے ساتھ بھی زیادہ ہم آہنگ ہے جو اس آیت کے لیے بیان ہوئی ہے کیونکہ بہت سے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک سفر میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ انہیں شدید پیاس لگی۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے دُعا فرمائی۔ نتیجتہً بارش کا نزول ہوا اور سب سیراب ہو گئے۔ اسی دوران میں پیغمبرِ اسلامؐ نے سُنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ فلاں ستارے کے طلوع کی وجہ سے بارش ہوئی۔ (عرب زمانۂ جاہلیت میں "انواء" کا عقیدہ رکھتے تھے اس سے ان کی مراد ایسے ستارے تھے جو مختلف فصلوں میں آسمان پر ظاہر ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان میں سے ہر ستارے کے ظہور کے ساتھ بارش ہوتی ہے اس لیے وہ کہتے تھے (مطرنا بنو فلاں)" یہ بارش فلاں ستارے کے طلوع کی برکت کی وجہ سے ہے اور یہ بھی شرک و بُت پرستی و ستارہ پرستی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تھا)[3]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے بہت کم آیتوں کی تفسیر کی ہے منجملہ ان چند آیتوں کے جن کی آپ نے تفسیر کی ہے ایک آیت یہ ہے "وتجعلون رزقکم انکم تکذبون"۔ آپ نے فرمایا کہ: "اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی روزی کے شکر کی بجائے تم تکذیب کرتے ہو"۔[4]

چند نکات

۱۔ قرآن مجید کی خصوصیات

ان چار اوصاف سے جو مندرجہ بالا آیتوں میں قرآن کے بارے میں بیان ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی عظمت ایک تو اس کے موضوعات و مضامین کی وجہ سے ہے، دوسرے اس کے معانی کے عمق کی وجہ سے ہے، تیسرے اس پاکیزگی کی وجہ سے ہے کہ نیک اور پاک افراد کے سوا کوئی اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور چوتھے اس وجہ سے کہ یہ حد سے زیادہ تربیتی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ان چاروں موضوعات میں سے ہر موضوع مفصل بحث کا محتاج ہے جسے ہم نے

---

[1] اس تفسیر کے مطابق یہاں شکر کا لفظ محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے۔ (وتجعلون شکر رزقکم انکم تکذبون) یا شکر کنایہ ہے شکر رزق کا۔

[2] ان دونوں تفسیروں کے مطابق کوئی چیز مقدر نہیں ہے۔

[3] اس حدیث کو طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے تفسیر در المنثور جلد ۶، ص ۱۶۳۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۹۸۔ مراغی جلد ۲۷ ص ۱۵۲۔ اور رُوح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۵۵ نے بھی مختصر سے فرق کے ساتھ زیر بحث آیات کے ذیل میں اسے نقل کیا ہے۔

[4] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۶۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۷

مناسب آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

۲۔ قرآن و طہارت

مندرجہ بالا آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ قرآن کو پاک لوگوں کے علاوہ کوئی مَس نہیں کرتا اور ہم نے بتایا ہے کہ اس آیت کی مس ظاہری سے بھی تفسیر ہوئی ہے اور مس معنوی سے بھی اور دونوں تفسیریں آپس میں تضاد بھی نہیں رکھتیں۔ اور آیت کے مفہوم کلی میں موجود ہیں۔ پہلے حصہ میں روایات اہل بیت میں حضرت ابوالحسن امام علی ابن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے:

المصحف لا تمسه علی غیر طهر و لا جنبا و لا تمس خطه و لا تعلقه ان الله تعالیٰ یقول: لا یمسه الا المطهرون)

قرآن کو وضو کے بغیر مَس نہ کر اور جنابت کی حالت میں بھی مَس نہ کر اور اس حالت میں اس کی تحریر کو مت چھو اور اسے حمائل نہ کر کیونکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے سوائے پاکیزہ لوگوں کے لیے کوئی مَس نہیں کرتا[1]

یہی معنی ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مختصر فرق کے ساتھ منقول ہیں[2]۔

منابع اہل سُنّت میں بھی آیا ہے اور مختلف طرق سے بھی نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

لا یمس القرآن الا طاهر۔

"قرآن کو پاکیزہ افراد کے علاوہ کوئی مَس نہ کرے۔"[3]

مس معنوی کے بارے میں ابن عباس کے ذریعے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"انه لقرآن کریم فی کتاب مکنون" قال عند الله فی صحف مطهرة لا یمسه الا المطهرون قال المقربون۔

"یہ قرآن کریم ہے جو پوشیدہ (لوح محفوظ) کتاب میں ہے، خدا کے پاس پاکیزہ صفحات ہیں اور سوائے پاکیزہ لوگوں کے اسے کوئی مَس نہیں کرتا، پاک لوگوں سے مراد مقربین ہیں۔"[4]

یہ مطلب ازرُوئے عقل بھی مدلل ہے کیونکہ قرآن مجید اگرچہ سب لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ تھے جو قرآن کو پیغمبرؐ کے لب ہائے مبارک سے سُنتے تھے اور اس آب زلال حقیقت کو سرچشمہ وحی میں دیکھتے تھے لیکن چونکہ تعصب، عناد اور ہٹ دھرمی کا شکار تھے انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن جن لوگوں نے تھوڑا سا اپنے آپ کو پاک کیا اور حق جوئی کے جذبے اور تحقیق کی رُوح کے ساتھ اس کی طرف آئے وہ ہدایت پا گئے۔ اس بنا پر جس شخص میں جس قدر انسانی پاکیزگی زیادہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۶۹ - حدیث ۳ - اس حدیث کے مطابق اوپر والی آیت میں نفی نہی سے کنایہ ہے۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱ ص ۲۷۰ - حدیث ۵ -

[3] یہ حدیث درالمنثور میں عبداللہ ابن عمر، معاذ ابن جبل اور ابن حزم کے واسطے سے پیغمبرؐ سے منقول ہے ج ۶ ص ۱۶۲

[4] درالمنثور ج ۶ ص ۱۶۲

ہو گی اور تقویٰ کی زیادہ ہو گا وہ قرآن مجید سے زیادہ عمیق مفاہیم حاصل کر سکے گا۔ لہٰذا یہ آیت اس طرح جسمانی اور روحانی دونوں جنتوں سے منطبق ہوتی ہے۔ بغیر کہے یہ امر واضح ہے کہ ذات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمہ معصومین اور ملائکہ مقربین اس کے زیادہ واضح مصداق ہیں اور وہ حقائق قرآن کا سب سے بہتر ادراک کرتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۸۳۔ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۙ
۸۴۔ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۙ
۸۵۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝
۸۶۔ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۙ
۸۷۔ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۳۔ پس کیوں جب کہ رُوح گلے تک پہنچ جائے گی۔ (اسے واپس لوٹانے کی تم توانائی نہیں رکھتے) ؟

۸۴۔ اور تم اس حالت میں نظارہ کروگے۔ (اور کوئی کام تمہارے ہاتھ سے نہیں ہوسکے گا)۔

۸۵۔ اور ہم اس سے زیادہ نزدیک ہیں تمہاری نسبت لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔

۸۶۔ اگر تمہارے اعمال کی تمہیں بالکل جزا نہ دی جائے۔

۸۷۔ تو پھر اس کو لوٹا دو اگر سچ کہتے ہو۔

تفسیر

جس وقت کہ جان گلے تک پہنچ جائے گی

منجملہ دیگر حسّاس لمحات کے جو انسان کو بہت زیادہ گہری فکر میں مستغرق کر دیتے ہیں احتضار یعنی انسانی زندگی کے اختتام کا لمحہ ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے کہ جہاں معاملہ انسان کے اختیار سے باہر ہو جاتا ہے اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ جان کنی میں مبتلا فرد کو نا اُمیدی سے دیکھتے ہیں کہ یہ شمع کی طرح ہے جس کی زندگی ختم ہو چکی ہے اور آہستہ آہستہ بجھ رہی ہے۔ وہ زندگی سے رُخصت ہوتا ہے۔ اس وقت اس کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ جی ہاں انسان کا مکمل ضعف ان حسّاس لمحات میں آشکار ہو جائے گا۔ نہ صرف گزشتہ زمانوں میں، بلکہ موجودہ زمانے میں بھی، علاج کی تمام سہولتوں کے باوجود، جاں کنی کے عالم کی زبوں حالی بالکل گزشتہ دور کی طرح واضح و آشکار ہے۔ قرآن مجید معاد کے مباحث کی تکمیل اور منکرین و مکذّبین کی جواب دہی میں اس لمحے کی گویا تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: "پس کیوں جس وقت جان گلے میں آجائے گی تو اس کو واپس لوٹانے کی طاقت تم نہیں رکھتے"۔ (فلولا اذا بلغت الحلقوم)[1]

"اور تم اس حالت میں نظارہ کرو گے اور تم سے کچھ نہیں ہو سکے گا"۔ (وانتم حینئذ تنظرون)۔ یہاں مخاطب وہ لوگ ہیں جو جاں کنی میں مبتلا فرد کے متعلقین ہیں۔ ایک تو وہ اس کی خستہ حالت کو دیکھیں گے، دوسرے اپنی بے چارگی و ناتوانی کو محسوس کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ ان کا اپنا انجام بھی یہی ہونا ہے۔[2]

اس کے بعد پروردگارِ عالم مزید فرماتا ہے: "حالانکہ تمہاری نسبت ہم اس کے زیادہ قریب ہیں اور ہمارے فرشتے جو اس کی رُوح قبض کرنے کے لیے آمادہ ہیں وہ بھی تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے"۔ (ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون)۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جاں کنی میں مبتلا شخص کی جان پر کیا گزر رہی ہے اور اس کے وجود کی گہرائی میں کیسا تلاطم برپا ہے اور وہ ہم ہی ہیں جس نے اس کی رُوح کے قبض کرنے کا معیّن وقت پر فرمان جاری کیا ہے لیکن تم تو صرف اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہو اور اس گھر سے دوسرے گھر کی طرف انتقال سے اور ان طوفانوں سے جو اس وقت برپا ہیں، تم بے خبر ہو۔ اس بنا پر اس آیت سے مراد خدا کا جاں کنی میں مبتلا فرد سے قریب ہونا ہے۔ بعض مفسّرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد رُوح قبض کرنے والے فرشتہ کا نزدیک ہونا ہے لیکن پہلی تفسیر آیت کے ظاہر سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بہرحال نہ صرف اس موقع پر بلکہ ہر حالت میں خدا ہر شخص کی نسبت ہم سے زیادہ نزدیک ہے یہاں تک کہ وہ خود ہم سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔ اگرچہ ہم بے خبری کی وجہ سے اس سے دور ہیں۔

---

[1] آیت محذوف رکھتی ہے جس کا گزشتہ آیات سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے۔ (فلولا اذا بلغت الحلقوم لا ترجعونھا ولا تمکنون شیئًا)۔ یہاں فعل کا مؤنث ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ نفس کی طرف لوٹتا ہے۔

[2] یہ جو بعض مفسّرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ یہاں مخاطب جاں کنی میں مبتلا ہونے والا شخص ہے، بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ بعد والی آیت واضح کرتی ہے کہ مخاطب اس کے متعلقین اور اردگرد بیٹھنے والے افراد ہیں۔

اس حقیقت کا اظہار جاں کنی کے موقع پر دیگر تمام موقعوں کی نسبت زیادہ واضح و آشکار ہے۔ اس کے بعد مزید تاکید کے لیے اور اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے مزید فرماتا ہے: "اگر تمہیں تمہارے اعمال کی بالکل جزا نہ دی جائے۔ (فلولا ان کنتم غیر مدینین)" تو پھر اس کو واپس لوٹا دو اگر تم سچے ہو" (ترجعونها ان کنتم صادقین)۔ یہ تمہارا ضعف اس بات کی دلیل ہے کہ موت و حیات کا مالک کوئی اور ہے اور جزا و سزا کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور وہ وہی ہے کہ جو مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ "مدینین" جمع ہے "مدین" کی۔ یہ دَین کے مادہ سے ہے جس کے معنی جزا ہیں۔ بعض نے اس کے معنی مربوبین بتائے ہیں یعنی اگر اب تمہارا کوئی اور نہیں ہے اور اپنے امر کے تم خود ہی مالک ہو تو اس کو واپس لوٹا دو۔ یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ تم کسی اور کے محکوم ہو۔

چند نکات

۱۔ جبارین کی ناتوانی کا لمحہ

حقیقت میں ان آیات کا مقصودِ کلام یہ ہے کہ موت و حیات کے مسئلہ پر خدا کے اختیار کو بیان کیا جائے تاکہ اس سے مسئلہ معاد تک ایک پل بنایا جا سکے۔ اس موقع پر موت اور جاں کنی کا انتخاب انسان کی مکمل ناتوانی اور اس کے ضعف کے ظہور کی وجہ سے ہے۔ باوجود اس تمام اختیار کے جس کو وہ اپنے لیے خیال کرتا ہے۔ یہ امر معیوب نہیں کہ بعض ایسے جبار لوگوں کی طرف ہم توجہ کریں جن کے اوجِ قدرت و اختیار میں ان کی موت کا لمحہ آیا ہے تاکہ ان آیتوں کی گہرائی زیادہ آشکار ہو۔ مسعودی نے مروج الذہب میں مامون اور اس کی فوج کی روم سے جنگ کے بارے میں ایک داستان بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مامون جس وقت میدانِ جنگ سے لوٹ رہا تھا تو وہ "بدیدون" نامی چشمے پر پہنچا جو قشیرہ کے علاقہ میں مشہور ہے۔ آرام کرنے کی غرض سے اس نے وہاں پڑاؤ کیا۔ اس چشمے کے پانی کی صفائی، ٹھنڈک اور چمک نے اسے بہت مسرور کیا اور اس طرح وہ اس علاقہ کی شادابی، تازگی اور بشاشت سے بہت خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ درختوں کو کاٹ کر چشمہ پر ایک پُل بنا دیں اور اس پر لکڑیوں اور پتوں سے ایک چھت بنا دیں۔ وہ وہاں آرام کرنے لگا اس حالت میں کہ پانی اس کے پاؤں کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پانی اس قدر صاف و شفاف تھا کہ اس نے ایک درہم پانی کے اندر پھینکا جو پانی کی تہہ میں پہنچ گیا لیکن اس پر جو تحریر کندہ تھی وہ صاف پڑھی جا رہی تھی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ کوئی اس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک مچھلی جو خاصی بڑی تھی، تقریباً ایک ہاتھ کے برابر ہوگی" وہ ظاہر ہوئی مچھلی بالکل ایک چاندی کے ٹکڑے کی طرح تھی۔ مامون نے کہا جو شخص اس کو پکڑ کر لائے گا میں اس کو تلوار انعام میں دوں گا۔ ایک خدمت گار نے پیش قدمی کی اور اس کو پکڑ لیا۔ جس وقت اس مچھلی کو وہ مامون کی خدمت میں لایا تو مچھلی نے ہلنا شروع کر دیا اور وہ خدمت گار کے ہاتھ سے نکل کر باہر گر پڑی اور ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح پانی میں گر گئی۔ اس کے گرنے سے تھوڑا سا پانی مامون کے گلے سینے اور شانوں پر پڑا اور اس کا لباس خاصا بھیگ گیا۔ خدمت گار دوبارہ پانی میں اتر گیا اور اس نے مچھلی کو پکڑ لیا اور اس کو ایک رومال میں لپیٹ کر مامون کے سامنے رکھ دیا اس حالت میں کہ وہ مچھلی حرکت کر رہی تھی۔ مامون نے کہا ابھی ابھی اسے بھون کر سُرخ کرو۔ اسی اثنا میں مامون اچانک سردی کی وجہ سے کانپنے لگا اور حالت یہ ہوئی کہ وہ دو قدم چل نہیں سکتا تھا۔ اسے کئی لحاف اوڑھائے گئے مگر وہ پھر بھی کپکپاتا رہا۔ وہ چلا رہا تھا سردی سردی۔ اس کے لیے آگ جلائی گئی پھر بھی اسے افاقہ نہ ہوا۔ اسی اثنا میں مچھلی سُرخ کر کے اس کے لیے لے آئے لیکن وہ اس کو چکھ بھی نہ سکا۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تو بختیشوع اور ابن ماسویہ جو دونوں شاہی طبیب تھے طلب کیے گئے اس وقت مامون

نزع کے عالم میں تھا۔ بختیشوع نے اس کا ایک ہاتھ اور ابن ماسویہ نے دوسرا ہاتھ پکڑ کر اس کی نبض دیکھی جو مکمل طور پر غیر معتدل تھی اور اس کی موت کی خبر دے رہی تھی۔ اس حالت میں اُسے ایک خاص قسم کا پسینہ آ رہا تھا جو تیل کی طرح چپکنے والا تھا۔ یہ دونوں طبیب اس کی تشخیص میں منہمک تھے۔ ان دونوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے ایسی کسی مرض کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بہر حال جو صورت حال ہے وہ اس کی موت کی خبر دیتی ہے۔ مامون کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی تو کہنے لگا مجھے کسی اُونچی جگہ لے چلو جہاں سے میں اپنے لشکر کو دیکھ سکوں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اسے اُونچی جگہ پر لے جایا گیا۔ وہاں سے جب اس نے اپنے لشکریوں کے خیموں اور اس بہت سی آگ کو دیکھا جو لشکر نے اپنے پڑاؤ میں روشن کر رکھی تھی تو اس نے کہا: یا من لا یزول ملکه ارحم من قد زال ملکه ۔ اے وہ خدا جس کی حکومت کو کبھی زوال نہیں ہے اس پر رحم کر جس کی حکومت رو بہ زوال ہے۔ اس کے بعد اُسے اُٹھا کر لائے اور بستر پر لٹا دیا گیا اور ایک شخص کو اس کے پاس بٹھایا جو اسے شہادتین کی تلقین کرے۔ چونکہ مامون کی سماعت کمزور ہو چکی تھی، اس شخص نے اپنی آواز بلند کی تو ابن ماسویہ نے کہا فریاد نہ کر اور اُونچی آواز نہ نکال خدا کی قسم وہ اس وقت خدا اور "مانی" کے درمیان فرق نہیں کر سکتا۔ اس وقت مامون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے اتنے سُرخ ہو چکے تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے ابن ماسویہ کی خبر لے لیکن اس پر اُسے قدرت نہ تھی۔ بس اسی لمحہ اس کی جان نکل گئی۔[1]

ہو سکتا ہے کہ اس کی بیماری پہلے سے ہو یا بعض مؤرخین کے بقول جو شخص اُس چشمے کا پانی پیتا تھا بیمار ہو جاتا تھا۔ وہ مچھلی زہریلے اثرات رکھتی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اُس کی حکومت و قدرت چند لمحوں میں ختم ہوگئی اور بڑے بڑے جنگ کے میدانوں کا قہرمان و سپاہی موت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا۔ اس لمحے کسی میں قدرت نہ تھی کہ وہ اس کے لیے کوئی قدم اُٹھائے یا کم از کم اسے اس کی اصل منزل یعنی اس کے گھر تک لے جائے۔ تاریخ کے دامن میں اس قسم کی بہت سی عبرت انگیز داستانیں ہیں۔

۲۔ کیا جانکنی تدریجی امر ہے؟

جان کے گلے تک پہنچنے کی تعبیر جو گزشتہ آیات میں آئی ہے (فلولا اذا بلغت الحلقوم) وہ زندگی کے آخری لمحات کا کنایہ ہے۔ شاید اس کا منشایہ ہے کہ زیادہ تر اعضائے بدن ہاتھ پیر وغیرہ موت کے وقت باقی اعضا سے پہلے بیکار ہو جاتے ہیں اور گلا وہ عضو ہے جو سب سے آخر میں بیکار ہوتا ہے۔ سورہ قیامۃ کی آیت ۲۶ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (کلا اذا بلغت التراقی) کفار کبھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ رُوح ان کی (ترقوہ) ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے۔ (ترقوہ وہ ہڈیاں ہیں جو حلق کے اطراف کو گھیرے ہوئے ہیں)۔

❖ ❖ ❖

---

[1] مروج الذهب مطابق نقل سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۴

۸۸۔ فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ۝

۸۹۔ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ۝

۹۰۔ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ۝

۹۱۔ فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ۝

۹۲۔ وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُكَذِّبِينَ ٱلضَّآلِّينَ ۝

۹۳۔ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ ۝

۹۴۔ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ ۝

۹۵۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ حَقُّ ٱلْيَقِينِ ۝

۹۶۔ فَسَبِّحْ بِٱسْمِ رَبِّكَ ٱلْعَظِيمِ ۝

ترجمہ

۸۸۔ لیکن اگر وہ مقربین میں سے ہو۔

۸۹۔ تو رُوح و ریحان اور پُر نعمت بہشت میں ہے۔

۹۰۔ اور اگر اصحاب یمین میں سے ہے۔

۹۱۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ پر سلام ہو تیرے دوستوں کی طرف سے جو اصحاب یمین
میں سے ہیں۔

۹۲۔ لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو۔

۹۳۔ تو دوزخ کے جوش دیے ہوئے پانی سے اس کی تواضع ہوگی۔

۹۴۔ اس کے بعد اس کی سرنوشت یہ ہوگی کہ اس کا دوزخ میں ورود ہوگا۔

۹۵۔ یہ وہی حق و یقین ہے۔

۹۶۔ اب جب کہ ایسا ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک شمار کر۔

تفسیر

نیکو کاروں اور بدکاروں کا انجام

یہ آیات اس سورہ کی ابتدائی اور آخری آیات کا ایک قسم کا امتزاج ہیں۔ یہ آیتیں جب انسان موت کے آستانے پر ہو تو اس کی حالت کے تغیر کی تصویرکشی کرتی ہیں کہ کس طرح بعض لوگ انتہائی آرام و سکون اور راحت و خوشی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اور ایک وہ گروہ ہے جو جہنم کی آگ کے دور سے نظر آنے والے نظارے کی وجہ سے انتہائی اضطراب و وحشت کے عالم میں جان دیتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "جس شخص پر جاں کنی کا عالم طاری ہوتا ہے اگر وہ مقربین میں سے ہو (فاما ان کان من المقربین) تو وہ انتہائی راحت و آرام میں ہے اُسے نعمتوں سے لبریز جنت میں جگہ مل جائے گی۔ (فروح و ریحان وجنة نعیم)۔

"روح" بروزن "قول" جیسا کہ علمائے لغت نے کہا ہے اصل میں تنفس کے معنوں میں ہے اور ریحان خوشبودار گھاس یا کسی خوشبودار چیز کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے بولا گیا ہے جو سبب حیات و راحت ہو۔ جیسا کہ "ریحان" ہر قسم کی نعمت اور فرحت بخش روزی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر روح و ریحان انسان کے آرام کے تمام وسائل اور خدائی نعمت و برکت پر محیط ہیں دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ روح ان تمام امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو تکالیف سے رہائی بخشیں تاکہ وہ سکھ کا سانس لے سکے۔ باقی رہا "ریحان" تو وہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو تکالیف سے رہائی کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسلامی مفسرین نے ان ہر دو الفاظ کے لیے متعدد تفسیریں تجویز کی ہیں جو غالباً دس تفسیروں سے زیادہ ہیں۔ کبھی انہوں نے کہا ہے کہ "روح" کے معنی رحمت اور ریحان ہر شرافت و فضیلت کو کہتے ہیں اور کبھی کہا ہے کہ "روح" جہنم کی آگ سے نجات کو اور "ریحان" جنت میں داخلہ کو کہتے ہیں اور کبھی "روح" اس آرام و سکون کو کہتے ہیں جو قبر میں میسر آئے۔ اور "ریحان" کے معنی وہ سکون ہے جو بہشت میں حاصل ہو۔ کبھی "روح" سے مراد کشف الکروب (بے آرامیوں کا برطرف ہونا) لیا ہے اور "ریحان" کی تفسیر غفران الذنوب کی ہے۔ کبھی "روح" کو (النظر الی وجہ اللہ) اور "ریحان" کو استماع کلام اللہ شمار کیا ہے اور اس قسم کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے

کہا ہے یہ سب ایک جامع مفہوم کے مصداق ہیں جن کا ذکر آیت کی تفسیر میں ہوا۔ قابل توجہ یہ ہے کہ "روح" اور "ریحان" کے ذکر کے بعد جنت نعیم کی گفتگو درمیان میں لائی گئی ہے جو ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ "روح و ریحان" موت کے وقت اور قبر و برزخ اور بہشت میں مومن کو حاصل ہوں گے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

فاما ان کان من المقربین فروح و ریحان یعنی فی قبرہ وجنۃ نعیم یعنی فی الآخرۃ۔

"لیکن اگر مقربین میں سے ہو تو اس کے لیے قبر میں روح و ریحان ہے اور اس کے لیے آخرت میں پُر نعمت بہشت ہے۔" [۱، ۲]

اس کے بعد پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "لیکن اگر دوسرے گروہ یعنی اصحاب یمین میں سے ہو۔" وہی نیک اور صالح مرد اور عورتیں جن کے نامۂ اعمال کامیابی اور قبولیت کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے" (واما ان کان من اصحاب الیمین)۔ تو اس سے کہا جائے گا تجھ کو تیرے ان دوستوں کی طرف سے سلام ہو جو اصحاب یمین میں سے ہیں۔ (فسلام لك من اصحاب الیمین)۔ اس طرح رُوح قبض کرنے والے فرشتے انتقال کے وقت اس کے دوستوں کا سلام اسے پہنچائیں گے جیسا کہ اس سورہ واقعہ کی آیت ۲۶ میں اہل بہشت کی تعریف و توصیف میں ہم نے پڑھا ہے (الا قیلا سلاما سلاما) اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے، اور وہ یہ کہ یہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو جو اس سے کہیں گے تجھ پر سلام ہو اے وہ شخص جو اصحاب یمین میں سے ہے یعنی تیرے اعزاز و افتخار و تعریف و توصیف کے لیے یہی کافی ہے کہ تو ان کی صف میں قرار پایا ہے۔ [۳]

دوسری قرآنی آیات میں بھی مومنین کو موت کے موقع پر فرشتوں کا سلام آیا ہے مثلاً سورہ نحل کی آیت ۳۲ جس میں پروردگار عالم فرماتا ہے: الذین تتوفاھم الملئکۃ طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنۃ بما کنتم تعملون۔

"وہ لوگ کہ فرشتے جن کی رُوحوں کو قبض کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں۔ وہ ان سے کہتے ہیں تم پر سلام ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کی بنیاد پر جنہیں تم انجام دیتے تھے۔"

یہ سلام کی تعبیر بہت پُر معنی ہے چاہے وہ سلام فرشتوں کی طرف سے ہو چاہے اصحاب یمین کی طرف سے۔ وہ سلام جو "روح و ریحان" اور ہر قسم کی سلامتی و سکون و آرام ہے اور نعمت کی نشانی ہے۔ [۴]

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اصحاب الیمین (وہ لوگ جن کے نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے) کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ عام طور پر انسان اپنے اہم اور ماہرانہ کام دائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہٰذا دایاں ہاتھ مہارت، توانائی اور کامیابی کی علامت

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۸ حدیث ۱۰۳، ۱۰۴۔

۲۔ "روح" ہو سکتا ہے مبتدائے محذوف کی خبر ہو اور تقدیر عبارت یہ ہو (فجزائہ روح) اور یا مبتدائے خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت (فلہ روح) ہے اور پورا جملہ فروح ... اما کی جزا ہے اور ان شرطیہ اس جزا کے ہوتے ہوئے دوسری جزا سے مستغنی ہے (غور فرمایئے)

۳۔ اس بنا پر آیت میں دو تقدیریں ہیں۔ اس شکل میں (یقال لہ سلام لك انك من اصحاب الیمین) لیکن پہلی تفسیر کی بنا پر صرف ایک ہی تقدیر ہے اور وہ (یقال لہ)

۴۔ ان سلاموں کے بارے میں جو جنتیوں پر نثار ہوں گے جلد ۱۸ ص ۲۰۴ سورہ یٰسین کی آیت ۵۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا:

(ھم شیعتنا و محبونا)

"اصحاب یمین ہمارے شیعہ اور ہمارے دوست ہیں"۔[1]

اس کے بعد ہم تیسرے گروہ کو عنوانِ کلام بناتے ہیں جنہیں سورہ کے اوائل میں اصحاب شمال کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "لیکن اگر وہ تکذیب کرنے والے گمراہوں میں سے ہو" (واما ان کان من المکذبین الضالین)۔ تو اس کی دوزخ کے کھولتے ہوئے اور زہریلے پانی سے ضیافت و پذیرائی ہوگی۔ (فنزل من حمیم)[2]

اور اس کے بعد اس کی قسمت یہ ہے کہ اس کا جہنم میں ورود ہوگا" (وتصلیة جحیم)۔ جی ہاں موت کی آمد پر خدا کی طرف سے نازل ہونے والے ابتدائی عذاب وہ چکھیں گے اور قبر و برزخ میں قیامت کے عذابوں کے "تلخ ذائقہ" ان کے حصہ میں آئیں گے اور چونکہ گفتگو محتضر کے بارے میں ہے مناسب یہ ہے کہ "فنزل حمیم" کا جملہ برزخ کے عذاب کے بارے میں ہے اور "وتصلیة جحیم" قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ معنی متعدد روایات میں آئمہ اہل بیتؑ سے منقول ہیں۔[3]

قابل توجہ یہ ہے کہ مکذبین اور ضالین کا ذکر ایک جگہ ہوا ہے جن میں سے پہلے کا تعلق قیامت، خداوند یکتا اور نبوت پیغمبر کی تکذیب سے ہے اور آیت میں اسی طرف اشارہ ہے اور دوسرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو راہ حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ یہ تعبیر اس کے علاوہ کہ تاکید کے معنوں میں ہے، اس نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو سکتی ہے کہ گمراہوں کے درمیان ایسے مستضعف و جاہل اور قاصر افراد بھی تھا جو حق سے عناد نہیں رکھتے، نہ ہٹ دھرمی کا شکار ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے حال پر اللہ کا لطف و کرم ہو۔ لیکن ایسے تکذیب کرنے والے جو حق سے عناد رکھتے ہوں اور ہٹ دھرم ہوں ان کا نصیب وہی ہوگا جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ "حمیم" کھولتے ہوئے پانی یا گرم اور زہریلی ہواؤں کے معنی میں ہے اور تصلیہ کا مادہ "صلی" (بروزن سعی) ہے اس کے معنی جلنا اور آگ میں داخل ہونا ہے۔ باقی متعدی رہا وہ تصلیہ جو متعدی کے معنی رکھتا ہے وہ صرف جلانے کے معنی میں آتا ہے۔ اس گفتگو کے آخر میں مزید فرماتا ہے: "یہ وہی حق و یقین ہے": (انّ ھٰذا لھو حق الیقین)۔ اَب جب کہ معاملہ اس طرح ہے تو اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اُسے منزہ شمار کر: (فسبح باسم ربك العظیم)۔ مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ (حق الیقین) اضافتِ بیانیہ کے قبیل میں سے ہے۔ یعنی جو کچھ مقربین، اصحاب یمین اور تکذیب کرنے والے تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عین واقعیت و حق و یقین ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ چونکہ یقین کے کئی مدارج ہیں اس کا اعلیٰ درجہ حق الیقین ہے۔ واقعی یقین جو مکمل ہو اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو۔[4]

---

1. تفسیر برہان جلد ۴ ص ۲۸۵
2. نزل مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے۔ (فجزائہ نزل من حمیم) یا مبتدا ہے محذوف خبر کا اور تقدیر عبارت یوں ہے (فلہ نزل من حمیم)۔
3. نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۹
4. اس تفسیر کے مطابق حق کی اضافت یقین کی طرف اختصاص و تقیید کے لیے ہے۔ بعض نے اسے موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل میں سے سمجھا ہے اور کہا ہے کہ (الیقین الحق) وہ یقین جو حق ہے یہ ان معنوں میں ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ اس آیت میں لفظ هٰذا تین گروہوں کے حالات کی طرف اشارہ ہے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ بعض نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ سورہ واقعہ کے سارے موضوعات و مضامین کی طرف اشارہ ہے یا سارے قرآن کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "فسبح" (پس تسبیح کر) کی تعبیر "فا تفریع" کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ ان تین گروہوں کے بارے میں کہا گیا ہے وہ عین عدالت ہے۔ لہٰذا اس بنا پر اپنے خدا کو ہر قسم کے ظلم اور بے انصافی سے پاک و منزہ شمار کر یا یہ کہ اگر تو چاہتا ہے کہ تیسرے گروہ کی حالتِ زار سے دوچار نہ ہو تو خدا کو ہر قسم کے شرک و ناانصافی سے، جو انکارِ قیامت کا لازمہ ہیں، پاک و منزہ سمجھ۔ بہت سے مفسرین نے آخری آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ اس کے نزول کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اجعلوها في رکوعکم" اس کو اپنے رکوع میں قرار دو۔ (اور سبحان ربی العظیم کہو) اور جس وقت سبح اسم ربك الاعلیٰ نازل ہوا تو فرمایا: "اجعلوها في سجودکم" اسے اپنے سجدے میں قرار دو۔ (سبحان ربی الاعلیٰ کہو)[1]

اسی سورہ کی آیت ۷۴ کی تفسیر میں بھی ہم نے اس روایت سے مشابہ روایتیں مفسرین کی جانب سے نقل کی ہیں۔

ایک نکتہ

عالمِ برزخ

اوپر والی آیات ان آیات میں سے ہیں جو عالمِ برزخ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ان آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ موت کے آستانے پر پہنچ کر جب انسان دوسرے جہان کی طرف انتقال کے لیے آمادہ ہوگا تو درج ذیل حالات میں سے کسی حالت سے دوچار ہوگا۔ اسے خدا کی نعمتیں میسر ہوں گی۔ اس کے حال پر اللہ کا لطف و کرم ہوگا۔ اعمال کی جزا ملے گی اور "روح و ریحان" سے ہمکنار ہوگا یا اسے دردناک سزائیں ملیں گی اور عذابِ الٰہی اس پر نازل ہوگا۔ آیت میں موجود قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے ایک حصہ قیامت سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرے کا تعلق قبر و برزخ سے ہے اور یہ خود اس عالم کے وجود پر ایک دلیل شمار ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ پہلی چیز جس کی مومن کو موت کے وقت بشارت دی جائے گی وہ "روح و ریحان" ہیں اور نعمتوں سے پُر جنت ہے اور پہلی چیز جس کی مومن کو قبر میں بشارت دی جائے گی، خوشنودیٔ خدا کی بشارت ہوگی۔ اس سے کہا جائے گا ہم تجھے جنت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ خدا نے ان تمام افراد کو بخش دیا ہے جنہوں نے تیرے جنازے کی مشایعت کی ہے اور تیرے بارے میں جو انہوں نے شہادت دی ہے اللہ نے اس کی تصدیق کر دی ہے اور تیرے بارے میں ان کی دعائے مغفرت کو مستجاب کیا ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان جس وقت ایامِ دنیا میں سے آخری دن اور ایامِ آخرت میں سے پہلے دن کی منزل پر پہنچے گا تو اس کی دولت، اولاد اور اعمال اس کے سامنے مجسم ہو کر آئیں گے۔ وہ اپنے اعمال سے کہے گا میں

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، روح المعانی، روح البیان، قرطبی، درالمنثور اور تفسیر مراغی در ذیل آیت زیر بحث۔

[2] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۶۶۔

تمہارے معاملہ میں بالکل بے پرواہ تھا۔ اگرچہ تم مجھ پر گراں تھے۔ اب تم میرے متعلق کیا خبر رکھتے ہو تو اس کا عمل اس سے کہے گا: میں قبر میں اور قیامت میں تیرا ہم نشین ہوں تاکہ میں اور تو دونوں حضور پروردگار عالم میں پیش ہوں"۔ اس کے بعد امام نے مزید فرمایا: "اگر وہ خدا کا دوست ہو گا تو اس کا عمل بہت ہی خوشبودار انسان کی شکل میں، انتہائی خوبصورتی کے عالم میں، نہایت پُرکشش لباس پہنے ہوئے آئے گا اور کہے گا تجھے سکون و آرام و نعمت و موہبت اور پُر نعمت جنت کی خوشخبری ہو۔ تیرا خیر مقدم کیا جائے گا۔ تو وہ انسان سوال کرے گا کہ تُو کون ہے۔ وہ اس کے جواب میں کہے گا: مَیں تیرا عمل صالح ہوں۔ مَیں دُنیا سے تیرے ساتھ بہشت کی طرف جاؤں گا:"[1]

عالم برزخ کے بارے میں زیادہ تفصیل ہم سورۂ مومنون کی آیت ۱۰۰ کے ذیل میں تحریر کر چکے ہیں۔[2]

اے پروردگار! ہمیں مقربین، اصحاب یمین اور اپنے خالص اولیاء میں شمار کر اور موت کے وقت ہمیں رُوح و ریحان اور جنت نعیم کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔

خداوندا! قیامت کا عذاب ایسا دردناک عذاب ہے کہ اسے برداشت کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے اور تیری بے شمار رحمتیں اور عظیم موہبتیں ہیں جن کا کوئی شخص بھی اپنے عمل سے حقدار نہیں ہو گا۔ اس روز ہمارا سرمایہ صرف تیرا لُطف و کرم ہو گا۔

بار الہا! قیامت کبریٰ اور موت جو قیامت صغریٰ ہے اس کے آنے سے پہلے ہمیں بیدار کر دے تاکہ اپنے آپ کو ہم اس عظیم سفر کے لیے آمادہ کر سکیں جو ہمارے سامنے ہے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

سورۂ واقعہ کا اختتام
۶ / ج ۲ / ۱۴۰۶ھ
۲۷ / ۱۱ / ۱۳۶۴ش
اختتام ترجمہ ساڑھے پانچ بجے صبح بروز منگل
۱۹ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ جون ۱۹۸۷ء
بر مکان حقیر واقع قم۔ ایران

۞ ۞ ۞

---

1. تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۲۸ حدیث ۱۰۶
2. تفسیر نمونہ جلد ۱۴ ص ۳۱۴ تا ص ۳۲۴ ملاحظہ فرمائیں۔

سُورۂ حدید

- یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
- اِس میں ۲۹ آیتیں ہیں۔

تاریخ شروع
۸/ ج ۲/ ۱۴۰۶ ھ
۲۹/ ۱۱/ ۱۳۶۴ ش

سورۂ حدید کے مشمولات

یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اجماع ہے۔ مدنی سورتوں کی خصوصیات کے طور پر اعتقادی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے علاوہ اس سورہ نے کئی اجتماعی، حکومتی اور عملی احکام پیش کیے ہیں جن کے نمونے انشاء اللہ ہم آیت ۱۰، ۱۱ اور ۲۵ میں دیکھیں گے۔

۱۔ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں توحید اور صفاتِ خدا کے بارے میں نہایت مدلل اور دلچسپ بحث ہے۔ خدا کی تقریباً بیس ایسی صفتیں ان میں مذکور ہیں جن کا ادراک انسان کو معرفتِ خدا کی ایک بلند منزل پر فائز کرتا ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ قرآن سے متعلق ہے اور اس نورِ الٰہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو شرک کی تاریکیوں میں چمکا۔

۳۔ تیسرا حصہ قیامت میں مومنین اور منافقین کی جو کیفیت ہوگی اس پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پہلا گروہ نورِ ایمان کے سائے میں باغِ فردوس کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ شرک کی ظلمتوں میں محصور رہ جاتا ہے۔ اس سورہ میں یہ دونوں مباحث ہیں۔ اس طرح سورہ میں اسلام کے تین بنیادی اصول توحید، نبوت اور قیامت نہایت خوبی سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ ایک اور حصہ میں قبولِ ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور شرک سے دستبردار ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس حصہ میں گزشتہ کافر قوموں میں سے ایک قوم کا احوال بھی پیش کیا گیا ہے۔

۵۔ سورہ کا اہم حصہ یہ ہے کہ اس میں راہِ خدا میں انفاق پر زور دیا گیا ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور مالِ دنیا کے بے قدر و قیمت ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶۔ یہ مختصر سا حصہ ہے لیکن نہایت مدلل ہے۔ اس میں عدالتِ اجتماعی پر گفتگو ہوئی ہے جو انبیاء کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے۔

۷۔ آخری حصہ میں رہبانیت اور اجتماعی طور پر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے مسئلہ پر بحث کے ساتھ اس کی مذمت کی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کا اس سے اختلاف واضح کیا گیا ہے۔

ان مباحث کے درمیان کچھ اور نکات بھی بڑی مناسبت کے ساتھ زیرِ بحث آئے ہیں اور آخر میں ایک خوابِ غفلت سے بیدار کرنے والا اور ہدایت بہم پہنچانے والا مجموعہ احکام تشکیل پاتا ہے۔

اس سورہ کا نام جو حدید رکھا گیا ہے وہ اس تعبیر کی بنا پر ہے جو آیہ ۲۵ میں آئی ہے۔

سورۂ حدید کی تلاوت کی فضیلت

روایات اسلامی میں اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں قابلِ ذکر باتیں سامنے آئی ہیں۔ تلاوت محض تلاوت نہیں بلکہ ایسی تلاوت جس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کا عنصر شامل ہو اور جو تحریک عمل کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے ہو۔ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ (من قرأ سورة الحديد كتب من الذين آمنوا بالله ورسوله) "جو سورہ حدید پڑھے گا وہ ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہوگا جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں۔"[1]

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے کہ آپ سونے سے پہلے مسبحات کی تلاوت فرماتے تھے۔ مسبحات وہ سورتیں ہیں جو سبّح للہ یا یسبح للہ سے شروع ہوتی ہیں اور وہ پانچ سورتیں ہیں۔ سورہ حدید، حشر، صف، جمعہ اور تغابن۔ آپ فرمایا کرتے تھے (انّ فيهن آية افضل من الف آية) ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیتوں سے افضل و برتر ہے۔[2] البتہ آپ نے اس آیت کو معین نہیں فرمایا لیکن بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد سورہ حشر کی آخری آیت ہے اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی ہے۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ من قرأ المسبحات كلها قبل ان ينام لم يمت حتى يدرك القائم وان مات كان فى جوار رسول الله

"جو شخص مسبحات کی تلاوت کرے تو وہ اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھے گا جب تک حضرت مہدیؑ کا ظہور نہ ہو جائے اور اگر اس سے پہلے وہ دنیا سے اٹھ گیا تو دوسرے جہان میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمسایہ ہو گا۔"[3]

❖ ❖ ❖

---

1. "مجمع البیان" آغاز سورہ حدید۔
2. مجمع البیان آغاز سورہ حدید و در المنثور جلد ۶ ص ۱۷۰۔
3. مجمع البیان آغاز سورہ حدید۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

۲۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

۳۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

۲۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت (و حاکمیت) اس کے لیے ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۔ اوّل و آخر اور ظاہر و باطن وہی ہے اور وہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

گہری فکر رکھنے والوں کی علامات

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ توحید اور صفات باری تعالٰی کے بیان سے شروع ہوا ہے۔ وہ صفتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ تعداد میں بیس ہیں۔ یہ صفات ایسی ہیں کہ ان کی معرفت انسان کی سطح فکر کو بلند کرتی ہے اور وہ اپنے رب سے روشناس ہو جاتا ہے۔ ان صفتوں میں سے ہر ایک پروردگار عالم کی صفاتِ جلال و کمال کے کسی گوشہ کو لیے ہوئے ہے اور صاحبانِ فکر و نظر اس میں جس قدر غور و فکر کرتے ہیں انہیں نئے حقائق دستیاب ہوتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے یہ بات سننے میں آئی ہے کہ جس وقت آپ سے لوگوں نے توحید الٰہی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ان اللّٰہ عزّ وجل علم انہ یکون فی آخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللّٰہ تعالٰی " قل ھو اللّٰہ احد" والآیات من سورۃ الحدید، الٰی قولہ " علیم بذات الصدور" فمن رام وراء ذالک فقد ھلک۔

" خداوند تعالٰی جانتا تھا کہ آخری زمانے میں کچھ قومیں آئیں گی جو مسائل میں غور و فکر سے کام لیں گی لہٰذا خدا نے سورہ قل ھو اللّٰہ اور سورہ حدید کی ابتدائی آیات علیم بذات الصدور تک نازل فرمائیں۔ پس جو شخص اس سے ہٹ کر کسی اور شے کا طالب ہو گا وہ ہلاک ہو جائے گا[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیتوں سے طالبانِ حقیقت کو خدا کی ممکن معرفت کے بیشتر حصّہ پر عبور ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس سورہ کی پہلی آیت خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہی ایسا قادر ہے جسے کبھی شکست نہیں ہوتی اور وہ حکیم علی الاطلاق ہے۔ (سبّح للّٰہ ما فی السماوات والارض و ھو العزیز الحکیم) گزشتہ سورہ تسبیح کے حکم کے ساتھ ختم ہوا ہے اور یہ سورہ تسبیح الٰہی سے شروع ہو رہا ہے اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ سورتیں جو خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور جنہیں مسبحات کہتے ہیں ان میں تین مواقع ایسے ہیں کہ جہاں تسبیح کا ذکر ماضی کے صیغے سَبَّحَ سے شروع ہوا ہے۔ (حدید، حشر اور صف) اور دو مواقع ایسے ہیں کہ وہاں صیغہ مضارع استعمال ہوا ہے۔ یعنی یُسَبِّحُ (جمعہ اور تغابن) تعبیر کا یہ فرق شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ گزشتہ اور آئندہ یعنی ہمیشہ اس جہان کے موجودات اس ذاتِ اقدس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ یہ تسبیح ہوتی رہی تھی، ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ تسبیح سے مراد خدا کی ذات کو ہر عیب و نقص سے پاک قرار دینا ہے[2]

---

[1] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۲۳۱

[2] "تسبیح" "سبح" (بروزن مسح) کے مادہ سے ہے جس کے معنی پانی یا ہوا کی تیز حرکت ہے تسبیح بھی پروردگار کی عبادت کی راہ میں حرکت سریع ہے (مفردات راغب)

اور تمام موجوداتِ عالم کی یہ گواہی کہ خدا تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے یا تو اس بنا پر ہے کہ ان سب کے نظامِ حیات میں اس طرح کی حکمت و دانائی اور ایسے نظم و نسق، حساب و کتاب اور عجائب و غرائب موجود ہیں جو سب کے سب زبانِ حال سے ذکرِ پروردگار کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و حمد و ثنا کرتے ہیں اور با آواز بلند کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کی قدرت اور اس کا اختیار بے حد و بے پایاں ہے، اسی لیے اس آیت کے آخر میں (وھو العزیز الحکیم) کا جملہ آیا ہے یا پھر یہ کہ اس عالم کے تمام ذرات اک طرح کے ادراک و شعور سے بہرہ ور ہیں اور وہ اپنے اپنے مقام پر زبانِ حال سے خدا کی تسبیح و حمد کرتے ہیں یہ اور بات کہ اپنے علم کے محدود ہونے کی بنا پر ہم اس تسبیح سے بے خبر ہیں۔ تمام موجوداتِ عالم کی تسبیح کے بارے میں سورۂ اسراء کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (جلد ۱۲ ملاحظہ فرمائیں۔ اس نکتہ کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ لفظ "ما" جو (سبح للہ ما فی السماوات) میں استعمال ہوا ہے وہ وسیع معانی پر مشتمل ہے۔ اس سے تمام موجوداتِ عالم مراد ہیں خواہ وہ صاحبِ عقل و رُوح ہوں یا بے رُوح۔ یہ سب پر احاطہ رکھتا ہے۔[1]

خداوندِ عالم کی دو صفتیں یعنی عزت اور حکمت کے بعد عالمِ ہستی میں جو اس کی مالکیت، تدبیر اور تصرف کار فرما ہے اور جو لازماً قدرت ہے اس کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کے لیے آسمانوں اور زمین کی مالکیت و حاکمیت" (لہ ملک السماوات والارض)۔ "وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے" (یحیی و یمیت)۔ "اور وہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے" (وھو علی کل شیء قدیر)۔ عالمِ ہستی میں خدا کی مالکیت اعتباری اور تشریعی نہیں ہے بلکہ مالکیتِ حقیقی و تکوینی ہے یعنی وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور سارا جہان اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے ارادہ و فرمان کے ماتحت ہے۔ اسی لیے اس کے بعد زندہ کرنے، مارنے اور ہر چیز پر اختیار رکھنے کی گفتگو درمیان میں آئی ہے۔ تو اس طرح اب تک ان دو آیتوں میں خدا کی صفات میں سے چھ صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ عزت اور قدرت میں فرق یہ ہے کہ عزت عام طور پر دفاع کے انتظامات کو درہم و برہم کرتی ہے اور قدرت کی توجہ اسباب کو ایجاد کرنے کی طرف ہے۔ اس بنا پر یہ دو مختلف صفتیں شمار ہوتی ہیں، اگرچہ بنیادی طور پر قوت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں (غور فرمائیے) زندہ کرنے اور مارنے کا مسئلہ بہت سی آیتوں میں بیان ہوا ہے اور در حقیقت یہ دونوں موضوع ایسے ہیں جن کے پیچیدہ اسرار کسی پر واضح و روشن نہیں ہیں۔ نہ کوئی شخص کمل طور پر زندگی کی حقیقت سے باخبر ہے اور نہ موت کی حقیقت کو کوئی کما حقہٗ جانتا ہے بلکہ جو کچھ ہم ان دونوں کے بارے میں جانتے ہیں وہ ان کے آثار ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ تمام چیزوں سے زیادہ نزدیک ہم سے ہماری زندگی ہے۔ اس کے باوجود اس کی حقیقت اور اس کے اسرار ہم سے ہی سب سے زیادہ مخفی ہیں۔ قابلِ توجہ یہ کہ یحیی و یمیت کا جملہ مضارع کی شکل میں تمام زمانوں میں موت و حیات کے استمرار کی دلیل ہے۔ ان دونوں کا اطلاق نہ صرف انسانوں کی زندگی و موت تک محدود ہے بلکہ فرشتے اور دوسرے تمام زندہ موجودات بمع حیوانات حتی کہ یہ گھاس پھونس پر بھی احاطہ رکھتے ہیں اور نہ صرف اس دنیا ہی کی زندگی بلکہ عالمِ برزخ و قیامت کی زندگی کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔ جی ہاں حیات و موت اپنی تمام صورتوں کے اعتبار سے خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے

اس کے بعد پانچ اور صفتوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اوّل ہے اور وہ آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔ (ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم)۔ اوّل و آخر ہونے کی صفت اس کی ازلیت و ابدیت کی

---

[1] باوجودیکہ تسبیح حرفِ جر کے بغیر متعدی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے سبحوہ، لیکن یہاں لام کے ساتھ آیا ہے اور یہ ممکن ہے کہ تاکید کے لیے ہو۔

بہت لطیف تعبیر ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ واجب الوجود اور لامتناہی ہے یعنی اس کی ہستی خود اپنی ذات ہی سے ہے نہ کہ خارج سے کہ اس کی کوئی ابتدا ہو اور وہ ختم ہو۔ اس بنا پر وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ عالم ہستی کا سر آغاز ہے اور وہی ہے کہ جو عالم فنا کے بعد بھی ہوگا۔ اس بنا پر اول و آخر کی تعبیر کسی خاص زمانے تک محدود نہیں ہے اور کسی معیّن مدت تک اشارہ نہیں کرتی ظاہر و باطن کی توصیف بھی تمام چیزوں کی نسبت اس کے احاطۂ وجودی کی ایک اور تعبیر ہے۔ وہ ہر چیز سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس کے آثار نے ہر جگہ کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور وہ ہر چیز سے زیادہ مخفی ہے کیونکہ اس کی کنہ ذات کسی پر آشکار نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں یہ مفہوم لیا ہے۔ (الاول بلا ابتداء والآخر بلا انتہا والظاہر بلا اقتراب والباطن بلا احتجاب) "وہ ایسا اول ہے کہ جس کا آغاز نہیں ہے اور ایسا آخر ہے جس کا اختتام نہیں ہے۔ باوجود قریب نہ ہونے کے ظاہر ہے اور پوشیدہ ہے باوجود ظاہر ہونے کے۔ کچھ اور مفسرین ایک تعبیر پیش کرتے ہیں۔ (الاول ببرہ والآخر بعفوہ والظاہر باحسانہ وتوفیقہ اذا اطعتہ والباطن بسترہ اذا عصیتہ) وہ اول ہے نیکیوں میں اور آخر ہے عفو و بخشش کی بنا پر۔ اگر تو اس کی اطاعت کرے تو وہ اپنے احسان و توفیق کے ساتھ تجھ پر ظاہر ہوتا ہے اور اگر تو اس کی نافرمانی کرے تو ستر و پوشش کے ذریعے پنہاں ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے اور عالم ہستی کا آغاز و انجام اور ظاہر و باطن ہے۔ بعض مفسرین نے ظاہر کے معنی یہاں غالب تجویز کیے ہیں (ظہور معنی غلبہ) اور نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں ان معانی کا قرینہ نظر آتا ہے جہاں خلقت زمین کے بارے میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

(ھو الظاھر علیھا بسلطانہ وعظمتہ وھو الباطن لھا بعلمہ و معرفتہ)

وہ اس پر اپنے تسلط اور عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے اور اپنے علم و معرفت کی وجہ سے
اس کے باطن میں راہ رکھتا ہے [1]

ان دونوں تفسیروں کے اجتماع کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بہرحال ان امور کے نتائج میں سے ایک وہی ہے جو آیت کے آخر میں آیا ہے: (وھو بکل شیء علیم) کیونکہ وہ جو آغاز سے تھا اور آخر تک باقی رہے گا اور جہان کے ظاہر و باطن میں ہے وہ یقیناً ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ایک نکتہ

خدا کی صفات میں اضداد کا جمع ہونا

بہت سی صفات ایسی ہیں جو انسانوں میں اور دوسرے موجودات میں سے کسی ایک وجود میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ وہ صفات ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں ایک گروہ میں اولین شخص ہوں تو یقیناً میں آخری شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ظاہر ہوں تو پوشیدہ نہیں ہو سکتا اور اگر پوشیدہ ہوں تو ظاہر نہیں ہوں گا۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ ہمارا وجود محدود ہے اور ہر محدود

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶۔

وجود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب گفتگو صفاتِ خدا تک پہنچتی ہے تو پھر اوصاف اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ وہاں ظاہر و باطن آپس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آغاز و انجام کا ایک جگہ جمع ہونا اس کی ذات کے لامتناہی ہونے کی بنا پر کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ وہ احادیث جو خود پیغمبر اسلامؐ سے ائمہ اہل بیتؑ سے مروی ہیں ان میں اس عنوان پر بہت ہی پُرکشش وضاحتیں موجود ہیں اور مذکورہ موضوعات کی تفسیریں بہت حد تک معاون ہیں۔ منجملہ دیگر حدیثوں کے ان میں ایک حدیث ہے جو صحیح مسلم میں درج ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

(اللّٰھم انت الاول فلیس قبلک شیء وانت الاٰخر فلیس بعدک شیء وانت الظاھر فلیس فوقک شیء وانت الباطن فلیس دونک شیء)

"خداوندا تو ایسا اول ہے جس سے پہلے کوئی چیز نہیں اور ایسا آخر ہے جس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح تو وہ ظاہر ہے اور غائب ہے کہ تجھ سے برتر کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح تو باطن و پنہاں ہے کہ تجھ سے ماوراء کسی چیز کا تصور نہیں ہو سکتا۔"[۱]

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لیس لاولیته ابتداء ولا لازلیته انقضاء هوالاول لم یزل والباقی بلا اجل ... الظاهر لا یقال مم، والباطن لا یقال فیم؟

اس کی اولیت کی ابتدا نہیں ہے اور اس کی ازلیت کی کوئی انتہا نہیں ہے وہ ایسا پہلا ہے جو ہمیشہ سے تھا اور ایسا باقی ہے جس کے اختتام کی کوئی مدت معین نہیں ہے۔ ایسا ظاہر و آشکار ہے جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس چیز سے ظاہر ہوا اور ایسا پنہاں ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کس چیز میں پوشیدہ ہے۔[۲]

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

(الحمد لله الذی لم یکن فیه اول معلوم ولا اٰخر متناه ... فلا تدرک العقول واوهامها ولا الفکر وخطراتها ولا الالباب واذهانها صفته فتقول متی، ولا بدء مما، ولا ظاهر علی ما، ولا باطن فیما)۔

"حمد ہے اس خدا کے لیے جس کی ابتدا معلوم نہیں اور نہ اس کی انتہا محدود ہے۔ عقل و فہم اور فکر و خرد کبھی اس کی صفات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت سے اور کس سے اس کی ابتدا ہوئی اور کس چیز پر ظاہر ہوا اور کس میں پنہاں ہے۔"[۳]

۱۔ تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۰۲۔

۲۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۳۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۲۳۶

بہ عقل نازی حکیم تاکے — بہ عقل این رہ نمی شود طے
بہ کنہ ذاتش خرد برد پے — اگر رسد خس بہ قعر دریا

اے حکیم و دانا و فلسفی تو اپنی عقل پر کب تک ناز کرے گا تو عقل کے ذریعے اس راہ کو طے نہیں کر سکتا. اس کی کنہہ ذات تک عقل جب پہنچ سکتی ہے جب خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ لیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ

خرد بہ ذاتش نمی برد پے — وگر رسد خس بہ قعر دریا

خس و خاشاک سمندر کی حقیقت کو سمجھ بھی لیں تب بھی عقل اس کی کنہ ذات تک نہیں پہنچ سکتی.

❁ ❁ ❁

۴۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ
فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ
وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○
۵۔ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ○
۶۔ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ
وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

ترجمہ

۴۔ وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن (چھ ادوار) میں پیدا کیا اور تختِ قُدرت پر جلوہ گر ہوا (اور تدبیرِ عالم کی) جو کچھ زمین میں جذب ہو جاتا ہے وہ اسے جانتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو زمین سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے۔ وُہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی رہو اور جسے تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

۵۔ آسمانوں اور زمین کی ملکیت اسی کے لیے ہے اور ہر چیز اسی کی طرف لوٹتی ہے۔

۶۔ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو دلوں پر حکومت کرتی ہیں۔

تفسیر

وہ ہمیشہ قدرت پر جلوہ گر ہے

ان گیارہ اوصاف کے بعد جو گزشتہ آیتوں میں پروردگارِ عالم کی ذاتِ پاک کے بارے میں بیان ہوئے ہیں نو آیتوں میں مزید اوصاف بیان ہوتے ہیں۔ پہلی زیرِ بحث آیت میں خدا کی صفات جمال و جلال میں سے پانچ صفتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سب سے پہلے خالقیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق کیا ہے"۔ (ھوالذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام)۔ چھ دن میں خلقت کا مسئلہ قرآن مجید میں سات مرتبہ بیان ہوا ہے۔ سب سے پہلے سورہ اعراف کی آیت ۵۴ میں اور آخری مرتبہ اس زیرِ بحث آیت میں (سورہ حدید کی آیت ۴)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ ان آیات میں یوم سے مُراد عام دن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک دَور ہے چاہے وہ دَور چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کئی ملین سال پر محیط ہو۔ اور یہ ایسی تعبیر ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوئی ہے اور دوسری زبانوں میں بھی۔ مثلاً کہتے ہیں: آج فلاں گروہ کی باری ہے کہ وہ حکومت کرے اور کل دوسروں کی باری ہوگی یعنی ان کا دور ہوگا۔ اس بات کو ہم شواہد اور مبسوط شرح کے ساتھ جلد ۶ سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں[1]

البتہ خدا کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ سارے جہان کو ایک ہی لمحے میں خلق کر دے لیکن یہ مسلّم ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو خالق (خدا) کی بہت کم عظمت، قدرت اور اس کا علم ظاہر ہوتا لیکن اگر انہیں کئی ارب سال میں، مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں منظم اور طے شدہ پروگرام کے ماتحت پیدا کرے تو یہ اس کی قدرت و حکمت پر زیادہ واضح و آشکار دلائل لیے ہوئے ہوگا۔ علاوہ ازیں تخلیقی عمل کا اس طرح بتدریج ہونا انسانی ترقی کی تدریجی رفتار اور مختلف مقاصد کے حصول میں عجلت نہ کرنے کے بارے میں ایک نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد مسئلہ حکومت اور تدبیرِ عالم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے عالم کو پیدا کرنے کے بعد تختِ حکومت پر استقرار کیا"۔ (ثم استوٰی علی العرش)۔ وہ زمامِ حکومت اور تدبیرِ عالم کو ہمیشہ سے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عرش کے معنی تختِ سلطنت کے ہیں بلکہ یہ تعبیر خدا کی حاکمیتِ مطلقہ اور عالمِ ہستی میں اس کی تدبیر کے نفوذ کا ایک لطیف کنایہ ہے۔ لغت میں عرش اس چیز کے معنوں میں ہے جس پر چھت ہو۔ اور کبھی چھت کو بھی عرش کہا جاتا ہے اور یہ لفظ بادشاہوں کے اُونچے اُونچے تختوں کے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۱۷۶

معنوں میں بھی آیا ہے اور قدرت و طاقت کے کنائے کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں اس کے تخت کی بنیادیں گر گئیں یا عربی میں کہتے ہیں: (فلان ثل عرشہ) جو اس بات کا کنایہ ہے کہ اس کا اقتدار برباد ہو گیا۔[1]

بہر حال اس کے برخلاف، جو بے خبروں کے ایک گروہ نے خیال کیا ہے کہ خدا نے اس عالم کو پیدا کر کے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ زمامِ حکومت اور تدبیرِ عالم کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس جہان کے نظاموں کی بلکہ ایک ایک چیز کی اس کی ذات سے وابستگی اس طرح ہے کہ اگر ایک لمحے کے لیے ان سے نظرِ لطف ہٹالے اور اپنے فیض و کرم کو منقطع کر لے تو "فرو ریزند قالبہا" سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے۔ اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے تو پھر انسان کو یہ بلندیٔ نظر عطا ہوتی ہے کہ وہ خدا کو ہر جگہ ہر چیز کے ساتھ اور اپنی جان کے اندر دیکھے، محسوس کرے اور اس سے محبت کرے۔

اس کے بعد اپنے علم بے پایاں کی ایک اور شاخ کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "جو کچھ زمین میں نفوذ کرتا ہے اور جو کچھ اس سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان کی طرف صعود کرتا ہے وہ اس سب سے واقف و باخبر ہے" (یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منها وما ینزل من السماء وما یعرج فیها)۔ اگرچہ یہ تمام امور ھو بکل شیء علیم کے مفہوم میں داخل ہیں جو گزشتہ آیات کا ایک جز ہے لیکن ان معانی کی تشریح و تفصیل اس سلسلہ میں انسان کو خدا کے علم کی وسعت کی طرف زیادہ توجہ دلاتی ہے۔ جی ہاں وہ اس سے آگاہ ہے جو زمین میں نفوذ کرتا ہے اور اس میں جذب ہو جاتا ہے۔ بارش کے تمام قطرات سے، سیلابوں کی موجوں سے، نباتات کے دانوں سے جو ہوا کی مدد سے یا کیڑے مکوڑوں کے ذریعہ زمین پر بکھر جاتے ہیں اور اس میں نفوذ کر جاتے ہیں، درختوں کی جڑوں سے جب وہ پانی اور غذا کی تلاش میں زمین کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہیں، انواع و اقسام کی ایسی کانوں اور ذخیروں سے جو کسی وقت سطح زمین پر تھے اور اس کے بعد اس میں دفن ہو گئے، گنجینوں اور دفینوں سے، مُردوں کے جسموں سے، انواع و اقسام کے کیڑے مکوڑوں سے جو زمین کے اندر گھر بناتے ہیں، جی ہاں وہ ان سب سے آگاہ ہے۔ ان گھاس کی پتیوں سے جو زمین سے سر نکالتی ہیں اور ان چشموں سے جو ظاہر ہوتے ہیں اور مٹی اور پتھر کا دل چیر کر باہر آتے ہیں۔ معدنوں اور گنجینوں سے، ان انسانوں سے جو اس مٹی سے بنے ہیں، ان آتش فشاں پہاڑوں سے جو زمین کے اندر سے شعلے نکالتے ہیں۔ ان گیسوں اور بخارات سے جو زمین سے اُوپر اُٹھتے ہیں، ان جاذبہ موجوں سے جو اس کے اندر سے اُٹھتی ہیں، خدا ان تمام سے، ان کے ایک ایک جز اور ذرہ ذرہ سے واقف ہے۔ اسی طرح جو کچھ آسمانوں سے نازل ہوتا ہے، بارش کے قطروں سے سُورج کی حیات بخش کرنوں تک، فرشتوں کے دستوں سے لے کر وحی و کتب آسمانی کی طاقتور تحریروں تک، اس عالم کی روشنی سے لے کر شہابِ ثاقب اور ان سرگرداں پتھروں اور سنگریزوں تک جو زمین میں جذب ہوتے ہیں، وہ ان سب کی حقیقتوں سے باخبر ہے۔ نیز جو کچھ آسمانوں کی طرف صعود کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ فرشتے ہوں، انسانوں کی ارواح ہوں، بندوں کے اعمال ہوں، انواع و اقسام کی دعائیں ہوں، طرح طرح کے پرندے اور بخارات ہوں، بادل ہوں یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں ہوں جنہیں ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، وہ سب اس کی بارگاہِ علم میں آشکار و ہویدا ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں تھوڑا سا سوچیں کہ ہر لمحہ اربوں کی تعداد میں مختلف موجودات زمین کے اندر داخل ہوتے ہیں یا وہ جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور حد و حساب سے باہر ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی

---

[1] عرش کی حقیقت کے سلسلہ میں مزید وضاحتیں تفسیر نمونہ جلد ۶ آیت ۵۴ سورہ اعراف اور دوسری جلد سُورہ بقرہ کی آیت ۲۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

بھی ان کا شمار نہیں کر سکتا تو پھر ہم پروردگار کے علم کی وسعت سے آگاہ ہو سکیں گے۔ آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کے سلسلہ میں ایک حساس نکتہ پر انحصار کرتے فرماتا ہے: "وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو" (وھو معکم اینما کنتم)۔ بہرحال ایسا ہے تو پھر جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتا ہے" (واللّٰہ بما تعملون بصیر)۔ وہ کس طرح ہمارے ساتھ نہ ہو جبکہ ہم نہ صرف اپنے وجود میں بلکہ اپنی بقا کے بارے میں بھی ہر لمحے اس کے محتاج ہیں اور اس سے مدد لیتے ہیں۔ وہ عالم ہستی کی رُوح ہے، جانِ جہاں ہے بلکہ ہر شے سے بہتر و برتر ہے۔ اس وقت جب ہم ایک ذرۂ خاک کی شکل میں ایک گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اور پھر اس لمحے جب ہم جنین کی صورت میں شکمِ مادر میں تھے وہ ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ساری عمر ہمارے ساتھ رہا اور عالمِ برزخ میں بھی ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہم سے بے خبر ہو۔ فی الحقیقت یہ احساس کہ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور نہ صرف ہم کو عظمت و شکوہ بخشتا ہے بلکہ ہمارے نفس کو اعتماد و اطمینان عطا کرتا ہے اور شجاعت و شہامت پیدا کرتا ہے اور اس کے علاوہ اسے یعنی ہمارے نفس کو شدید ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور نگراں ہے۔ اس کی قربت کا یہ احساس ایک عظیم درسِ اصلاحِ احوال ہے۔ جی ہاں یہ اعتقاد انسان کے لیے تقویٰ، پاکیزگی اور کامیابی کا بنیادی سبب ہے اور اس میں اُس کی (انسان کی) عظمت و بزرگی کی رمز بھی پنہاں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وُہ ہمیشہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کوئی کنایہ یا مجاز نہیں ہے بلکہ ایسی حقیقت ہے جو دلپذیر، عقل انگیز اور رُوح پرور بھی ہے اور ہمارے دلوں میں رعب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں احساسِ فخر بھی دلاتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(انّ من افضل ایمان المرء ان یعلم ان اللّٰہ تعالیٰ معہ حیث کان)

انسان کے ایمان کا افضل ترین درجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ جہاں کہیں بھی وہ ہے خدا اس کے ساتھ ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہمیں ملتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے سوال کیا: این اجدک یا رب؟ "پروردگار میں تجھے کہاں پاؤں؟" (قال یا موسیٰ اذا قصدت الیّ فقد وصلت الیّ) فرمایا اے موسیٰ تو جیسے ہی میرا ارادہ کرے (تو سمجھ لے) کہ مجھ تک پہنچ گیا۔[2]

اصولی طور پر بندہ کے ساتھ خدا کی یہ معیت اس قدر پُرلطف اور دقیق ہے کہ ہر مفکر و مومن انسان اپنی پروازِ فکر اور جذبۂ ایمانی کے مطابق اس کا ادراک کرتا ہے اور اس کی گہرائی سے باخبر ہوتا ہے۔ اس کی حاکمیت و تدبیر کے بعد گفتگو سارے عالمِ ہستی پر اس کی حاکمیت تک جا پہنچتی ہے۔ فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اسی کے لیے ہے" (لہ ملک السّمٰوٰت والارض)۔

آخر میں مرجعیت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور تمام کاموں کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (والی اللّٰہ ترجع الامور)۔ جی ہاں جب وہ ہمارا خالق و مالک اور حاکم و مدبّر ہے اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے تو یقیناً ہم سب کی اور ہمارے امور کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہوگی۔ ہم اس کی منزلِ عشق کے مسافر ہیں۔ اُمید اور دوسری توانائیوں کا بوجھ اپنے کاندھے پر رکھے ہوئے منزلِ عدم سے چلے ہیں اور اقلیمِ وجود تک یہ سارا راستہ ہم نے طے کیا ہے۔ ہم اس کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے کیونکہ وہی ہمارا مبدأ و منتہیٰ ہے۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ گزشتہ تین آیتوں میں بعینہٖ یہی توصیف بیان ہوئی تھی لہ ملک السّمٰوٰت

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۱۔

[2] رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۵۱

والأرض ممکن ہے یہ تکرار اس بنا پر ہو کہ وہاں گفتگو صرف زندہ موجودات کی موت و حیات سے متعلق تھی اور یہاں بحث کا دامن زیادہ وسیع ہے اور اب گفتگو یہ ہے کہ تمام امور کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ پہلے ہر چیز پر خدا کے قادر ہونے کے سلسلہ میں ایک تعارفی بیان ہے کہ ہر چیز کی بازگشت اس کی طرف ہے۔ یہ دونوں امور اس بات کا لازمہ ہیں کہ زمین اور آسمان دونوں خدا کی ملکیت ہیں۔ "الامور" کی تعبیر جو جمع کی صورت میں ہے یہ بتاتی ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات اسی کی سمت رُخ کیے ہوئے چل رہے ہیں اور یہ ایسا چلنا ہے کہ اس میں کسی مقام پر کوئی توقف نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آیت کا مفہوم صرف اس حد تک محدود نہیں ہے کہ قیامت کے لیے انسانوں کی بازگشت اس کی طرف ہے، اگرچہ معاد کے موضوع کا تعلق خصوصیت کے ساتھ انسان سے ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں دو اور صفتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔"

(یولج الیل فی النھار ویولج النھار فی الیل)[1]

جی ہاں بتدریج ایک میں کمی کر دیتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے۔ رات اور دن کے طول میں تغیر کرتا ہے۔ وہ تغیر جو سال بھر کی چار فصلوں کے ہمراہ ہے۔ ان تمام برکتوں کے ساتھ جو ان فصلوں میں انسان کے لیے چھپی ہوئی ہیں۔ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے وہ یہ کہ سورج کے طلوع و غروب کے وقت روشنی و تاریکی کے نظام میں کبھی یک لخت تبدیلی نہیں ہوتی تاکہ انسان اور دوسرے زندہ موجودات کے لیے مختلف قسم کی مشکلات پیدا نہ ہوں۔ یہ صورتِ احوال رفتہ رفتہ وقوع پذیر ہوتی ہے اور وہ موجودات کو آہستہ آہستہ دن کی روشنی سے رات کی تاریکی کی طرف اور رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کی طرف منتقل کرتا ہے اور رات اور دن کی آمد کا اعلان کافی پہلے کرتا ہے تاکہ سب لوگ اس تبدیلی کے لیے خود کو آمادہ کر لیں۔ دونوں تفسیروں کو مفہوم آیت میں جمع کرنے سے کوئی علمی قباحت لازم نہیں آتی۔ آخر میں مزید کہتا ہے: "اور وہ اس چیز سے جو دلوں پر حاکم ہے باخبر ہے۔" (وھو علیم بذات الصدور)۔ جس طرح سورج کی حیات بخش کرنیں اور دن کی روشنی رات کی تاریکی کی گہرائیوں میں نفوذ کر جاتی ہے اور ہر جگہ کو روشن کر دیتی ہے، اسی طرح پروردگار کا علم بھی انسان کے دل و جان کے تمام اطراف و جوانب میں نفوذ کرتا ہے اور اس کے تمام اسرار کو واضح و روشن کر دیتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں گفتگو یہ تھی کہ خدا ہمارے اعمال سے باخبر ہے (واللہ بما تعملون بصیر) یہاں گفتگو یہ ہے کہ وہ ہماری نیتوں، ہمارے عقائد و اعمال اور افکار سب سے باخبر ہے۔ (وھو علیم بذات الصدور)

لفظ "ذات" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، عربی زبان میں عین و حقیقت کے معنی میں نہیں۔ یہ فلسفیوں کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ لفظ لغت میں کسی چیز کے "صاحب" کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ذات الصدور ان نیتوں اور عقائد کی طرف اشارہ ہے جن کا انسانوں کے دلوں پر قبضہ ہے اور وہ ان پر حکومت کرتے ہیں (غور فرمائیے)۔ کتنا اچھا ہو اگر انسان خدا کی ان تمام صفتوں کا اپنے دل و جان کی گہرائیوں سے اقرار کرے اور اپنے اعمال، نیتوں اور عقائد سے اس کو باخبر سمجھے تو کیا اس شعور کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان اطاعت و بندگی کے راستے سے ہٹ کر بُرائی کی راہ اختیار کرے۔

---

[1] "یولج" مادہ "ایلاج" سے ہے اور وہ بھی "ولوج" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ "ولوج" کے معنی داخل ہونے اور نفوذ کرنے کے ہیں اور "ایلاج" داخل کرنے اور نفوذ کرنے کے معنی میں ہے۔

ایک نکتہ

خدا کے اسمِ اعظم کی نشانیاں

ہم جانتے ہیں کہ فلسفیوں اور متکلمین نے خدا کی صفات کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ "صفاتِ ذات" جو اس کے جلال و جمال کا بیان ہیں اور "صفاتِ فعل" جو ان افعال کو بیان کرتی ہیں جو اس کی ذاتِ مبارک سے صادر ہوں۔ ان چھ آیتوں میں جو اس سورہ کی ابتدا میں آئی ہیں، حدیث کے مطابق چاہیے کہ انہیں گہری نظر رکھنے والوں کی آیات کا نام دیا جائے۔ صفاتِ ذات و افعال میں سے بہت سی صفتیں ان میں بیان ہوئی ہیں۔ خدا کے علم، اس کی قدرت، حکمت، ازلیت اور ابدیت سے لے کر تمام موجودات کے بارے میں اس کی خالقیت، تدبیر، مالکیت اور حاکمیت کا ان میں بیان ہے۔ اس کا ہر شے پر محیط ہونا اور ہر جگہ موجود ہونا بھی ان میں مذکور ہوا ہے اور وہ بھی ایسی تعبیروں کے ساتھ جو انہیں مزید گہرائی بخشتی ہیں۔ ان صفات کی طرف توجہ کرنا، ان پر ایمان رکھنا اور اپنے وجود کے اندر ان کے شعور کا ہلکا سا شعلہ روشن کرنے کی کوشش کرنا ہماری تدریجی ترقی کے لیے اور راہِ خدا میں ہمارے آگے بڑھنے کے لیے بہترین مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک حدیث میں براء ابنِ عازب سے منقول ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت علیؑ کی خدمت میں عرض کیا: یا امیر المؤمنین اسئلك باللّٰه ورسوله، الا خصصتنی باعظم ما خصك به رسول اللّٰه (ص) واختصه به جبرئیل، وارسله به الرحمٰن؛ فقال اذا اردت ان تدعو اللّٰه باسمه الاعظم، فاقرأ من اول سورة الحدید الٰی اٰخر ست اٰیات منها علیم بذات الصدور، واٰخر سورة الحشر یعنی اربع اٰیات، ثم ارفع یدیك فقل یا من هو هكذا اسئلك بحق هذه الاسماء ان تصلی علی محمد (ص) وان تفعل بی كذا وكذا مما ترید، فواللّٰه الذی لا اله غیره لتنقلبن بحاجتك ان شاء اللّٰه۔" اے امیر المومنینؑ میں خدا اور اس کے رسولؐ کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ سب سے عظیم چیز جس سے پیغمبرؐ نے آپ کو مخصوص کیا اور جبرئیل نے آنحضرتؐ کو مخصوص کیا اور خدا نے اسے دے کر جبرئیل کو بھیجا، مجھے عطا فرمائیے۔" فرمایا:

"جب تم چاہو کہ خدا کو اس کے اسمِ اعظم کے ساتھ پکارو تو سُورۂ حدید کی ابتدائی چھ آیتیں علیم بذات الصدور تک پڑھ کر اسے پکارو اور اس کے بعد سُورۂ حشر کی آخری چار آیتیں پڑھو، پھر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہو: اے وہ خدا جو ایسا ہے! میں تجھے ان اسماء کے حق کا واسطہ دے کر پکارتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر درود بھیج [1] اور میری فلاں حاجت پُوری کر دے۔ اس کے بعد جو چاہو کہو۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اِنشاءَ اللہ تمہاری حاجت پُوری ہو جائے گی۔"

ان آیات کی عظمت اور ان کے موضوعات و مضامین کی اہمیت کے لیے یہی ایک حدیث کافی ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسمِ اعظمِ الٰہی صرف الفاظ نہیں ہیں ان کا تخلق اور ان کا اپنانا بھی ضروری ہے۔

---

[1] تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۱

٧- اٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَاَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ
مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيهِ ۖ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا مِنْكُمْ
وَاَنْفَقُوا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

٨- وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ
لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيثَاقَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

٩- هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّورِ ۖ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ
رَّحِيمٌ ۝

١٠- وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ
مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۖ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً
مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ

الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ۧ

۱۱۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ
لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝ۚ

ترجمہ

۷۔ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور اس چیز میں سے جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے انفاق کرو (کیونکہ) وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے انفاق کیا ہے ان کے لیے اجرِ عظیم ہے۔

۸۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ رسول تمہیں پکارتا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ اور تم سے اس نے عہد و پیمان لیا ہے۔ (فطرت و عقل کے مطابق پیمان) اگر پیمان کے لیے آمادہ ہو۔

۹۔ وہی ہے جو اپنے بندہ (محمدؐ) پر آیاتِ بیّنات نازل کرتا ہے تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی طرف لے جائے اور خدا تم پر مہربان و رحیم ہے۔

۱۰۔ راہِ خدا میں انفاق کیوں نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث سب خدا کے لیے ہے (اور کوئی شخص کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا)۔ وہ لوگ جنہوں نے کامیابی اور فتح سے پہلے انفاق کیا ہے اور جنگ کی ہے۔ (ان لوگوں سے جنہوں نے کامیابی کے بعد انفاق کیا ہے) بہتر ہیں۔ وہ ان سے بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق

کیا ہے اور جہاد کیا ہے اور خدا نے دونوں سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور خدا اُس سے جو کام تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۱۔ کون ہے جو خُدا کو قرضِ حسنہ دے (جو اموال اُسے دیے ہیں ان میں سے انفاق کرے) تاکہ خُدا اس میں اس کے لیے اضافہ کردے اور اس کے لیے اجرِ فراواں ہے۔

تفسیر

ایمان و انفاق نجات و خوش بختی کے لیے دو عظیم سرمائے ہیں:

عالم ہستی میں خدا کی عظمت کے کچھ دلائل، اور اس کے لیے اوصافِ جلال و جمال جو رجوع الی اللہ کا سبب بنتے ہیں، ان کے بیان کے بعد، ان آیات میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سب کو ایمان و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ (امنوا باللّٰہ و رسولہ)۔ یہ دعوتِ فکر ایک عام دعوتِ فکر ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں۔ مومنین کو زیادہ کامل الایمان اور راسخ الایمان ہونے کی طرف اور غیر مومنین کو اصل ایمان کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہ ایسی دعوتِ فکر ہے جو مدلل ہے اور اس کے ثبوت توحید کے بیان پر مشتمل گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد ایمان کے ایک اہم اثر یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے: "جس میں خدا نے تمہیں دوسروں کا جانشین قرار دیا ہے اس میں سے انفاق کرو۔" (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ)۔ یہ دعوتِ فکر قربانی و فداکاری کا تقاضا کرتی ہے اور ان نعمتوں کے بارے میں جو انسان کے اختیار میں ہیں ایک ایسے رویّہ کو انگیخت دیتی ہے جو سخاوت پر مبنی ہو اور اس دعوتِ فکر کو اس نکتہ پر مرکوز کرتا ہے کہ یہ نہ بھولو کہ اصل میں ہر شے کا مالک خدا ہے اور یہ دولت اور یہ سرمایہ جو تمہیں عطا کیا گیا ہے۔ یہ امانت کے طور پر ہے اور چند روزہ ہے کیونکہ یہ اس سے پہلے دوسری قوموں کے اختیار میں تھا۔ حقیقت واقعہ یہی ہے۔ گزشتہ آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ سارے جہان کا مالک حقیقی خدا ہے۔ اس حقیقت پر ایمان رکھنا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ ہم اس کے امانت دار ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ ایک امانت دار امانت رکھوانے والے کے حکم کی پرواہ نہ کرے۔ اس حقیقت کا شعور انسان کو سخاوت و ایثار کی روح عطا کرتا ہے اور اس کے دل اور ہاتھ کو انفاق فی سبیل اللہ کے عزم سے نوازتا ہے۔ "مستخلفین" (جانشین) کی تعبیر ہو سکتا ہے اس طرف اشارہ ہو کہ انسان زمین پر اس کی نعمتوں کے تصرف کے سلسلہ میں خدا کی نمائندگی کرتا ہے۔ یا اس سے گزشتہ اقوام کی جانشینی مُراد ہو یا دونوں مراد ہوں۔ اور "مما" (ان چیزوں میں سے جو) کی تعبیر ایک عام تعبیر ہے اور محض مال و دولت ہی نہیں بلکہ اس میں خدا کی عطا کی ہوئی تمام نعمتیں شامل ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے کہا ہے کہ انفاق کا ایک وسیع مفہوم ہے جو صرف مال و دولت تک محدود نہیں ہے اس میں علم اور ہدایت بھی شامل ہیں اور وہ عزت بھی جو کسی کو معاشرہ میں حاصل ہو۔ اس کے علاوہ دیگر مادی و معنوی سرمائے بھی اس کے مفہوم

میں داخل ہیں۔ اس کے بعد مزید تشویق کے لیے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لے آئیں اور انفاق کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔" (فالذین اٰمنوا منکم وانفقوا لھم اجر کبیر)۔ اجر کے ساتھ جو لفظ کبیر استعمال ہوا ہے وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی عظمت اور ان کی بے عیب ابدیت کی طرف اشارہ ہے۔ نہ صرف آخرت میں بلکہ اس دُنیا میں بھی اجر کبیر کا ایک حصّہ انہیں ملے گا ایمانُ انفاق کے حکم کے بعد ان دونوں میں سے ہر ایک کے بارے میں ایک تشریح پیش کرتا ہے جو استدلال کی حیثیت رکھتی ہے۔ سب سے پہلے ایک ایسے استفہام کے انداز میں جو تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہے ایمان باللہ کے عنوان پر پیغمبر کی طرف سے دی ہوئی دعوت اسلام کو قبول نہ کرنے کا سبب تلاش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا سبب ہوا کہ تم خدا پر ایمان نہیں لائے حالانکہ اس کا رسول تمہیں تمہارے پروردگار پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اور جب کہ اس نے تم سے عہد لیا ہے اگر تم ایمان کے لیے آمادہ ہو۔" (وما لکم لا تؤمنون باللہ والرسول یدعوکم لتؤمنوا بربکم وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین)۔
یعنی واقعی اگر تم قبولِ حق کے لیے آمادہ ہوتے تو اس کے دلائل، فطرت وعقل کے تقاضوں کے مطابق بھی اور دلیل نقلی کے اعتبار سے بھی بالکل واضح اور روشن ہیں۔ ایک تو خدا کا پیغمبر واضح دلیلیں اور روشن آیات اور کُھلے معجزے لے کر تمہارے پاس آیا ہے۔ دوسرے خُدا نے عالم ہستی میں اور خُود تمہارے وجود کے اندر اپنے آثار دکھا کر ایک قسم کا عہدِ تکوینی تم سے لے لیا ہے کہ خدا پر ایمان لے آؤ۔ لیکن تم نہ اپنی فطرت وعقل کی پرواہ کرتے ہو اور نہ وحیِ الٰہی کی طرف تمہاری توجہ ہوتی ہے۔ تم ایمان لانے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہو۔ اور تمہاری فکر پر جہالت وتعصّب غالب ہے اور تم اندھی تقلید کا شکار ہو۔ جو کچھ ہم نے کہا اس سے واضح ہوا کہ ان کنتم مؤمنین کے جملہ سے یہ مُراد ہے کہ اگر تم کسی چیز پر ایمان لانے اور کسی دلیل کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو تو یہ ایسا ہی موقع ہے۔ کیونکہ اس کے دلائل ہر لحاظ سے واضح ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ خُود پیغمبرؐ کو دیکھتے تھے اور آپؐ کی دعوتِ اسلام کو بغیر کسی واسطے اور وسیلہ کے سُنتے تھے اور آپؐ کے معجزات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اَب کونسا عُذر تھا جو ایمان لانے میں مانع ہو۔ اس سلسلہ میں ہمیں ایک حدیث ملتی ہے کہ ایک روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

(ای المؤمنین اعجب الیکم ایماناً قالوا: الملائکة! قال: وما لھم لا یؤمنون وھم عند ربھم؟ قالوا: فالانبیاء! قال فما لھم لا یؤمنون والوحی ینزل علیھم؟ قالوا: فنحن قال: وما لکم لا تؤمنون وانا بین اظھرکم! ولکن اعجب المؤمنین ایمانا قوم یجیئون بعدکم یجدون صحفاً یؤمنون بما فیھا)

"مومنین میں سے کس کا ایمان لانا تمہارے نزدیک تعجب انگیز ہے۔ انہوں نے کہا "فرشتے"۔ فرمایا کونسی تعجب کی بات ہے کہ وہ ایمان لے آئیں وہ تو جوارِ خدا میں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا "انبیاء" فرمایا اس صورت میں کہ وحی ان پر نازل ہوتی ہے وہ کس طرح ایمان نہ لائیں۔ انہوں نے عرض کیا اس سے خُود ہم مُراد ہیں فرمایا: کونسی تعجب کی بات ہے کہ تم ایمان لے آئے جب کہ مَیں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (یہ وہ مقام تھا کہ جہاں سب خاموش ہوگئے)۔ پیغمبرِ اسلامؐ

نے فرمایا: "سب سے زیادہ تعجب اس قوم پر ہے جو تمہارے بعد آئے گی وہ صرف اوراق
اپنے سامنے دیکھے گی اور جو کچھ ان میں تحریر ہے اس پر ایمان لے آئے گی"۔[1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ لوگ جو رحلتِ پیغمبرؐ کے سالہا سال بعد دنیا میں آئیں گے اور صرف کتابوں میں پیغمبرؐ کے آثار دیکھیں گے اور آپ کے دین کی حقانیت کی تہہ تک پہنچ جائیں گے، وہ دوسروں کے مقابلہ میں امتیازِ خاص کے مالک ہیں۔ "میثاق" (وہ عہد جس میں تاکید کا عنصر شامل ہو) کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ فطرتِ توحیدی کی طرف اشارہ ہو یا اُن دلائل عقلی کی طرف جو مشاہدہ فطرت سے انسان پر آشکار ہوتے ہیں اور "بربکم" (تمہارے پروردگار) کی تعبیر مذکورہ حقیقت پر شاہد ہے۔ بعض مفسرین میثاق کو یہاں "عالم ذر" کے عہد و پیمان کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں لیکن یہ معنی بعید از فہم نظر آتے ہیں سوائے اس تفسیر کے جو عالم ذر کے لیے ہم نے پہلے بیان کی۔[2]

بعد والی آیت انہی معانی کی توضیح کے سلسلے میں کہتی ہے: "وہی ہے جس نے واضح آیات اپنے بندہ پر نازل کیں تاکہ وہ تمہیں شرک و جہالت اور نادانی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، توحید اور علم کی روشنی کی طرف لے آئے اور خدا تم پر رؤف و مہربان ہے": (هو الذی ینزل علی عبده آیات بینات لیخرجکم من الظلمات الی النور وان الله بکم لرءوف رحیم)۔ ایک گروہ نے یہاں آیاتِ بینات کا مفہوم معجزات بتایا ہے اور دوسرے گروہ نے قرآن لیکن آیت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور یہ سب معانی اس میں شامل ہیں اگرچہ "نازل کرنے" کے الفاظ قرآن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہی قرآن جو ظلمت و کفر اور ضلالت و نادانی کے پردے چاک کرتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کے باطن میں آفتابِ ایمان و آگہی طلوع ہوتا ہے۔ "رءوف رحیم" کے الفاظ اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں کہ خدا کی طرف سے یہ دعوتِ ایمان و انفاق، جو تم سب کے سامنے پیش کی گئی ہے، رحمتِ الٰہیہ کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اس دعوتِ ایمان کی تمام برکتیں اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی تمہیں کو حاصل ہوں گی۔

اس بات کے بارے میں کہ رؤوف اور رحیم کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس قسم کا فرق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ مناسب ترین رُخِ کلام یہی ہے کہ رؤف میں جو محبت کا پہلو ہے اس سے خدا کی وہ محبت مراد ہے جو اُسے اپنے اطاعت گزاروں سے ہے اور رحیم میں جو رحمت کا پہلو ہے اس سے مراد وہ رحمت ہے جو نافرمان افراد کے شامل حال ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ رافت کا لفظ اس کے ظہور سے پہلے بھی بولا جاتا ہے لیکن رحمت اسی وقت بولا جاتا ہے جب وہ ظہور میں آچکی ہو۔ اس کے بعد انفاق کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تم راہِ خدا میں انفاق کیوں نہ کرو حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اسی کے لیے ہے": (وما لکم الا تنفقوا فی سبیل الله ولله میراث السماوات والارض)۔ یعنی آخر کار تم اس جہان اور اس کی نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے اور سب کچھ چھوڑ کر چلے جاؤ گے لہٰذا اب جب کہ تمہارے اختیار میں ہے تو اپنا حصہ کیوں نہیں حاصل کرتے۔ "میراث" اصل میں جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے، اس مال کے معنی میں ہے جو بغیر کسی معاہدہ کے انسان کے ہاتھ لگتا ہے اور جو کچھ میت کی طرف سے پس ماندگان کو ملتا ہے وہ اس کا ایک مصداق ہے۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس لفظ کے بیان کے وقت یہی معنی سننے والے کے ذہن میں آتے ہیں: (لله میراث السماوات والارض) کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ نہ صرف اموال اور روئے زمین کی دیگر ثروتیں بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین

---

[1] صحیح بخاری مطابق نقل "مراغی" و "تفسیر فی ظلال القرآن" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۷ در ذیل آیت ۱۷۲ از سورہ اعراف ص ۳۹ سے رجوع فرمائیں۔

میں موجود ہے، اسی کی ذات پاک کی طرف لوٹتا ہے۔ تمام مخلوق فنا ہو جائے گی اور خدا ان سب کا وارث ہوگا۔ چونکہ انفاق فی سبیل اللہ مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے اس لیے بعد والے جملہ میں مزید فرماتا ہے: "جنہوں نے فتح کے بعد انفاق کیا ہے وہ ان کے برابر نہیں ہیں جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق کیا تھا اور جنگ کی ہے"۔ (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل)۔[1]

اس فتح سے مراد کون سی فتح ہے اس کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض اس سے فتح مکہ مراد لیتے ہیں جو ہجرت کے آٹھویں سال واقع ہوئی اور بعض اس سے فتح حدیبیہ مراد لیتے ہیں جو چھٹے سال ہجری میں ہوئی البتہ اس بات کے پیش نظر کہ لفظ فتح سورہ (انا فتحنا لک فتحا مبینا) کی تفسیر فتح حدیبیہ سے کی گئی ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ یہاں بھی فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن "قاتل" جنگ کرنے کی تعبیر فتح مکہ سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ حدیبیہ میں تو جنگ ہوئی ہی نہیں ہاں البتہ فتح مکہ کے سلسلہ میں مختصر سی تیز جنگ ہوئی تھی جو طول نہ پکڑ سکی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں "الفتح" سے مراد خود جنس فتح اور اسلامی جنگوں میں سے ہر جنگ میں مسلمانوں کی فتح مراد ہو یعنی وہ لوگ جو بحران کے مواقع پر جان و مال کے خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، ان افراد سے جو طوفانوں اور آندھیوں کے رکنے کے بعد آگے بڑھتے ہیں، افضل و برتر ہیں۔ اسی لیے تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "اس گروہ کا مقام برتر ہے ان لوگوں سے جنہوں نے فتح کے بعد انفاق و جہاد کیا ہے"۔

(اولٰئک اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا)۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت جو آیت کو فتح مکہ یا فتح حدیبیہ سے منسوب کرتی ہے اس نے اس آیت میں انفاق کرنے والے کا مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سمجھا ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ ہجرت سے لے کر اس وقت تک، جو چھ یا آٹھ سال کا طویل عرصہ ہے، اس میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ہزاروں افراد نے راہ خدا میں انفاق بھی کیا اور جہاد بھی کیا کیونکہ فتح مکہ میں تاریخ کے مطابق دس ہزار افراد نے شرکت کی اور یقیناً اس گروہ میں سے کافی افراد نے جنگ سے متعلق اخراجات کے لیے مالی امداد بھی کی ہوگی اور انفاق فی سبیل اللہ بھی کیا ہوگا اور یہ طے شدہ ہے کہ "قبل" کی تعبیر کے معنی اس فتح کے موقع سے متعلق ہیں نہ کہ آغاز اسلام سے جو اکیس سال پہلے کی بات ہے۔

اس نکتہ کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ انفاق جہاد سے افضل ہے تاکہ ان کے پہلے کیے ہوئے فیضان کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور شاید اوپر والی آیت میں جہاد سے پہلے انفاق کے ذکر کو اسی مفہوم کا گواہ سمجھتے ہوں۔ حالانکہ واضح ہے کہ انفاق مالی کو مقدم رکھنا اس بنا پر ہے کہ جنگ کے وسائل، اس کے متعلقات، ساز و سامان اور آلات حرب وغیرہ اسی انفاق کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جان دینا اور شہادت کے لیے آمادہ ہونا انفاق مال سے کہیں بہتر و برتر ہے۔ بہرحال چونکہ دونوں گروہ درجات کے فرق کے ساتھ عنایت پروردگار کے مستحق ہیں اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا نے دونوں گروہوں سے اچھا وعدہ کیا ہے"۔ (وکلًّا وعد اللہ الحسنٰی)۔ یہ ان تمام لوگوں کی ایک طرح کی قدر دانی ہے جنہوں نے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے۔ "حسنٰی" کا یہاں ایک وسیع مفہوم ہے جس سے مراد دنیا و آخرت کی بھلائیاں ہیں۔ چونکہ عمل کی قدر و قیمت خلوص پر مبنی ہوتی ہے لہذا آیت کے آخر میں

---

[1] اس آیت میں کچھ محذوف ہے جس کا مذکورہ سے استفادہ ہوتا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے (لا یستوی من انفق من قبل الفتح وقاتل والذین انفقوا بعد الفتح وقاتلوا)

فرماتا ہے۔ "خدا اس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے" (واللہ بما تعملون خبیر)۔ خدا تمہارے اعمال کی کمیت وکیفیت سے باخبر ہے اور تمہاری نیتوں اور معیار خلوص سے بھی آگاہ ہے۔ آخری زیر بحث آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں شوق دلانے کے لیے پھر ایک جاذب نظر اور عمدہ تعبیر کے ذریعے فرماتا ہے: "کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دے اور ان اموال میں سے جو اس نے اُسے بخشے ہیں انفاق کرے تاکہ خدا اس کے لیے اس میں بہت سا اضافہ کردے اور بہت سا اجر قرار دے" (من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً فیضاعفہ لہ ولہ اجر کریم)۔ حقیقتاً یہ تعبیر عجیب ہے کہ وہ خدا جو تمام نعمتوں کا بخشنے والا ہے اور ہمارے وجود کے تمام اجزا جس کے فیض بے پایاں کے سمندر سے بہرہ مند ہوتے ہیں، اور وہ ان سب کا مالک ہے وہ خود ہمیں صاحب مال شمار کرکے ہم سے قرض کا خواہاں ہے اور پھر، عام قرضوں کے خلاف جن میں اتنا ہی مال واپس کیا جاتا ہے جتنا قرض دیا جائے۔ بہت زیادہ اضافہ کردے گا کبھی سینکڑوں کی تعداد میں کبھی ہزاروں کی تعداد میں۔ اجر عظیم کا وعدہ اس کے علاوہ کیا ہے جو ایک عظیم صلہ ہے جسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

چند نکات

۱۔ انفاق کے اسباب

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیتوں میں انفاق کی تشویق کے لیے، عام اس سے کہ جہاد کے سلسلہ میں مدد کی جائے یا حاجت مندوں کی، دوسرے موضوعات کی تعبیریں بھی نظر آتی ہیں جن میں سے ہر ایک اس مقصد کے حصول کی طرف بڑھنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ساتویں آیت میں لوگوں کے ایک دوسرے کے جانشین بننے کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے یا ان ثروتوں کے سلسلہ میں خدا کے جانشین ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حقیقی مالکیت کو خدا سے مخصوص کیا گیا ہے اور تمام لوگوں کو اموال کے سلسلہ میں خدا کا نمائندہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ انداز فکر ممکن ہے کہ انسان کے ہاتھ اور دل کو انفاق کے معاملہ میں کشادہ رکھے اور اس کام پر آمادہ ہونے کا سبب بنے دسویں آیت میں ایک اور تعبیر آئی ہے جو سرمائے کی ناپائیداری اور تمام انسانوں کے فنا ہو جانے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ تعبیر "میراث" ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے"۔ گیارہویں آیت میں جو تعبیر ہے وہ سب سے زیادہ حساس ہے۔ اس میں خدا کو قرض لینے والا شمار کیا گیا ہے اور وہ بھی ایسا قرض ہے کہ جس میں سُود کا دخل نہیں ہے اور یہ قرض کئی ہزار گنا کرکے واپس کیا جائے گا۔ وہ عظیم اجر اس کے علاوہ ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ حسن عمل سے انحراف رکھنے والے افکار، حرص و حسد، خود خواہی اور طویل خواہشات کو اُبھارنے والے ان جذبوں کو ختم کرے جو انفاق کی راہ میں حائل ہوتے ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کو تشکیل دے جن میں اجتماعی رُوح کارفرما ہو، محبت پر مبنی رشتوں کا احساس ہو اور جس میں بہت زیادہ تعاون کی بنیاد موجود ہو۔

۲۔ راہ خُدا میں انفاق کے شرائط

مندرجہ بالا آیت میں "قرضاً حسناً" کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قرض دینے کی بھی اقسام ہیں جن میں سے

بعض کو "قرض حسنہ" (اچھا قرض) شمار کیا جاتا ہے اور بعض کو ایسا قرض جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس قرض حسنہ کی شرائط بعض آیات میں بیان کی ہیں جو خدا کو دیا جائے اور بالفاظ دیگر جو ایسا انفاق ہے جس کی قدر کی جانی چاہیئے۔

۱۔ مال کے بہترین حصہ میں سے اس کا انتخاب ہو نہ کہ کم حیثیت مال میں سے۔ (یا ایھا الذین امنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم باٰخذیہ الا ان تغمضوا فیہ واعلموا ان اللہ غنی حمید) "اے ایمان لانے والو! پاکیزہ اموال میں سے، جو تمہارے ہاتھ آیا ہے یا جسے ہم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے، خرچ کرو اور ناپاک حصّوں کو خرچ کرنے کی طرف دھیان نہ دو جب کہ تم خود تیار نہیں ہو کہ انہیں قبول کرو مگر چشم پوشی کے طور پر اور جان لو کہ خدا بے نیاز ہے اور لائق حمد و ستائش ہے"۔ (بقرہ۔ ۲۶۷)

۲۔ ایسے اموال میں سے ہو جس کی انسان کو ضرورت ہو جیسا کہ فرماتا ہے: (ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ) وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں جب کہ وہ خود شدت کے ساتھ اس کے حاجت مند ہوں"۔ (حشر۔ ۹)

۳۔ ایسے لوگوں پر انفاق کرو جنہیں شدید ضرورت لاحق ہو اور اولویت کو نظر میں رکھو۔ (للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ) "تمہارا انفاق ایسے ضرورت مندوں کے ساتھ مخصوص ہو جو راہِ خدا میں محصور ہو گئے ہوں"۔ (بقرہ۔ ۲۷۳)

۴۔ انفاق اگر پوشیدہ طور پر ہو تو بہتر ہے۔ (وان تخفوھا وتؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم) "اگر ضرورت مندوں کو دو اور چھپا کر دو تو بہتر ہے"۔ (بقرہ۔ ۲۷۱)

۵۔ کسی طرح کا احسان جتانا اور آزار پہنچانا اس کے ساتھ نہ ہو۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذٰی) اے ایمان لانے والو صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے سے باطل نہ کرو۔ (بقرہ۔ ۲۶۴)

۶۔ انفاق اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے۔ (ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ) "وہ لوگ جو اپنا مال خوشنودیٔ خدا کے لیے صرف کرتے ہیں"۔ (بقرہ۔ ۲۶۵)

۷۔ "جو کچھ انفاق کرو اسے چھوٹا اور کم اہم شمار کیا جائے خواہ وہ بظاہر بہت بڑا ہو"۔ (ولا تمنن تستکثر) (مدثر۔ ۶)[1]

۸۔ انفاق ایسے مال میں سے ہو جس سے اُسے دلی لگاؤ ہو اور عشق ہو۔ (لن تنالوا البر حتٰی تنفقوا مما تحبون) "نیکی کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پا سکو گے جب تک اس مال میں سے انفاق نہ کرو جسے عزیز رکھتے ہو"۔ (آل عمران۔ ۹۲)

۹۔ آدمی کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو کبھی مالک حقیقی تصور نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ سمجھے۔ (وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ)۔ "اس مال سے انفاق کرو جس میں خدا نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے"۔ (حدید۔ ۷)

۱۰۔ اور ہر چیز سے پہلے انفاق مال حلال میں سے ہونا چاہیئے کیونکہ خدا صرف ایسے ہی انفاق کو پسند کرتا ہے۔ (انما یتقبل اللہ من المتقین) (مائدہ۔ ۲۷)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (لا یقبل اللہ صدقۃ من غلول) خدا اس انفاق کو کبھی قبول نہیں کرتا جس میں خیانت کا دخل ہو۔[2]

---

[1] اس آیت کی کئی تفسیریں ہیں جن میں سے ایک وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کی۔ مزید تشریح انشاء اللہ آپ سورہ مدثر کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

(۲ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شرائط انفاق کے سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ اس موضوع کا نہایت اہم حصّہ ہے لیکن ان شرائط کو یہیں تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر آیاتِ کلام مجید اور روایات اسلامی پر زیادہ تفکر کیا جائے تو اور بھی شرائط دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جو کچھ عرض کیا گیا ہے ان میں سے بعض شرائطِ انفاق واجب شمار ہوتے ہیں (مثلاً احسان نہ جتانا، تکلیف نہ پہنچانا، ریاکاری سے اجتناب کرنا)۔ بعض شرائطِ کمال ہیں مثلاً خود ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دینا، اس شرط کا نہ ہونا انفاق کی قیمت کو کم نہیں کرتا اگرچہ اس کو اعلیٰ سطح پر بھی قرار نہیں دیتا۔

جو کچھ کہا گیا ہے اگرچہ انفاق کے موضوع پر تھا لیکن ان میں سے بہت سی شرطیں عام قرضوں پر بھی صادق آتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق قرض حسنہ کی شرائط لازم یا شرائط کمال میں سے ہیں۔ راہ خدا میں انفاق کی اہمیت کے بارے میں مبسوط تشریح سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۱ سے لے کر ۲۶۷ تک کے ذیل میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۲)۔

۳۔ ایمان، جہاد اور انفاق میں پیش قدمی کرنے والے

اس میں شک نہیں کہ جو ایمان اور اعمال خیر میں دوسروں سے مقدم ہوتے ہیں ان میں شجاعت بھی ہوتی ہے اور انہیں زیادہ آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے اور ان میں جذبۂ ایثار و قربانی بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ سب درگاہِ خدا میں برابر نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر انحصار کیا گیا تھا کہ وہ لوگ جنہوں نے (فتح مکہ یا فتح حدیبیہ) سے پہلے یا مطلق فتوحات اسلام میں انفاق کیا ہے اور جہاد کیا ہے، بارگاہ خدا میں دوسرے ان کے برابر نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں ابوسعید خدری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ حدیبیہ کے سال (چھ ہجری) ہم رسول خدا[۳] کے ساتھ تھے جس وقت ہم "عسفان" (مکے کے قریب ایک جگہ ہے) پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

> "ہو سکتا ہے کہ عنقریب ایسی قوم آئے جو اپنے اعمال کا تمہارے اعمال سے موازنہ کرتے ہوئے تمہیں چھوٹا تصور کرے"۔

ہم نے کہا وہ کون ہیں؟ اے خدا کے رسولؐ! کیا اس سے مراد قریش ہیں؟ فرمایا:

> "نہیں، وہ اہل یمن ہیں جن کے دل تم سے زیادہ رقیق اور نرم ہیں (اور ان کے اعمال تم سے زیادہ ہیں)۔

ہم نے عرض کیا کہ کیا وہ ہم سے بہتر ہیں۔ فرمایا:

> "اگر ان میں سے کسی ایک کے پاس سونے کا پہاڑ ہو اور وہ اس کا راہ خدا میں انفاق کرے تو ایک[۱] یا اس سے نصف جو تم خرچ کرتے ہو وہ اس کے برابر بھی نہیں ہے۔ جان لو کہ یہ فرق ہے ہمارے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

[۱] ان دس اوصاف کو مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے رُوح المعانی میں نقل کیا ہے اور ہم نے مختصر سے تغیر اور تکمیل کے ساتھ اس کا اُوپر ذکر کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا)

[۱] ظاہراً مراد ایک مد طعام ہے جو کلو سے بہت کم ہے۔

اور دوسرے لوگوں کے درمیان اور خدا کا یہ ارشاد اس کا شاہد ہے کہ (لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل ......)[1]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پروردگار کو قرض دینے سے مراد اس کی راہ میں ہر قسم کا انفاق ہے جس کا ایک اہم مصداق پیغمبر اسلام اور امام المسلمین کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ حکومتِ اسلامی کے قیام و انصرام کے سلسلہ میں اسے ضروری مصارف میں خرچ کرے۔ اسی لیے کافی کی ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(ان اللہ لم یسئل خلقہ مما فی ایدیھم قرضاً من حاجۃ بہ الی ذالک و ما کان للہ من حق فانما ھو لولیہ)

"خدا نے اپنے بندوں سے کسی احتیاج کی بنا پر قرض کا مطالبہ نہیں کیا۔ جو خدا کے حقوق ہیں وہ اس کے ولی اور نمائندہ کے لیے ہیں"۔[2]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے:

(من ذا الذی یقرض اللہ ......) کے ذیل میں مروی ہے کہ (نزلت فی صلۃ الامام)

"یہ آیت امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے"۔[3]

۞ ۞ ۞

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۱۷۲

[2] تفسیر صافی ص ۵۲۲

[3] تفسیر صافی ص ۵۲۲

۱۲۔ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ
اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
۱۳۔ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا
نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ
فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۚ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۚ بَاطِنُهٗ
فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝
۱۴۔ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ
فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ
وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ
بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝
۱۵۔ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوا ۭ مَأْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۱۲۔ یہ عظیم اجر اس دن کا ہے جب تو صاحبانِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نُور ان کے سامنے اور ان کے دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہو گا۔ (اور ان سے کہیں گے) آج تمہارے لیے بشارت ہو جنّت کے ایسے باغوں کی جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۳۔ وہ دن کہ جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے کہ ہماری طرف نظر کرو تا کہ ہم تمہارے نُور سے روشنی حاصل کریں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسبِ نُور کرو۔ تو اس وقت ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہو گا۔ جس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے۔

۱۴۔ انہیں پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ وہ کہیں گے ہاں لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور پیغمبر کی موت کے منتظر رہے اور ہر چیز میں شک اور تردد رکھتے تھے اور تمہیں تمہاری لمبی چوڑی آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا۔ یہاں تک کہ خدا کا فرمان آن پہنچا اور شیطان نے تمہیں خدا کے مقابلہ میں فریب دیا۔

۱۵۔ اس لیے آج تم سے اور کفار سے کوئی تاوان قبول نہیں کیا جائے گا اور تمہارے رہنے

کی جگہ آگ ہے۔ وہ تمہاری سرپرست ہے اور کیا ہی بُری جگہ ہے۔

تفسیر

ہمیں اپنے نُور سے استفادہ کرنے دو

چونکہ گزشتہ آیتوں میں سے آخری آیت میں خدا نے انفاق کرنے والوں کو اجرِ کریم کی خوش خبری دی تھی، زیرِ بحث آیت میں وہ یہ معیّن کرتا ہے کہ یہ اجرِ کریم کس دن دیا جائے گا۔ فرماتا ہے: "یہ اس دن پر مقرر ہے کہ جس دن ایماندار مرد اور عورتوں کو تو دیکھے گا کہ ان کا نُور ان کے آگے آگے اور دائیں طرف تیزی سے چل رہا ہو گا۔" (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعٰی نورھم بین ایدیھم و بایمانھم)۔ اگرچہ یہاں مخاطب پیغمبرِ اسلامؐ ہیں لیکن مسلّم ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس منظر کو دیکھیں گے لیکن چونکہ پیغمبرؐ کی مومنین سے شناسائی ضروری ہے تاکہ وہ ان پر خصوصی نظر رکھیں تو اس نشانی سے آپ انہیں اچھی طرح پہچان لیں گے۔ اگرچہ مفسّرین نے اس نور کے سلسلہ میں بہت سے احتمال تجویز کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس سے مراد نُورِ ایمان کا مجسّم ہونا ہے۔ چونکہ نورھم" (صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کا نور) کے الفاظ آئے ہیں، اور تعجب کی بات بھی نہیں ہے، کیونکہ اس دن انسانوں کے عقائد و اعمال کی تجسیم ہوگی، ایمان جو نورِ ہدایت ہے، ظاہری نور اور روشنی کی شکل میں مجسّم ہو گا اور کفر کہ جو تاریکی مطلق ہے ظاہری تاریکی کی صورت میں مجسّم ہو گا اسی لیے سُورہ تحریم کی آیت میں ہے یوم لا یخزی اللّٰہ النبی والّذین اٰمنوا معہ نورھم یسعٰی بین ایدیھم، اور اس دن اللہ اپنے پیغمبرؐ اور ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے ہیں رسوا نہیں کرے گا اور ان کا نور ان کے آگے چلے گا۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے کہ خدا مومنین کو ظلمت کی طرف سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ "یسعٰی" سعی کے مادہ سے ہے جس کے معنی تیز حرکت اور چلنے کے ہیں۔ یہ لفظ اس امر کی دلیل ہے کہ بروزِ محشر خود مومنین بھی وہ راہ بہشت جو سعادت جاودانی کا مرکز ہے تیزی سے طے کریں گے کیونکہ ان کے نور کی سریع حرکت ان کی اپنی سریع حرکت سے علیحدہ نہیں ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ گفتگو صرف دو قسم کے انوار کے بارے میں درمیان میں آئی ہے۔ (ایک وہ نور جو مومنین کے آگے آگے چل رہا ہے۔ دوسرے وہ نور جو ان کے دائیں جانب ہے)۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر مومنین کے دو گروہوں کے بارے میں ہو۔ ایک تو مقربین کا گروہ ہے جن کی صُورت نورانی ہے اور ان کا نور ان کے آگے آگے چلتا ہے۔ دوسرے اصحاب یمین جن کا نور ان کے دائیں جانب ہے، اس لیے کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اس میں سے نُور پھُوٹے گا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں اشارے ایک ہی گروہ کی طرف ہوں اور نورِ یمین کنایہ ہو۔ اس نور کا جو ان کے نیک اعمال سے نکلے گا اور ان کے تمام اطراف کو گھیر لے گا اور روشن کرے گا۔ بہرحال یہ نور بہشت بریں تک ان کی رہنمائی کرے گا اور اس کے سائے میں وہ جنّت کی راہ تیزی سے طے کریں گے۔ چونکہ یہ نور بلا شک و شبہ ان کے ایمان اور عمل صالح سے نکلے گا تو ایمان اور عمل صالح کے اختلاف مراتب کی وجہ سے لوگ بھی مختلف ہوں گے۔ ایک وہ جن کا ایمان بہت زیادہ قوی ہو گا ان کا نور زیادہ فاصلہ کو روشن کرے گا اور وہ لوگ جن کا ایمان کافی کمزور ہے، انہیں کمتر درجہ کا نور حاصل ہو گا یہاں تک کہ ان کے پاؤں کی انگلیوں کی نوکوں کو روشن

کرے گا جیسا کہ تفسیر علی ابن ابراہیم میں آیۂ زیر بحث کے ذیل میں اشارہ ہوا ہے کہ "یقسم النور بین الناس یوم القیامة علیٰ قدر ایمانھم" قیامت کے دن نور لوگوں کے درمیان ان کے ایمان کی مقدار کے مطابق تقسیم ہوگا۔[1]

یہ وہ مقام ہے جہاں ان کے احترام کی وجہ سے ملائکہ کی طرف سے ایک آواز آئے گی: "تمہارے لیے آج کے دن جنت کے باغات کی بشارت ہو جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں": (بشراکم الیوم جنات تجری من تحتھا الانھار)۔ "اس میں تم ہمیشہ رہوگے اور یہ ایک عظیم کامیابی و رستگاری ہے": (خالدین فیھا ذالك ھو الفوز العظیم)۔

باقی رہے وہ منافقین جو کفر و نفاق اور گناہ کی وحشت ناک تاریکی میں مقیم ہوں گے تو اس موقع پر وہ فریاد کریں گے۔ وہ مومنین سے نور حاصل کرنے کی التجا کریں گے لیکن سوائے انکار کے انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

(یوم یقول المنافقون والمنافقات للذین اٰمنوا انظرونا نقتبس من نورکم)۔[2]

"وہ دن جس میں منافق مرد اور عورتیں مومنین سے کہیں گے ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔"

اقتباس کا مادہ "قبس" ہے جس کے معنی ہیں آگ کا شعلہ لینا۔ اس کے علاوہ نمونوں کے انتخاب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ "انظرونا" کے لفظ سے یہ مراد ہے کہ ہماری طرف نگاہ کرو تاکہ تمہارے چہرہ کے نور سے ہم فائدہ اُٹھائیں اور اپنا راستہ دیکھ لیں یا ہم پر لطف و محبت کی نگاہ ڈالو اور اپنے نور کا ایک حصہ ہمیں بھی دو۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "انظرونا" سے مراد انتظار کرنا ہو یعنی ہمیں مہلت دو تاکہ ہم بھی تم تک پہنچ جائیں اور تمہارے نور کے زیرِ سایہ اپنی راہ تلاش کریں۔ لیکن بہرحال جو جواب انہیں دیا جائے گا وہ یہ ہے کہ اپنے پیچھے کی طرف پلٹ جاؤ اور کسبِ نور کرو۔ (قیل ارجعوا وراءکم فالتمسوا نوراً)۔ یہ نور حاصل کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ یہ نور اس دنیا میں جسے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو، ایمان اور عمل صالح کے ذریعے حاصل کرتے۔ اب وقت گزر چکا ہے اور دیر ہو چکی ہے۔ اس وقت اچانک ان کے گرد ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا۔ (فضرب بینھم بسور لہ باب)۔ لیکن اس عظیم دیوار کے دونوں اطراف میں یا اس دروازہ کے دونوں اطراف میں بڑا فرق ہوگا۔ "اس کے اندر رحمت اور باہر عذاب ہے": (باطنہ فیہ الرحمة وظاھرہ من قبلہ العذاب)۔ سور کے معنی از روئے لغت دیوار کے ہیں جو گزشتہ زمانے میں شہروں کے گرد کھینچتے تھے جسے فصیل کہتے ہیں اور فارسی میں بارو کہتے ہیں۔ اس فصیل میں مختلف فاصلوں پر محافظوں اور نگہبانوں کے لیے برج ہوتے تھے لہٰذا مجموعی حیثیت سے اُسے "برج و بارو" کہتے ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ پروردگارِ عالم فرماتا ہے: "اُس کے اندر رحمت ہے اور باہر عذاب ہے": یعنی مومنین ساکنینِ شہر کی طرح اس باغ کے اندر ہیں اور منافقین بیگانوں اور اجنبیوں کی طرح صحرائی حصہ میں ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک ہی معاشرہ میں اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن مختلف عقائد و اعمال کی ایک عظیم دیوار انہیں ایک دوسرے سے جُدا کیے ہوئے تھی۔ قیامت میں یہی معنی مجسّم ہو جائیں گے۔ رہی یہ بات کہ یہ دروازہ کس لیے ہے، ممکن ہے اس لیے ہو کہ منافقین اس دروازہ سے جنت کی نعمتوں کو دیکھیں اور حسرت و افسوس سے دوچار ہوں۔ یا یہ کہ وہ افراد جن کے گناہ کم ہیں وہ اصلاح کے بعد وہاں سے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۲۴۱، حدیث ۶۰۔

[2] "انظرونا" کا مادہ نظر ہے جس کے معنی ہیں سوچ بچار کرنا، نگاہ کرنا، کسی شے کا مشاہدہ کرنا یا ادراک کرنا۔ کبھی تامّل یا جستجو کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب الیٰ کے ساتھ متعدی ہو تو کسی چیز پر نظر ڈالنے کے معنی میں ہے۔ اور جب فی کے ساتھ متعدی ہو تو تامّل و تدبّر کرنے کے معنی میں ہے اور جب حرفِ جر کے بغیر متعدی ہو اور ہم کہیں کہ نظرتہ و انظرتہ و انتظرتہ تو تاخیر کرنے یا انتظار کرنے کے معنی میں ہے۔

گزر جائیں اور مومنین کے پاس آجائیں لیکن یہ دیوار اس طرح کی نہیں ہے کہ جس پر سے آواز نہ گزر سکے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے:

"انہیں پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے": (ینادونھم الم نکن معکم)۔ ہم دُنیا میں بھی تمہارے ساتھ ایک ہی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور یہاں بھی تمہارے ساتھ ہی تھے۔ کیا ہوا کہ تم اچانک ہم سے الگ ہوگئے اور جوارِ رحمت الٰہی میں پہنچ گئے اور ہمیں عذاب کے چنگل میں چھوڑ گئے۔ تو وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں ہم اکٹھے ہی تھے۔ (قالوا بلیٰ)۔ ہر جگہ اکٹھے تھے، کوچہ و بازار میں، سفر و حضر میں، کبھی ایک دوسرے کے ہمسائے تھے یہاں تک کہ کبھی ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن عقیدہ و عمل کے اعتبار سے جُدا بنا لیا تھا اور اصول و فروع میں تم حق سے بیگانہ تھے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"تم بڑی بڑی خطاؤں میں گرفتار تھے منجملہ دیگر خطاؤں کے:

۱۔ "تم نے راہِ کفر کے عبور کرنے کی وجہ سے اپنے آپ کو فریب دیا اور ہلاک ہوئے۔ (ولٰکنکم فتنتم انفسکم)۔

۲۔ "تم پیغمبر کی موت، مسلمانوں کی فنا اور دینِ اسلام کی بساط اُلٹنے کے انتظار میں تھے۔ (وتربصتم)۔ اس کے علاوہ ہر مثبت کام کے انجام دینے اور ہر حرکتِ صحیح کے موقع پر صبر اور انتظار کی حالت میں رہتے تھے اور اس کی وجوہات بیان کرتے تھے۔

۳۔ "ہمیشہ قیامت، پیغمبرؐ کی دعوتِ اسلام اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا رہتے تھے (وارتبتم)۔

۴۔ "تم ہمیشہ لمبی چوڑی آرزوؤں میں اسیر رہتے، ایسی آرزوئیں جنہوں نے کبھی تمہارا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ خدا کی طرف سے تمہاری موت کا فرمان آن پہنچا۔ (وغرتکم الامانی حتّٰی جاء امر اللّٰہ)۔ ہاں ان آرزوؤں نے تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی صحیح غور و فکر کی مہلت نہیں دی۔ تم خواب و خیال کی حالت میں مستغرق تھے اور توہمات کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے اور مادّی مقاصد اور شہوات کے حصول کی آرزو تم پر غالب تھی۔

۵۔ اُن تمام چیزوں سے قطع نظر، شیطان فریب کار جس نے تمہارے وجود میں اپنا ٹھکانہ مضبوط طور پر بنا رکھا تھا۔ اس نے تم کو دھوکہ دیا۔ (وغرکم باللّٰہ الغرور)۔ اس نے وسوسوں کے ذریعے تمہیں مغرور کیا۔ کبھی دنیا کو تمہارے سامنے جاودانی بنا کر پیش کیا اور قیامت کو ایک بھولی ہوئی چیز بنایا۔ کبھی تمہیں رحمتِ خدا کے سلسلہ میں مغرور کیا۔ کبھی وجودِ پروردگار کو مشکوک بنایا۔ یہ پانچ عوامل تھے جنہوں نے باہم مل کر تمہاری راہ فکر و عمل کو ہماری راہِ فکر و عمل سے بالکل جُدا کر دیا۔ (فتنتم) کا مادہ فتنہ ہے۔ اس کے مختلف معانی ہیں: آزمائش و امتحان، فریب دہی، بلا و عذاب، ضلالت و گمراہی اور شرک و بُت پرستی۔ یہاں آخری دو معانی زیادہ مناسب ہیں۔ "تربصتم" کا مادّہ "تربص" ہے۔ اس کے معنی ہیں انتظار کرنا۔ چاہے نعمت کا انتظار ہو یا مصیبت کی فراوانی کا۔ یہاں زیادہ تر پیغمبر کی موت اور اسلام کے خاتمہ کا انتظار مراد ہے۔ گناہ سے توبہ اور ہر قسم کے کارِ خیر کے انجام دینے کے بارے میں مختلف بہانے بنانے کے معنی میں بھی ہے۔ (وارتبتم) ریب کے مادہ سے ہر ایسے شک اور تردد کے معنی میں ہے جس کے چہرہ سے بعد میں پردہ اُٹھ جائے۔ یہاں زیادہ تر قیامت اور قرآن کی حقانیت کے بارے میں شک کرنے کے معنی میں ہے۔ اگرچہ آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم وسیع ہے لیکن عنوانات کی ترتیب اس طرح ہے۔ مسئلہ شرک۔ اسلام اور پیغمبرؐ کی عمر کا اختتام پھر قیامت میں شک، اس کے بعد آرزوؤں اور شیطان کے دیے ہوئے فریب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بداعمالیاں۔ اس بنا پر یہ پہلے تین قسم کے جملے اصولِ دین میں سے اوّل تین اصولوں کے بارے میں ہیں اور آخری دو فروعِ دین سے متعلق ہیں۔ آخر کار مومنین ایک صورتِ حال میں منافقین کو مخاطب

کرتے ہوئے کہتے ہیں: "آج کے دن تم سے کوئی تاوان یا جرمانہ وصول نہیں کیا جائے گا کہ تم عذاب الٰہی سے نجات پاؤ" (فالیوم لا یؤخذ منکم فدیۃ) "اور نہ کفار ہی سے" (ولا من الذین کفروا) اس طرح کفار کی قسمت بھی منافقوں جیسی ہے۔ یہ سب کے سب اپنے گناہوں اور بداعمالیوں میں گرفتار ہیں اور ان کی نجات کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر فرماتا ہے: "تمہاری جگہ آگ ہے۔ (مأوٰکم النار)" "اور تمہارا مولا اور سرپرست بھی وہی جہنم ہے" (ھی مولٰکم[1])۔

"اور کیا ہی بُری جگہ ہے" (وبئس المصیر)۔ دنیا میں انسان عام طور پر سزاؤں سے بچنے کے لیے یا تو مالی نقصان برداشت کرتا ہے یا پھر کسی مددگار اور سفارش کرنے والے سے اعانت کا طلب گار ہوتا ہے لیکن آخرت میں کفار اور منافقین کے لیے ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہے۔ قیامت اصولی طور پر وہ تمام مادی وسائل و اسباب بیکار ہو جائیں گے جو اس دنیا میں حصول مقاصد کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ وہاں رشتے منقطع ہو جائیں گے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (وتقطعت بھم الاسباب) "اس دن نہ لین دین ہے اور نہ دوستی کا رابطہ" (یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ) (بقرہ۔ ۲۵۴) "نہ کوئی عوض لیا جائے گا" (ولا یؤخذ منھا عدل) (بقرہ۔ ۴۸)۔ "اور نہ کوئی شخص اپنے دوست کی فریاد کو پہنچے گا" (یوم لا یغنی مولیً عن مولیً شیئا) (دخان۔ ۴۱) "نہ منصوبے اور بہانے کام آئیں گے" یوم لا یغنی عنھم کیدھم شیئا) (طور۔ ۴۶) "نہ نسب اور رشتہ داری کا رابطہ کسی کام آئے گا" (فلا انساب بینھم یومئذ) (مومنون۔ ۱۰۱) "خلاصہ یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے اعمال میں گرفتار اور اپنے افعال میں گروی ہیں" (کل نفس بما کسبت رھینۃ) (مدثر۔ ۳۸) اس طرح قرآن واضح کرتا ہے کہ اس دن نجات کا واحد ذریعہ ایمان اور عملِ صالح ہے، یہاں تک کہ شفاعت کا دائرہ بھی محدود ہے۔ شفاعت صرف ان کے لیے ہے جو مذکورہ دونوں صفتوں میں سے کچھ حصّہ اپنے پاس رکھتے ہوں نہ کہ وہ لوگ جو ایمان وعملِ صالح سے بالکل بیگانہ ہیں اور جنہوں نے خدا اور اس کے اولیا سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر رکھا ہے۔

ایک نکتہ

قیامت میں مُجرموں کا بے مقصد مدد کرنا

چونکہ بہت سے لوگ عرصہ محشر میں آنے کے وقت اس نظام سے جو وہاں رائج ہے ناآشنا ہیں لہٰذا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہاں بھی دنیاوی نظام رائج ہیں لہٰذا اُن سے فائدہ اُٹھائیں گے لیکن وہ بہت جلد سمجھ جائیں گے کہ وہ ایک عظیم غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کبھی مُجرم مومنین سے مدد طلب کریں گے اور کہیں گے۔ (انظرونا نقتبس من نورکم) ہم پر ایک نگاہ ڈالو تاکہ ہم تمہارے ایمان اور عملِ صالح کی روشنی سے کچھ نور حاصل کریں۔ (آیات زیر بحث) لیکن انہیں بہت جلد انکار سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ سُنیں گے کہ منبعِ نور یہاں نہیں ہے بلکہ وہاں دنیا میں تھا جہاں سے تم بے خبری کی حالت میں گزر آئے ہو۔ کبھی مجرم ایک دوسرے سے مدد طلب کریں گے۔ (پیروکار اپنے رہبروں) اور کہیں گے: (فھل انتم مغنون عنا من عذاب اللہ من شیء) "کیا تم ہمارے بدلے عذاب الٰہی کا ایک حصّہ قبول کرتے ہو؟ (ابراہیم۔ ۲۱)۔

---

[1] مولیٰ یہاں ہو سکتا ہے کہ ولی وسرپرست کے معنی میں ہو یا اس چیز اور شخص کے معنی میں ہو جو انسان کے لیے اہمیت رکھتی ہو۔

انہیں یہاں بھی انکار سے دوچار ہونا پڑے گا حتیٰ کہ وہ خازنین جہنم سے ملتجی ہو کر کہیں گے: (ادعوا ربکم یخفف عنا یوما من العذاب) "اپنے پروردگار سے استدعا کرو کہ ایک دن کے لیے ہم پر سے عذاب ہٹالے"۔ (مومن - ۴۹) کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر خدا سے مدد طلب کریں گے اور عرض کریں گے: (ربنا اخرجنا منها فان عدنا فانا ظالمون) "پروردگار ہمیں اس جلانے والی آگ سے باہر لے آ۔ اگر ہم دوبارہ لوٹ آئے تو ہم ظالم ہیں"۔ (مومنون - ۱۰۷)

٭ ٭ ٭

۱۶۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ
اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ
قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ○
۱۷۔ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا
لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○
۱۸۔ إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ
قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ○

ترجمہ

۱۶۔ کیا وہ وقت نہیں آیا کہ جب مؤمنین کے دل ذکرِ خدا اور جو حق سے نازل ہوا ہے اس سے خشوع اختیار کریں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے آسمانی کتاب دی گئی ہے پھر ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی اور ان میں سے بہت سے گنہگار ہیں۔

۱۷۔ جان لو کہ خدا زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ہم نے اپنی آیات

تمہارے لیے بیان کی ہیں شاید تم عقل کرو (اور سوچو)

۱۸۔ انفاق کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ جو خدا کو قرض حسنہ دیں ان کے لیے وہ رقم کئی گنا ہو جائے گی اور ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

شانِ نزول

پہلی زیر بحث آیت کے متعلق کئی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں منجملہ ان سب کے ایک یہ ہے کہ آیت مذکورہ ہجرت کے ایک سال بعد منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس بنا پر کہ ایک دن انہوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا جو کچھ توراۃ میں ہے ہم سے اس کی بات کرو کیونکہ توراۃ میں تعجب خیز مسائل ہیں۔ اس طرح وہ چاہتے تھے کہ قرآن کو نظرانداز کر دیں۔ اس بنا پر سورہ یوسف کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو سلمان نے ان سے کہا کہ یہ قرآن احسن القصص ہے اور بہترین واقعات بیان کرتا ہے اور تمہارے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سود مند ہے۔ انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا پھر وہ سلمان کے پاس آئے اور اپنی خواہش کی تکرار کی تو اس وقت یہ آیت (الله نزل احسن الحديث كتابًا متشابهًا مثاني تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم...) خدا نے بہترین گفتگو کو نازل کیا ہے۔ ایسی کتاب جس کی آیات (لطف و زیبائی اور معانی کے لحاظ سے) ایک دوسرے کے مانند ہیں اس کی آیات مکرر ہیں (لیکن یہ تکرار شوق انگیز ہے)۔ ان آیتوں کے سننے سے وہ لوگ جو خدا سے ڈرتے ہیں لرزہ براندام ہو جاتے ہیں ...." (زمر - ۲۳)

پھر انہوں نے ایک مدت تک اپنے سوال کو نہ دہرایا پھر تیسری مرتبہ سلمانؓ کے پاس آئے اور اپنا سوال دہرایا تو اس وقت زیر بحث آیت نازل ہوئی (اور ان کا مواخذہ کیا کہ کیا اس بات کا موقع نہیں آیا کہ تم خدا سے ڈرو اور ان باتوں سے دستبردار ہو جاؤ)۔

ایک اور شانِ نزول اس طرح ہے کہ پیغمبرؐ کے اصحاب مکہ میں خشک سالی اور سختی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر جس وقت انہوں نے ہجرت کی اور ان کو نعمتوں کی فراوانی حاصل ہوئی تو ان کی کیفیت بدل گئی اور ایک جماعت کے دلوں میں سختی آگئی حالانکہ امکان اس بات کا زیادہ تھا کہ قرآن ہمراہ ہونے کی وجہ سے، ان کے ایمان، خلوص اور یقین میں اضافہ ہو، (تو والی آیت نازل ہوئی اور اس نے ان کو تنبیہ کی)۔[1]

اس آیت کے سلسلہ میں کچھ اور شانِ نزول بھی نظر آتی ہیں لیکن چونکہ وہ آیت کو مکی بتاتی ہیں لہٰذا قابلِ اعتبار نہیں ہیں کیونکہ مشہور یہ ہے کہ یہ ساری سورت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

تفسیر

غفلت و بے خبری کب تک

ان تمام سرکوبی کرنے والی تنبیہوں اور گزشتہ آیتوں میں بیدار کرنے والی تخویفوں اور قیامت میں کافروں اور منافقوں کا جو حال ہوگا اس کو

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۲۳۷۔ تفسیر در المنثور میں بھی کئی شانِ نزول بیان ہوئی ہیں جو مذکورہ دوسری شانِ نزول مطابقت رکھتی ہیں۔ در المنثور جلد ۶ ص ۱۷۵۔ بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر انوار التنزیل میں یہ شانِ نزول نقل کی ہے۔

بیان کرنے کے بعد پہلی زیر بحث آیت میں پروردگارِ عالم تنبیہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے : کیا اس چیز کا وقت نہیں آیا کہ صاحبِ ایمان افراد کے دل، ذکرِ خدا سے اور جو کچھ حق میں سے نازل ہوا ہے، اس سے خوف کھائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں گزشتہ زمانے میں آسمانی کتاب دی گئی (مثل یہود و نصاریٰ کے) پھر ان کے اور پیغمبروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ انہوں نے طولانی عمر پائی اور خدا کو فراموش کیا۔ ان کے دلوں میں قساوت پیدا ہوگئی ان میں سے بہت سے فاسق اور گنہگار تھے۔ (الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فاسقون)[1]

"تخشع" کا مادہ "تخشوع" ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ حالتِ تواضع اور جسمانی و روحانی ادب جو کسی عظیم حقیقت یا بزرگ شخصیت کے سامنے کوئی انسان اختیار کرے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر خدا کی یاد انسان کے دل اور اس کی روح کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہ ان آیات کو سُنے جو پیغمبرِ خُدا پر نازل ہوئی ہیں اور ان میں غور و فکر کرے تو ان آیتوں کو خوفِ خُدا کا سبب بننا چاہیئے۔ لیکن قرآن یہاں مؤمنین کے ایک گروہ کو سخت ملامت کرتا ہے کہ وہ ان حقائق کے پیشِ نظر کیوں خشوع اختیار نہیں کرتے اور بہت سی گزشتہ اُمتوں کی طرح کیوں غفلت و بے خبری کا شکار ہیں۔ وہی غفلت جس کا نتیجہ قساوتِ قلبی ہے اور وہی قساوت جس کا ثمر فسق و فجور اور گناہ ہے۔ کیا صرف ایمان کے دعویٰ پر قناعت کرنا اور اہم مسائل کے نزدیک سے بہ آسانی گزر جانا اور خود کو خوشحالی کے سپرد کر دینا اور ناز و نعمت میں رہنا اور ہمیشہ عیش و عشرت میں مگن رہنا ایمان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے؟ (طال علیھم الامد) "ان پر زمانہ طولانی ہوگیا" یہ جملہ ہو سکتا ہے ان لوگوں اور ان کے پیغمبروں کے درمیانی فاصلہ کی طرف اشارہ ہو یا ان کے طولِ عمر اور آرزوؤں کی کثرت کی طرف یا عذابِ الٰہی کے طویل زمانہ تک نازل نہ ہونے کی طرف یا ان سب کی طرف، اس لیے کہ ممکن ہے ان میں سے ہر چیز غفلت و قساوتِ قلبی کا سبب ہو اور وہ فسق و گناہ کا سبب بنے۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(لا تعاجلوا الامر قبل بلوغه فتندموا ولا یطولن علیکم الامد فتقسو قلوبکم)۔

"کسی کام کے سلسلہ میں اس کا وقت آنے سے پہلے، جلدی نہ کرو ورنہ پشیمان ہوگے اور تمہارے اور حق کے درمیان طویل فاصلہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے تمہارے دل قساوت کا شکار ہو جائیں گے۔"[2]

ایک اور حدیث میں حضرت عیسٰیؑ کی زبانی یہ مروی ہے کہ :

(لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فتقسو قلوبکم فان القلب القاسی بعید من اللہ ولا تنظروا فی ذنوب العباد کانکم ارباب وانظروا فی ذنوبکم

---

[1] "یأن" کا مادہ "أنی" (بروزن "امن") ہے اور "انا" بروزن "ندا" کے مادہ سے اور "أناء" بروزن "جفاء" کے مادہ سے نزدیک ہونے اور کسی چیز کے حضور کے وقت کے معنوں میں ہے۔

[2] "بحار الانوار" جلد ۷۸ ص ۸۳ حدیث ۸۵۔

كانكم عبيد، والناس رجلان: مبتلى، ومعافى، فارحموا اهل البلاء، واحمدوا الله على العافية)

" خدا کے ذکر سے جو خالی ہوں وہ باتیں زیادہ نہ کرو یہ قساوتِ قلب کا باعث ہے اور قساوت رکھنے والا دل خدا سے دُور ہے۔ بندوں کے گناہوں پر اس طرح نظر نہ ڈالو جس طرح مالک اپنے غلاموں پر نظر ڈالتے ہیں بلکہ اپنے گناہوں کی طرف اس طرح دیکھو جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے ہو۔ لوگ دو طرح کے ہیں۔ ایک گروہ مبتلا ہے اور دوسرا اہلِ عافیت کا گروہ ہے۔ مبتلاؤں پر رحم کرو اور اہلِ عافیت کو دیکھ کر خدا کی حمد و ستائش کرو۔" [۱]

چونکہ ذکرِ خدا سے مُردہ دلوں کا زندہ ہونا اور قرآن کے سامنے خضوع و خشوع اختیار کرنے سے حیاتِ معنوی کا پیدا ہونا، بارش کے حیات بخش قطروں کی برکت سے مُردہ زمینوں کے زندہ ہونے کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے اس لیے بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے: " جان لو کہ خدا زمین کو مُردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے" (اعلموا ان الله يحى الارض بعد موتها)۔ " ہم اپنی آیتوں کو آفرینش کے میدان میں اور وحی کے میدان میں تمہارے لیے واضح کرتے ہیں اس خیال سے کہ شاید تم عقل سے کام لو" (قد بينا لكم الأيات لعلكم تعقلون)۔ درحقیقت یہ آیت بھی بارش کے وسیلہ سے زمینِ مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اور ذکرِ خدا و قرآن کے وسیلہ سے دل ہائے مُردہ کے زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن وہ ہے جو خدا کی طرف سے قلبِ پاک پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔ ذکرِ خدا و قرآن دونوں تدبّر و تعقّل کے مستحق ہیں اسی لیے اسلامی روایات میں دونوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

العدل بعد الجور

زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعے زندہ ہونا مُراد ہے بعد اس کے کہ وہ ظلم و جور سے مُردہ ہو چکی ہو۔ [۲]

ایک دوسری حدیث امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے " اعلموا ان الله يحى الارض بعد موتها" کی تفسیر میں فرمایا:

(يحى الله تعالى بالقائم بعد موتها يعنى بموتها كفر اهلها والكافر ميت)۔

" خدا زمین کو حضرت مہدیؑ کے ذریعے زندہ کرے گا بعد اس کے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہوگی اور زمین کے مُردہ ہونے سے مُراد اس کے رہنے والوں کا کفر ہے اور کافر مُردہ ہے۔" [۳]

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ تفسیریں زیرِ بحث آیت کے مصداقوں کا بیان ہیں اور ہرگز آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتیں۔ ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے کہ:

فان الله يحى القلوب الميتة بنور الحكمة كما يحى الارض الميتة بوابل المطر

" خدا مُردہ دلوں کو نورِ حکمت سے زندہ کرتا ہے جیسا کہ مُردہ زمینوں کو بابرکت بارشوں سے زندہ کرتا ہے۔" [۴]

---

[۱] " مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۳۸

[۲] روضۃ الکافی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۳۔ [۳] " کمال الدین" مطابق نقل " نور الثقلین" جلد ۵ ص ۲۴۲

[۴] بحار جلد ۷۸ ص ۳۰۸۔

بعد والی آیت ایک مرتبہ پھر انفاق، جو شجرِ ایمان کا ایک پھل ہے، اس کی طرف توجہ دلاتی ہے اور اسے موضوعِ گفتگو بناتی ہے اور وہی تعبیر جو گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں اسے کچھ اضافوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"وہ مرد اور عورتیں جو راہِ خدا میں انفاق کریں اور وہ جو اس طرح خدا کو قرضِ حسنہ دیں خدا اس قرض کو کئی گنا کرتا ہے اور ان مردوں اور عورتوں کے لیے بیش قیمت اجر ہے": (انّ المصّدقین والمصّدقات واقرضوا اللّٰہ قرضاً حسناً یضاعف لھم ولھم اجر کریم)[1]

مسئلہ انفاق کو خدا نے قرضِ حسنہ دینے کے عنوان کے ماتحت کیوں پیش کیا ہے اور مذکورہ اضافہ اور اجرِ کریم کس بنا پر ہے؟ اس سورہ کی آیت ۱۱ کے ذیل میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ اس آیت میں اور اسی قسم کی دوسری آیتوں میں[2] خدا کو قرضِ حسنہ دینے سے مُراد بندوں کو قرض دینا ہے اس لیے کہ خدا کو قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مومن بندے ہی ہیں جنہیں قرض کی ضرورت ہے لیکن آیات کے سیاق و سباق کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ نظر آتا ہے کہ ان آیات میں قرضِ حسنہ سے مُراد وہی انفاق فی سبیل اللہ ہے اگرچہ بندگانِ خدا کو قرض دینا بھی افضل و برتر اعمال میں سے ہے اور یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ فاضل مقداد نے بھی کنز العرفان میں انہی معانی کی طرف اشارہ کیا ہے، اگرچہ وہ قرضِ حسنہ کی تفسیر میں تمام اعمالِ صالح کو پیش کرتے ہیں۔[3]

وہ گنہگار افراد جنہوں نے یہ آیت سُن کر توبہ کی

آیت (الم یأن للذین اٰمنوا ۔ ۔ ۔ ۔) قرآن مجید کی ان لرزہ براندام کر دینے والی آیتوں میں سے ہے جو انسان کے دل اور اس کی رُوح کو مسخر کرتی ہیں اور غفلت کے پردے چاک کر کے پکار پکار کر کہتی ہیں کیا اس کا موقع نہیں آ پہنچا کہ ایماندار دل خدا کے ذکر سے اور جو حق سے نازل ہوا ہے اس کو سُن کر خدا کا خوف اختیار کریں اور ان لوگوں کے مانند نہ ہوں جنہوں نے کتابِ آسمانی کی آیات کا ادراک کیا لیکن طولِ زمان کے زیرِ اثر ان کے دل قساوت کی طرف مائل رہے۔ اس لیے تاریخ کے طویل دور میں ہم بہت سے گنہگار افراد کو دیکھتے ہیں جو اس آیت کو سُن کر اس طرح کانپ اُٹھتے ہیں کہ ایک ہی لمحے میں اپنے تمام گناہوں کو ترک کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اُن میں سے بعض زاہدوں اور عابدوں میں قرار پائے ہیں۔ منجملہ دوسروں کے فضیل بن عیاض ہیں۔ فضیل جو کُتبِ رجال میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے موثق راویوں میں سے ہیں اور مشہور زاہدوں میں شمار ہوتے ہیں وہ آخری زندگی میں جوارِ کعبہ میں رہائش رکھتے تھے۔ انہوں نے اسی علاقہ میں بروز عاشورہ دُنیا سے رختِ سفر باندھا۔ وہ ابتدا میں ایک خطرناک رہزن تھے جس سے تمام لوگ ڈرتے تھے۔ وہ ایک آبادی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ایک لڑکی کو اُنہوں نے دیکھا۔ اس سے انہیں محبت ہوگئی۔ اس لڑکی کے عشق نے انہیں اس بات کی انگیخت دی کہ رات کے وقت وہ اس کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہوں اور ہر قیمت پر اس کا وصال حاصل کریں۔ وہ جس وقت دیوار پھاند رہے تھے تو اس وقت قریب کے گھروں میں

---

[1] "المصّدقین والمصّدقات" "المتصدقین والمتصدقات" کے معنی میں ہے اور اقرضوا اللّٰہ کا عطف جو جملہ فعلیہ ہے گزشتہ جملہ اسمیہ پر اسی بنا پر ہے کیونکہ یہ جملہ الذین اقرضوا اللّٰہ کے معنی میں ہے۔

[2] بقرہ ۔ ۲۴۵، تغابن ۔ ۱۷، مزمل ۔ ۲۰، حدید ۔ ۱۱

[3] کنز العرفان جلد ۲ ص ۵۸۔

ایک گھر میں کوئی شخص تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھا اور وہ اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا: الم یأن للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ... یہ آیت ایک تیر کی طرح فضیل کے دل پر لگی۔ انہوں نے دل میں چبھن محسوس کی۔ ان کے دل میں ایک قسم کا ہیجان برپا ہوگیا۔ انہوں نے تھوڑا سا اس پر غور و فکر کیا کہ کون ہے جو یہ گفتگو کر رہا ہے اور کسے یہ پیام دے رہا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے فضیل کیا وہ وقت نہیں آپہنچا کہ تُو بیدار ہو اور اس راہ خطا سے لوٹ آئے ؛ اس گناہ سے اپنا دامن بچالے اور توبہ کی راہ اختیار کرے ؟ اچانک فضیل کی صدا بلند ہوئی۔ وہ مسلسل کہے جا رہے تھے: (بلی واللہ قد اٰن، بلی واللہ قد اٰن) "خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے۔ خدا کی قسم اس کا وقت آپہنچا ہے" انہوں نے آخری فیصلہ کیا اور پختہ ارادہ کر لیا اور وہ بجلی کی سی ایک جست لگا کر حلقۂ اشقیاء سے نکل آئے اور صف سعداء میں شامل ہو گئے۔ وہ دیوار سے نیچے اُتر آئے اور ایک ایسے خرابے میں داخل ہوئے جہاں مسافروں کی ایک جماعت قیام پذیر تھی۔ وہ مسافر اپنی منزل کی طرف کوچ کرنے کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے اور آپس میں یہ کہہ رہے تھے، کہ فضیل اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں اگر ہم جائیں گے تو وہ ہمارا راستہ روک لیں گے اور ہمارا مال و اسباب لُوٹ لیں گے۔ فضیل لرز گئے اور اپنے آپ کو سخت ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ میں کتنا بُرا شخص ہوں۔ یہ کون سی شقاوت و بدبختی ہے جس میں مبتلا ہوں۔ رات کی تاریکی میں گناہ کے ارادہ سے میں باہر نکلا ہوں اور مسلمانوں کا ایک گروہ میرے خوف کی وجہ سے اس خرابہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا ہے۔ انہوں نے آسمان کی طرف مُنہ کیا اور توبہ کرنے والے دل سے ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کیا: اللّٰھم انی تبت الیک وجعلت توبتی الیک جوار بیتک الحرام ۔ خدایا میں تیری طرف لوٹ آیا اور اپنی توبہ یہ قرار دی ہے کہ ہمیشہ تیرے گھر کے قُرب میں رہوں گا۔ خدایا میں اپنی بدکاری پر رنجیدہ ہوں اور اپنی دنائت کی وجہ سے آہ و بکا کرتا ہوں تو میرے درد کی دوا کر۔ اے ہر درد کی دوا کرنے والے! اے ہر عیب سے پاک و منزہ! اے وہ جو میری خدمات بجالانے سے بے نیاز ہے! اے وہ جسے میری خیانت سے کوئی نقصان نہیں! مجھے اپنی رحمت کے صدقہ میں بخش دے اور مجھ ہوا و ہوس کے اسیر کو اس قید و بند سے رہائی بخش" خدا نے ان کی دُعا قبول کی اور ان پر عنایات فرمائیں وہ وہاں سے لوٹ کر مکہ آئے برسوں تک وہاں مجاور رہے اور اولیاء اللہ میں سے ہوگئے

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است   اسیر عشق تو از ہر دو کون آزاد است

تیرے کوچہ کا گدا آٹھوں بہشتوں سے مستغنی ہے اور تیرے عشق کا قیدی دونوں جہاں سے آزاد ہے[1]

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بصرہ کے مشہور افراد میں سے ایک فرد کہتا ہے کہ میں ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک چیخ میں نے سُنی۔ میں اس چیخ مارنے والے کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص زمین پر بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک بیدار دل شخص ہے۔ قرآن کی ایک آیت اس نے سُنی ہے اور مدہوش ہوگیا ہے۔ میں نے کہا کہ کون سی آیت تو انہوں نے بتایا: الم یأن للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ ... میری آواز سُن کر وہ بے ہوش شخص ایک دم ہوش میں آگیا اور ہوش میں آکر اس نے ان دل سوز اشعار کو پڑھنا شروع کیا:

اما اٰن للھجران ان یتصرما   و للغصن غصن البان ان یتبسما

وللعاشق الصب الذی ذاب وانحنی   الم یأن ان یبکی علیہ و یرحما

---

[1] اقتباس از سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۳۶۹ ۔ اور روح البیان جلد ۹ ص ۳۶۵ ۔ اور تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۲۱

کتبت بماء الشوق بین جوانحی کتابا حکی نقش الوشی المنمنما

کیا اس کا موقع نہیں آیا کہ ہجر کا وقت ختم ہو اور میری اُمید کی بلند شاخ اور اس کی خوشبو مسکرائے اور کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ اس بیقرار عاشق کے لیے جو پگھل کر پانی ہو چکا ہے اور اس کی کمر جھک گئی ہے، لوگ گریہ کریں اور وہ مرکز رحم قرار پائے جس نے آب شوق کے پانی کی روشنائی سے میں نے اپنے صفحۂ دل پر لکھ دیا ہے اور ایک ایسا نامۂ شوق تحریر کیا ہے جو بہت ہی خوبصورت عمدہ اور جاذب توجہ ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا مشکل ہے مشکل ہے یہ کہہ کر وہ دوبارہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اس کو ہم نے ہلا کر دیکھا تو وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکا تھا[1]

❖ ❖ ❖

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۲۷ ص ۱۵۶۔

۱۹۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ
وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۟

۲۰۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ
تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَ
مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

ترجمہ

۱۹۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آئے وہ صدیقین و شہدا ہیں۔ اپنے
پروردگار کے پاس۔ ان کے (اعمال) کا اجر اور ان کا نور (ایمان) ان کے لیے ہے
اور جو لوگ کافر ہوگئے اور انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اصحاب جحیم ہیں۔

۲۰۔ جان لو کہ زندگیٔ دُنیا صرف کھیل کود، سرگرمی، تجمل پرستی اور تمہارے درمیان تفاخر ہے اور مال و اولاد میں اضافہ کا طلب کرنا اس بارش کی طرح جس کا حاصل کسانوں کو تعجب میں ڈال دیتا ہے، پھر وہ (کھیتی) خشک ہو جاتی ہے اس طرح کہ تو اسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ خشک بھوسہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آخرت میں یا عذاب شدید ہے یا مغفرت و رضائے الٰہی۔ بہرحال زندگیٔ دنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تفسیر

دُنیا متاعِ غرور کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں

گزشتہ آیات کی بحث جس میں مومنین اور بارگاہ خدا میں ان کے اجر سے متعلق گفتگو تھی اس کو جاری رکھتے ہوئے پروردگارِ عالم زیر بحث آیت میں مزید فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں: (والذین اٰمنوا باللّٰہ ورسلہ اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم)۔ "صدیق" صدق سے ہے اور صیغہ مبالغہ ہے اور اس شخص کے معنی میں ہے جو سراپا صداقت ہو۔ وہ جس کا عمل اس کی گفتار کی تصدیق کرتا ہو اور وہ سچائی کا کامل نمونہ ہو۔ "شہداء" جمع ہے شہید کی، اس کا مادہ شہود ہے جس کے معنی ایسا حضور ہیں جس کے ساتھ مشاہدہ وابستہ ہو۔ چاہے وہ ظاہری آنکھ سے ہو چاہے دل کی آنکھ سے۔ اور اگر گواہ پر شاہد و شہید کا اطلاق ہوتا ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ اس نے کسی منظر کا مشاہدہ حاضر رہ کر کیا ہے۔ اسی طرح جس طرح اس کا اطلاق شہیدانِ راہِ خدا پر میدانِ جہاد میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن زیر بحث آیت میں ہو سکتا ہے کہ، اعمال کی شہادت کے معنی میں ہو جیسا کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اور انبیاء اپنی اپنی اُمتوں کے اعمال کے گواہ ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ ان کے گواہ بھی ہیں اور اپنی اُمت کے بھی اور مسلمان بھی لوگوں کے اعمال کے شاہد اور گواہ ہیں۔[1]

اس بنا پر شہداء کا مقام (اعمال کے گواہ) ایک بلند مقام ہے جو ایمان دار افراد کو حاصل ہے۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ یہاں شہداء انہی شہدائے راہِ خدا کے معنوں میں ہے یعنی جو مومن ہے وہ شہیدوں جیسا اجر رکھتا ہے اور بمنزلہ شہداء ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: (ادع اللّٰہ ان یرزقنی الشھادۃ)۔ خدا سے دُعا

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۱۴ سورہ حج کی آیت ۷۸ کے ذیل میں اور جلد ۳ سورہ نساء کی آیت ۴۱ کے ذیل میں جو تحریر ہے اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیجیے کہ وہ مجھے شہادت عطا فرمائے۔

امام نے فرمایا:

"ان المؤمن شہید وقرأ ھٰذہ الاٰیۃ"

مومن شہید ہے اور پھر آپ نے اس آیت (والذین اٰمنوا باللّٰہ ورسلہ ...) کی تلاوت فرمائی۔[1]

مذکورہ دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے اس لیے کہ قرآن مجید میں شہید و شہداء کے الفاظ عام طور پر گواہوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں بہرحال خدا مومنین کی دو صفتیں بیان کرتا ہے۔ پہلی صفت صدیق اور دوسری شہید، اور یہ چیز بتاتی ہے کہ زیر بحث آیت میں مومنین سے مراد وہ افراد ہیں جن کو ایمان کا بلند ترین مقام حاصل ہے ورنہ ایک عام مومن اسی قسم کے اوصاف کا حامل نہیں ہوتا۔[2]

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ان کے لیے ان کے اعمال کا اجر ہے اور ان کے ایمان کا نور" (لھم اجرھم ونورھم)۔ یہ تفصیلی تعبیر عظیم اجر اور ان کے حد سے زیادہ نور کی طرف اشارہ ہے۔ آخر میں فرماتا ہے: "لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی وہ اہل دوزخ ہیں:" (والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا اولٰئک اصحاب الجحیم)۔ تاکہ دونوں گروہوں کے تقابل سے۔ پہلے گروہ کا مقام بلند اور دوسرے گروہ کی پستی آشکار ہو جائے اور چونکہ پہلے گروہ میں ایمان کی بلند سطح مدِنظر تھی لہٰذا اس گروہ کا بھی شدید کفر پیش نظر ہے اسی لیے اس گروہ کا ذکر آیات الٰہی کی تکذیب کے عنوان سے ہوا ہے اور چونکہ دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے (رأس کل خطیئۃ) اس لیے بعد والی آیت میں دنیا کی کیفیتِ حیات اور اس کے مختلف مرحلوں کی گویا نمایاں تصویر کشی ہوئی ہے اور ہر مقام پر جو عوامل کارفرما ہیں وہ پیش کیے گئے ہیں۔

پروردگار عالم فرماتا ہے: "جان لو کہ زندگیٔ دنیا صرف کھیل کود، جوش و خروش، تجمل پرستی، ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا اور مال و اولاد میں اضافہ کا مطالبہ کرنا ہے": (اعلموا انما الحیاۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد)۔ اس اعتبار سے غفلت، جوش و خروش، تجمل پرستی، تفاخر اور تکاثر انسانی زندگی کے پانچ مرحلوں کو تشکیل دیتا ہے۔ پہلا بچپن کا دور ہے جس میں زندگی بے خبری اور لہو و لعب میں مصروف رہتی ہے۔ اس کے بعد لڑکپن کا دور آتا ہے۔ اس میں سرگرمی اور جوش و خروش کھیل کود کی جگہ لے لیتے ہیں اور اس مرحلہ میں انسان ایسے مسائل میں اُبھارتا رہتا ہے جو اسے صرف اپنے ساتھ سرگرم رکھیں لیکن سنجیدہ مسائل سے دور۔ تیسرا مرحلہ جوانی کا ہے جس میں شور و غوغا ہوتا ہے اور تجمل پرستی ہوتی ہے۔ اس مرحلے سے گزرے تو چوتھا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں مقام و منصب کے حاصل کرنے اور فخر و مباہات کرنے کے جذبات انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ آخرکار وہ پانچویں مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے جس میں افزائش مال و اولاد کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ پہلے مرحلے تو زندگی اور عمر کے مطابق طے شدہ ہیں لیکن بعد کے مرحلے مختلف افراد

---

1. تفسیر عیاشی مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۴۔

2. اور پرانی تفسیر کے مطابق (اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم) میں کوئی چیز مقدر نہیں ہے اور مومنین کے اس گروہ کو صدیقین و شہداء کے مصداق شمار کیا گیا ہے لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مقام صدیقین و شہداء ہیں نہ کہ خود وہی ہیں یعنی ان کا اجر تو انہیں ملے گا لیکن تمام اعزازات و افتخارات نہیں ملیں گے اور وہ کہتے ہیں کہ آیت کی تقدیر عبارت اس طرح ہے (اولٰئک لھم مثل اجر الصدیقین والشھداء) تفسیر روح المعانی اور المیزان (در ذیل آیات زیر بحث) اور طبعاً لھم اور اجرھم کی ضمیروں کا مرجع بھی مختلف ہو گا لیکن یہ تفسیر ظاہر آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

میں مکمل طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ انسان میں مال کی افزائش کا جذبہ آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اگرچہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان پانچ اصولوں میں سے ہر مرحلہ انسانی زندگی کے آٹھ سال پر محیط ہوتا ہے اور مجموعی طور پر چالیس سال تک جا پہنچتا ہے۔ جب انسان اس مرحلہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی شخصیت پختہ ہو جاتی ہے۔ یہ امر بھی پورے طور پر ممکن ہے کہ بعض انسانوں کی شخصیتیں پہلے یا دوسرے مرحلے ہی میں ٹھہر جاتی ہیں اور یہ بڑھاپے تک کھیل کود، سرگرمی اور معرکہ آرائی کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یا یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت تجمل پرستی میں بٹ کر رہ جاتی ہے اور انہیں مکان، سواری اور عمدہ لباس کی فراہمی کے علاوہ اور کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ یہ ادھیڑ عمر کے لوگ ہونے کے باوجود بچے ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو کر بھی بچوں کے سے جذبات و احساسات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد پروردگارِ عالم انسان کی دنیاوی زندگی اور اس کے آغاز و انجام کی ایک مثال بیان کر کے پوری کیفیت کو نگاہِ انسانی کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: "مثل بارش کے ہے جو آسمان سے زمین کی طرف آتی ہے اور اس طرح زمین کو زندہ کرتی ہے کہ اس پر نمایاں ہونے والے سبزے زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خشک ہو جاتے ہیں اور ایسے ہو جاتے ہیں کہ تو انہیں زرد رنگ کا دیکھتا ہے۔ پھر ٹوٹ پھوٹ کر اور چھوٹے چھوٹے تنکے بن کر خشک کٹی ہوئی گھاس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔" (کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراه مصفرا ثم یکون حطاما)[1]۔

یہاں لفظِ کفار بے ایمان افراد کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ زراعت کرنے والوں کے معنی میں ہے کیونکہ کفر کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور چونکہ کسان بیج چھڑک کر اُسے زمین کے اندر چھپا دیتا ہے اس لیے اُسے کافر کہتے ہیں اور اسی لیے کفر بعض اوقات قبر کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ وہ مرنے والے کے جسم کو چھپا دیتی ہے۔ کبھی رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی تاریکی ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ درحقیقت زیرِ بحث آیت سورۂ فتح کی آیت کے مانند ہے جس میں گیاہ و نبات کے متعلق زیادہ گفتگو کرتا ہے تو فرماتا: (یعجب الزراع) "زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے (یعنی کفار کی بجائے زراع کہا گیا ہے)۔ بعض مفسرین نے یہاں اس احتمال کو بھی پیش کیا ہے کہ یہاں کفار سے مراد وہی کفار کے وجود کا انکار کرنے والے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے چند توجیہات بھی پیش کی ہیں۔ لیکن یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر نہیں آتی کیونکہ اظہارِ تعجب میں کافر و مومن دونوں شریک ہیں۔" حطام "، حطم " کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی توڑنے اور چھوٹا کرنے کے ہیں۔ گھاس کے ان اجزا کو حطام کہا جاتا ہے جو تیز ہوا کی جنبش سے بکھر جاتے ہیں۔ جی ہاں وہ مرحلے جو انسان ستر سال یا اس سے زیادہ عمر میں طے کرتا ہے وہ گھاس اور دیگر نباتات پر چند مہینوں میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور انسان ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر عمر کے گزرنے اور اس کے آغاز و انجام کو مختصر سی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے ماحصل کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "لیکن آخرت کا معاملہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہے: یا عذاب شدید ہے یا اس کی مغفرت، رضا اور خوشنودی" (وفی الاخرة عذاب شدید ومغفرة من الله ورضوان)۔ آخرکار آیت کو اس جملہ پر ختم کرتا ہے، "اور زندگیٔ دنیا سوائے متاعِ غرور اور فریب کے اور کوئی چیز نہیں ہے": (وما الحیوة الدنیا الا متاع الغرور)۔

"غرور" اصل میں "غر" (بروزن حر) کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا اثرِ ظاہری۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر ظاہر ہونے والے اثر کو "غرہ" کہتے ہیں۔ اس کے بعد غفلت کی حالت پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے جہاں ظاہر میں انسان ہوشیار ہے لیکن حقیقت میں بے خبر ہے۔ یہ فریب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ "متاع" ہر قسم کے فائدہ اُٹھانے کے وسائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تو اس بنا پر دنیا متاعِ غرور ہے

---

[1] "یهیج" کا مادہ "هیجان" ہے یہ لغت میں دو معانی کے لیے آیا ہے ایک گھاس کا خشک ہو جانا دوسرے حرکت میں آنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معانی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہوں کیونکہ جب گھاس خشک ہو جائے تو وہ حرکت اور پراگندگی کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

کے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ دُنیا فریب کاری کے لیے وسیلے کی مانند ہے، اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے بھی اور دوسروں کو فریب دینے کے لیے بھی۔ البتہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو دُنیا کو اپنا انتہائی مقصود قرار دیتے ہیں اور اُسی میں دل لگا لیتے ہیں اور اسی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی آخری آرزو یہی ہوتی ہے کہ دنیا حاصل کر لیں۔ لیکن اگر اس دنیا کی نعمتیں بلند اقدار اور سعادتِ جاودانی کے حصول کا ذریعہ بن جائیں تو پھر وہ ہرگز دنیا نہیں ہے، بلکہ آخرت کی کھیتی، عظیم مقاصد تک پہنچنے کا ایک پل ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر دنیا کی طرف ایک گزرگاہ یا آرام کرنے کی جگہ کی حیثیت سے نظر کی جائے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک میں جھگڑا اور فساد ہے، حد سے تجاوز ہے، ظلم ہے اور سرکشی و غفلت ہے۔ دوسرے پہلو میں بیداری کا وسیلہ ہے، آگاہی ہے، ایثار و قربانی ہے، بھائی چارہ ہے اور معاف کر دینا ہے۔

چند نکات

۱۔ قرآن مجید میں عظیم پیغمبروں اور ان جیسے افراد کی ایک جماعت کی تعریف صدق کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر افراد کے ایک حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ (انہ کان صدیقًا نبیًّا) (سورہ مریم آیت ۔ ۴۱) خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ادریسؑ کے بارے میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مریم ۔ ۵۶) حضرت مریمؑ مادرِ جناب عیسیٰؑ کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں: (وامہ صدیقۃ)۔ (مائدہ ۔ ۷۵)۔

قرآن کی بعض آیتوں میں صدیقین کا ذکر پیغمبروں کے ہمراہ ہوا ہے جیسا کہ سُورہ نسا کی آیت ۶۹ میں ہم دیکھتے ہیں: (ومن یطع اللہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقًا) جو شخص خدا و پیغمبر کی اطاعت کرے وہ (قیامت میں) ایسے لوگوں کا ہم نشین ہو گا جن پر خدا نے اپنی نعمت کو تمام کیا ہے، پیغمبروں، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے اور وہ اچھے رفقا ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ لفظ مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ صدق ہے اور یہ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے وجود کا صدق و راستی نے احاطہ کر لیا ہو اور صداقت اس کی پُوری زندگی پر حاوی ہو۔ یہ چیز مقامِ صدق کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ باقی رہے شہدا، تو جیسا کہ ہم نے کہا ہے کبھی تو اعمال کے گواہ کے معنوں میں اور کبھی شہیدانِ راہِ خُدا کے معنوں میں اور زیرِ بحث آیت میں ان دونوں معانی کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ البتہ شہید اسلامی فرہنگ اور تمدن کے اعتبار سے صرف انہی افراد میں محدود نہیں ہے جو میدانِ جہاد میں قتل ہو جائیں اگرچہ وہ اس کے واضح ترین مصداق ہیں۔ حتیٰ کہ وہ تمام افراد جو عقیدۂ حق رکھتے ہیں، راہِ حق میں قدم اُٹھاتے ہیں اور اسی راہ میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، روایاتِ اسلامی کے مطابق سب زمرہ شہدا میں آتے ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ:

(العارف منکم ھذا الامر المنتظر له المحتسب فیه الخیر کمن جاھد واللہ مع قائم آل محمدؑ بسیفه ثم قال بل واللہ کمن جاھد مع رسول اللہ بسیفه ثم قال الثالثة: بل واللہ کمن استشھد مع رسول اللہ فی فسطاطه وفیکم آیة من کتاب اللہ قلت وای آیة جعلت فداك؟ قال قول اللہ عزوجل والذین آمنوا باللہ ورسله اولٰئك ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم ... ثم قال صرتم واللہ صادقین شھداء عند ربکم)

جو شخص تم میں سے مسئلہ ولایت سے آشنا ہو اور ظہورِ مہدیؑ کے انتظار میں زندگی گزارے اور

اپنے آپ کو ان کی عادل حکومت کے لیے آمادہ رکھے اس شخص کی مانند ہے جو مہدی آلِ محمدؐ کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جنگ کرے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا بلکہ خدا کی قسم اس شخص کے مانند ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اپنے ہتھیاروں سے جہاد کیا پھر آپ نے تیسری مرتبہ فرمایا بلکہ خدا کی قسم اس شخص کے مانند ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ کے خیمے میں شہید ہوا ہو پھر فرمایا تمہارے بارے میں قرآن میں آیت نازل ہوئی ہے راوی نے کہا: آپ پر قربان ہو جاؤں، کون سی آیت؟ فرمایا: خدا کا یہ کلام جس میں فرماتا ہے وہ جو خدا اور اس کے بھیجے ہوئے افراد پر ایمان لائے ہیں وہ اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین اور شہداء ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: تو اس طرح سے تم خدا کی قسم اپنے پروردگار کے ہاں صدیقین بھی ہو اور شہداء بھی[1]

اس گفتگو کو ہم حضرت امیرالمومنین علیؑ کی ایک گفتگو پر ختم کرتے ہیں جس وقت آپؑ کے اصحابؓ کا ایک گروہ جہاد کے وقت کے انتظار میں اور راہِ خدا میں شہادت پانے کے شوق میں بے تاب تھا تو آپؑ نے یہ جملہ فرمایا:

(ولا تستعجلوا بمالم یعجله الله لکم فانه من مات منکم علی فراشه و هو علی معرفة حق ربه وحق رسوله واهل بیته مات شهیدًا)

اس چیز میں جس میں خدا عجلت روا نہیں رکھتا جلدی مت کرو کیونکہ تم میں سے جو شخص اپنے بستر پر مرجائے لیکن حقِ پروردگار، حقِ پیغمبر اور حقِ اہلِ بیت کی معرفت رکھتا ہو، وہ شہید مرا ہے۔[2]

⁂ ⁂ ⁂

دُنیاوی زِندگی ان اسبابِ علل کا مجمُوعہ ہے

قرآن کی مختلف آیتوں میں کبھی تو دنیاوی زندگی کو لہو ولعب کہا گیا ہے مثلاً: (وما الحیاة الدنیا الا لعب ولهو) "دنیاوی زندگی لہو و لعب کے علاوہ کچھ نہیں ہے" (انعام۔ ۳۲) اور کبھی لہو ولعب، زینت، تفاخر اور تکاثر کے الفاظ آئے ہیں مثلاً (زیر بحث آیات) اور کبھی اسے "متاع غرور" سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً (آل عمران۔ ۱۸۵) اور آیات زیر بحث) اور کبھی "متاع قلیل" (نساء ۷۷) اور کبھی عارضی وظاہری اور جلد گزر جانے والے امر سے تعبیر کیا ہے۔ (نساء ۹۴) ان تعبیروں سے اور قرآن کی دوسری تعبیروں کے مجموعہ سے اسلام کا مادی زندگی اور اس سے متعلقہ نعمتوں کے بارے میں جو نظریہ ہے وہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسلام اس زندگی کو بالکل بے قدر وقیمت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۳۸

[2] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۰

میلان و توجہ کو اور اس سے وابستگی کو بے مقصد امور (لعب) اور خواہ مخواہ مصروف رکھنے والے مقاصد (لہو) اور تجمل پرستی (زینۃ) اور حبِ مقام و منصب اور ریاست اور دوسروں پر برتری کی خواہش (تفاخر) اور حرص و آز اور افزوں طلبی (تکاثر) شمار کرتا ہے۔ اور دُنیا سے عشق کرنے کو انواع و اقسام کے مظالم اور گناہوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے لیکن اگر یہ نعمتیں اپنی جہت کو بدل لیں اور مقاصدِ الٰہی تک پہنچنے کا زینہ بن جائیں تو ایسا سرمایہ بن جائیں گی جنہیں خدا مؤمنین سے خریدتا ہے اور بہشتِ جاوداں اور سعادتِ ابدی انہیں بخشتا ہے۔

"ان اللہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ ..." (توبہ - ۱۱۱)

✣ ✣ ✣

۲۱۔ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

۲۲۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ ۚۖ

۲۳۔ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ
اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ ۙ

۲۴۔ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ
يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

ترجمہ

۲۱۔ ایک دُوسرے پر سبقت کرو اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنّت تک پہنچنے کے لیے جس کی وُسعت آسمان و زمین کی وسعت جیسی ہے اور تیار کی گئی ہے ایسے لوگوں کے لیے جو خدا اور رسُولوں پر ایمان لائے ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیتا ہے اور خُدا صاحب فضلِ عظیم ہے۔

۲۲۔ کوئی مصیبت زمین میں اور تمہارے وجُود میں نمودار نہیں ہوتی مگر یہ کہ زمین کی تخلیق سے پہلے سے لوحِ محفوظ میں ثبت ہے اور یہ چیز خدا کے لیے آسان ہے۔

۲۳۔ یہ اس لیے ہے تاکہ اس پر جسے تم گُم کر چکے ہو افسوس نہ کرو اور جو کچُھ تمہیں دیا گیا ہے اس سے خوش نہ ہو اور خُدا کسی متکبّر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

۲۴۔ وہ لوگ جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بُخل کی دعوت دیتے ہیں اور جو شخص (اس فرمان سے رُوگرداں ہو (خُدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا) کیونکہ خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔

تفسیر

ایک عظیم معنوی مقابلہ

دُنیا اور اس کی لذّتوں کی ناپائیداری کے بیان کے بعد اور اس بیان کے بعد کہ لوگ اس دُنیا میں بے قیمت سرمائے کے سلسلہ میں ایک دُوسرے سے تفاخر و تکاثر کرتے ہیں لوگوں کو، زیرِ بحث آیات میں، ان چیزوں کے طریقۂ کسب کے لیے جو پائیدار اور ہر قسم کی سعی و کوشش کے لائق ہیں، دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی بخشش، مغفرت اور اس جنّت کے حصُول کے لیے جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہے اور جو ایسے لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو خدا اور اس کے بھیجے ہُوئے رسُولوں پر ایمان لائے ہیں، ایک دُوسرے پر سبقت کرو۔"

(سابقوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها کعرض السمآء والارض اُعدت للذین اٰمنوا باللہ

ورسلہ)۔ حقیقت میں پروردگار کی طرف سے عطا کی ہوئی مغفرت، کلید جنت ہے۔ وہ جنت جو زمین و آسمان کی وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ابھی سے مؤمنین کی پذیرائی کے لیے آمادہ ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جنت اُدھار ہے اور اُدھار سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ جنت اگرچہ اُدھار فرض کی گئی ہے لیکن وہ ہر نقد سے زیادہ شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس کا وعدہ اس خدا کی طرف سے کیا گیا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ چہ جائیکہ وہ پورے طور پر نقد ہے اور اب بھی موجود ہے۔ ان معانی سے مشابہت رکھتی ہوئی گفتگو سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آئی ہے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں "سابقوا" "مسابقہ" کے مادہ سے اور وہاں "سارعوا" "مسارعہ" کے مادہ سے ہے اور ایسے افراد کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیزی و سُرعت کرنے کے معنی میں آیا ہے جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں (باب مفاعلہ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو دو افراد کے ایک دوسرے پر غلبہ کی کوشش کو مجسّم کرتا ہے)۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں "عرضها السماوات والارض" ہے اور یہاں "كعرض السماء والارض" ہے تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ وہاں فرماتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے" اور یہاں فرماتا ہے: "مومنین کے لیے"۔ چونکہ پرہیزگاری شجرِ ایمان کا ثمر ہے لہٰذا یہ دونوں تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ترجمان ہیں۔ یہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ دونوں آیتیں دو مختلف بیانات کے ساتھ ایک ہی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔ اسی بنا پر، جیسا کہ بعض مفسرین کا نقطۂ نظر ہے کہ اُنھوں نے سورۂ آل عمران کی آیت کو مقربین کی جنت کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور زیرِ بحث آیت میں مؤمنین کی بہشت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، تو یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ یہاں عرض کا لفظ طول کے مقابلہ میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے، اور اس کے بعد وہ ایسی طویل و عریض جنت کی تلاش میں ہیں جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہو اور اس کاوش کی وجہ سے وہ زحمت اُٹھا رہے ہیں۔ ایسے موقع پر عرض کے معنی وسعت کے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں: "پہنۂ دشت" جس کے معنی ہیں وسعتِ صحرا۔ مغفرت کی تعبیر جو جنت کی بشارت سے پہلے دونوں آیات میں آئی ہے وہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جب تک انسان گناہ سے پاک نہ ہو وہ جنت اور جوارِ پروردگار میں ورود کے قابل نہیں ہوگا۔ یہ نکتہ بھی لائقِ توجہ ہے کہ پروردگار کی مغفرت کی طرف سبقت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حصولِ مغفرت کے اسباب کی طرف توجہ کی جائے جیسے توبہ کا راستہ اختیار کرنا، وہ اطاعتیں جو نظر انداز ہو گئی ہیں ان کی تلافی کرنا اور اصولی طور پر اطاعتِ پروردگار گناہوں اور معاصی سے پرہیز ہی کا نام ہے۔ اور اگر بعض احادیث و روایات میں واجبات و مستحبات پر انحصار کیا گیا ہے، مثال کے طور پر جماعت کی صفِ اوّل کی طرف بڑھنا، جہاد کی پہلی صف میں جگہ لینا، امام جماعت کے ساتھ تکبیرۃ الاحرام کہنا، اوّل وقت میں نماز پڑھنا تو یہ مثالوں کے ذکر کے طور پر ہے یا واضح اور روشن مصداق کا بیان ہے اور آیت کے مفہوم کی وسعت میں کمی نہیں کرتا۔ آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے: "یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے" (ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم)۔ یقیناً اس قسم کی وسیع جنت جس میں اتنی عظیم نعمتیں ہوں وہ ایسی چیز نہیں ہوتی جو ناچیز اعمال کے ذریعہ انسان کو حاصل ہو جائے یہ صرف اللہ کا فضل و کرم ہے جو قلیل اعمال کے بدلے اتنا بڑا اجر مقرر کیا گیا ہے اور خدا سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع بھی نہیں کی جا سکتی وہ اس لیے کہ اجر ہمیشہ اعمال کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اجر دینے والے کے کرم کے مطابق ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ ثواب اور جزاءِ عمل کی مزدوری نہیں ہیں بلکہ یہ ایک طرح کا فضل و کرم ہے۔ اس کے بعد دُنیا سے عدم دل بستگی اس کے حصول پر خوش نہ ہونے اور اس کے منہ موڑنے پر غمگین نہ ہونے کے بارے میں تاکید مزید کے لیے فرماتا ہے: "کوئی مصیبت زمین میں واقع نہیں ہوتی مگر یہ کہ وہ تمہاری اور زمین کی خلقت سے پہلے سے کتاب (لوحِ محفوظ) میں ثبت ہے اور یہ امر خدا کے لیے آسان ہے": (ما اصاب من مصيبة فى الارض ولا فى انفسكم الا فى كتاب من قبل ان نبرأها ان ذالك على الله

یلسیں)۱؎

جی ہاں وہ مصیبتیں جو زمین میں پیش آتی ہیں مثلاً زلزلے، طوفان، سیلاب اور انواع و اقسام کے دردناک حوادث جن سے انسان دوچار ہوتا ہے، وہ سب پہلے سے طے شدہ ہیں، اور لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں۔ لیکن توجہ کرنی چاہیئے کہ وہ مصیبتیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، صرف اسی نوعیت کی ہیں جن سے کسی طرح نہیں بچا جا سکتا اور وہ انسانوں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں (بالفاظ دیگر یہاں حصر حصرِ اضافی ہے)۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ ہمیں بتاتی ہے کہ: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفوا عن کثیر ۔ "جو مصیبت بھی تمہیں پہنچے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جنہیں تم انجام دیتے ہو اور بہت سے گناہوں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ آیتیں ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں، جس وقت یہ آیتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو بتاتی ہیں کہ وہ مصیبتیں جو انسان پر نازل ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک تو وہ جو انسان کے اعمال کی سزا ہوتی ہیں یا گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ یہ مصیبتیں بے شمار ہیں، ظلم و ستم، بے انصافیاں، خیانتیں، وعدہ خلافیاں وغیرہ اور نہ معلوم کتنے کام اور ایسی چیزیں جو ہمارے خود کردہ مصائب کا سرچشمہ ہیں۔ لیکن مصائب کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں ہم کسی قسم کا دخل نہیں رکھتے۔ اس حصہ کے مصائب ایک ایسے ناگزیر امر کی صورت میں انسان یا معاشرہ کا مقدر بنتے ہیں جن سے کسی طرح بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ ان دونوں کا حساب الگ الگ ہے اسی لیے بہت سے انبیاء، اولیاء اور صلحاء اس قسم کی مصیبتوں کا شکار ہوتے تھے۔ ان مصائب کا ایک دقیق فلسفہ ہے جس کی طرف ہم خداشناسی اور عدل الٰہی کے مباحث میں اور یہ مسئلہ آفات و بلیات کے ماتحت اشارہ کر چکے ہیں۔

ایک حدیث ہماری نظر سے گزری ہے کہ جس وقت امام زین العابدین علیہ السلام کو یزید کی مجلس میں ایسی حالت میں لے جایا گیا کہ آپ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے تو یزید نے امام کی طرف رُخ کر کے سورۂ شوریٰ کی آیت پڑھی: وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم ۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ خاندانِ رسالتؐ کے مصائب خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح وہ دلِ امامؑ پر زبان کا زخم لگانا چاہتا تھا لیکن امامؑ نے فوراً اس کے کلام کی تردید کی اور فرمایا:

(کلا ما نزلت هذه فینا انما نزلت فینا ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها)

ایسا نہیں ہے یہ آیت ہمارے بارے میں نازل نہیں ہوئی بلکہ ہمارے بارے میں ایک اور آیت نازل ہوئی ہے جو یہ ہے کہ: جو مصیبت بھی تمہارے وجود میں یا زمین پر پڑتی ہے تمہاری خلقت سے پہلے سے لوحِ محفوظ میں ثبت ہے۔ (اور اس کا ایک فلسفہ ہے اور حکمت ہے)۲؎

اس سلسلہ میں تفصیلی بحث ہم سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ کے ذیل جلد ۲۰ میں کر چکے ہیں۳؎

۱؎ یہ کہ "نبرأها" مرجع ضمیر کیا چیز ہے اس میں کئی احتمال ہیں۔ بعض اس کا مرجع زمین اور انفس کو سمجھتے ہیں بعض مصیبت کو اور بعض سب کو لیکن آیت کے لب ولہجے پر توجہ کرتے ہوئے پہلے معنی مناسب ہیں کیونکہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ زمین و آسمان اور تمہاری خلقت سے پہلے ان مصائب کی پیش بینی ہوئی ہے۔

۲؎ تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۴۷۔

۳؎ جلد ۲ ص ۳۸ سے آگے اور سورہ نساء کی آیت ۷۸، ۷۹ کے ذیل میں بھی ایک اور بحث تھی جو زیر بحث آیات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے

مکتب اہل بیتؑ کے شاگردوں نے یہی معانی سمجھے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت "سعید ابن جبیرؓ کو حجاج کے پاس لے گئے اور اس نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تو حاضرین میں سے ایک شخص رونے لگا تو سعیدؒ نے کہا: کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا: اس مصیبت کی بنا پر جو آپ کو پیش آئی ہے تو انہوں نے کہا گریہ نہ کرو یہ علم خدا میں تھا کہ اس طرح ہو۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ خدا فرماتا ہے؛

(ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأها)[1]

البتہ تمام حوادث جو عالم میں رُونما ہوتے ہیں لوحِ محفوظ میں ثبت ہیں اور خدا کے علم بے پایاں میں ہیں۔ اگر یہاں صرف زمین اور نفوسِ انسانی میں رُونما ہونے والے مصائب کی طرف اشارہ ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوعِ سخن یہی تھا جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعد والی آیت میں اس کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے؛ (ان ذالك علی الله یسیر) کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ لوحِ محفوظ میں تمام حالات کا ثبت ہونا حوادث کی کثرت کے باوجود خدا کے لیے دُشوار نہیں ہے اور لوحِ محفوظ سے مُراد خدا کا لامحدود علم ہے یا صفحۂ جہانِ خلقت ہے یا پھر نظامِ علّت و معلول جو خدا کے علمِ فعلی کا مصداق ہے (غور فرمائیے) ہمیں دیکھنا ہے کہ لوحِ محفوظ میں ان مصائب کی تقدیر اور پھر قرآن میں اس حقیقت کا بیان دراصل کیا چیز ہے۔ بعد والی آیت اس اہم راز کے چہرے سے پردہ اُٹھاتی ہے اور کہتی ہے: "یہ اس بنا پر ہے کہ جو کچھ تم نے گنوایا ہے اس پر غمگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس پر خوش نہ ہونا"۔ (لکیلا تأسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما أتاکم) یہ دو جملے حقیقت میں فلسفۂ آفرینش کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو حل کرتے ہیں اس لیے کہ انسان عالمِ ہستی میں ہمیشہ مشکلات اور حوادث سے دوچار رہتا ہے اور اکثر اوقات اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ، اس کے باوجود کہ خدا مہربان و کریم ہے، یہ دردناک حوادث کس وجہ سے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تم اس جہان سے خوش اور اس چمک دمک کے اسیر نہ بن جانا، اس گزرگاہ اور اس پُل کی حیثیت کو جس کا نام دُنیا ہے اور اپنی حیثیت کو فراموش نہ کر دینا اور اس کے والا و شیدا نہ بن جانا اور اس کو ابدی اور جاودانی نہ سمجھنا کیونکہ یہ حد سے زیادہ وابستگی تمہاری سعادت کی بہت بڑی دشمن ہے۔ وہ تمہیں یادِ خدا سے غافل کرتی ہے اور ترقی کے راستے سے منحرف کرتی ہے۔ یہ مصیبتیں غافلوں کے لیے "ہوشیار رہو" کی آوازیں اور سوئی ہوئی ارواح کے لیے اس جہان کی ناپائیداری کی ایک رمز ہیں، اور اس زندگی کے مختصر ہونے کی طرف ایک اشارہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دار الغرور کے فریب دینے والے مظاہر انسان کو بہت جلد اپنی طرف کھینچ کر یادِ خدا سے غافل کر دیتے ہیں۔ جب وہ اچانک باخبر ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قافلہ چلا گیا اور وہ محوِ خواب ہے جب کہ سامنے ایک وسیع بیاباں ہے یہ حوادث جو ہمیشہ زندگی میں تھے اور ہمیشہ رہیں گے یہاں تک کہ علم و دانش کی عظیم ترقی بھی زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں، بیماریوں اور اس قسم کے دردناک حوادث سے پناہ نہیں دلا سکتے اور نہیں دلا سکیں گے۔ یہ زمانہ کی بے مہری کے بارے میں ایک درس ہے جو انسان کو پُکار پُکار کر بتاتا ہے۔

؎ این دشت خواب گاہ شہیدان است — فرصت شمار وقت تماشا را

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان اس دنیا میں خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دے یا ان سے فائدہ نہ اُٹھائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا قیدی نہ بن جائے اور ان کو مقصدِ حیات نہ بنا لے اور محض اسی کو اپنی زندگی کا حصّہ شمار نہ کرے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جو کچھ انسان گنوا دے اُسے (فاتکم) (جو کچھ تم سے فوت ہو جائے) سے تعبیر کر رہا ہے لیکن ہاتھ آنے والی نعمتوں کو اپنی طرف

[1] رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۷۵۔

نسبت دیتا ہے۔ (بما اٰتاکم) کیونکہ فنا ہونا خود اشیا کی ذات میں پوشیدہ ہے اور وجود کا سرچشمہ وجودِ خداوندی ہے۔ جی ہاں یہ مصیبتیں ہیں جو غرور کو شکستہ کرتی ہیں اسی لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "خدا کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا" (واللّٰہ لا یحب کل مختال فخور)۔ "مختال" خیال کے مادہ سے لیا گیا ہے اور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ تکبر فضیلت کے خیال اور دوسروں کے مقابلہ میں برتری کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ "فخور" مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا مادہ فخر ہے۔ فخور کے معنی ہیں وہ شخص جو دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ فخر کرے۔ ان حالات کا صرف وہی شخص شکار ہوتا ہے جو ناز و نعمت میں کھو جائے۔ لیکن مصیبتیں اور آفتیں ان لوگوں کو مدہوشی سے محفوظ رکھتی ہیں جو بیداری کی حالت میں ہوں اور ہدایت پانے کے قابل ہوں۔

صاحب ایمان افراد، مذکورہ بالا اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جس وقت خدا کی جانب سے کوئی نعمت پائیں تو وہ خود کو اس نعمت کا امانت دار سمجھتے ہیں۔ وہ نہ اس کے چلے جانے سے غمگین ہوتے ہیں نہ اس کی موجودگی سے مغرور ہوتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو بیتُ المال کے نگراں اور جواب دہ فرد کی حیثیت دیتے ہیں جو ایک دن بہت زیادہ مال حاصل کرتے ہیں اور دوسرے دن ہزاروں کی تعداد میں واپس دے دیتے ہیں۔ انہیں نہ اس مال کے حاصل ہونے سے خوشی ہوتی ہے نہ اس کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اس آیت کے بارے میں کتنی عمدہ تعبیر پیش کرتے ہیں:

(الزھد کلہ بین کلمتین من القراٰن قال اللّٰہ تعالیٰ لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم ومن لم یأس علی الماضی ولم یفرح بالاٰتی فقد اخذ الزھد بطرفیہ)۔

سارا زہد قرآن کے دو جملوں کے درمیان میں ہے جہاں خداوند متعال فرماتا ہے: "یہ اس لیے ہے کہ جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس کے لیے غمگین نہ ہونا اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے اس پر غرور نہ کرنا"۔ لہٰذا جو شخص گزشتہ پر تاسف نہ کرے اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہو اس پر مغرور نہ ہو تو اس نے زہد کو دونوں طرف سے قبضہ میں کر رکھا ہے۔[1]

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا کہ ناکامیاں انسان کی زندگی کے ساتھ ابتدا سے رکھی گئی ہیں اور سنّتِ حکیمانہ کے مطابق مقرر ہوئی ہیں اور دنیا ہمیشہ نشیب و فراز رکھتی ہے۔ انسان کو مصیبتوں کی برداشت کے ضمن میں بہادر اور حوادث کے مقابلہ میں صابر اور ثابت قدم بنا دیتا ہے وہ انسان کو سکونِ قلب عطا کرتا ہے اور بے تابیوں اور رونے دھونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف ان مصائب کے بارے میں ہے جن سے بچنا ممکن نہیں ہے ورنہ وہ مصیبتیں اور ناکامیاں جو خود انسان کے گناہوں اور اس کی سہل انگاری کا نتیجہ ہوتی ہیں وہ اس بحث سے خارج ہیں۔ زندگی کے نظام الاوقات میں ان سے مقابلہ کرنا ایک صحیح راہِ عمل ہے اس بحث کو ہم ایک سرگزشت پر ختم کرتے ہیں جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے۔ قتیبہ بن سعید[2] کہتا ہے میں ایک عرب قبیلہ میں گیا جو صحرا میں تھا وہ صحرا اونٹوں سے پُر تھا جو سب مر چکے تھے اور لاتعداد تھے۔ وہاں ایک بُڑھیا عورت تھی میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اونٹ کس کے تھے۔ اس نے کہا اس بڑھے شخص کے تھے جو ٹیلے پر تو دیکھ رہا ہے کہ اون بُن رہا ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ سب اونٹ تیرے تھے۔

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۴۳۹۔

[2] "قتیبہ بن سعید" ایک محدث ہے جو مالکؒ ابن انس سے روایت کرتا ہے (منتہی الادب)

اُس نے کہا کہ میرے نام سے تھے۔ مَیں نے کہا کہ کیا وجہ ہوئی جوان کا یہ حال ہوا۔ اس نے جواب میں (بغیر ان کے کہ ان کی موت کا سبب بیان کرے) کہا کہ جس نے دیے تھے اس نے واپس لے لیے۔ مَیں نے کہا تجھے کوئی پریشانی نہیں ہے اور تُو نے اس سلسلہ میں کیا کیا ہے۔ اس نے کہا مَیں نے یہ دو شعر کہے ہیں:

لا والّذی انا عبد من خلائقه والمرء فی الدھر نصب الرزء والمحن

ما سرنی ان ابلی فی مبارکها وما جری من قضاء الله لم یکن

قسم ہے اُس کی جس کی مخلوق میں سے میں بھی ایک بندہ ہوں کہ انسان دنیا میں محنتوں اور مصیبتوں کا ہدف ہے۔ میرے اُونٹ اگر اپنے بیٹھنے اور سونے کی جگہ پر ہوتے ہیں اور یہ قضائے الٰہی جو آئی ہے نہ آتی تو میں خوش نہ ہوتا۔ (میں تو صرف اس کی رضا پر راضی ہوں اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی کو پسند کرتا ہوں)[1]

آخری زیر بحث آیت اس چیز کی توضیح و تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے۔ وہ حقیقت میں مختال فخور کا تعارف کراتی ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: "وہ ایسے افراد ہیں جو بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بُخل کی دعوت دیتے ہیں۔" (الّذین یبخلون و یأمرون النّاس بالبخل)[2]

جی ہاں دنیا کی نعمتوں سے بہت زیادہ دل لگانے کا نتیجہ تکبر و غرور ہے اور تکبر و غرور کا لازمہ بُخل کرنا اور دُوسروں کو بُخل کی دعوت دینا ہے بُخل کرنا تو اس بنا پر ہے کہ وہ ان اموال ہی کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتے ہیں جو انہیں حاصل ہے اور کبھی نہیں چاہتے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے دوسروں کو بُخل کی دعوت دینا اس بنا پر ہے کہ اگر کوئی دُوسرا سخاوت کرے گا تو یہ ذلیل ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ بُخل کو دوست رکھتے ہیں لہٰذا ایسی چیز کے مبلغ ہیں جسے دوست رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر کہ کہیں یہ تصور نہ پیدا ہو جائے کہ خدا کا انفاق کے مسئلہ پر اصرار کرنا اور بُخل کو ترک کرنے کی تاکید کرنا حتیٰ کہ بندوں سے قرض لینے کی بات کرنا، جیسا کہ گزشتہ آیات میں آیا ہے، اس کی کسی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے ہے لہٰذا آخر میں فرماتا ہے: "جو شخص اس حکم سے منہ پھیرے تو وہ خُدا کو نقصان نہیں پہنچاتا اس لیے کہ خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے۔" (ومن یتول فان الله هو الغنی الحمید) سب اس کے محتاج و نیازمند ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے وہ سب سے بے نیاز ہے کیونکہ تمام چیزوں کے خزانے اور منابع اس کے قبضہ میں ہیں اور چونکہ وہ تمام صفات کمال کا جامع ہے اس لیے ہر حمد و ستائش کے قابل ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا آیت میں لفظ بخل صرف انفاق مال میں بُخل کرنے سے تعلق رکھتا ہے پھر بھی اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جو علم میں بُخل کرنے اور حقوق وغیرہ کی ادائیگی میں بُخل کرنے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

---

1. تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۵۳۔ انہی معانی کی مثال تفسیر رُوح البیان جلد ۹ ص ۳۶۷ پر نقل کی گئی ہے۔

2. (الّذین ...) بدل ہے کل مختال فخور (تفسیر کشاف در ذیل آیات زیر بحث) ضمناً توجہ کرنی چاہیے کہ بدل اور مبدل منہ میں معرفہ اور نکرہ ہونے کا تطابق شرط نہیں ہے۔

۲۵۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

ترجمہ

۲۵۔ ہم نے اپنے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی کتاب (آسمانی)
(اور حق اور عادلانہ قوانین کی شناسائی کی) میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ
قیام کریں۔ اور ہم نے لوہے کو نازل کیا جس ہیں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے
منافع ہیں تاکہ خدا جان لے کہ کون شخص اس کی اور اس کے رسُولوں کی مدد کرتا ہے
بغیر اس کے کہ وہ اسے دیکھیں۔ خُدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے۔

تفسیر

بعثتِ انبیاء کا مقصدِ اعلیٰ

چونکہ پروردگار کی رحمت، مغفرت اور بہشت کی طرف سبقت کرنا (جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے) رہبرانِ الٰہی کی رہبری کا محتاج ہے لہٰذا زیرِ بحث آیت میں، جو قرآن کی زیادہ مفہوم رکھنے والی آیتوں میں سے ایک آیت ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور انبیا کے بھیجنے کا مقصد اور ان کے دستور العمل کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"ہم نے اپنے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے": (لقد ارسلنا رسلنا بالبینات)۔ اور ہم نے ان کے ساتھ آسمانی کتاب اور میزان کو نازل کیا": (وانزلنا معهم الكتاب والميزان)۔ تاکہ لوگ عدل وانصاف کے ساتھ قیام کریں": (ليقوم الناس بالقسط)۔ " بینات " (واضح دلائل) اس کے معنی وسیع ہیں جن میں معجزات اور عقلی دلائل دونوں شامل ہیں اور جن کی صلاحیت خدا کے رسولؐ اپنی ذات میں رکھتے تھے۔ "کتاب" سے مُراد وہی کُتبِ آسمانی ہیں اور چونکہ سب کی رُوح اور حقیقت ایک ہے لہٰذا لفظ کتاب مفرد آیا ہے، اگرچہ زمانے کے گزرنے اور انسانوں کے علمی ارتقاء سے اس کا مفہوم زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ باقی رہی میزان تو وہ وزن کرنے اور ناپ تول کے آلے اور ذریعہ کے معنی میں ہے۔ اس کا مادّی مصداق وہی ترازو ہے جس کے ذریعے چیزوں کے وزن کی ناپ تول ہوتی ہے۔ لیکن مسلّمہ طور پر یہاں اس کا مصداق اس کی معنوی حقیقت ہے یعنی ایسی چیز جس سے تمام انسانوں کے اعمال کی ناپ تول کی جا سکتی ہے اور وہ کُلی طور پر خُدائی احکام وقوانین ہیں یا اس کا آئین و دستور ہے اور جو نیکیوں بُرائیوں، قدروں، قیمتوں اور ان کی ضد کو جانچنے کا معیار ہے۔ اس اعتبار سے انبیاء تین چیزیں اپنے ساتھ رکھتے تھے، واضح دلائل، کُتبِ آسمانی اور حق و باطل کی ناپ تول کا معیار اور اس چیز میں کوئی مانع نہیں ہے کہ قرآن مجید "مبینہ" (معجزہ) بھی ہو۔ آسمانی کتاب بھی اور احکام و قوانین کو بیان کرنے والا بھی۔ یعنی ایک ہی چیز میں تینوں پہلو موجود ہوں۔ بہرحال ان عظیم افراد (انبیاءؑ) کو پورے ساز و سامان کے ساتھ بھیجنے کا مقصد قسط و عدل کا اجرا ہے۔ دراصل یہ آیت رسُولوں کے بھیجنے کے متعدد مقاصد میں سے ایک مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ انبیاء و مرسلین متعدد مقاصد کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کے آنے کا ایک مقصد لوگوں کی تعلیم و تربیت تھا جیسا کہ سُورہ جمعہ کی آیت ۲ میں آیا ہے۔ (هوالذی بعث فی الامیین رسولا منهم يتلوا عليهم اٰياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة) وہی ہے جس نے مکّہ والوں میں سے ایک فرد کو رسول بنا کر بھیجا تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ انسان کی غلامی کی زنجیریں توڑ دے جیسا کہ سُورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں درج ہے: (ويضع عنهم اصرهم والاغلال التی كانت عليهم) پیغمبرِ اسلامؐ ان کے کاندھوں پر سے بہت بھاری بوجھ ہٹاتا ہے اور وہ زنجیریں جو ان کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں ہیں ان کو توڑ دیتا ہے۔ تیسرا مقصد اخلاقی اقدار کی تکمیل ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے:

(بعثت لاتمم مكارم الاخلاق)

مَیں اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں[1]

آخری ایک مقصد اور ہے اور وہ ہے " اقامہ قسط " جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اس طرح بعثت انبیاء کے مقاصد کا سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی تعلیم و تربیت کے عنوان کے ماتحت خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل آشکار ہے کہ زیر بحث آیت میں تنزیل کتب کے قرینے کے پیش نظر رسولوں سے مراد اُولوالعزم پیغمبر ہیں یا وہ پیغمبر ہیں جو ان کے مانند ہیں۔

ایک دُوسرا نکتہ " ليقوم الناس بالقسط " کے جملہ میں یہ ہے کہ لوگوں کی ترغیب کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا: "مقصد یہ تھا کہ انبیاءؑ انسانوں میں قیام عدل کی تحریک پیدا کریں، بلکہ فرماتا ہے کہ: " لوگ انصاف کو بروئے کار لائیں"۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۱۶ ص ۲۷۳ باب حسن الخلق در ذیل حدیث اوّل۔

جی ہاں اہم بات یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود عدالت و انصاف کو جاری کرنے والے بن جائیں اور اس راہ کو اپنے قدموں سے طے کریں۔ لیکن چونکہ ایک انسانی معاشرہ میں بہرحال جس قدر بھی اخلاق، اعتقاد اور تقویٰ کی سطح بلند ہو گی اس میں پھر بھی ایسے افراد پیدا ہوں گے جو طغیان و سرکشی کے لیے آمادہ ہوں اور قیام عدل کی راہ میں روڑے اٹکائیں اس لیے اس آیت کو برقرار رکھنے اور دوام بخشنے کے لیے فرماتا ہے: "ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں شدید قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں"۔ (وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس)۔ جی ہاں انبیائے خدا کی تمین قوتیں اجرائے عدالت کے لیے اپنے اصلی مقصد کو اس وقت حاصل کر سکتی ہیں جب وہ لوہے جیسی طاقت اور شدید قوت سے بہرہ ور ہوں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ تصور کیا ہے کہ انزلنا کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ لوہا زمین پر دوسرے کرّوں سے آیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ انزال کی تعبیر اس قسم کے مواقع پر ایسی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو بلند مقام کی جانب سے پست مقامات کو دی جائیں۔ چونکہ ہر چیز کے خزائن خدا کے پاس ہیں اور وہی ہے جس نے لوہے کو اس کی گوناں گوں منفعتوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے لفظ انزال آیا ہے۔ اسی بنا پر ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا:

(انزاله ذالك خلقه اياه)

لوہے کو نازل کرنے سے مراد اس کو پیدا کرنا ہے۔[1]

جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۶ میں چوپاؤں کے بارے میں ہمیں ملتا ہے:

(وانزل لكم من الانعام ثمانية ازواج)

"اور تمہارے چوپاؤں کے آٹھ جوڑے نازل کیے ہیں"۔

بعض مفسرین نے انزلنا کو "نزل" (بروزن شتر) کے مادہ سے ایسی چیز کے معنی میں لیا ہے جسے مہمان کی تواضع کے لیے تیار کرتے ہیں لیکن ظاہر وہی پہلے معنی ہیں۔ "بأس" لغت میں شدت قدرت کے معنی میں ہے اور جنگ کو بھی باس کہا جاتا ہے اس لیے بعض مفسرین نے جنگی وسائل کے معنی میں لیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ دفاعی ہوں یا جنگجویانہ۔

ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: (یعنی السلاح وغیر ذالك) مراد اسلحہ وغیرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بیان مصداق ہی کی قبیل میں سے ہے۔ "منافع" سے مراد ہر قسم کا نفع ہے جو انسان لوہے سے حاصل کرتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہے کی اہمیت انسانی زندگی میں اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے انکشاف سے تاریخ بشر میں ایک نیا دور شروع ہو گیا جو لوہے کے دور کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس کے انکشاف سے انسانی زندگی کا چہرہ تمام روئے زمین پر دوسری سمتوں میں پھیل گیا ہے۔ یہ صورت حال مذکورہ آیت میں منافع کی وسعت کو بیان کرتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی مختلف آیات میں انہی معانی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک مقام پر فرماتا ہے:

"جس وقت ذوالقرنین نے اپنی مشہور دیوار کے بنانے کا پکا ارادہ کیا تو کہا: (أتونی زبر الحدید) "میرے لیے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لے آؤ" (کہف ۹۶) اور جس وقت خدا نے داؤد پر اپنا کرم کیا تو لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا تاکہ وہ اس سے زرہ بنائے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵۰ (حدیث ۱۰۰ و ۱۰۱)۔

اور جنگ کے خطروں اور دشمنوں کے حملوں میں کمی واقع ہو سکے۔ (والنا له الحديد ان اعمل سابغات) (سبا ۱۰، ۱۱)۔ اس کے بعد ارسال رسل، نزول کتب آسمانی اور لوہے جیسے وسائل کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ خدا جان لے کہ کون لوگ اس کی اور اس کے رسولوں کی اس کے غیب میں مدد کرتے ہیں": (وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب)۔ یہاں خدا کے علم سے مراد اس کے علم کی تحقیق عینی ہے یعنی یہ بات واضح ہو جائے کہ کون لوگ خدا کی اور اس کے مکتب فکر کی مدد کے لیے آمادہ ہوتے ہیں اور قیام بالقسط کرتے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو اس عظیم ذمہ داری سے رُوگردانی کرتے ہیں۔ حقیقت میں اس آیت کا مفہوم اُس کے مشابہ ہے جو سُورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۹ میں آیا ہے: (ما كان الله ليذر المؤمنين على ما انتم عليه حتّى يميز الخبيث من الطيب) "ممکن نہیں تھا کہ خدا مؤمنین کو اس شکل میں جس میں تم ہو چھوڑ دے مگر یہ کہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے"۔ تو اس طرح انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ اور مختلف صفوں کو الگ کرنا اور ان کا تصفیہ کرنا اس دستور العمل کا ایک عظیم مقصد تھا۔ خدا کی مدد کرنے کی جو تعبیر ہے وہ مسلم طور پر اس کے دین و آئین اور اس کے نمائندوں کی مدد کرنے اور دینِ حق اور عدل و انصاف کو پھیلانے کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ خدا کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ سب اس کے نیازمند ہیں۔ اس لیے ان معانی کو ثابت کرنے کے لیے آیت کو اس جملے پر ختم کرتا ہے کہ "خدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے": (ان الله قوى عزيز)۔ اُس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایک ہی اشارے سے سارے جہان کو زیر و زبر کر لے اور اپنے تمام دشمنوں کو ختم کر دے اور اپنے اولیاء کو کامیابی عطا کرے لیکن وہ مقصدِ اصلی جسے انسان کی تربیت اور اس کا ارتقا کہا جا سکتا ہے اس طرح حاصل نہیں ہوتا اس لیے وہ انسان کو دینِ حق کی مدد کے لیے دعوتِ عمل دیتا ہے۔

چند نکات

۱۔ منطق اور زبردستی کی قلمرو

مندرجہ بالا آیت گویا تعلیم و تربیت، انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف کی وسعت اور اس کے اجراء کے سلسلہ میں اسلام کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اسلام سب سے پہلے بیّنات، واضح دلائل، کُتبِ آسمانی اور اس کی قدر و قیمت کے ناپ تول کے معیار اور احکام و قوانین کے بیان سے مدد لیتا ہے۔ اس طرح فکری و معاشرتی انقلاب کی بُنیاد رکھتا ہے اور عقل و منطق سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں اثرانداز نہ ہوں اور معاملہ مشکل ہو جائے یعنی طاقت ور اور سرکش افراد پیدا ہو جائیں جو نہ بیّنات کے سامنے جُھکتے ہیں اور نہ کتاب و میزان کے لیے کسی قدر و قیمت کے قائل ہیں، تو پھر نوبت حدید تک پہنچ جاتی ہے جس میں باس شدید ہے۔ پھر ہتھیاروں سے سرکشوں کے دماغ کو کُچلا جاتا ہے تاکہ وہ عدل و انصاف کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس مرحلہ پر ایماندار افراد سے مدد لی جاتی ہے اور یہ جو ایک حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(بعثت بالسيف بين يدى الساعة حتى يعبد الله وحده لا شريك له وجعل رزقى تحت ظل رمحى)

"میں قیامت کی قیام گاہ پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں تاکہ لوگ خدائے یگانہ کی عبادت کریں اور میری روزی میرے نیزے کے سائے میں ہے"۔[۱]

حاشیہ اگلے صفحے پر

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میں مامور ہوں کہ اس سرکش گروہ کے مقابلہ میں تلوار اُٹھاؤں۔ اپنے کام کی بنیادی ضرورت کے طور پر نہیں بلکہ اس طرح جس طرح مذکورہ بالا آیت میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

(الخیر کلہ فی السیف و تحت السیف و فی ظل السیف)

"تمام خوبیاں تلوار میں، تلوار کے نیچے اور تلوار کے سائے میں ہیں"۔ [1]

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ :

(ان اللہ عزّوجل فرض الجہاد وعظمہ وجعلہ نصرہ و ناصرہ واللہ ماصلحت دنیا ولا دین الا بہ)

"خدا نے جہاد کو واجب کیا ہے، اس کو بڑا شمار کیا ہے اور اس کو مددگار قرار دیا ہے۔ خدا کی قسم دین و دُنیا میں کسی چیز کی بھی اصلاح جہاد کے بغیر ممکن نہیں"۔ [2]

اس بات کو ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا :

(لایقیم الناس الا السیف والسیوف مقالید الجنۃ والنار)

لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کر سکتی اور تلواریں دوزخ و جنت کی چابیاں ہیں"۔ [3]

اسی وجہ سے خدا کے مقرر کردہ رہبروں کے ایک ہاتھ میں کتاب آسمانی ہوتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو پہلے دلیل و منطق سے حق و انصاف کی طرف بلاتے ہیں لیکن جب طاقتور اور شہ زور افراد منطق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تو پھر ان کے خلاف تلوار استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ زندگی کی عُمدہ ضرورتیں لوہے سے تعلق رکھتی ہیں

بعض مفسرین مندرجہ بالا آیت کا ایک تجزیہ پیش کرتے ہیں جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ انسان کی زندگی کے چار اصول ہیں :

۱۔ زراعت ، ۲۔ صنعت ، ۳۔ سکن ، ۴۔ حکومت

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان غذا ، لباس اور مکان کا محتاج ہے اور چونکہ وہ ایک اجتماعی و معاشرتی وجود ہے لہٰذا وہ تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بالفاظِ دیگر اجتماع کے مسائل اجتماع ہی سے حل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہر اجتماع میں مفادات کا تصادم ضرور ہوتا ہے اس لیے اس کے سدِّباب کے لیے ایک حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو اس معاشرہ میں انصاف قائم کر سکے۔ حیران کن بات یہ

گزشتہ صفحہ کا حاشیہ [1]

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۷ ص ۱۸۳

حاشیہ صفحہ ہذا

[1] [2] فروع کافی جلد ۵ ص ۸ (حدیث ۱۰، ۱۱)

[3] فروع کافی جلد ۵ ص ۲ حدیث ۱

ہے کہ یہ چاروں "حدید" یعنی لوہے کی احتیاج رکھتے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ نہ ہوتا تو انسان کی زندگی بہت مشکل ہوجاتی۔ پھر یہ کہ چونکہ انسان کو لوہے کی بہت زیادہ ضرورت ہے لہٰذا خُدا نے اسے بہت زیادہ اور آسانی سے حاصل ہونے والا بنایا ہے۔ (یہ ٹھیک ہے کہ دُوسری دھاتیں بھی انسانی زندگی میں دخل رکھتی ہیں لیکن زیادہ ضرورت لوہے کی ہے)۔ یہاں سے (فیہ بأس شدید و منافع للناس) کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

۲۶۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا
النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ
مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

۲۷۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا
مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ
اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶۔ ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی ذُرّیت میں نبوّت و کتاب قرار دی۔ بعض ان میں سے ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

۲۷۔ پھر ان کے بعد ہم نے دُوسرے رسُول بھیجے۔ ان کے بعد ہم نے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کو مبعوث کیا اور انہیں انجیل عطا کی۔ ان لوگوں کے دل میں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہم نے

رحمت و رافت پہنچائی اور جس رہبانیت کا انہوں نے اختراع کیا تھا وہ ہم نے ان پر عائد نہیں کی تھی۔ اگرچہ خوشنودیٔ خدا ان کا مقصد تھا لیکن اس کے حق کی اُنہوں نے رعایت نہیں کی۔ اس لیے ہم نے ان میں سے جو ایمان لے آئے ان کو اُجر دیا اور ان میں کثرت فاسقوں کی ہے۔

تفسیر

ہم نے یکے بعد دیگرے انبیاء بھیجے

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کے اصولِ کلی کے ایک سلسلہ کو بیان کرنے کے بعد گزشتہ قوموں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ اس بیان کے سلسلہ میں شاہد کا کام دیں۔ اس مقصد کے لیے یہاں بھی گزشتہ مسائل کے بعد ارسال رسل، بینات و کتاب و میزان کے ذکر اور مغفرت و سعادتِ جاودانی تک پہنچنے کے لیے ایک دُوسرے کے مقابلہ میں سبقت کرنے کے تذکرے کے ساتھ گزشتہ اقوام اور پیغمبروں کے نام لیتا ہے اور اسلام کے اصول کلی کو اُن کی زندگی میں ثابت کرتا ہے۔

سب سے پہلے سلسلہ گفتگو نوحؑ و ابراہیمؑ سے شروع کرتا ہے جو شیخ الانبیا ہیں اور نمایاں رسُولانِ حق میں سے ہیں اور فرماتا ہے:

"ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان دونوں کی ذریّت میں نبوت و کتاب آسمانی قرار دی" (ولقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتاب)۔ لیکن ان لوگوں نے ان عظیم نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ایک گروہ ان کی تعلیم پر ایمان لایا اور ان میں سے اکثریت گنہگاروں اور بے ایمان لوگوں کی ہے: (فمنھم مھتد وکثیر منھم فاسقون)۔

جی ہاں وہ نبوت جس کے ساتھ شریعت اور آئین بھی تھے حضرت نوحؑ سے شروع ہوئی اور ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے، جو دُوسرے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس شریعت کو دوام بخشا اور یہی ان کی ذریّت میں برقرار رکھی گئی۔ لیکن ہمیشہ اس نورِ ہدایت سے اقلیت ہی نے فائدہ اُٹھایا جب کہ اکثریت نے راہ خطا طے کی۔ اس کے بعد اجمالی طور پر دُوسرے پیغمبروں کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے کے آخری نبی یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حوالے سے فرماتا ہے: (ثم قفینا علٰی اٰثارھم برسلنا)۔ جو یکے بعد دیگرے آئے اور اُنہوں نے لوگوں کے راستے میں ہدایت کے چراغ روشن کیے یہاں تک کہ عیسٰی علیہ السلام تشریف لائے۔ "ہم اس کے بعد عیسٰی ابنِ مریمؑ کو لے آئے"۔ (وقفینا بعیسی ابن مریم)۔ "قفینا" "قفا" کے مادہ سے جس کے معنی پُشت کے ہیں۔ قافیہ کو اسی لیے قافیہ کہتے ہیں کہ شعر کے آخری حصّے ایک دوسرے کے مشابہ اور عقب میں قرار پاتے ہیں۔ مذکورہ بالا جُملے سے مُراد یہ ہے کہ انبیاء و مُرسلین نے یکساں طریقہ پر ہم آہنگ مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر یکے بعد دیگرے عرصہ وجود میں قدم

رکھا ہے اور ایک دوسرے کی تعلیمات کی تائید و تکمیل کی ہے۔ یہ تعبیر درحقیقت "توحید نبوت" کی طرف ایک بہت ہی خوبصورت اشارہ ہے۔ اس کے بعد حضرت مسیح کی کتاب آسمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"ہم نے اسے انجیل عطا کی" (واٰتیناہ الانجیل) اس کے بعد ان کے پیروکاروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس کی پیروی کی رحمت و رافت قرار دی"۔ (وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ و رحمۃ)۔ بعض مفسرین نے رحمت و رافت دونوں کے ایک ہی معنی تجویز کیے ہیں لیکن مفسرین کا ایک گروہ ان دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہے۔ رافت رفع مضرات کی محبت کے لیے ہے اور رحمت حصول منافع کی محبت کے معنوں میں ہے اسی لیے رافت کا ذکر عام طور پر رحمت سے پہلے ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زناکاروں کی سزا والی آیت میں فرماتا ہے: ولا تأخذکم بھما رأفۃ فی دین اللّٰہ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم خدا کی مقرر کی ہوئی حد کے جاری کرنے کے سلسلہ میں رافت و محبت کا شکار ہو جاؤ اور خدا کے حکم کو فراموش کردو"۔ (نور۔ ۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکاروں کی رحمت و رافت کا مسئلہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی طرف صرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہو بلکہ سورہ مائدہ کی آیت ۸۲ میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰرٰی ذالک بان منھم قسیسین و رھبانًا و انھم لایستکبرون "تو مومنین کے قریب ترین دوست (غیر مسلموں میں سے) ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں تارک الدنیا اور صاحب علم افراد ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے۔ اگرچہ یہ آیت زیادہ تر حبشہ کے عیسائیوں اور نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ان سے خلوص محبت روا رکھا تھا، لیکن کلی طور پر سچے عیسائیوں کی رافت و محبت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے مراد وہ خونخوار بھیڑیے اور آدم نما دیو نہیں ہیں جو ہمارے زمانے میں اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں اور ساری دنیا میں غارت گری کرتے ہیں اور لوگوں کو خون میں نہلاتے ہیں۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ان کے دلوں کو ہم نے رہبانیت کی طرف لگا دیا ہے جو خود ان کی اختراع ہے اور اسے ہم نے ان کے لیے مقرر نہیں کیا تھا، ان کا مقصد تھا کہ خوشنودی خدا حاصل کریں لیکن انہوں نے حق کی رعایت نہیں کی لہٰذا ہم نے ان میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اجر عطا کیا لیکن ان میں سے بہت سے فاسق و گنہگار ہیں"۔ (و رھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللّٰہ فما رعوھا حق رعایتھا فاٰتینا الذین اٰمنوا منھم اجرھم و کثیر منھم فاسقون)[1]۔

تو اس طرح انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسیح کے آئین توحید کی رعایت نہیں کی بلکہ اس رہبانیت کے حق کی بھی رعایت نہیں کی جو خود ان کی اپنی اختراع تھی اور زہد و رہبانیت کے نام پر انہوں نے مخلوق خدا کے راستے میں جال بچھائے ہیں اور گرجاؤں کو مختلف قسم کے فسادات کا مرکز

---

[1] اس آیت کی ترکیب اور معنی میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے اسے رأفت و رحمت پر عطف سمجھا ہے اور لفظ "حب" رہبانیت سے پہلے مقدر سمجھا ہے کیونکہ رہبانیت کوئی ایسی چیز نہیں جو دل میں ہو بلکہ اس کی محبت کا تعلق دل سے ہے اور ایک جماعت نے اسے فعل مقدر سے منصوب سمجھا ہے جس کا مفسر ابتدعوھا ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے "ابتدعوا رھبانیۃ ابتدعوھا"۔ (الا ابتغاء رضوان اللّٰہ) میں بھی دو نظریے ہیں پہلا یہ کہ استثنائے منقطع ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے: (ولکنھم ابتدعوھا ابتغاء رضوان اللّٰہ) دوسرا یہ کہ استثنائے متصل ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے رہبانیت کی ایک قسم ان پر مقرر کی تھی جس کا مقصد رضائے الٰہی کو حاصل کرنا تھا لیکن انہوں نے رہبانیت کی ایک دوسری نوع ایجاد کرلی جو حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف تھی یوں نظر آتا ہے کہ دونوں موارد میں پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے

بنا دیا ہے اور انہوں نے دین مسیح میں بہت سی خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق رہبانیت دین مسیح کا جزو نہیں تھی بلکہ حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں نے اُن کے بعد اس کی اختراع کی تھی۔ ابتدا میں اس رہبانیت کا ایک معتدل انداز تھا لیکن بعد میں اس میں دین سے بالکل انحراف کی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کی وجہ سے بہت سے مفاسد رُونما ہوئے۔ دُوسری تفسیر کے مطابق دین مسیح میں ایک طرح کا زہد موجود تھا لیکن اس کے پیروکاروں نے جو بدعتیں رہبانیت کے نام پر جاری کیں وہ کچھ اور تھیں جس کا پروردگارِ عالم نے انہیں کبھی مکلف نہیں بنایا تھا۔[1]

پہلی تفسیر مناسب ہی نہیں بلکہ بعض حیثیتوں کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔ بہرکیف مندرجہ بالا آیات سے ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رہبانیت دینِ مسیح میں موجود نہیں تھی ان کے پیروکاروں نے ان کے بعد اسے اپنی طرف سے دین مسیح میں شامل کیا ہے ابتدا میں ایک قسم کے زہد کی طرف جھکاؤ اچھا لگتا تھا۔ مثال کے طور پر بہت سے مراسم اور سنن حسنہ جو ابھی تک لوگوں میں رائج ہیں اور کوئی شخص بھی ان کو شرعی احکام کے ماتحت نہیں سمجھتا لیکن یہ سُنّت اور یہ رسم بعد میں دینِ حق سے انحراف کی شکل اختیار کر گئی حتیٰ کہ آلودۂ گناہ ہو گئی۔ (فما رعوها حق رعايتها) "انہوں نے اس کے حق کی رعایت نہیں کی" اس جملہ کی قرآنی تعبیر اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے حق کو ادا کیا جاتا تو وہ ایک اچھی سُنّت ہوتی اور سُورۂ مائدہ کی آیت ۸۲ کی تعبیر جو رہبانیت اختیار کرنے والوں اور سچے عیسائی علما کو اچھی نظر سے دیکھتی ہے وہ اس مقصد کی شاہد ہے۔ (غور کیجیے) اور اگر رہبانیت رأفت و رحمت پر عطف ہے تو پھر اس مدعا پر ایک اور شاہد پیدا ہو جائے گا کیونکہ وہ پھر رافت و رحمت کا ہم ردیف ہو گا جسے خدا نے ایک پسندیدہ عنوان کے ماتحت ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی سُنّتِ حسنہ لوگوں میں رائج ہو جائے (مثلاً زُہد کا دستور) جس کے اصول کُلی دینِ حق میں موجود ہوں اور لوگ اس سُنّت کو خصوصیت کے ساتھ دین سے منسوب بھی نہ کریں بلکہ اسے اصولِ کُلی کا ایک مصداق سمجھیں اور اس کا حق ادا کریں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ بدبختی وہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب افراط و تفریط کی صورتِ حال پیدا ہو جائے اور اس سُنّتِ حسنہ کو سُنّتِ سیئہ میں تبدیل کر دے۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں ہمارے ہاں مراسم سوگواری اور دین کے پیشواؤں کا یوم ولادت و وفات منانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اور اسی طرح شہیدوں اور مرحوم عزیزوں کی یاد منانا، ان کا یوم ولادت و شہادت منانا یا دسواں اور چالیسواں کرنا یہ اسلام کے اصولِ کُلی کے مطابق ہے اور تعظیم شعائر کے ذیل میں آتا ہے اور دین کے رہبروں اور شہدائے عموم مسلمین کی یاد منانے کا جو معمول ہے اسی سے ماخوذ و مربوط ہے۔ شہدائے کربلا کی عزاداری اور اس قسم کے ایّامِ مصائب کی بُنیاد اسلام کے اصولوں کی رُوحِ کُلی کے مطابق ہے۔ ان مراسم کی جزئیات و تفاصیل کسی مخصوص شرعی حکم کے ماتحت نہیں ہے بلکہ یہ دستورِ اسلامی کی رُوحِ کلی کے مطابق انجام پاتی ہیں تو جب تک ان مراسم میں حدودِ شریعت سے تجاوز نہیں اور گناہ و خرافات سے آلودہ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے تو یقیناً یہ "ابتغاء رضوان الله" کی مصداق ہیں اور سُنّتِ حسنہ کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر معاملہ مختلف ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ رہبانیت "رہبہ" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی خوفِ خدا

---

[1] پہلی تفسیر استثنا کے منقطع ہونے کی صُورت میں ہے اور دُوسری تفسیر اس کے متصل ہونے کے مطابق ہے۔ غور کیجیے یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر رہبانیت کا عطف "رافت و رحمت" پر ہو جیسا کہ ہم نے متن میں منتخب کیا ہے تو پھر دلوں میں اس کے جعل کرنے سے مُراد ان کا اس مسئلہ کی طرف میلان قلبی ہے جب کہ "ما كتبناها" سے مُراد یہ ہے کہ مسئلہ رہبانیت دین مسیح میں ایک حکم الٰہی کی شکل میں نہیں تھا اگرچہ اس سے لگاؤ اور اس کی محبت خدا نے ہی ان کے دل میں ڈالی تھی تو اس بنا پر ابتدعوها کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

کے ہیں۔ شروع میں یہ رہبانیت دُنیا سے بے اعتنائی کا مصداق تھی لیکن بعد میں اس میں بہت سی تحریفیں دخل انداز ہوگئیں۔ اگر اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اس رہبانیت کا شدت سے مخالف ہے تو اس کی اِس حد سے تجاوز کی ہوئی آخری صُورت کی بنا پر ہے چنانچہ نکات کی بحث میں ہم انشاء اللہ اس کی مزید تشریح کریں گے۔

چند نکات

۱۔ اسلام اور رہبانیت

جیسا کہ ہم نے کہا ہے رہبانیت "رہبہ" کے مادہ سے خوف کے معنوں میں ہے اور یہاں مُراد خوف خدا ہے۔ "مفردات" میں "راغب" کے بقول اس سے ایسا خوف مُراد ہے جس میں پرہیز و اضطراب کی آمیزش ہو اور "ترھب" یعنی "تعبد" اور عبادت کرنے کے معنی میں ہے لہذا رہبانیت کے معنی شدید تعبد ہیں۔ مذکورہ بالا آیت کی ہم جس طرح بھی تفسیر کریں اس سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عیسائیوں میں ایک طرح کی رہبانیت موجود تھی اگرچہ دینِ مسیح میں اس طرح کا لازم حکم نہیں دیا گیا تھا لیکن مسیح کے پیروکاروں نے اس رہبانیت کے سلسلہ میں اس کی حدُود سے تجاوز کیا اور وہ اسے دین سے برگشتگی کی طرف لے گئے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی شدت سے مذمت کی اور یہ مشہور حدیث (لا رھبانیۃ فی الاسلام، "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے") بہت سے منابع اسلامی میں نظر آتی ہے۔[۱]

عیسائیوں کی رہبانیت کے سلسلہ میں دُوسری قبیح بدعتوں کے علاوہ ایک بدعت یہ تھی کہ تارک الدنیا مردوں اور عورتوں نے ازدواج کو اپنے اُوپر حرام کر لیا تھا اور دوسری چیز یہ تھی کہ اجتماعی گوشہ نشینی کو جائز سمجھ لیا گیا تھا۔ اس طرح معاشرتی ذمہ داریوں کو ٹھوکر مار کر عبادت کرنے کے ارادہ سے دُور دراز کے گرجاؤں کو منتخب کرنا اور معاشرتی ماحول سے دُور زندگی بسر کرنا دین کا جُزو سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح گرجاؤں اور رہبانیت کے قائل لوگوں کی زندگی کے مرکزوں سے بہت سے مفاسد وابستہ ہو گئے تھے جن کے ایک گوشہ کے بارے میں انشاء اللہ اس مبحث کی تکمیل کے وقت ہم ایک بحث پیش کریں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تارک الدنیا عورتوں اور مردوں (راہبین و راہبات) نے بہت سی مثبت خدمات انجام دی ہیں، مثال کے طور پر ناقابل علاج بیماروں کی تیمارداری کا فرض انجام دینا (جذام اور کوڑھ کے مریض)۔ اور دُور دراز علاقوں میں جا کر وحشی اقوام میں تبلیغ کا فرض انجام دینا اور اسی طرح کے دیگر مطالعاتی اور تحقیقی پروگراموں کو بروئے کار لانا لیکن یہ تمام امور ان پروگراموں سے متعلق مفاسد کے مقابلہ میں بہت کم ہیں اور مفاسد کئی گنا زیادہ ہیں۔

اصولی طور پر انسان ایک ایسا موجود ہے جو معاشرتی طور پر زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اُس کی مادّی و معنوی ترقی بھی اسی میں مضمر ہے کہ وہ تمدنی اور اجتماعی زندگی بسر کرے۔ اسی لیے کسی آسمانی مذہب نے انسان کے بارے میں اس اجتماعی زندگی کے خلاف کوئی راہِ عمل تجویز نہیں کی بلکہ اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا ہے۔ خدا نے انسان میں اس کی حفاظتِ نسل کے لیے غریزہ جنسی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو اس حفاظتِ نسل کی مطلق طور پر نفی کرے وہ یقیناً باطل ہے۔ اسلامی زُہد ایک مختلف چیز ہے۔ اس کے معنی ہیں سادہ طور پر زندگی بسر کرنا، عیش و عشرت کو ترک کرنا اور مال و مقام کے چُنگل میں پھنسنا

---

[۱] مجمع البحرین میں مادہ "رھب" میں یہ حدیث آئی ہے اور نھایہ ابن اثیر میں بھی بیان ہوئی ہے۔

اس زہد کا عیسائیت کی رہبانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رہبانیت کے معنی ہیں معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے فرار اختیار کرنا جب کہ زُہد کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔ مشہور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ عثمان بن مظعون کا بیٹا مرگیا تھا تو وہ بہت غمگین ہوئے یہاں تک کہ اُنہوں نے گھر کو مسجد بنالیا اور عبادت میں مشغول ہوگئے اور باقی تمام کام چھوڑ دیے۔ یہ خبر رسولِ خُدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے عثمان کو بلایا اور فرمایا:

(یا عثمان ان اللہ تبارک و تعالیٰ لم یکتب علینا الرھبانیۃ انما رھبانیۃ
امتی الجھاد فی سبیل اللہ)

"اے عثمان خدا نے میری اُمت کے لیے رہبانیت کو تجویز نہیں کیا ہے۔ میری اُمت
کی رہبانیت تو یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کیا جائے"[1] اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ مادی زندگی سے رُوگرداں ہو جائے تو اس عمل کو منفی شکل میں انجام نہ دے اور اجتماعی گوشہ نشینی کی راہ اختیار نہ کر بلکہ اسے ایک مثبت طریقِ عمل میں تلاش کر اور وہ مثبت طریقِ عمل راہِ خدا میں جہاد ہے۔ اس کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے ایک تفصیلی بحث نماز با جماعت کی فضیلت کے مسئلہ میں بیان کرتے ہیں جو گوشہ نشینی اور رہبانیت کی نفی کی تائید میں ہے۔ ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ کے بھائی علیؑ ابن جعفرؒ نے آپ سے سوال کیا:

الرجل المسلم ھل یصلح ان یسیح فی الارض او یترھب فی بیت لا یخرج منہ؟
قال لا۔

کیا مردِ مسلمان کے لیے مناسب ہے کہ وہ سیاحت کرے یا رہبانیت اختیار کرے
اور اپنے گھر میں بیٹھ رہے اور باہر نہ نکلے تو امام نے فرمایا نہیں[2]

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ سیاحت جس کی اس روایت میں ممانعت ہوئی ہے رہبانیت ہی کی قسم کی ایک چیز ہے یعنی وہ ایک طرح کی سیر کرنے والی رہبانیت ہے اور وہ یُوں ہے کہ بعض افراد بغیر اس کے کہ ان کا کوئی گھر بار یا کاروبار ہو جہاں گردی کی شکل میں سامانِ سفر کے بغیر ہمیشہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف جاتے تھے اور لوگوں سے مدد حاصل کرکے اور گدائی کرکے زندگی بسر کرتے تھے اور اسے ایک قسم کا زہد اور ترکِ دُنیا خیال کرتے تھے لیکن اسلام اس کی ہی نہیں بلکہ "مقیم رہبانیت" کی بھی نفی کرتا ہے۔ جی ہاں تعلیماتِ اسلامی کی نظر میں اہم یہ ہے کہ انسان اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہوئے زہد اختیار کرے نہ یہ کہ معاشرتی زندگی کو خیرباد کہہ کر زاہد بنے۔

۲۔ رہبانیت کا تاریخی سرچشمہ

مسیحیت کی موجودہ تاریخیں بتاتی ہیں کہ وہ رہبانیت جو موجودہ شکل میں ہے یہ مسیحیت کے قرونِ اولیٰ میں موجود نہیں تھی وہ اس

[1] بحارالانوار جلد ۷۰ ص ۱۱۴ (باب نہی از رہبانیت حدیث ۱)

[2] بحارالانوار جلد ۷۰ ص ۱۱۹ حدیث ۱۰

کی ابتدا تیسری صدی میلادی کے بعد امپراطور روم ریسوس کے ظہور اور مسیح کے پیروکاروں سے اس کی شدید لڑائی کے بعد سے بتاتی ہیں۔ عیسائیوں نے اس امپراطور (خونخوار) سے شکست کھانے کے بعد پہاڑوں اور بیابانوں میں پناہ لی تھی۔[1]

اسلامی روایات میں بھی یہی معانی دقیق شکل میں پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہیں کہ ایک دن آنحضرتؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا:

تم جانتے ہو کہ رہبانیت کب پیدا ہوئی؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا پیغمبر بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جبارین کی ایک جماعت کا ظہور ہوا اور مؤمنین نے تین مرتبہ ان سے جنگ کی اور شکست کھائی لہٰذا بیابانوں میں جا چھپے اور موعود عیسےٰ علیہ السلام (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کے انتظار میں پہاڑوں کے غاروں میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان میں سے بعض اپنے دین پر باقی رہے اور بعض نے کفر کی راہ اختیار کی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

جانتے ہو میری اُمت کی رہبانیت کیا ہے؟ عرض کیا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: الهجرة والجهاد والصلٰوة والصوم والحج والعمرة۔

"میری اُمت کی رہبانیت: ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج اور عمرہ ہے"۔[2]

مشہور عیسائی مؤرخ "ویل ڈورانت" اپنی مشہور تاریخ کی جلد ۱۳ میں ایک تفصیلی بحث راہبوں کے بارے میں درج کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ راہبوں کے ساتھ راہبوں کا میل جول چوتھی صدی میلادی سے شروع ہوا اور رہبانیت کا معاملہ روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ دسویں صدی میلادی میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔[3]

اس میں شک نہیں کہ اس اجتماعی طور پر ظہور میں آنے والے معاملے کے دوسرے معاملات کی طرح تاریخی اسباب کے علاوہ نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ منجملہ ان تمام کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اصولی طور پر متفرق افراد و اقوام کا شکستوں اور ناکامیوں کے مقابلہ میں جو ردِ عمل ہے وہ مختلف ہوتا ہے۔ بعض گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں اور باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی مصروفیتوں سے بے تعلق کر لیتے ہیں، جب کہ دوسرا گروہ شکست سے استقامت کا درس لیتا ہے اور اپنے اندر زیادہ صلابت اور ثابت قدمی پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا گروہ رہبانیت یا اسی قسم کی کسی صورتِ حال کو اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا گروہ زیادہ اجتماعی ردِ عمل پیش کرتا ہے۔

۳۔ رہبانیت سے پیدا ہونے والے اجتماعی اور اخلاقی مفاسد

قوانین خلقت سے انحراف ہمیشہ اپنے پیچھے منفی ردِ عمل رکھتا ہے اس وجہ سے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جس وقت انسان اجتماعی

---

[1] دائرۃ المعارف قرن بیستم مادہ "رھب"

[2] تفسیر "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۴۳ (تھوڑے سے خلاصہ کے ساتھ) تفسیر در المنثور میں اس کے مقابل ایک اور حدیث نقل ہوئی ہے (جلد ۶ ص ۱۷۷)

[3] تاریخ "ویل ڈورانت" جلد ۱۳ ص ۲۴۳

زندگی سے، جو اس کی فطرت میں رچی بسی ہے، دُور ہو جائے تو شدید ردِ عمل کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے رہبانیت جو انسان کے اصول فطرت اور طبیعت و مزاج کے برخلاف ہے زیادہ مفاسد کا باعث بنتی ہے۔

۱۔ رہبانیت انسان کے مدنی الطبع ہونے کی رُوح کے خلاف جنگ کرتی ہے اور انسانی معاشروں کو انحطاط اور پس ماندگی کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ رہبانیت نہ صرف یہ کہ کمالِ نفس، تہذیب رُوح اور تہذیبِ اخلاق کا سبب نہیں ہے بلکہ اخلاقی تنزل، سستی و کاہلی، بدبینی، غرور و تکبر و عجب اور نامعقول احساس برتری کا باعث بنتی ہے۔ فرض کیجیے کہ انسان حالتِ گوشہ نشینی میں اخلاقی فضیلت تک پہنچ بھی جائے تو یہ کیفیت فضیلت شمار نہیں ہوگی۔ فضیلت تو یہ ہے کہ انسان اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے اندر رہ کر خود کو اخلاقی گراوٹوں سے بچا سکے۔

۳۔ ترک ازدواج جو رہبانیت کے اصولوں میں سے ہے نہ صرف یہ کہ کسی کمال کو پیدا نہیں کرتا بلکہ کئی نفسیاتی اُلجھنوں اور بیماریوں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ دائرۃ المعارف قرن بلیستم میں ہم پڑھتے ہیں کہ بعض راہب صنفِ نازک کی طرف توجہ کو اس قدر شیطانی عمل سمجھتے تھے کہ وہ اس بات پر تیار نہیں ہوتے تھے کہ کسی مادہ جانور کو اپنے گھر لے جائیں اس خوف سے کہ کہیں رُوح شیطانی اس کی رُوحانیت پر ضرب نہ لگا دے اس کے باوجود تاریخ گرجاوں کے بارے میں اپنے اندر بہت زیادہ قباحتیں لیے ہوئے ہے یہاں تک کہ بقول "ویل ڈورانٹ" "ایونسان کے تیسرے پوپ" نے ایک گرجے کی فاحشہ خانے کے عنوان سے تعریف کی ہے۔[1]

ان میں سے بعض گرجے شکم پرستوں، دُنیا طلبوں اور اچھا وقت گزارنے والوں کے اجتماع کا مرکز بن چکے تھے۔ یہاں تک کہ بہترین شراب گرجوں ہی میں ملتی تھی۔ البتہ تاریخ کے مطابق حضرت عیسیٰ نے شادی قطعاً نہیں کی لیکن یہ چیز ہرگز اس امر سے آپ کی نفی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حضرت مسیح کی مختصر سی عمر اور دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف ان کے مسلسل سفر نے ان کو اس امر کی مہلت نہ دی۔

رہبانیت کے بارے میں بحث کرنا ایک مستقل کتاب چاہتا ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیلات کی طرف جائیں تو بحث تفسیری سے خارج ہو جائیں گے۔ اس بحث کو حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ نے آیہ ذیل کی تفسیر میں فرمایا:

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔

"کہہ دے کیا میں تمہیں خبر دوں کہ لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ وہ ہیں جن کی کوشش دُنیاوی زندگی میں گُم ہو گئی لیکن اس کے باوجود وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔"[2]

حضرت علی علیہ السلام نے اس کی تفسیر میں فرمایا: (ھم الرھبان الذین حبسوا انفسھم فی السواری) اس کا ایک واضح مصداق

---

[1] ویل ڈورانٹ جلد ۱۲ ص ۲۹۳

[2] سورۂ کہف (آیت ۱۰۳ و ۱۰۴)

وہ راہب ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو پہاڑوں اور بیابانوں کی اونچی جگہوں میں قید کر رکھا ہے ۔ اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اچھا کام انجام دے رہے ہیں۔[1]

۴۔ انجیل یا اناجیل

انجیل اصل میں ایک یونانی لفظ ہے اس کے معنی ہیں بشارت یا جدید تعلیم اور یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ۔ یہ لفظ بارہ مرتبہ قرآن مجید میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ مفرد کی شکل میں ہے لیکن قابلِ توجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو چیز انجیل کے نام سے مشہور ہے وہ بہت سی کتابوں کا مجموعہ ہے جنہیں اناجیل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے مشہور چار انجیلیں ہیں "لوقا" "مرقس" "متی" اور "یوحنا"۔

عیسائیوں کا نظریہ ہے کہ چار انجیلیں اصحابِ مسیح یا ان اصحاب کے شاگردوں میں سے چار افراد کے ذریعہ تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی تالیف کی تاریخ حضرت مسیحؑ کے ۳۸ سال بعد سے لے کر تقریباً ایک صدی بعد تک پہنچتی ہے۔ اس بنا پر مسیح علیہ السلام کی اصل کتاب ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے مستقل طور پر پردہ خفا میں چلی گئی ہے ۔ صرف اس کے بعض حصے جو ان چاروں افراد کے حافظے میں رہ گئے تھے ان کے اپنے افکار کی آمیزش کے ساتھ ان چاروں انجیلوں میں تحریر ہوئے ہیں۔ اس عنوان پر زیادہ تفصیلی بحث ہم سورہ آل عمران کی آیت[3] میں پیش کر چکے ہیں۔[2]

✣ ✣ ✣

---

[1] کنز العمال جلد ۳ حدیث ۴۴۹۶ ۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۳۱ سے آگے ۔

۲۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ
كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ
بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۚ

۲۹۔ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ
فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۧ

ترجمہ

۲۸۔ اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو خُدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ وُہ اپنی رحمت کے دو حصّے تمہیں بخش دے اور تمہارے لیے ایسا نُور قرار دے جس کے ساتھ (لوگوں کے درمیان اپنی راہِ حیات میں) چلو پھرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خُدا غفور و رحیم ہے۔

۲۹۔ تاکہ اہلِ کتاب جان لیں کہ وہ فضلِ خُدا میں سے کسی چیز پر قُدرت نہیں رکھتے اور فضل (رحمت) سب کا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خُدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کے لیے ایک شانِ نزول نقل کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جعفرؓ ابن ابی طالب کو ستر افراد کے ساتھ نجاشی (حبشہ) کی طرف بھیجا۔ حضرت جعفرؓ نجاشی کے پاس گئے اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ دعوت قبول کرکے ایمان لے آیا۔ حبشہ سے واپسی کے وقت اس ملک کے چالیس افراد نے جو ایمان لاچکے تھے حضرت جعفرؓ سے کہا ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوں اور اپنا اسلام اس کے سامنے پیش کریں۔ پھر وہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ مدینہ آئے۔ جس وقت انہوں نے مسلمانوں کا فقر و فاقہ دیکھا تو رسولؐ خدا سے عرض کیا کہ ہم اپنے دیار میں بہت زیادہ مال و متاع رکھتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے ملک کی طرف پلٹ جائیں اور اپنا مال اپنے ساتھ لے آئیں اور مسلمانوں میں تقسیم کردیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی وہ گئے اور اپنا مال لے آئے اور اسے اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کردیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی توصیف کی۔ الذین اٰتینٰھم الکتاب من قبلہ ھم بہ یؤمنون ...... (قصص ۵۲ تا ۵۴) اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تھے جب انہوں نے یہ جملہ جو مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں آیا ہے سُنا۔ اولٰئک یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا۔ "وہ اپنا اجر اپنے صبر و استقامت کی بنا پر دو مرتبہ حاصل کریں گے" تو وہ مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوگئے اور کہا: اے مسلمانو! جو شخص تمہاری کتاب اور ہماری کتاب دونوں پر ایمان لائے گا اسے دوہرا اجر ملے گا اور جو ہماری کتاب پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے تمہاری طرح صرف ایک اجر ہے۔ اس بنا پر تمہارے اپنے اقرار کے مطابق تم ہم پر کوئی فضیلت نہیں رکھتے۔ یہ وہ منزل تھی کہ جس کے پیش نظر اوپر والی آیات نازل ہوئیں۔ یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کو بھی دگنا اجر ملے گا۔ علاوہ خدائی نور اور مغفرت کے اور پھر مزید کہا کہ "اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل و رحمت میں سے کوئی چیز اپنے ہاتھ میں لینے کی طاقت نہیں رکھتے۔"[1]

چونکہ گزشتہ آیات میں گفتگو عیسائیوں اور اہل کتاب کے بارے میں تھی زیر بحث آیات اسی کی تکمیل میں جو گزشتہ آیات میں آیا ہے پہلے فرماتا ہے: (یاایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و اٰمنوا برسولہ) "اے ایمان لانے والو خدا کے بارے میں تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ"۔ اس آیت کا مخاطب کون ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کے دو قول ہیں:

پہلا یہ کہ مخاطب مومنین ہیں البتہ ان سے کہا جائے گا کہ ظاہری ایمان کافی نہیں ہے بلکہ وہ ایمان درکار ہے جو روح کی گہرائی تک جس کے نتیجے میں ہونے والے اعمال تقویٰ سے متصف ہوں تاکہ وہ اجر جو آیت میں بیان ہوئے ہیں وہ حاصل ہوسکیں۔

دوسرا یہ کہ مخاطب اہل کتاب میں سے مومنین ہیں یعنی اے وہ لوگو جو گزشتہ پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان لائے ہو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی ایمان لے آؤ تاکہ انواع و اقسام کے اجر حاصل ہوں۔ جو چیز دوسری تفسیر کی شاہد بن سکتی ہے وہ دگنا اجر ہے جس کا ذکر آیت کے ذیل میں آیا ہے۔ ایک اجر گزشتہ انبیا پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر پیغمبرِ اسلام پر ایمان لانے کا۔ لیکن یہ تفسیر، علاوہ اس کے کہ، بعد والی آیت کے ساتھ، جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے، سازگار نہیں ہے۔ آیت کی شانِ نزول اور یاایھا الذین اٰمنوا

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۲ یہی معنی تفسیر ابوالفتوح رازی اور روح المعانی میں اختلافات کے ساتھ زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں۔

کے اطلاق کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس بنا پر قبول کر لینا چاہیئے کہ مخاطب سب مومنین ہیں جنہوں نے بظاہر پیغمبرؐ کی طرف سے دی ہوئی دعوت اسلام کو قبول کر لیا ہے لیکن وہ ایمان راسخ جو ان کی رُوح کی گہرائیوں کو روشن کرے اور ان کے اعمال سے ظاہر ہو ابھی ان میں پیدا نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں تین ایسی نعمتوں کی طرف جو مضبوط ایمان اور تقویٰ کے سائے میں حاصل ہوتی ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر ایسا کرو تو خدا تمہیں اپنی رحمت میں سے دو حصّہ دے گا اور تمہیں روشنی بخشے گا۔ جس کے سہارے زندگی کی راہ تلاش کرو وہ تمہیں بخش دے گا اور خدا غفور و رحیم ہے": (یؤتکم کفلین من رحمتہ و یجعل لکم نوراً تمشون بہ و یغفر لکم واللّٰہ غفور رحیم)۔ "کفل" (بروزن طفل) اس حصّہ کے معنی میں ہے جو انسان کی حاجت کو پورا کرے اور ضامن کو اسی وجہ سے کفیل کہتے ہیں کہ وہ مدِمقابل کی کفالت کرتے ہوئے اس کا حصّہ دیتا ہے۔[۱]

بہرحال ان دو حصّوں سے مُراد وہی ہے جو سُورہ بقرہ کی آیت ۲۰۱ میں آیا ہے: ربّنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ "خداوندا! دُنیا میں بھی ہم کو نیکی دے اور آخرت میں بھی نیکی عطا فرما"۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ ان دونوں حصّوں میں سے ایک حصّہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے اور دوسرا حصّہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے کیونکہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ تمام گزشتہ انبیاء اور ان کی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے اور سب کو محترم شمار کرے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد پے در پے اور دائمی اجر ہیں۔ مذکورہ بالا معانی اور یہ معانی دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کے دوسرے اجر (و یجعل لکم نوراً تمشون بہ) سے، بعض مفسرین کے بقول، مراد وہی نورِ ایمان ہے جو قیامت میں ان کے آگے اور دائیں سمت چل رہا ہوگا اور اس نور کی بدولت مومنین ظلماتِ محشر کو چیر کر نکل جائیں گے اور سعادتِ ابدی یعنی بہشت کی طرف بڑھیں گے جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۱۲ میں آیا ہے: (یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعیٰ نورھم بین ایدیھم و بایمانھم) جب کہ بعض دوسرے مفسرین اسے نورِ قرآن کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو دنیا میں مومنین کے پاس آیا ہے۔ جیسا کہ سُورہ مائدہ کی آیت ۱۵ میں ہم پڑھتے ہیں: (قد جاءکم من اللّٰہ نور و کتاب مبین) "خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے"۔ لیکن ظاہر ہے کہ آیت کا مفہوم مطلق اور وسیع ہے جو دُنیا کے ساتھ اختصاص رکھتا ہے، اور نہ آخرت کے ساتھ۔ دوسرے معنی میں ایمان اور تقویٰ سبب بنتے ہیں کہ مومنین کے دل پر سے حجاب ہٹ جائیں اور وہ حقائق کا چہرہ ویسا ہی دیکھیں جیسا وہ ہے اور اس کے سائے میں انہیں وہ مخصوص نگاہ نصیب ہو جس سے بے ایمان افراد محروم ہیں۔ اور یہ جو روایاتِ اہلِ بیتؑ میں آیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں نور سے مُراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ اقتدا کرتے ہیں تو یہ حقیقت میں ایک واضح مصداق کا بیان ہے۔

۱۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ کفل (بروزن دکل) سے لیا گیا ہے اور وہ اس چیز کو کہتے ہیں جو چوپاؤں کی کفل (پیٹھ کا آخری حصّہ) پر رکھتے ہیں تاکہ وہ شخص جو سواری پر سوار ہو وہ گرنے نہ پائے۔ اس لیے ہر وہ چیز جو نگہداری کا سبب ہو اُسے کفل کہا جاتا ہے اور اگر ضامن کو کفیل کہتے ہیں تو وہ بھی اسی بنا پر ہے (ابوالفتوح رازی در ذیل آیات زیر بحث)۔ لیکن راغب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے دو معنی ہیں اور دوسرے معنی بے قدر و قیمت چیز ہے جو چوپاؤں کی کفل کے مشابہ (پیٹھ) کیونکہ جو شخص وہاں سوار ہو اُسے گرنے کا خوف نہیں ہوتا۔ (غور کیجئے)۔

(۲۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

آخر میں مومنین کا تیسرا اجر وہی گناہوں کا بخشنا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے لیے کوئی نعمت خوشگوار ثابت نہیں ہو سکتی۔ پہلے اسے عذاب الٰہی سے محفوظ ہونا چاہیئے اس کے بعد وہ ایمان اور تقویٰ کے نور سے اپنی راہ روشن کرے اور آخر میں وہ خدا کی کئی گنا رحمتوں سے فیض یاب ہو۔ بعد والی آیت جو اس سورۃ کی آخری آیت ہے اس میں اس دلیل کا بیان ہے جو گزشتہ آیات میں آئی ہے فرماتا ہے: یہ کئی گنا خدائی نعمتیں نورانیت اور مغفرت کے علاوہ اس وجہ سے ہیں تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ فضل خدا میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل و رحمت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خدا عظیم فضل و رحمت کا مالک ہے (لئلا یعلم اھل الکتاب الّا یقدرون علٰی شیءٍ من فضل اللہ و ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم)[1]

یہ ان کا جواب ہے جو یہ کہتے تھے کہ (مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق) خداوند اہل کتاب کے اس گروہ کو جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہے دو اجر دے گا تو اس وجہ سے ہم جو ایمان نہیں لائے وہ مسلمانوں کی طرح ایک اجر تو رکھتے ہیں[2] قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ مسلمان عام طور پر دو اجر رکھتے ہیں کیونکہ وہ پیغمبر اسلام اور تمام گزشتہ پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اہل کتاب کا وہ گروہ جو ایمان نہیں لایا وہ کوئی حصہ نہیں رکھتا تھا کہ انہیں پتہ چل جائے کہ رحمت الٰہی ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جسے چاہے وہ دے سکیں اور جسے چاہے نہ دیں۔ یہ آیت ہو سکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی بلند پروازیوں اور بے بنیاد دعووں کا بھی جواب ہو جو بہشت اور رحمت الٰہی کو اپنے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس سے محروم خیال کرتے تھے (وقالوا لن یدخل الجنۃ الّا من کان ھودًا او نصارٰی تلک امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین) "انہوں نے کہا کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہہ دے اگر سچ کہتے ہو تو اپنی دلیل لاؤ" (بقرہ - ۱۱۱)

ایک نکتہ

تقویٰ اور نگاہ دُوررس کا رابطہ

قرآن مجید نے تقویٰ کے بہت سے آثار بیان کیے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ انسان کی فکر اور اس کے دل سے پردے

---

[2] یہ روایات نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵۲ اور ۲۵۳ پر نقل ہوئی ہیں۔

[1] یہ کہ لا (لئلا یعلم اھل الکتاب) میں زائد ہے یا اصلی مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بہت سے لا کو زائد اور تاکید کے لیے سمجھتے ہیں (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) اور اگر لا کو اصلی سمجھا جائے تو پھر آیت کے معانی گوناں گوں بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک مراد یہ ہے کہ اہل کتاب جان لیں کہ اگر وہ بھی اسلام و ایمان کو قبول کر لیں تو اپنے لیے فضل خدا کو فراہم کر سکتے ہیں۔ (دوسرے لفظوں میں یہاں نفی در نفی اثبات کے معنوں میں ہے) یا یہ کہ ہم نے یہ سب ثواب مسلمانوں کو دیے ہیں تاکہ اہل کتاب یہ تصور نہ کریں کہ مسلمان فضل خدا میں سے کوئی حصہ نہیں رکھتے لیکن آیت کے ذیل کی طرف توجہ کرتے ہوئے (ان الفضل بید اللہ) اور اس شان نزول کو دیکھتے ہوئے جسے ہم نے اوپر نقل کیا ہے لا کا زائد ہونا زیادہ مناسب نظر آتا ہے بلکہ بعض کے نظریے کے مطابق قرآن تمام موارد میں جہاں جملہ منفی پر مشتمل ہو لا زائد ہوگا مثلاً (ما منعک الّا تسجد اذ امرتک) (اعراف - ۱۲) (وما یشعرکم انھا اذا جاءت لا یؤمنون) (انعام - ۱۰۹) غور کیجیے

ہٹ جائیں ایمان اور تقویٰ کا نگاہ دُور رس سے جو رابطہ ہے اس کے متعلق قرآن کی دوسری آیات میں اشارے ہیں۔ سورہ انفال کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں: یاایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللّٰہ یجعل لکم فرقانا ۔ اے ایمان لانے والو! اگر تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے پرہیز کرو تو خدا تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کا ذریعہ قرار دے گا" سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں آیا ہے:

واتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ "خدا کا خوف اختیار کروگے تو خدا تمہیں علم و دانش سے نوازے گا"۔ اور زیر بحث آیات میں بھی یہ معنی صراحت کے ساتھ آئے ہیں کہ اگر ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو خدا تمہارے لیے نور قرار دے گا جس کے سائے میں تم قدم بڑھا سکوگے۔ ان دونوں کا رابطہ، علاوہ معنوی پہلوؤں کے، جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے، تحلیل عقلی کے نتیجے میں سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ معرفت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا پردہ جو انسان کے دل پر پڑا رہتا ہے اور اسے حقائق کو نہیں دیکھنے دیتا اس کی وہ سرکش خواہشات اور لاتعداد تمنائیں اور آرزوئیں ہیں اور دنیا کی چمک دمک میں اس کا اُلجھا ہوا ہونا ہے جو اسے صحیح فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے حقائق کا چہرہ نہیں دیکھنے دیتا۔ جس وقت ایمان اور تقویٰ کے زیر سایہ گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے اور رُوحِ انسانی پر چھائے ہوئے تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں تو پھر صفحۂ دل پر آفتابِ حقیقت چمکتا ہے اور حقائق تک اس کی دسترس ہو جاتی ہے اور اس کو ادراک کی لذت نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ وہ لذت ہے جو تعریف و توصیف سے ماوراء ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ جی ہاں یہ تقویٰ ہی ہے جو انسان کو آگاہی بخشتا ہے اور جس طرح علم اور آگاہی اسے تقویٰ سے ہمکنار کرتے ہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں مشہور حدیث میں ملتا ہے:

لولا ان الشیاطین یحوطون علی قلوب بنی اٰدم لنظروا الی ملکوت السماوات

اگر شیاطین انسانی دلوں پر مسلط نہ ہو جاتے تو وہ ملکوت سموات کو دیکھ سکتے۔

اس بات کے بہتر ادراک کے لیے ہم حضرت علیؑ کے ارشادِ گرامی سے استفادہ کرتے ہیں:

لا دین مع ھوی۔ لا عقل مع ھوی من اتبع ھواہ اعماہ واصمہ واذلہ واضلہ۔

جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا۔ اسی طرح عقل اور ہوائے نفس ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔

جب انسان ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے تو وہ اسے اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے اور وہ ذلیل و گمراہ ہو جاتا ہے۔

پروردگارا! ہمیں ہوائے نفس سے محفوظ رکھ اور ہمیں تقویٰ اور نگاہ دُور رس عطا فرما۔

خداوندا! تمام رحمتیں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں ہمیں ان سے محروم نہ کر۔

بارالٰہا! ہمیں حق اور عدل و انصاف قائم کرنے کی توفیق عطا فرما اور بیّنات سے استفادہ کے زیر سایہ مُنہ زور افراد کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کا حوصلہ اور حریم کتاب و میزان کی پاسداری کی توفیق عطا فرما۔

سُورہ "حدید" کا اختتام
۲۰/ رجب / ۱۴۰۲ھ

اختتام ترجمہ بتاریخ ۲۶ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۳ جون ۱۹۸۷ء بروز منگل بوقت سوا ایک بجے دوپہر بمکان حقیر رقم کوئے جمشیدی محلہ سلطان محمد شریف اعوان

قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارہ کا آغاز

۵۸۔ سُورہ مُجادِلہ

* یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
* اِس میں ۲۲ آیتیں ہیں۔

تاریخ شروع ۲۰/رجب/۱۴۰۶ھ ق
۱۱/۱/۱۳۶۵ھ ش

سُورۂ "مجادلہ" کے مضامین

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے اور مدنی سُورتوں کی طبیعت و مزاج کے مطابق زیادہ تر فقہی احکام، اجتماعی نظام زندگی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ اس سُورہ کے تمام مباحث کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ پہلا حصّہ "ظہار" کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت میں ایک قسم کی طلاق اور دائمی جُدائی شمار ہوتی تھی۔ اسلام نے اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس کی صحیح راہ متعین کی۔

۲۔ دُوسرے حصّہ میں آداب مجالست کے احکام کے بارے میں گفتگو ہے۔ سرگوشی سے منع کیا گیا ہے اور جو نئے لوگ مجلس میں داخل ہوں اُنہیں جگہ دینے کے بارے میں احکام ہیں۔

۳۔ تیسرے اور آخری حصّہ میں جو بحث ہے وہ گویا مُنہ سے بولتی ہوئی بھی ہے، تفصیلی بھی اور سرکوبی کرنے والی بھی۔ منافقین یعنی وہ لوگ جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن دشمنان اسلام کے ساتھ پوشیدہ طور پر ربط و ضبط رکھتے ہیں، ان کے بارے میں گفتگو ہے: سچے مسلمانوں کو گروہ شیاطین و منافقین میں داخل ہونے سے ڈرایا گیا ہے اور انہیں "حُب فی اللّٰہ" اور "بغض فی اللّٰہ" کے پیشِ نظر حزب اللہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

سُورۂ "مجادلہ" کی تلاوت کی فضیلت

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت میں دو روایتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہیں۔ پہلی روایت میں ہے کہ :

من قرأ سورة المجادلة كتب من حزب الله يوم القيامة

جو شخص سورہ مجادلہ کی تلاوت کرے (اور اس میں غور و فکر کرے اور اس پر کاربند ہو) تو بروز قیامت وہ حزب اللہ میں شمار ہوگا۔

دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

من قرأ سورة الحديد والمجادلة في صلوة فريضة وادمنهما لم يعذبه الله حتى يموت ابدًا ولا يرى في نفسه ولا في اهله سوءًا ابدًا ولاخصاصة في بدنه

جو شخص سورہ حدید و مجادلہ واجب نمازوں میں پڑھے اور اس کا ورد رکھے تو خدا اس کی پوری زندگی میں اس پر کوئی عذاب نازل نہیں کرے گا اور وہ اپنی ذات میں اور اپنے اہل خانہ میں کوئی برائی نہیں دیکھے گا نیز فقر و بدحالی میں گرفتار نہیں ہوگا۔

ان کو سورتوں کے مضامین کی جو مناسبت مذکورہ بالا اجر اور جزا کے ساتھ ہے وہ واضح ہے اور یہ چیز خود بتاتی ہے کہ تلاوت کا مقصد زندگی میں عملی شکل دینا ہے، ایسی تلاوت نہیں جو غور و خوض اور عمل سے خالی ہو۔

❖ ❖ ❖

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّتِىۡ تُجَادِلُكَ فِىۡ زَوۡجِهَا وَتَشۡتَكِىۡۤ
اِلَى اللّٰهِ ‌ۖ وَاللّٰهُ يَسۡمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ ۢ بَصِيۡرٌ ۝
۲۔ اَلَّذِيۡنَ يُظٰهِرُوۡنَ مِنۡكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِهِمۡ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمۡ‌ ؕ
اِنۡ اُمَّهٰتُهُمۡ اِلَّا الّٰٓـىِٔۡ وَلَدۡنَهُمۡ‌ ؕ وَاِنَّهُمۡ لَيَـقُوۡلُوۡنَ مُنۡكَرًا
مِّنَ الۡقَوۡلِ وَزُوۡرًا ‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ۝
۳۔ وَالَّذِيۡنَ يُظٰهِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِهِمۡ ثُمَّ يَعُوۡدُوۡنَ لِمَا
قَالُوۡا فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا ‌ؕ ذٰلِكُمۡ
تُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ۝
۴۔ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ مِنۡ قَبۡلِ
اَنۡ يَّتَمَآسَّا ‌ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّيۡنَ مِسۡكِيۡنًا ‌ؕ
ذٰلِكَ لِتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ‌ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ‌ ؕ

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ خدا نے اس عورت کا قول سُنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا اور خُدا کی بارگاہ میں شکایت کی تھی۔ خدا تمہاری آپس کی گفتگو (اس عورت کا اصرار اس کی مشکل کے حل کے سلسلہ میں) سُن رہا تھا اور خُدا سُننے اور دیکھنے والا ہے۔

۲۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کے بارے میں ظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں (انت علیّ کظھر امی) (تو میرے لیے میری ماں کی پُشت کی مانند ہے) تو وہ ہرگز ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ وہ بڑی قبیح اور باطل بات کرتے ہیں اور خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۳۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی ہی کہی ہوئی بات سے پلٹ جاتے ہیں تو اُن کو اُن کے ساتھ صُحبت کرنے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ یہ وہ حکم ہے جس کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔

۴۔ اور جو شخص غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ صحبت کرنے سے پہلے دو ماہ پے دَر پے روزے رکھے اور جو اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ یہ خُدا کی حدود ہیں جو ان کی مخالفت کریں گے ان پر دردناک عذاب ہوگا۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے اس سُورہ کی پہلی آیات کے لیے کئی شانِ نزول نقل کی ہیں جن میں سے ہر ایک کا نفسِ مضمون اجمالی طور پر ایک ہی ہے اگرچہ جزئیات میں ایک دوسرے سے اختلاف ہے لیکن یہ اختلاف اس چیز پر جس کے ہم تفسیری بحث میں ضرورت مند ہیں اثر انداز نہیں ہوگا۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ گروہ انصار کی ایک عورت جس کا نام "خولہ" تھا (دوسری روایات میں اس عورت کے اور بھی نام بیان ہوئے ہیں) وہ قبیلہ "خزرج" سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کا نام "اوس بن صامت" تھا۔ کسی بات پر خولہ کا شوہر اس سے ناراض ہوگیا۔ وہ ایک تند خو اور شدید الحس آدمی تھا۔ اُس نے اپنی عورت سے علیحدگی کا مصمم ارادہ کرلیا اور کہا "انت علیّ کظھر امّی" (تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے)۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ طلاق کی ایک قسم تھی۔ لیکن یہ طلاق اس طرح کی تھی کہ نہ تو اس میں رجوع ممکن تھا نہ عورت مرد سے آزاد ہوتی تھی کہ اپنے لیے کوئی دوسرا شوہر منتخب کرے۔ یہ بدترین حالت تھی جس سے کوئی شوہردار عورت دوچار ہوتی تھی۔ وہ شخص جلد ہی پشیمان ہوگیا اور چونکہ زمانۂ جاہلیت میں "ظہار" (مذکورہ بالا جملہ کہنا) ایک ایسی طلاق شمار ہوتا تھا جس میں طرفین ایک دوسرے سے قطعاً رجوع نہیں کرسکتے تھے، وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ میرا خیال ہے تو مجھ پر ہمیشہ کے لیے حرام ہوگئی۔ عورت نے کہا ایسا نہ کہہ تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا اور اس مشکل کا حل دریافت کر۔ مرد نے کہا مجھے شرم آتی ہے۔ عورت نے کہا میں جاتی ہوں۔ اس نے کہا: کوئی حرج نہیں تو چلی جا۔ وہ عورت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے شوہر "اوس بن صامت" نے مجھ سے شادی کی تھی۔ اُس وقت میں صاحبِ دولت و ثروت تھی اور خوبصورت تھی۔ میرا خاندان بھی اچھا تھا، وہ میرا مال اپنے مصرف میں لے آیا۔ اب جب کہ میں جوان نہیں رہی میرا خاندان بھی پراگندہ ہوگیا ہے تو اب اُس نے "ظہار" کیا ہے۔ لیکن وہ اپنے اس اقدام پر پشیمان ہے۔ تو کیا ایسی صورت ہے کہ ہم ایک دوسرے سے رجوع کرلیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تو اس پر حرام ہوگئی ہے۔"

عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس نے صیغۂ طلاق جاری نہیں کیا۔ پھر وہ میری اولاد کا باپ بھی ہے۔ اور ان سب چیزوں کے علاوہ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تو اس پر حرام ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں میرے پاس سرِ دست کوئی دوسرا حکم نہیں ہے۔"

وہ عورت مسلسل اصرار کرتی تھی اور گڑگڑا کر عرض حال کرتی تھی۔ آخر کار اس عورت نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: (اشکوا الی اللہ فاقتی وحاجتی وشدۃ حالی اللّٰھم فانزل علی لسان نبیک) پروردگار! میں اپنی بے چارگی اور احتیاج کی شدت تجھ سے عرض کرتی ہوں۔ خداوندا کوئی فرمان اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرما اور اس مشکل کو حل کردے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے عرض کیا:

اللّهم انك تعلم حالی فارحمنی فان لی صبیة صغار ان ضممتهم الیه ضاعوا و ان ضممتهم الی جاعوا

خداوندا! تُو میری حالت کو جانتا ہے مجھ پر رحم کر میرے چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں جنہیں مَیں اگر اپنے شوہر کے حوالے کردوں تو وہ ضائع ہو جائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھُوکے مرجائیں گے۔

اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی حالت طاری ہوئی اور اس سُورہ کی ابتدائی آیات آپؑ پر نازل ہوئیں جو ظہار کی مشکل کو حل کرنے کا راستہ بتاتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اپنے شوہر کو بُلا کر لا۔

جب وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ آیات کی اس کے سامنے تلاوت کی اور فرمایا:

"کیا تُو ایک غلام ظہار کے کفارے کے طور پر آزاد کرسکتا ہے"۔

اُس نے کہا: "اگر ایسا کروں گا تو میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا"۔

فرمایا: "دو مہینے تک مسلسل روزے رکھ سکتا ہے!"

اُس نے کہا: "میرے کھانے میں تین مرتبہ تاخیر ہو جائے تو میری آنکھ بیکار ہو جائے اور مجھے خوف ہے کہ مَیں نابینا ہوجاؤں"۔

فرمایا: "تو کیا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے"۔

عرض کیا "نہیں مگر اس طرح کہ آپ میری مدد کریں"۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَیں تیری مدد کروں گا اور پندرہ صاع (پندرہ من ایرانی جو ساٹھ مسکینوں کی خوراک میں ہر شخص کے لیے ایک مُد یعنی ¼ من تقریباً چودہ چھٹانک) غذا اس کو دی۔ اس نے کفارہ ادا کیا۔ اس طرح وہ میاں بیوی اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ آئے[1]۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس شانِ نزول کو بہت سے لوگوں نے تفسیر و تاریخ و حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرطبی، ابوالفتوح رازی اور کنزالعرفان کے نام نمایاں ہیں۔

تفسیر

ظہار زمانۂ جاہلیت کا ایک قبیح عمل

جو کچھ شانِ نزول کے سلسلہ میں عرض کیا گیا ہے اور آیات زیرِ بحث کے نفسِ مضمون کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر واضح ہوگئی ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"خُدا نے اس عورت کا قول سُنا جس نے اپنے شوہر کے بارے میں تجھ سے رجوع کیا تھا اور بحث و تکرار کرتی تھی، اس کی التجا کو قبول کیا" (قد سمع الله قول التی تجادلك فی زوجها)۔ "تجادل" "جدل" کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی رسی بٹنے

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۶۴ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

کے ہیں۔ چونکہ طرفین اصرار آمیز گفتگو کے موقع پر یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے کو خاموش کر دیں لہٰذا اس پر مجادلہ کا اطلاق ہوا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "وہ عورت، اس کے علاوہ کہ تجھ سے مجادلہ کرتی تھی، اس نے خدا کی بارگاہ میں شکایت بھی کی اور حلِ مشکل کی استدعا بھی کی۔ (و تشتکی الی اللّٰہ)۔ یہ اس حالت میں تھا کہ جب خدا تمہاری گفتگو اور اس عورت کے اصرار کو سُن رہا تھا۔ (واللّٰہ یسمع تحاورکما)۔

"تحاور" "حور" (بروزن غور) کے مادہ سے گفتگو یا غور و خوض میں رجوع کرنے کے معنوں میں ہے اور محاورہ کا طرفین کی گفتگو پر اطلاق ہوتا ہے۔

"اور خدا سُننے اور دیکھنے والا ہے"۔ (ان اللّٰہ سمیع بصیر)۔ جی ہاں! خدا تمام مسموعات و مبصرات سے، بغیر اس کے کہ بینائی و سماعت کے اعضا کا محتاج ہو، آگاہ ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز کو دیکھتا اور ہر بات کو سُنتا ہے۔ اس کے بعد ظہار کے حکم کی طرف رجوع ہے اور تمہید کلام کے طور پر اس بے ہودہ نظریہ کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے مختصر مگر قاطع جملے ارشاد فرماتا ہے: "تم میں سے وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: (انت علیّ کظھر امی) "تو میرے لیے میری ماں کی پُشت کی طرح ہے" وہ ہرگز ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنھوں نے انہیں جنا ہے" (الّذین یظاھرون منکم من نسائھم ماھن امھاتھم ان امھاتھم الّا اللّائی ولدنھم)۔ ماں اور بیٹا ہونا ایسا نہیں ہے جو صرف الفاظ سے درست ہو جائے وہ تو ایک ظاہر ہونے والی حقیقتِ واقعی ہے جو کسی صورت میں بھی الفاظ کے ساتھ کھیلنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس بنا پر اگر کوئی انسان سو مرتبہ بھی اپنی بیوی سے کہے کہ تُو میری ماں کی طرح ہے تو وہ ماں کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی۔ یہ محض ایک فضول بات ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"وہ ایک بُری اور قبیح بات کہتے ہیں۔ اور ان کا قول باطل و بے بنیاد ہے" (وانھم لیقولون منکرا من القول و زورا)[1]۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس بات کا کہنے والا قصدِ "اخبار" نہیں رکھتا بلکہ اس کا "مقصود" "انشاء" ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس جملے کو صیغۂ طلاق کا درجہ دے لیکن اس جملہ کا نفسِ مضمون ٹھیک "منہ بولے بیٹے" جیسی خرافات کی طرح بے بنیاد ہے جو زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم تھی کہ کسی بچے کو اپنا بیٹا کہہ دیتے تھے اور پھر اس پر احکام پسر جاری کرتے تھے، جس کی قرآن نے مذمت کی ہے اور اسے باطل و بے بنیاد بات قرار دیا ہے۔ ذالکم قولکم بافواھکم۔ "یہ ایسی بات ہے جسے تم صرف اپنے منہ سے کہتے ہو اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے" (احزاب۔ ۴)۔ اس آیت کے مطابق ظہار ایک منکر اور حرام عمل ہے لیکن چونکہ تکلیفِ شرعی گزشتہ اعمال سے تعلق نہیں رکھتی اور اس کا اطلاق نزول کے وقت سے ہوتا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"۔ (وان اللّٰہ لعفو غفور)۔ اس بنا پر اگر کوئی مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے اس عمل کا مرتکب ہوا ہے تو اسے پریشان نہیں ہونا چاہیئے، خدا اسے بخش دے گا۔ بعض فقہا اور مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اب بھی ظہار ایک گناہ ہے، گناہانِ صغیرہ کے مانند بخشا ہوا، خدا نے جس کے بارے میں گناہانِ کبیرہ کے ترک کی صورت میں عفو کا وعدہ کیا ہے لیکن اس مفہوم پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور اُوپر والا جملہ اس امر پر گواہ نہیں بن سکتا۔ بہر حال کفارے کا مسئلہ اپنی پُوری قوت کے ساتھ باقی ہے۔ حقیقت میں یہ تعبیر اس کے مشابہ ہے جو سُورہ احزاب کی آیت ۵ میں آیا ہے جہاں منہ بولے بیٹے کے مسئلہ کی نفی کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے: (ولیس علیکم جناح فیما اخطأتم بہ ولٰکن ما تعمدت قلوبکم وکان اللّٰہ غفورا رحیما)[2]۔

---

[1] "زور" اصل میں سینے کے اُوپر والے حصہ کا ٹیڑھا اور جھکا ہوا ہونا ہے۔ یہ منحرف ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے اور چونکہ جھوٹی بات اور باطل گفتگو حق سے انحراف رکھتی ہے لہٰذا اسے زور کہتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لفظ بت کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

[2] "کنز العرفان" جلد ۲ ص ۲۹۰۔ المیزان میں بھی انہی معانی کی طرف اشارہ ہے۔

اس غلطی کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جو اس موضوع پر تم سے سرزد ہوئی ہے لیکن جو کچھ تم عمداً کہو تو خدا اس پر مواخذہ کرتا ہے اور خدا غفور و رحیم ہے۔ (گزشتہ بے راہ روی کے بارے میں)۔ "عفو" اور "غفور" کے درمیان کیا فرق ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "عفو" بخشش خدا کی طرف اشارہ ہے اور "غفور" گناہ کی پردہ پوشی کی طرف۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کے گناہ کو تو بخش دے لیکن اس کو چھپائے ہرگز نہیں۔ لیکن خدا بخشتا بھی ہے اور چھپاتا بھی ہے۔ بعض مفسرین نے غفران کے معنی یہ لیے ہیں کہ کسی شخص کو عذاب سے چھپا لیا جائے جس کا مفہوم عفو سے مختلف ہے اگرچہ نتیجہ ایک ہی ہے۔ چونکہ یہ قبیح اور تکلیف دہ گفتگو کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے لہٰذا اس کا کفارہ نسبتاً سنگین قرار دیا گیا ہے تاکہ اس کی تکرار کا سدباب کیا جائے۔ فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں اور پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے پلٹتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ مباشرت سے پہلے ایک غلام آزاد کریں۔ (والذین یظاھرون من نسائھم ثم یعودون لما قالوا فتحریر رقبة من قبل ان یتماسا)۔ "پھر اپنے کہے سے (ثم یعودون لما قالوا) پلٹتے ہیں کے جملے کے بارے میں کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ فاضل مقداد نے کنز العرفان میں اس کی چھ تفسیریں نقل کی ہیں۔ لیکن اس کا ظاہر (خصوصاً "من قبل ان یتماسا" پر توجہ کرتے ہوئے) یہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر نادم ہوتے ہیں اور گھریلو زندگی اور جنسی آمیزش کی طرف پلٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ روایات آئمہ اہل بیت میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہے۔[1]

اس جملے کی اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن وہ آیت کے معانی کے ساتھ چنداں مناسبت نہیں رکھتیں۔ مثلاً یہ کہ "عود" سے مراد "ظہار" کی تکرار ہے۔ یا یہ کہ "عود" سے مراد ایسے مواقع پر زمانۂ جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا ہے یا یہ کہ "عود" اس عمل کے تدارک اور تلافی کے معنوں میں ہے اور اسی قسم کے دیگر احتمالات۔[2] "رقبة" اصل میں گردن کے معنوں میں ہے لیکن یہاں انسان کا کنایہ اس بنا پر ہے کہ گردن دیگر اعضائے بدن کے مقابلہ میں زیادہ حساس سمجھی جاتی ہے۔ کبھی لفظ راس بھی کہا جاتا ہے اور اس سے مراد انسان ہوتا ہے مثلاً پانچ افراد کی جگہ پانچ راس کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "یہ ایک دستور ہے جس کا تمہیں وعظ کیا گیا ہے" (ذالکم توعظون بہ)۔ یہ گمان نہ کرنا کہ ظہار کے سلسلہ میں اس قسم کا کفارہ غیر معتدل ہے۔ کیونکہ یہ پند و نصیحت، بیداری اور تمہارے نفوس کی تربیت کا سبب ہے تاکہ اس قسم کے حرام کاموں کے سلسلہ میں تم اپنے نفوس کو قابو میں رکھ سکو۔ اصولی طور پر تمام کفارے تربیتی پہلو رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات وہ کفارے جو مالی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تاثیر تعزیرات کے مقابلہ میں، جو بدنی حیثیت رکھتی ہیں، کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس بات کا امکان تھا کہ بعض افراد مختلف بہانوں سے کفارے سے جان چھڑائیں گے اور ظہار کے بعد بغیر کفارہ ادا کیے اپنی بیوی سے جنسی آمیزش رکھیں گے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا اس سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے"۔ (واللّٰہ بما تعملون خبیر)۔ ظہار سے بھی آگاہ ہے اور کفارہ نہ دینے سے بھی اور تمہاری نیتوں سے بھی۔ اور چونکہ ایک غلام کا آزاد کرنا تمام افراد کے لیے ممکن نہیں جیسا کہ ہم نے آیت کی شان نزول میں دیکھا ہے، "اوس بن صامت" جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہیں اس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یہ کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہوں اور اگر ایسا کروں تو تمام پونجی کو گنوا دوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انسان مالی اعتبار سے تو غلام

---

[1] مجمع البیان در ذیل آیات محل بحث۔

[2] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۹۰ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

کے آزاد کرنے کی قدرت رکھتا ہو لیکن اسے کوئی غلام دستیاب نہ ہو جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے۔ اس لیے اسلام کے دین جاودانی ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ بعد کے مرحلہ میں غلاموں کے آزاد کرنے کا کوئی نعم البدل مذکور ہو اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: " جو شخص غلام آزاد کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو جنسی آمیزش سے پہلے دو ماہ مسلسل روزے رکھے۔ (فمن لم یجد فصیام شھرین متتابعین من قبل ان یتماسا)۔ اس قبیح عمل کو روکنے کے لیے یہ کفارہ بھی ایک گہرا اثر رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ روزہ روح کی صفائی اور تہذیب نفس کا باعث ہے لہٰذا اس قسم کے اعمال کے اعادہ کا سدباب کر سکتا ہے۔ البتہ ظاہر آیت تو یہ ہے کہ روزے ساٹھ دن تک مسلسل رکھے جائیں۔ بہت سے فقہائے اہل سنت نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے لیکن آئمہ اہل بیتؑ کی روایتوں میں آیا ہے کہ اگر دوسرے مہینے میں سے کچھ دن حتیٰ کہ ایک دن بھی پہلے مہینے کے تسلسل کے ساتھ روزہ رکھ لے تو شھرین متتابعین یعنی مسلسل دو ماہ کا تقاضا پورا ہو جائے گا اور یہ تصریح ظہور آیت پر حاکم ہے۔[1]

یہ چیز بتاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اور سورۂ نساء کی آیت ۹۲ میں (کفارہ قتل خطا) تتابع سے مراد فی الجملہ پے در پے ہونا ہے۔ البتہ اس قسم کی تفسیر صرف امام معصوم سے سننے میں آئی ہے جو علوم پیغمبرؐ کا وارث ہے اور اس قسم کے روزے رکھنا مکلفین کے لیے آسانی کا باعث ہیں۔ (اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل کتاب الصوم اور ابواب ظہار و کفارہ قتل خطا میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)۔ (فمن لم یجد کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضروریات زندگی سے زائد کوئی چیز نہ رکھتا ہو جس سے غلام خرید کر آزاد کر سکے۔ اور چونکہ بعض لوگ دوسرے کفارے یعنی مسلسل دو ماہ روزے رکھنے پر بھی قادر نہیں ہیں لہٰذا ایک اور متبادل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: " جب کوئی دو ماہ تک مسلسل روزے نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ (فمن لم یستطع فاطعام ستین مسکینا)۔ اطعام کے معنی یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اتنی غذا دے کہ کھانے والا سیر ہو جائے لیکن اسلامی روایات میں ایک مد طعام (ایرانی من کا چوتھا حصہ یا تقریباً ۷۵۰ گرام معین ہوا ہے) جب کہ بعض فقہا نے اسے دو مد (ڈیڑھ کلو) قرار دیا ہے۔[2]

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اس قسم کے کفاروں کے اصل مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" یہ اس لیے ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ"۔ (ذالک لتؤمنوا باللّٰہ ورسولہ)۔ جی ہاں! کفاروں کے ذریعہ گناہوں کی تلافی ایمان کے ستونوں اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرتی ہے اور انسان کو مقررات الٰہی کا علماً و عملاً پابند کرتی ہے۔ آیت کے آخر میں اس کے پیش نظر کہ تمام مسلمان اس مسئلہ کو ایک پختہ امر کے طور پر قبول کریں فرماتا ہے: " یہ احکام خدا کی حدود ہیں

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۷، ص ۲۷۱ سے رجوع فرمائیں (باب ۳ از ابواب بقیۃ الصوم الواجب)۔

[2] ہمارے فقہا کے درمیان جیسا کہ ہم نے کہا ہے مشہور وہی ایک مد ہے اور اس کی دلیل بہت سی روایات ہیں جو شاید حد تواتر تک ہوں جن میں سے بعض قتل خطا کے کفارے کے بارے میں اور بعض قسم کے کفارے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور بعض ماہ مبارک رمضان کے کفارے کے بارے میں اس ضمیمہ کے ساتھ کہ فقہا میں سے کسی نے کفاروں کی اقسام میں فرق نہیں رکھا لیکن مرحوم "شیخ طوسی" سے "خلاف"، "مبسوط"، "نہایۃ" اور "تبیان" میں منقول ہے کہ اس کی مقدار دو مد ہے اور اس سلسلہ میں ابو بصیر کی روایت سے استدلال کیا ہے جو کفارۂ ظہار کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے اور اس کی مقدار دو مد معین کرتی ہے لیکن یہ روایت یا تو کفارۂ ظہار سے مخصوص ہونی چاہیئے یا اگر ہم قبول کر لیں کہ فقہا کفاروں کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہوئے جیسا کہ واقعی ایسا ہے تو پھر اسے استحباب پر محمول کرنا چاہیئے۔

جو خدا کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور کافر ہو جائیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ (وتلک حدود الله وللکافرین عذاب الیم)۔ یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ لفظ کفر کے مختلف معانی ہیں جن میں سے ایک کفرِ عملی ہے یعنی معصیت و گناہ ہے اور زیرِ بحث آیت میں یہی معنی مُراد ہیں جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۹۷ میں ان لوگوں کے بارے میں جو فریضۂ حج بجا لاتے ہیں فرماتا ہے: ولله علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلاً و من کفر فان الله غنیّ عن العالمین "لوگوں پر لازم ہے کہ جو استطاعت رکھتے ہیں وہ خدا کے لیے اس کے گھر کا ارادہ کریں اور جو شخص کفر کرے (اور حج کو چھوڑ دے) اس نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے اور اللہ عالمین سے بے نیاز ہے"۔ "حد" اس چیز کے معنوں میں ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع ہے۔ اسی لیے مختلف ملکوں کی سرحدوں کو حُدود کہا جاتا ہے۔ احکامِ الٰہی کو اس لیے حدود کہتے ہیں کہ ان کو عبور کرنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تشریح پہلی جلد سُورہ بقرہ آیت ۱۸۷ کے ذیل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

بعض احکامِ ظہار

۱۔ ظہار کی رسم جس طرف قرآن مجید کی دو آیتوں میں (زیرِ بحث آیت اور سورۂ احزاب آیت ۴) اشارہ ہوا ہے، زمانۂ جاہلیت کے قبیح کاموں میں سے تھی۔ جب کوئی مرد اپنی بیوی سے اکتا جاتا تو اس غرض سے کہ عورت کو تنگ کرے یہ کہہ دیتا کہ (انت علیّ کظھر امی) "تُو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے"۔[1]

اس کے بعد وہ یہ سمجھتا تھا کہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی یہاں تک کہ وہ دوسرا شوہر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح وہ عضوِ معطل ہو کر رہ جاتی۔ اسلام نے اس اقدام کو، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، غلط قرار دیا اور اس کے بارے میں کفارہ کا حکم صادر کیا۔ لہٰذا اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے ظہار کرے تو اس کی بیوی حاکمِ شرع سے رجوع کر کے اس مرد سے یا تو طلاق حاصل کر سکتی ہے یا اسے ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ جانے کا پابند بنا سکتی ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کو بحال کرنے سے پہلے وہ کفارہ جو مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے اس مرد کو ادا کرنا ہوگا یعنی استطاعت کی صُورت میں غلام آزاد کرے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو مسلسل دو مہینے تک روزے رکھے اور اگر اس کی بھی مقدرت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اس طرح یہ کفارہ اصلاح و تربیت کا کام کرتا ہے۔

۲۔ ظہار گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اور مندرجہ بالا آیات کا لب ولہجہ اس پر گواہ ہے۔ یہ جو بعض فقہاؒ نے اسے صغائر میں شمار کیا ہے اور وہ اسے قابلِ معافی سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص کسی قسم کا بھی کفارہ ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو کیا صرف توبہ و استغفار پر اکتفا کر سکتا ہے اور ازدواجی زندگی کی طرف پلٹ سکتا ہے؟ فقہاؒ کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت اس حدیث پر انحصار کرتے ہوئے جو امام جعفر

---

[1] "ظھر" مندرجہ بالا عبارت میں جیسا کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے پُشت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کنایہ ہے اس رابطہ کا جو زوجیت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس جملہ کے معنی یہ ہوں گے، (تجھ سے زوجیت والا رابطہ اپنی ماں سے رابطے کی طرح ہے)۔ "لسان العرب" مادہ ظہر اور تفسیر خوارزمی کی طرف رجوع فرمائیں۔

صادق سے منقول ہے[1]

> اس نظریہ کی حامل ہے کہ دُوسرے کفاروں کے سلسلہ میں تو عدمِ استطاعت کی صُورت میں توبہ کفایت کر سکتی ہے لیکن کفارۂ ظہار میں کفایت نہیں کرتی لہٰذا طلاق کے ذریعہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کیا جائے۔ ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں توبہ و استغفار کفارہ کا بدل ثابت ہوں گے اور وہ اس کی دلیل ایک اور روایت سے پیش کرتے ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے[2]
>
> بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ بصُورتِ استطاعت اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں[3]

مذکورہ روایتوں کو ایک جگہ جمع کرنا بھی ممکن ہے، اس طرح سے کہ ہر طرح کے عدمِ استطاعت کی صورت میں ازدواجی زندگی کی طرف پلٹا جا سکتا ہے، اگرچہ مستحب ہے کہ ایسی صورت میں طلاق دے کر بیوی سے الگ ہو جائے (کیونکہ اس قسم کی جمع دونوں احادیث کے معتبر ہونے کی صُورت میں ایک واضح جمع ہے اور فقہ میں اس کی بہت سی نظائر ہیں)۔

۴۔ بہت سے فقہاؑ کا نظریہ ہے کہ اگر کئی مرتبہ ظہار کرے (یعنی مذکورہ جملے کی شدتِ قصد کے ساتھ تکرار کرے تو پھر اسے اتنے ہی کفارے دینے ہوں گے خواہ ایک ہی دفعہ تکرار صُورت پذیر ہو مگر یہ کہ تکرار سے اس کا مقصد صرف تاکید ہو نہ کہ نیا ظہار۔

۵۔ جب کفارہ ادا کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے جنسی اختلاط کرے تو دو کفارے دینے ہوں گے۔ ایک کفارہ ظہار کا اور دوسرا کفارہ ظہار کا کفارہ ادا کرنے سے پہلے جنسی اختلاط کا۔ اس حکم پر فقہا کے درمیان اتفاق رائے ہے۔ البتہ مذکورہ آیات اس کے بارے میں خاموش ہیں لیکن روایاتِ اہلبیت میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[4]

۶۔ ظہار کے بارے میں اسلام کا واضح اور قطعی طرزِ عمل اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ اسلام اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ خود غرض مرد ظالمانہ رسم و رواج سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے عورت کے حقوق کو پامال کریں، بلکہ وہ ہر اس غلط اور بے ہودہ رسم و رواج کو جو لوگوں میں رائج ہو، خواہ وہ کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو، ختم کرتا ہے۔

۷۔ ایک غلام کو آزاد کرنا جو ظہار کا پہلا کفارہ ہے علاوہ اس کے کہ وہ خُود غرض مردوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کی غلامی اور کنیزی کے ساتھ ایک پُر کشش مناسبت رکھتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ تمام ممکنہ طریقوں سے غلامی کی رسم کو ختم کرے لہٰذا نہ صرف کفارۂ ظہار میں بلکہ قتلِ خطا کے کفارے میں اسی طرح ماہِ رمضان کے روزے کے کفارے میں (جس نے عمداً روزہ نہ رکھا ہو)، اسی طرح قسم کی مخالفت کے کفارے میں یا نذر توڑنے کے بارے میں یہی اَمر وارد ہوا ہے جو غلاموں کی اصلی آزادی کو عملی حیثیت سے حقیقی بنانے کا خود ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

✧ ✧ ✧

---

[1] "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ ص ۵۵۴ (حدیث ۱ باب ۲)

[2] "وسائل الشیعہ" ص ۵۵۵ (حدیث ۴)

[3] "کنز العرفان" جلد ۱، ص ۲۹۲

[4] "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵، ص ۵۲۶ (حدیث ۱، ۳، ۴، ۵، ۶)

۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۚ

۶۔ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ
اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۚ

۷۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ مَا
يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا
هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ
اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ

۵۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسُول کے ساتھ دُشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے۔ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۶۔ جس دن خدا ان سب کو اُٹھائے گا اور ان اعمال سے جو انہوں نے انجام دیے ہیں انہیں باخبر کرے گا، وہ اعمال جن کا خدا نے احصا کیا ہے اور وہ انہیں بھول گئے ہیں اور خدا ہر چیز کا شاہد و ناظر ہے۔

۷۔ کیا تو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے خدا اسے جانتا ہے۔ کسی جگہ تین اشخاص آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کہیں پانچ افراد سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ اور اس سے کم تعداد میں اور نہ اس سے زیادہ تعداد میں مگر یہ کہ وہ ان کے ہمراہ ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

وہ جو خدا سے دشمنی کرتے ہیں

کیونکہ گزشتہ آیات کا آخری جملہ سب کے لیے خطرہ کا اشارہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی رعایت کی جائے اور ان سے تجاوز نہ کیا جائے، زیرِ بحث آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو نہ صرف یہ کہ ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اس طرح خدا، اس دنیا میں اور دوسرے جہان میں، ان لوگوں کے انجام کو ظاہر کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:
"جو لوگ خدا اور اس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہوں گے جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ ذلیل و خوار ہوئے۔"
(ان الّذین یحادون اللہ ورسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم)۔ "یحادون" "محادہ" کے مادہ سے ہے اور مسلح ہو کر لڑنے کے معنی میں ہے اور حدید یعنی لوہے سے مستفاد ہے اور غیر مسلح ہو کر لڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ محادہ کے معنی اصل میں ممانعت کے ہیں۔ اس کا مادہ حد ہے جو دو چیزوں کے درمیان مانع کی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے دربان کو حداد کہتے ہیں۔ دونوں معنی نتیجے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں اگرچہ دونوں دو مختلف اصل سے لیے گئے ہیں۔ "کبتوا" کا مادہ "کبت" (بروزن "ثبت") ہے۔ اس کے معنی مانع کے ہیں۔ ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان لوگوں کی سزا ذلت و خواری قرار دیتا ہے جو اس سے اور اس کے پیغمبر سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں۔ وہ ان کو اپنے لطف

بے پایاں سے محروم کر دیتا ہے۔[1]

یہ تعبیر اس تعبیر کی نظیر ہے جو سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۴ میں آئی ہے۔ جس میں ان افراد کے بارے میں، جو لوگوں کو مساجد میں نہیں جانے دیتے، عبادت سے روکتے ہیں اور دینِ حق سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، فرماتا ہے: لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم۔ "ان کے لیے دُنیا میں ذلّت و رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے: سورہ مائدہ کی آیت ۳۳ میں بھی اسی طرح ان لوگوں کے بارے میں جو خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں اور زمین میں فساد کریں، فرماتا ہے: ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم۔ "یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی کا باعث ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے"۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: "ہم نے واضح آیات نازل کیں" (وقد انزلنا اٰیات بیّنات)۔ اس سلسلہ میں کافی اتمامِ حجت ہوا ہے اور مخالفت کے لیے کوئی عُذر یا بہانہ باقی نہیں رہا۔ اس کے باوجود اگر مخالفت کریں تو پھر ان کو سزا ملنی چاہیے اور نہ صرف اس دنیا میں انہیں سزا دی جائے گی بلکہ "کفار کے لیے قیامت میں ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے" (وللکٰفرین عذاب مھین) تو اس طرح گزشتہ جملہ میں اُن کے دُنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہوا اور اس جملہ میں ان کے اُخروی عذاب کی طرف اشارہ ہے اور ان معانی پر شاہد (کما کبت الذین من قبلھم) (جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگ رُسوا ہوئے) کا جملہ ہے۔ بعد والی آیت بھی انہی معانی کی گواہی دیتی ہے۔ بہرحال یہ خدائی تہدید ان لوگوں کے بارے میں ہے جو پیغمبر اور قرآن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جنگ بدر و خندق و خیبر وغیرہ میں ذلت و خواری اور شکست سے دوچار ہو گئے تھے۔ آخرکار فتح مکہ نے ان کے اقتدار کی بساط اُلٹ دی اور اسلام ہر جگہ کامیاب ہوا۔ بعد والی آیت میں ان کے اُخروی عذاب کے وقوع کے زمانے کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے: "یہ ایسے دن ہو گا جب خدا ان کو قبروں سے اُٹھائے گا اور جو اعمال اُنہوں نے انجام دیے ہیں انہیں ان سے باخبر کرے گا۔ (یوم یبعثھم اللہ جمیعاً فینبئھم بما عملوا)[2]

جی ہاں خدا نے ان کے تمام اعمال کو شمار کیا ہے اگرچہ وہ خود اسے فراموش کر چکے ہیں۔ (احصاہ اللہ ونسوہ)۔ اسی وجہ سے جب ان کی نظر اپنے نامۂ اعمال پر پڑے گی تو ان کی فریاد بلند ہو گی مالھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الّا احصاھا "اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں جو اس میں منضبط نہ ہو۔ (کہف۔ ۴۹) اور یہ خود ایک دردناک عذاب ہے کہ خدا ان کے بھولے ہوئے گناہ ان کو یاد دلائے گا اور وہ میدانِ حشر میں تمام مخلوق کے سامنے رسوا ہوں گے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا ہر چیز کا شاہد اور ہر جگہ ناظر ہے"۔ (واللہ علیٰ کل شیءٍ شھید)۔ یہ درحقیقت بمنزلہ دلیل ہے اس چیز کے لیے جو گزشتہ جملے میں بیان ہوا ہے۔ جی ہاں! خدا کا حضور ہر جگہ اور ہر زمانے میں، خود ہمارے اندر اور باہر، اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ نہ صرف اعمال بلکہ وہ ہماری نیتوں اور عقائد کا بھی احصا کرتا ہے اور وہ عظیم دن جو "یوم البروز" ہے ان سب باتوں کو کھول دے گا تاکہ خود انسان بھی اور دوسرے بھی جان لیں کہ اگر سخت عذاب نازل ہوا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے بعد خدا کے ہر جگہ حاضر و ناظر

---

[1] بعض مفسرین نے "کبتوا" کو نفرین کے معنی میں لیا ہے۔ چونکہ خدائے قادرِ مطلق کی طرف سے کسی کے لیے نفرین اس بات کی دلیل ہے کہ جس گروہ کے خلاف نفرین ہے وہ ذلیل و خوار ہے لیکن آیت کی تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہے نہ کہ انشائیہ۔

[2] یوم ظرف ہے اور للکافرین سے متعلق ہے یا "مھین" سے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے اور بہت سے مفسرین نے اسی سے اتفاق کیا ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال تجویز کیا ہے کہ "اذکر" محذوف ہے۔ یہ بہت زیادہ محذوف نظر آتا ہے۔

ہونے اور ہر چیز سے آگاہ ہونے کی تاکید کے لیے مسئلہ نجویٰ کو موضوع بنا کر فرماتا ہے: "کیا تو نہیں جانتا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا اسے جانتا ہے" (الم تر ان اللہ یعلم ما فی السماوات وما فی الارض). اگرچہ روئے سخن یہاں پیغمبرؐ کی طرف ہے لیکن مراد تمام لوگ ہیں۔[1]

درحقیقت یہ مسئلہ نجویٰ کے بیان کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے: کبھی تین افراد آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور کبھی پانچ افراد آپس میں باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چھٹا ہوتا ہے۔ (ما یکون من نجوی ثلاثة الا هو رابعهم ولا خمسة الا هو سادسهم)۔[2]

اور نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ تعداد مگر یہ کہ خدا ان کے ہمراہ ہوتا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں (ولا ادنی من ذالک ولا اکثر الا هو معهم اینما کانوا)۔ پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا کیونکہ خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔ (ثم ینبئهم بما عملوا یوم القیامة ان اللہ بکل شیء علیم)۔

اس آیت میں چند نکات قابل توجہ ہیں

۱۔ نجویٰ اور نجات اصل میں بلند جگہ کے معنوں میں ہیں جو اپنے ارتفاع کی وجہ سے اپنے اطراف سے جدا ہوتی ہو اور چونکہ انسان جب چاہے کہ دوسرا اس کی باتوں سے آگاہ نہ ہو تو وہ ایسی جگہ جاتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو اس لیے سرگوشی کو نجویٰ کہتے ہیں یا پھر اس لحاظ سے کہ چونکہ نجویٰ کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اسرار دوسروں تک پہنچ جائیں لہٰذا وہ انہیں نجات بخشتا ہے۔

۲۔ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ نجویٰ حتمی طور پر تین یا تین سے زیادہ افراد کے مابین ہونا چاہیئے اور اگر صرف دو افراد کے درمیان ہو تو اسے (سرار) (بروزن کنار) کہتے ہیں لیکن یہ خود آیت کے ظہور کے خلاف ہے کیونکہ (ولا ادنی من ذالک) کا جملہ تین سے کم افراد یعنی دو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ البتہ جس وقت دو شخص آپس میں نجویٰ کریں تو ضروری ہے کہ تیسرا آدمی ان کے قریب موجود ہو ورنہ نجویٰ لازم نہیں آتا لیکن یہ بات جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ربط نہیں رکھتی۔

۳۔ قابل توجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں پہلے تین افراد کے نجویٰ کی اور پھر پانچ کے نجویٰ کی بات ہوئی ہے لیکن چار افراد کے نجویٰ کی جو ان دونوں کے درمیان ہے، بات نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ محض مثال کی بات ہے مگر بعض نے اس کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ کلام میں فصاحت و بلاغت کی رعایت رکھی گئی ہے اور تکرار سے پہلو بچایا گیا ہے اس لیے کہ اگر فرماتا کہ تین افراد نجویٰ کرتے ہیں تو خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور چار افراد نجویٰ کرتے ہیں تو خدا ان کا پانچواں ہوتا ہے تو چار کے عدد کی محض تکرار ہوتی اور یہ فصاحت سے بعید ہوتا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیات منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ٹھیک انہی اعداد کے مطابق تھے۔ یعنی تین اور پانچ کی تعداد میں تھے۔

۴۔ اس سے مراد کہ خدا چوتھا یا چھٹا ہے یہ ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز سے آگاہ ہے ورنہ اس کی پاک ذات نہ مکان

---

[1] "الم تر" رؤیت کے مادہ سے اصل میں حسی مشاہدہ کے معنی میں ہے لیکن بہت سے مواقع پر شہود قلبی بلکہ علم و آگاہی کے معنی میں آیا ہے۔

[2] "نجویٰ" اگرچہ مصدر ہے لیکن یہاں اسم فاعل کے معنوں میں ہے یا زید عدل (زید خود عدالت ہے) کے قبیل میں سے ہے۔

رکھتی ہے اور نہ اعداد کے حوالے سے اس کی تعریف و توصیف کی جا سکتی ہے۔ اس کی یگانگت بھی وحدت عددی نہیں ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ وہ مثل و نظیر اور شبیہ نہیں رکھتا۔

۵۔ آیت کے ذیل میں بات کو نجویٰ سے بھی اوپر لے جا کر کہتا ہے: "خدا ہر جگہ لوگوں کے ساتھ ہے اور قیامت کے دن ان کو ان کے اعمال سے باخبر کرے گا" آیت کو خدا کے احاطۂ علمی پر جا کر ختم کرتا ہے جیسا کہ آیت کی جو ابتدا ہے وہ تمام چیزوں کے بارے میں خدا کا احاطۂ علمی ہے۔

۶۔ بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ابن عباسؓ سے ایک شانِ نزول نقل کی ہے کہ یہ آیت تین افراد ربیعہ، حبیب اور صفوان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ خدا اس چیز کو جو ہم کہتے ہیں جانتا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کی کچھ مقدار کو جانتا ہے اور کچھ کو نہیں جانتا۔ تیسرے نے کہا: اگر کچھ مقدار کو جانتا ہے تو پھر ساری بات کو جانتا ہے (تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی) اور بتایا کہ خدا ہر نجویٰ میں موجود ہے اور آسمان و زمین کی ہر چیز سے آگاہ ہے تاکہ یہ دل کے اندھے اپنی غلط فہمی سے بچ جائیں۔[۱]

ایک نکتہ

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ خدا نہ جسم ہے اور نہ عوارضِ جسمانی رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے زمان و مکان کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم تصور کریں کہ اس کے لیے کوئی جگہ ہو جہاں حاضر و ناظر ہو تو ہم نے اسے محدود کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر چیز پر احاطۂ علمی رکھتا ہے باوجودیکہ اس کے لیے کوئی مکان متصور نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اس کے فرشتے ہر جگہ موجود ہیں جو تمام اقوال و اعمال کو سنتے اور دیکھتے ہیں اور ثبت کرتے ہیں اسی لیے اس آیت کی تفسیر میں ہم حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث سنتے ہیں:

(انما اراد بذالك استيلاء امنائه بالقدرة التى ركبها فيهم على جميع خلقه وان فعلهم فعله)

مراد یہ ہے کہ خدا کے امنا اس قدرت کی بنا پر جو انہیں بخشی گئی ہے اس کی ساری مخلوق پر تسلط رکھتے ہیں اور چونکہ ان کا فعل اُس کا فعل ہے لہٰذا اس حضور کی اُس کی طرف نسبت دی گئی ہے۔[۲]

البتہ یہ اس معاملہ کا ایک رُخ ہے لیکن دوسری جہت سے خود ذاتِ خدا کا حضور پیش کیا جا رہا ہے۔ ہم ایک اور حدیث میں دیکھتے ہیں کہ دُنیائے عیسائیت کے ایک بہت بڑے عالم نے امیر المومنین علی علیہ السلام سے پوچھا خدا کہاں ہے۔ فرمایا:

"هو هاهنا و هاهنا و فوق و تحت و محيط بنا و معنا و هو قوله ما يكون من نجوى

۱۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۶۵

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵۸ حدیث ۲۰۔

ثلاثة الّا هو رابعهم.....“

وہ اس جگہ ہے اور اس جگہ ہے وہ اوپر ہے نیچے ہے اور ہم پر احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور یہی معنی ہیں جن کے متعلق خدا کہتا ہے تین افراد آپس میں سرگوشی نہیں کرتے مگر یہ کہ خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے۔[1]

مشہور حدیث اہلیلجہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا کو سمیع کا نام جو دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تین افراد آپس میں نجویٰ نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

”یسمع دبیب النمل علی الصفا وخفقان الطیر فی الھواء لا یخفی علیہ خافیة ولا شیء مما ادرکه الاسماع والابصار وما لا تدرکه الاسماع والابصار ما جلّ من ذالك وما دق وما صغر وما کبر“

سخت پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی صدا وہ سنتا ہے اور فضا میں پرندوں کے پر مارنے کی آواز وہ سنتا ہے۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ شے جس کا کان اور آنکھیں ادراک کرتی ہیں اور وہ جس کا ادراک نہیں کرتیں چھوٹی اور بڑی سب کی سب اس کے لیے ظاہر و آشکار ہیں۔[2]

٭ ٭ ٭

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۱ حدیث ۲۳۔

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۲۵۸ حدیث ۲۱۔

۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا
نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ
اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ
حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○
۹۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○
۱۰۔ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ
بِضَآرِّهِمْ شَيْــــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۸۔ کیا تو نے نہیں دیکھا انہیں جن کو نجویٰ کی ممانعت کی گئی اس کے بعد اس کام کی طرف جس سے انہیں روکا گیا تھا لوٹ گئے اور گناہ و تعدی اور خدا کے رسول کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے سرگوشی کرتے ہیں اور جس وقت تیرے پاس آتے ہیں تو تجھے وہ سلام کرتے ہیں جو خدا نے

تجھے نہیں کیا اور دل میں کہتے ہیں کہ خدا کیوں ہمیں ہماری باتوں پر عذاب نہیں کرتا۔ جہنم ان کے لیے کافی ہے۔ اس میں وہ وارد ہوں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

۹۔ اے ایمان لانے والو جس وقت سرگوشی کرتے ہو تو گناہ، تعدی اور رسولِ خدا کی نافرمانی کے لیے نہ کرو اور اچھے کام اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کرو اور اُس خدا کی مخالفت سے، جس کی طرف تمہاری بازگشت ہے اور اس کے ہاں تمہیں جمع ہونا ہے، پرہیز کرو۔

۱۰۔ نجویٰ صرف شیطان کی طرف سے ہے، وہ چاہتا ہے کہ مومنین اس سے غمگین ہوں لیکن انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا مگر حکمِ خدا کے بغیر، اس لیے مومنین کو چاہیئے کہ وہ خدا پر توکل کریں۔

شانِ نزول

پہلی زیر بحث آیت کے بارے میں دو شانِ نزول نقل ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک آیت کے ایک حصہ سے مربوط ہے۔ پہلی یہ کہ یہودیوں اور منافقوں کی ایک جماعت مومنین سے علیحدہ آپس میں سرگوشی کرتی اور ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتی اور کبھی یہ کہ مومنین کو آنکھوں سے پریشان کن اشارے کرتی۔ جب مومنین یہ منظر دیکھتے تو کہتے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے عزیزوں اور رشتہ داروں کے بارے میں جو جہاد پر گئے ہوتے ہیں ان تک کوئی پریشان کن خبر پہنچی ہے۔ یہ اس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ یہ چیز مومنین کے غم و اندوہ کا باعث بنتی۔ جب انہوں نے یہ حرکت بار بار کی تو مومنین نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی۔ رسولِ خداؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص مسلمانوں کے سامنے ایک دوسرے سے سرگوشی نہ کرے تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (اور انہیں اس کام پر سختی سے سرزنش کی)۔[1]

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور بہت سی کتب تفسیر نے تحریر کیا ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور السلام علیک کی بجائے السام علیک یا اباالقاسم کہا۔ (اس کا مفہوم ہے تجھ پر موت یا ملامت وخستگی ہو)۔ پیغمبرؐ نے ان کے جواب میں فرمایا: وعلیکم (یہی چیز تم پر ہو)۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں: کہ میں اس مفہوم کی طرف متوجہ ہوئی اور میں نے کہا، علیکم السام ولعنکم اللّٰہ وغضب علیکم۔ تم پر موت وارد ہو، خدا تم پر غضب کرے تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

"نرمی سے کام لو اور سختی و بدگوئی سے پرہیز کرو"۔

تو میں نے کہا: کہ آپ نہیں سُن رہے تھے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ "تجھ پر موت ہو" فرمایا:

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۴۹

"کیا تُو نے نہیں سُنا کہ میں نے ان کے جواب میں علیکم کہا ہے۔"

یہ وہ موقع تھا کہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ "جس وقت یہ گروہ تمہارے پاس آتا ہے تو ایسا سلام کرتا ہے جیسا سلام خدا نے تم پر نہیں کیا۔[1]

تفسیر

ان آیات کی بحث اس طرح نجویٰ کے ان مباحث کا تسلسل ہے جو گزشتہ آیتوں میں تھے۔ پہلے فرماتا ہے:

"کیا تُو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں سرگوشی سے منع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کام کی طرف پلٹے جس کی ممانعت کی گئی تھی اور وہ گناہ، تعدی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کو انجام دینے کے لیے نجویٰ کرتے ہیں"۔

(الم تر الی الذین نھوا عن النجوٰی ثم یعودون لما نھوا عنہ و یتناجون بالاثم والعدوان و معصیت الرسول)۔ اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ نجویٰ سے پرہیز کریں۔ وہ ایسا کام ہے جو دوسروں یا بدگمانی اور پریشانی پیدا کرتا ہے لیکن انہوں نے، نہ صرف یہ کہ۔ اس حکم پر کان نہیں دھرا بلکہ اپنے نجویٰ کے لیے ایسے امور منتخب کیے جن میں گناہ کی انجام دہی تھی اور جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف تھے۔

اثم، عدوان اور معصیت الرسول میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ اثم ان گناہوں کو کہتے ہیں جو انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً (شراب پینا) اور عدوان ان امور کے لیے آتا ہے جو دوسروں کے حقوق کے سلسلہ میں تجاوز کا باعث ہوں۔ باقی رہی معصیت الرسول تو وہ ان فرامین سے تعلق رکھتی ہے جنہیں خود پیغمبرِ اسلام حکومتِ اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کی مصلحتوں کے سلسلہ میں صادر فرماتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنی سرگوشیوں میں ہر قسم کے غلط کاموں کو شامل کرتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ عمل خود انہی سے تعلق رکھتے تھے، یا دوسروں سے متعلق تھے، یا حکومتِ اسلامی اور ذاتِ پیغمبر سے ان کا تعلق تھا۔ "یعودون" اور "یتناجون" کی تعبیر جو فعل مضارع کی صورت میں آئی ہے، بتاتی ہے کہ وہ یہ کام بار بار کرتے تھے اور ان کا مقصد مومنین کے دلوں میں پریشانی اور شک پیدا کرنا تھا بہرحال مندرجہ بالا آیت ایک اخبارِ غیبی کے عنوان سے ان کے غلط اعمال کے چہرے سے پردہ اٹھاتی ہے اور ان کی راہ انحراف کا انکشاف کرتی ہے۔ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے منافقوں اور یہودیوں کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید ارشاد ہوتا ہے:

"اور جس وقت وہ تیرے پاس آتے ہیں تو ایسا سلام کرتے ہیں جیسا خدا نے تجھے نہیں کیا"۔

(واذا جاءوک حیوک بما لم یحیک بہ اللہ)۔ "حیوک" "تحیت" کے مادہ سے اصل میں حیات سے لیا گیا ہے اور سلامتی و زندگی تازہ کے لیے دُعا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں تحیتِ الٰہی سے مُراد وہی السلام علیک (یا سلام اللہ علیک) کا جملہ ہے جس سے ملتا جلتا جملہ قرآنی آیتوں میں پیغمبروں اور بہشتیوں کے لیے بارہا آیا ہے۔ منجملہ دیگر آیتوں کے ہم سورۂ صافات کی آیت ۱۸۱ میں دیکھتے ہیں وسلام علی المرسلین۔ "پروردگار کے تمام رسُولوں پر سلام"۔ باقی رہا وہ سلام جو خدا نے نہیں بتایا اور جو جائز نہیں تھا وہ السام علیکم کا جملہ تھا (تجھ پر موت یا ملامت و خستگی ہو)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے سلام کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ وہ کہتے تھے

---

[1] تفسیر مراغی جلد ۲۸ ص ۱۳

"انعم صباحًا" (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو)، (انعم مساءً) "تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو" بغیر اس کے کہ خدا کی طرف توجہ کرے اور اس سے اپنے مقابل کے لیے سلامتی طلب کرے۔

یہ صورت حال اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں تھی لیکن اس کا حرام ہونا ثابت نہیں ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں اسے پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اس طرح بادۂ غرور میں مست ہیں کہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر ہمارے اعمال بُرے ہیں اور خدا جانتا ہے تو ہماری باتوں کی وجہ سے ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کرتا (ویقولون فی انفسھم لولا یعذبنا اللہ بما نقول) اس طرح پیغمبر کی نبوّت پر اپنے ایمان کے نہ ہونے کو ثابت کرتے ہیں اور خدا کے علمی احاطہ پر بھی اپنے ایمان کے نہ ہونے کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتے ہیں لیکن قرآن ایک مختصر سے جملہ میں انہیں اس طرح جواب دیتا ہے: "جہنم ان کے لیے کافی ہے اور کسی اور عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہی جہنم جس میں وہ عنقریب داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی بُری جگہ ہے": (حسبھم جھنم یصلونھا فبئس المصیر)۔ بہرکیف یہ تعبیر اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ وہ دُنیاوی عذاب سے بچ جائیں گے اور اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ اگر کوئی اور عذاب، جہنم کے عذاب کے علاوہ، نہ بھی ہو تو یہ جہنم کا عذاب ہی ان کے لیے کافی ہے اور یہ اپنے تمام اعمال کا عذاب اکٹھا جہنم میں دیکھیں گے اور چونکہ مومنین کبھی کبھی ضرورت اور اپنی دلی خواہش کے ماتحت سرگوشی کرتے تھے لہٰذا بعد والی آیت میں روئے سخن ان کی طرف کرتے ہوئے۔ اس خیال کے پیش نظر کہ وہ اس کام میں منافقوں اور یہودیوں جیسے گناہوں میں آلودہ نہ ہوں، فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو! جس وقت تم نجویٰ کرو تو گناہ، تعدی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کے لیے نجویٰ نہ کرو تمہارے نجویٰ کا مضمون پاکیزہ ہو اور خوف خدا لیے ہوئے ہو۔ نیک کاموں اور تقوے کے لیے نجویٰ کرو": (یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان ومعصیت الرسول وتناجوا بالبر والتقوٰی)۔ اور خدا کی معصیت سے پرہیز کرو تم سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے": (واتقوا اللہ الذی الیہ تحشرون)۔ اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ نجویٰ اگر مومنین کے درمیان ہو تو وہ سُوئے ظن اور بدگمانی کے جذبات کو نہ اُبھارے، پریشانی پیدا نہ کرے اور اس کا نفس مضمون نیکیوں کی وصیت پر مبنی ہو پھر وہ جائز ہو لیکن اگر نجویٰ یہودیوں اور منافقوں کے درمیان واقع ہو، جس کا مقصد ہی پاکیزہ دل مومنین کو تکلیف پہنچانا ہے تب یہ عمل قبیح اور حرام ہے چہ جائیکہ اس کا نفس مضمون بھی شیطانی ہو۔ اس لیے بعد والی آیت میں جو زیر بحث آیتوں میں سے آخری آیت ہے مزید فرماتا ہے: "نجویٰ صرف شیطان کی طرف سے ہے۔ (انما النجوٰی من الشیطٰن)۔" اس مقصد کے پیش نظر کہ مومنین پریشان و غمگین ہوں" (لیحزن الذین اٰمنوا)۔ لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ شیطان اذنِ پروردگار کے بغیر مومنین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا (ولیس بضارھم شیئًا الا باذن اللہ)۔ عالم ہستی میں جو مؤثر بھی ہے اس کی تاثیر حکم خدا ہی سے ہے یہاں تک کہ آگ کا جلانا اور تلوار کا کاٹنا بھی اسی کے حکم کے ماتحت ہے۔ اگر جلیل حکم نہ دے تو خلیل کے حکم سے چھری نہیں کاٹتی۔ اسی لیے مومنین کو صرف خدا پر توکل کرنا چاہیئے اور اس کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ڈرنا چاہیئے اور اس کے غیر سے محبت نہ کی جائے (وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون)۔ وہ توکل کی روح اور خدا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اچھی طرح مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں اور شیطان کے پیروکاروں کے منصوبے کو ناکام بنا سکتے ہیں اور ان کی سازشوں کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ نجویٰ کی اقسام اور سرگوشی کی باتیں : یہ عمل فقہ اسلامی کے لحاظ سے شرائط کے اختلاف کے مطابق مختلف احکام رکھتا ہے اور اصطلاح کے مطابق پانچوں احکام میں تقسیم ہوتا ہے۔ یعنی کبھی حرام ہے اور وہ اس صورت میں کہ کسی مسلمان کی اذیت اور اس کے وقار کے برباد کرنے کا موجب ہو۔ (جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا تھا)۔ چونکہ اس کا مقصد مومنین کو غمگین کرنا ہے اس لیے ایسا نجویٰ شیطانی ہے۔ اس کے برعکس یہ کبھی واجب ہو جاتا ہے اور وہ اس صورت میں کہ جب کوئی ایسا مسئلہ زیر بحث ہو جس کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہو، اس کا افشا خطرناک ہو اور مسلمانوں کے حقوق کو برباد کرتا ہو۔ یہی نجویٰ کبھی مستحب ہو جاتا ہے وہ اس صورت میں کہ جب انسان اچھے نیک اور تقویٰ کے کاموں میں اسے اختیار کرے۔ اس طرح اس کے بارے میں کراہت اور اباحت کا حکم ہے۔ اصولی طور پر بات یہ ہے کہ اگر کوئی اہم ترین مقصد پیش نظر نہ ہو تو نجویٰ کرنا کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے اور آداب مجلس کے خلاف ہے کیونکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے بے اعتمادی اور بے اعتنائی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں :

اذا کنتم ثلاثة فلا يتناج اثنان دون صاحبهما فان ذالك يحزنه

جب تم تین افراد ایک جگہ ہو تو دو افراد تیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کرو کیونکہ یہ چیز تیسرے شخص کو غمگین کر دیتی ہے۔[۱]

ایک اور حدیث میں ابو سعید خدری سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پیغمبرؐ کے احکام کے اجرا کے لیے ایک رات کسی ضروری مقصد کے پیش نظر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانۂ اقدس کی طرف رواں تھے اور بہت سے افراد جمع ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا :

ما هٰذه النجوٰى الم تنهوا عن النجوٰى ؟

یہ کیا سرگوشی ہے کیا تمہیں نجویٰ سے منع نہیں کیا گیا ؟[۲]

دیگر متعدد روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان مومنین کو غمگین کرنے کے لیے ہر ذریعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے نہ صرف نجویٰ سے بلکہ خواب کے عالم میں کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے غم و اندوہ کا موجب ہوں۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ مومنین اس قسم کے مواقع پر خدا کی پاک ذات سے پناہ طلب کر کے اور اسی پر توکل کر کے اس قسم کے شیطانی محسوں کو اپنے سے دور کر سکتے ہیں۔[۳]

---

[۱] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیات زیر بحث، در المنثور جلد ۶ ص ۱۸۴ و اصول کافی جلد ۲ ص ۴۸۳ باب المناجات، حدیث ۱ - ۲۔

[۲] در المنثور جلد ۶ ص ۱۸۴

[۳] ان روایات سے آگاہی کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۱، ۲۶۲ حدیث ۳۱، ۳۲ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ خدا کا سلام کون سا ہے ؟

عام طور پر مجالس و محافل میں ورود کے موقع پر لوگ ایک دوسرے سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو احترام و محبت کی ترجمانی کرتی ہیں اور وہ اس کا نام " تحیت " رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام کو بھی خدا کی رضا کا حامل ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ معاشرت کے تمام آداب و رسوم کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے، سلام میں مقابل کے احترام و اکرام کے علاوہ خدا کی یاد بھی جھلکنی چاہیئے۔ جیسا کہ سلام کرتے وقت ہم اپنے مقابل کی سلامتی کی خدا سے استدعا کرتے ہیں۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں زیر بحث آیات کے ذیل میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ کے اصحابؓ کی ایک جماعت جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی تو انعم صباحاً و انعم مساءً کہتی ہوئی (تیری صبح راحت سے ہم کنار ہو اور تیرا وقت عصر راحت سے ہم کنار ہو)۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا سلام تھا۔ قرآن نے اس سے منع کیا اور رسولؐ خدا نے ان سے فرمایا کہ خدا نے ہمیں اس سے بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ وہ اہل بہشت کا سلام ہے :

" السلام علیکم [۱] جس کے معنی سلام اللہ علیکم ہیں۔ اسلامی سلام کا امتیاز یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ ذکرِ خُدا کو لیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف ہر قسم کی سلامتی کو پیش کرتا ہے۔ وہ دین و ایمان کی سلامتی ہو یا جسم و جان کی۔ سلام کا مقصد محض راحت و آسائش کی خواہش نہیں ہے [۲]

سلام اور اس کے آداب کے سلسلہ میں ہم سورۂ نساء کی آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیلی بحث پیش کر چکے ہیں۔ تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۸۱ سے آگے ملاحظہ فرمائیں۔

✤ ✤ ✤

---

[۱] تفسیر نور الثقلین حدیث ۳۰۔

[۲] کتاب " بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب " میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے سلام کی تفصیلی بحث اور انعم صباحاً و مساءً کے جملہ کی تفسیر مذکور ہے جلد ۲ ص ۱۹۴

۱۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت بخشو (نئے آنے والوں کو جگہ دو) تو اسے وسعت بخشو۔ خدا تمہارے لیے (جنت کو) وسعت دے گا۔ جب کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں عظیم درجات بخشے گا۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو

شانِ نزول

طبرسی نے مجمع البیان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں اور دوسرے مفسرین کی ایک جماعت نے تحریر کیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام ایک جمعہ کو "صفہ" (بڑا سا چبوترہ جو مسجد نبوی کے قریب تھا) پر تشریف فرما تھے اور ایک گروہ آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور جگہ تنگ تھی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عادت تھی کہ آپ مجاہدین بدر کا زیادہ احترام کرتے تھے خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار۔ اسی دوران بدریوں کا ایک گروہ آیا اس وقت دوسرے لوگ آپ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور جگہ خالی نہ تھی۔ وہ جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آئے تو انہوں نے سلام کیا۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب سلام دیا مگر وہ لوگ کھڑے رہے اور منتظر رہے کہ حاضرین انہیں جگہ دیں۔ لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ اُٹھا۔ یہ بات پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوار گزری۔ اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کچھ کی طرف آپ نے رُخ کیا اور فرمایا فلاں فلاں شخص کھڑا ہو جائے۔ اس طرح چند افراد کو آپ نے اُٹھایا تاکہ آنے والے بیٹھ سکیں (یہ ایک قسم کا ایمان اور جہاد میں سبقت کرنے والوں کے بارے میں ادب اور احترام کا درس تھا)۔ لیکن یہ بات ان چند افراد کو ناگوار گزری جو اپنی جگہ

سے اُٹھے تھے خفگی کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں تھے۔ منافقین جو ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتے تھے وہ کہنے لگے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاف سے کام نہیں لیا وہ لوگ جو عاشقانہ انداز میں آپؐ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے انہیں ان لوگوں کی خاطر جو مجلس میں بعد وارد ہوئے تھے اُٹھا دیا اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (اور مجلسوں میں بیٹھنے کے آداب کے کچھ حصّہ کی ان کے لیے شرح کی)[1]

تفسیر

مجالس میں پہلے آنے والوں کا احترام

اس حکم کے بعد جو گزشتہ آیات میں مجالس میں سرگوشی ترک کرنے اور اسے مخصوص مواقع تک محدود کرنے کے سلسلہ میں آیا تھا اس آیت میں ایک اور مجلسی ادب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو! جس وقت تم سے کہا جائے کہ مجلس کو وسعت دو اور نئے آنے والوں کو جگہ دو تو اس کی اطاعت کرو"

(یاایھا الذین اٰمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا)[2]

اگر ایسا کرو گے تو خدا تمہاری جگہ کو جنت میں وسعت بخشے گا اور اس جہان میں بھی تمہارے دل و جان اور رزق میں وسعت دے گا۔ (یفسح اللہ لکم)۔ "تفسحوا" "فسح" (بروزن قفل) کے مادہ سے ہے اور وسیع مکان کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "تفسح" وسعت دینے کے معنی میں ہے اور اسے آداب مجلس میں شامل سمجھنا چاہیئے۔ جس وقت کوئی نیا شخص مجلس میں وارد ہو تو حاضرین قریب قریب ہو جائیں اور اس کو جگہ دے دیں تاکہ وہ پریشان اور نادم نہ ہو۔ یہ موضوع محبت اور دوستی کے رشتوں کو محکم کرنے کے وسائل میں سے ہے یہ نجویٰ کے برعکس ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اور جو نفرت، بدبینی اور دشمنی کے عوامل میں سے ہے۔ قابل توجہ یہ ہے کہ قرآن مجید جو عظیم آسمانی کتاب ہے اور مسلمانوں کے بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے، اس نے اخلاقی مسائل اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بہت سی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے اہم اور بنیادی قوانین کے ذیل میں بھی ان جزئیات کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ مسلمان یہ تصور نہ کریں کہ ان کے لیے صرف کلی اصولوں کا پابند ہونا ہی کافی ہے۔ (یفسح اللہ لکم) "خدا تمہیں وسعت بخشے گا" کے جملے کی مفسرین کی ایک جماعت نے یہ تفسیر کی ہے کہ جنت کی مجالس کو وسعت دی جائے گی۔ یہ وہ اجر ہے جو خدا ان افراد کو دے گا جو اس جہان میں آداب مجلس کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے لہٰذا اس کا مفہوم وسیع اور خدا کی طرف سے ہر قسم کی وسعت بخشنے پر حاوی ہے اور وہ وسعت جنت میں ہو یا دنیا میں، رُوح و فکر میں ہو یا عمر اور زندگی میں، مال و متاع میں ہو یا رزق میں، یہ سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فضل خدا سے یہ بعید نہیں ہے کہ اس قسم کے چھوٹے سے کام کے صلہ میں وہ اس طرح کا عظیم اجر عطا کرے

---

[1] رُوح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۵ و مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۵۲۔ دُوسرے مفسرین رازی، قرطبی، سیوطی اور فی ظلال نے بھی یہی مفہوم زیر بحث آیت کے ذیل میں مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

[2] "تفسحوا" اور "فافسحوا" کی دو تعبیروں کا فرق جن میں سے ایک باب تفعل سے ہے اور دُوسری باب ثلاثی مجرد سے ہے شاید اس وجہ سے ہو کہ پہلی ایک قسم کے تکلف کی حامل ہے اور دوسری اس سے خالی ہے یعنی جب کہنے والا زحمت کرتے ہوئے کہے کہ نو وارد کو جگہ دو تو وہ زحمت کے احساس کے بغیر جگہ دے دیا کریں

کیونکہ اجر کی مقدار اس کے کرم پر منحصر ہے نہ کہ ہمارے اعمال پر۔ اور چونکہ کبھی مجلسوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کچھ افراد کے اٹھے بغیر دوسروں کے لیے جگہ نہیں بنتی یا اگر ہو تو ان کی ضرورت کے مطابق نہیں ہوتی لہٰذا آیت کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" جس وقت تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو" (واذا قیل انشزوا فانشزوا)[1]

نہ تو بہانے بناؤ اور نہ جس وقت اٹھو اس وقت پریشان ہو کیونکہ بعض اوقات نووارد افراد بیٹھنے کے تم سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں، زیادہ تھکن کی وجہ سے یا ضعیفی کی وجہ سے یا خاص احترام کی بنا پر یا اور کسی ایسے ہی سبب کی بنا پر۔ حاضرین کو چاہیئے کہ وہ ایثار سے کام لیں اور اس اسلامی ادب پر عمل پیرا ہوں جیسا کہ ہم نے شان نزول میں پڑھا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک جماعت کو، جو آپ کے قریب بیٹھی ہوئی تھی حکم دیا کہ اپنی جگہ ان نوواردوں کو دے دو جو مجاہدین بدر میں سے ہیں اور علم و فضل کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس بنا پر کہ " انشزوا " (اٹھ کھڑے ہو) یہاں مطلق ہے اس کی زیادہ وسیع معانی پر مبنی تفسیر کی ہے جس میں مجلس سے اٹھنا بھی شامل ہے اور یہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہونے اور نماز اور دوسرے امور خیر کے لیے مستعد ہونے کے معانی پر بھی حاوی ہے۔ لیکن اس سے پہلے جملے کی طرف توجہ سے، جس میں " فی المجالس " کی قید ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جملہ بھی اسی شرط کا پابند ہے جس کی تکرار سے، قرینہ کے موجود ہونے کی بنا پر، پرہیز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس حکم کے اجر کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" اگر ایسا کرو گے تو خدا ان لوگوں کو جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں۔ عظیم درجات بخشے گا" (یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات)[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان قوانین کی اطاعت ایمان و علم کی دلیل ہے۔ نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض افراد کو حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاؤ اور نووارد افراد کو جگہ دے دو تو یہ ایک ایسا مقدس مقصود ہے جس کا حکم خدا کی طرف سے ہے اور یہ ایمان و علم میں سبقت کرنے والوں کے احترام کی بنا پر ہے۔ "درجات" کی تعبیر (نکرہ کی شکل میں اور صیغہ جمع کے ساتھ) عظیم اور بلند مراتب کی طرف اشارہ ہے جو خدا اس قسم کے افراد کو عطا کرتا ہے جو علم و ایمان دونوں کے حامل ہوں۔ حقیقت میں وہ لوگ جو نووارد افراد کو اپنے پاس جگہ دیتے ہیں ایک درجہ پر فائز ہوتے ہیں اور جو ایثار سے کام لیں اور اپنی جگہ ان کو دے دیں اور وہ علم و معرفت سے بھی بہرہ ور ہوں تو ان کے لیے بہت سے درجات ہیں۔ اور چونکہ ایک گروہ ان آداب کو خلوص دل سے بروئے کار لاتا ہے لہٰذا آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے : " خدا اس سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے" (واللہ بما تعملون خبیر)۔

چند نکات

اگرچہ یہ آیت ایک خاص موقف کو لے کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ایک عام مفہوم بھی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ جو چیزیں

---

[1] " انشزوا " " نشز " (بروزن نصر) کے مادہ سے ہے جس کے معنی بلند زمین کے ہیں، اس لیے یہ لفظ اٹھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ " ناشزہ " اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو اس عورت سے بہتر سمجھتی ہو جو اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ یہ لفظ کبھی زندہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ یہ چیز کسی کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونے کا سبب بنتی ہے۔

[2] مندرجہ بالا آیت میں "یرفع" اس صیغہ امر کی وجہ سے مجزوم ہے جو اس سے پہلے ہے اور حقیقت میں مفہوم شرط رکھتا ہے اور یرفع اس کی جزا کے طور پر ہے

انسان کے رُتبہ کو خدا کی بارگاہ میں بلند کرتی ہیں وہ دو ہیں؛ ایک ایمان اور دُوسرے علم۔ ہمیں معلوم ہے کہ شہید کا اسلام میں بلند ترین مقام ہے لیکن اس کے باوجود ایک حدیث پیغمبرِ اسلام سے منقول ہے:

(فضل العالم علی الشهید درجة و فضل الشهید علی العابد درجة ...... و فضل العالم علیٰ سائر الناس کفضلی علیٰ ادناهم)

عالم شہید سے ایک درجہ بلند ہے اور شہید عابد سے ایک درجہ بلند ہے اور عالم کی فضیلت باقی لوگوں پر ان میں سے پست ترین کے مقابلے میں میری فضیلت جیسی ہے۔[۱]

ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

(من جائته منیته وهو یطلب العلم فبینه وبین الانبیاء درجة)

جس کو طالب علمی کے زمانہ میں موت آجائے اس کے اور انبیا کے درمیان صرف ایک درجہ کا فاصلہ ہے۔[۲]

ہمیں معلوم ہے کہ چاندنی راتوں میں خصوصاً مہینے کی چودھویں رات کو جب چاند بالکل مکمل ہوتا ہے ستارے چاند کے نور میں مدغم ہو جاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ عالم و عابد کے موازنہ میں ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

(فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب)

عالم کی عابد پر فضیلت و برتری چودھویں رات کے باقی تمام ستاروں پر برتری کے مانند ہے۔[۳]

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ عابد عبادت انجام دیتا ہے جو مقصدِ خلقت انسانی ہے لیکن رُوحِ عبادت معرفت الٰہی ہے لہٰذا عالم عابد پر حد سے زیادہ برتری رکھتا ہے۔ چونکہ مندرجہ بالا روایات میں عالم کی عابد کے مقابلہ میں فضیلت و برتری کے بارے میں آیا ہے اس سے مُراد ان دونوں کے درمیان ایک عظیم فاصلہ ہے اس لیے ایک دوسری حدیث میں ان دونوں کے فرق کے سلسلہ میں ایک درجہ کی بجائے سو درجہ کا فرق بیان ہوا ہے جس میں ہر درجہ کا فاصلہ دوسرے درجہ سے تیز رفتار گھوڑے کے ستر سال تک دَوڑنے کی مقدار کے برابر ہے۔[۴]

یہ بھی واضح ہے کہ قیامت میں شفاعت ہر شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ مقربانِ بارگاہِ خدا کا مقام ہے لیکن ہمیں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے:

(یشفع یوم القیامة ثلاثة الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء)[۵]

قیامت میں تین گروہ شفاعت کریں گے انبیا ان کے بعد علما اور پھر شہدا۔

حقیقت میں راہِ خُدا پر چلنا، خوشنودی خُدا کا حاصل کرنا اور اس کے قرب کی توفیق کا حصول دو عوامل کا مرہونِ منت ہے ایک تو ایمان و عمل، دوسرے آگاہی و تقویٰ جس میں سے کوئی بھی دُوسرے کے بغیر ہدایت و کامیابی حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۱، ۲۔ "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۵۳

۳، ۴۔ جوامع الجامع مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۴۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۷۵

۵۔ رُوح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۶۔ قرطبی جلد ۹ ص ۶۴۷۰

۲. آدابِ مجلس

قرآن کریم میں بارہا اہم مسائل کے ساتھ ساتھ مجالس کے اسلامی آداب کی طرف اشارے ہوئے ہیں. مثال کے طور پر سلام کرنے کے آداب، دعوتِ طعام کے آداب، پیغمبرؐ کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب، نوواردوں کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب، علی الخصوص فضیلت کے حامل افراد اور ایمان کی طرف سبقت کرنے والے افراد کو مجلس میں جگہ دینے کے آداب[1]

اس بات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہر موضوع کے لیے اس کے مقام کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا قائل ہے. اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ انسانی معاشرت کے آداب کچھ افراد کی بے اعتنائی کی وجہ سے پامال کر دیئے جائیں. کتب احادیث میں سینکڑوں روایات پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین سے دوسروں کے ساتھ معاشرت کے آداب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور مرحوم شیخ "حر عاملی" نے انہیں کتاب وسائل کی جلد آٹھ باب ۱۶۶ میں جمع کر دیا ہے اور جو جزئیات ان روایات میں ہیں وہ بتاتی ہیں کہ اسلام اس سلسلہ میں کس حد تک باریک بین اور سخت گیر ہے. ان روایات میں بیٹھنے، بات کرنے، مسکرانے، مذاق کرنے، کھانا کھلانے، خط لکھنے حتیٰ کہ دوستوں کی طرف نگاہ کرنے کے بارے میں بھی روایات مل جاتی ہیں اور جو احکام ہر موضوع پر دیے گئے ہیں ان کا نقل کرنا ہمیں تفسیری بحث کے دائرہ سے خارج کر دے گا. ہم حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں.

(لیجتمع فی قلبک الافتقار الی الناس والاستغناء عنهم یکون افتقارک الیهم فی لین کلامک وحسن سیرتک ویکون استغنائک عنهم نزاهة عرضک وبقاء عزک).

"تیرے دل میں لوگوں کے لیے نیاز مندی و حاجت مندی اور بے نیازی و بے احتیاجی دونوں موجود ہونے چاہئیں. تیری نیاز مندی و حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حُسنِ سلوک کے ذریعے ظاہر ہو اور تیری بے نیازی و بے احتیاجی حفظِ آبرو اور عزتِ نفس کے ذریعہ جلوہ گر ہو"[2]

❖ ❖ ❖

---

[1] یہ احکام ترتیب کے ساتھ درج ذیل آیات میں آئے ہیں. سلام کرنے کے آداب سورۂ نساء آیت ۸۶. دعوتِ طعام کے آداب سورۂ احزاب ۵۳. پیغمبرؐ سے گفتگو کرنے کے آداب حجرات آیت ۲ اور مجلس میں جگہ دینے کے آداب زیر بحث آیت میں.

[2] "وسائل الشیعہ" جلد ۸، ص ۴۰۱.

۱۲۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا نَٰجَيْتُمُ ٱلرَّسُولَ فَقَدِّمُوا۟ بَيْنَ
يَدَىْ نَجْوَىٰكُمْ صَدَقَةً ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ
فَإِن لَّمْ تَجِدُوا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

۱۳۔ ءَأَشْفَقْتُمْ أَن تُقَدِّمُوا۟ بَيْنَ يَدَىْ نَجْوَىٰكُمْ صَدَقَٰتٍ ۚ
فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا۟ وَتَابَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ
وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۱۲۔ اے ایمان لانے والو! جس وقت تم چاہو کہ رسولِ خدا کے ساتھ نجویٰ کرو تو اس سے پہلے (راہِ خدا میں) صدقہ دے دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ بات ہے اور اگر استطاعت نہ رکھتے ہو تو خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۳۔ کیا ڈر گئے ہو کہ فقیر ہو جاؤ گے جو تم نے سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب جب کہ یہ کام تم نے نہیں کیا اور خدا نے تمہاری توبہ کو قبول کر لیا ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور خُدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو۔ (جان لو) کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو باخبر ہے۔

شانِ نزول

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اور دیگر مشہور مفسرین کی ایک جماعت نے ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ اغنیا کا ایک گروہ محفلِ پیغمبرؐ میں آکر آپ سے نجویٰ کیا کرتا تھا۔ (یہ کام علاوہ اس کے کہ پیغمبرؐ کے قیمتی وقت کے بے جا صرف کا سبب بنتا غریبوں کی پریشانی اور امیر لوگوں کے ایک قسم کے امتیاز کا باعث بھی بنتا)۔ اس موقع کے لیے پروردگارِ عالم نے مندرجہ بالا آیات نازل کیں اور انہیں حکم دیا کہ پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے سے پہلے حاجت مندوں کو صدقہ دیا کرو۔ اغنیا نے جب یہ دیکھا تو نجویٰ سے احتراز برتنے لگے اس پر دوسری آیت نازل ہوئی (انہیں ملامت کی اور پہلے حکم کو منسوخ کیا)۔ اور سب کو نجویٰ کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن نجویٰ صرف وہی جو اطاعت پروردگار کے سلسلہ میں ہو۔[۱]

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ نجویٰ کرنے والے گروہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح دوسروں کے مقابلہ میں برتری حاصل کریں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنی مخصوص بزرگانہ حیثیت کے پیشِ نظر باوجود اس کے کہ وہ اس بات سے ناخوش تھے ان لوگوں کو اس سرگوشی سے منع نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ قرآن نے ان لوگوں کو اس کام سے منع کیا۔[۲]

تفسیر

ایک جاذبِ توجہ امتحان

گزشتہ آیات کے ایک حصہ میں نجویٰ کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ بحث آیات اسی مفہوم کو جاری و ساری رکھتی ہیں اور ا... کرتی ہیں پہلے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو! تم جب چاہو کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے نجویٰ کرو تو اس سے پہلے راہِ خدا میں صدقہ دے دو" (یاایھا الذین اٰمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجواکم صدقۃ)۔ جیسا کہ شانِ نزول میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ حکم اس لیے تھا کہ لوگوں کا ایک گروہ خصوصاً اغنیا پیغمبرؐ سے نجویٰ کرتے اور ان کو مصروف رکھتے۔ یہ ایسا کام تھا جو دوسروں کے لیے غم و اندوہ کا باعث بنتا تھا اور نجویٰ کرنے والوں کے لیے سببِ امتیاز ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں پیغمبرِ اسلامؐ کے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا سبب بھی بنتا تھا تو مندرجہ بالا حکم نازل ہوا۔ یہ حکم ان کے لیے ایک آزمائش، حاجت مندوں کے لیے مدد کا باعث اور مذکورہ زحمتوں کے کم کرنے کا ایک موثر ذریعہ تھا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"یہ تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے" (ذالک خیر لکم واطھر)۔ صدقہ کا اغنیا کے لیے خیر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ موجبِ ثواب تھا اور حاجت مندوں کے واسطے اس لیے کہ ان کی مدد کا ذریعہ تھا۔ باقی رہا اطہر ہونا تو وہ اس وجہ سے تھا کہ وہ

۱۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۵۱ اور بہت سی تفاسیر در ذیل آیات زیرِ بحث۔

۲۔ روح المعانی جلد ۲۸ ص ۲۸

اغنیاء کے دلوں سے مال کی محبت کو دھوتا تھا اور حاجت مندوں کے دلوں سے کینے اور پریشانی کو دُور کرتا تھا۔ نجویٰ جب مُفت نہ ہو سکتا اور صدقہ کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہوتا تو خُود بخود کم ہو جاتا جیسا کہ کم ہوا۔ لہٰذا یہ چیز مسلمانوں کے فکری اور اجتماعی ماحول کے لیے ایک قسم کی پاکیزگی بن گئی۔ لیکن اگر نجویٰ سے پہلے صدقہ کا وجوب عمومیت رکھتا تو پھر فقراء اہم مسائل یا اپنی ضرورتیں پیغمبرؐ کی بارگاہ میں پیش کرنے سے قاصر رہ جاتے۔ لہٰذا آیت کے ذیل میں صدقہ کا حکم اس گروہ سے واپس لیتے ہوئے فرماتا ہے :

" اور اگر استطاعت نہ رکھتے ہوں تو خدا غفور الرحیم ہے " (فان لم تجدوا فان اللّٰہ غفور رحیم)۔ اس طرح جو لوگ مالی اعتبار سے مضبوط تھے ان کے لیے نجویٰ سے پہلے صدقہ دینا واجب تھا اور جن کی مالی حالت اچھی نہ تھی وہ صدقہ کے بغیر نجویٰ کر سکتے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا حکم نے ایک عجیب تاثیر پیدا کی اور ایک عمدہ آزمائش پیش کی۔ ایک شخص کے علاوہ سب نے صدقہ دینے اور نجویٰ کرنے سے پہلوتہی کی اور وہ ایک شخص حضرت علی علیہ السلام تھے۔ یہ وہ مقام تھا کہ جہاں جس چیز کی وضاحت اور اس کے نمایاں ہونے کی ضرورت تھی وہ واضح ہو گئی اور جو کچھ مسلمانوں کو اس حکم سے سمجھنا چاہیئے تھا اور درس لینا چاہیئے تھا اس کو انہوں نے سمجھا اور درس لیا۔ لہٰذا بعد والی آیت نازل ہوئی اور اس حکم کو منسوخ کر دیا اور یہ حکم پیش کیا :

" کیا تم ڈر گئے کہ فقیر ہو جاؤ گے جس کی وجہ سے نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے تم نے احتراز کیا۔ (ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات)۔ معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت تمہارے دل میں پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے کے لگاؤ سے زیادہ پرکشش ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان سرگوشیوں میں عام طور پر زندگی کے مسائل موضوع گفتگو نہیں ہوتے تھے ورنہ کیا مانع تھا جو لوگ نجویٰ کرنے سے پہلے صدقہ دے دیتے اور پھر نجویٰ کرتے خصوصاً جب کہ صدقہ کے لیے کوئی مقدار بھی مقرر نہیں تھی اور وہ تھوڑی سی رقم سے اس مشکل کو حل کر سکتے تھے پھر مزید فرماتا ہے :

" اب جب کہ تم نے یہ کام نہیں کیا اور خود تم اپنی کوتاہی کو بھانپ چکے ہو اور خدا نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے اور تمہاری توبہ قبول کر لی ہے تو نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے "

(فاذ لم تفعلوا وتاب اللّٰہ علیکم فاقیموا الصلٰوۃ واٰتوا الزکٰوۃ واطیعوا اللّٰہ ورسولہ واللّٰہ خبیر بما تعملون)۔

توبہ کی تعبیر بتاتی ہے کہ وہ گزشتہ نجووں میں گناہ کے مرتکب ہوتے تھے خواہ ریاکاری کی بنا پر یا پیغمبرؐ کو تکلیف پہنچانے کی وجہ سے یا فقیر مومنین کو اذیت دے کر۔ اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ گفتگو نجویٰ کے جواز میں نہیں ہوئی لیکن اس آیت کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ پہلا حکم اُٹھا لیا گیا۔ جہاں تک نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور خدا و پیغمبرؐ کی اطاعت کرنے کا معاملہ ہے تو وہ ان امور کی اہمیت کی بنا پر ہے نیز اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اس کے بعد سرگوشی کرو تو وہ ان عظیم مقاصد کے حصول کے لیے ہو اور خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی راہ میں ہو۔

چند نکات

۱۔ آیہ نجویٰ و صدقہ پر عمل کرنے والا تنہا شخص

اکثر شیعہ اور اہل سُنّت مفسرین نے لکھا ہے کہ اکیلا وہ شخص جس نے اس آیت پر عمل کیا وہ امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام تھے

جیسا کہ طبرسی ایک روایت میں خود آنجناب سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

(آیة من کتاب اللہ لم یعمل بها احد قبلی ولا یعمل بها احد بعدی کان لی دینار فصرفته بعشرة دراهم فکنت اذا جئت الی النبی تصدقت بدرهم)

قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جس پر نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا ہے اور نہ کوئی میرے بعد عمل کرے گا میرے پاس ایک دینار تھا۔ میں نے اسے دس درھموں میں تبدیل کرلیا۔ جس وقت میں چاہتا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجویٰ کروں تو ایک درہم صدقہ میں دے دیتا۔[۱]

یہی مضمون شوکانی نے عبدالرزاق، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔[۲]

فخر رازی نے بھی اس حدیث کو کہ وہ اکیلا شخص، جس نے مندرجہ بالا آیت پر عمل کیا، حضرت علی علیہ السلام تھے، محدثین کی جماعت کے ذریعہ ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔[۳]

دُرالمنثور میں بھی متعدد روایات مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں اسی معنی میں آئی ہیں۔[۴]

تفسیر رُوح البیان میں عبداللہ ابن عمر بن خطاب سے منقول ہے کہ:

(کان لعلی ثلاث لو کانت لی واحدة منهن کانت احب الی من حمر النعم تزویجه فاطمه واعطائه الرایة یوم خیبر وآیة النجوی)

حضرت علی علیہ السلام کی تین ایسی فضیلتیں ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہوجاتی تو سُرخ بالوں والے اُونٹوں سے بہتر تھی (یہ تعبیر عربوں میں گراں بہا مال کی طرف اشارہ کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسے ضرب المثل کے طور پر کسی چیز کے بہت ہی نفیس ہونے کے بیان کے وقت استعمال کرتے ہیں)۔ پہلی فضیلت یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شادی ان سے کرنا، دوسرے خیبر کے دن علم ان کو عطا کرنا اور تیسری آیۂ نجویٰ۔[۵]

حضرت علی علیہ السلام کے لیے اس عظیم فضیلت کا ثابت ہونا اکثر کتب تفسیر وحدیث میں آیا ہے اور اس طرح مشہور و معروف ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

۱۔ طبرسی جلد ۲۸ ص ۱۵

۲۔ تفسیر البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱ ص ۳۰۵، سید قطب نے بھی یہی روایت فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۱ پر نقل کی ہے۔

۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۷۱

۴۔ درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۵

۵۔ تفسیر رُوح البیان ج ۹ ص ۴۰۶ (اس حدیث کو طبرسی نے مجمع البیان میں، زمخشری نے کشاف میں اور قرطبی نے تفسیر جامع میں زیر بحث آیات کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

۲۔ نجویٰ سے پہلے صدقہ کی تشریع اور پھر نسخ کا فلسفہ

پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے سے پہلے وجوب صدقہ کی تشریع کیوں ہوئی اور پھر تھوڑی سی مدت کے بعد وہ کیوں منسوخ ہوگیا؟ اس سوال کا جواب مندرجہ بالا آیت اور اس کی شان نزول میں موجود قرائن سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ مقصد ان بلند بانگ دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش تھا جو اس طریقے سے پیغمبرؐ سے ایک خاص لگاؤ کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ معلوم ہوگیا کہ یہ لگاؤ اور محبت کا اظہار صرف اس صورت میں تھا جب تک نجویٰ مفت تھا لیکن جس وقت تھوڑا سا مال خرچ کرنا پڑ گیا تو محبت کے اظہار کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ اس بات سے قطع نظر اس حکم نے مسلمانوں پر ہمیشہ اثر کیا اور ان پر واضح کر دیا کہ جب تک ضرورت نہ ہو پیغمبرؐ اور دوسرے عظیم اسلامی رہبروں کا گراں بہا وقت نجویٰ اور سرگوشی میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کی تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہیئے۔ درحقیقت یہ آئندہ کی سرگوشیوں کو قابو میں لانے کا ایک عمل تھا۔ اس بنا پر مذکورہ حکم ابتدا میں ایک عارضی و وقتی پہلو رکھتا تھا لیکن جب اس کا مقصد پورا ہوگیا تو وہ منسوخ ہوگیا کیونکہ اس کو برقرار رکھنا بھی مشکل پیدا کر دیتا۔ بعض اوقات ضروری مسائل پیش آتے ہیں جن میں ضروری ہوتا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انہیں پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا جائے چنانچہ اگر صدقہ کا حکم باقی رہ جاتا تو اکثر اوقات ان ضرورتوں کے تقاضے پورے نہ ہوتے اور اس طرح اسلامی معاشرہ کو نقصان پہنچتا۔

موارد نسخ میں کلی طور پر حکم ہمیشہ پہلے ہی سے محدود اور وقتی پہلو رکھتا تھا۔ اگرچہ لوگ بعض اوقات اس معنی سے آگاہ نہ ہوتے اور اسے حکم سمجھ لیتے جو ہمیشہ کے لیے ہو۔

۳۔ کیا یہ فضیلت تھی؟

اس میں شک نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دولت مندوں کے زمرہ میں داخل نہیں تھے آپ کی زندگی سادہ اور زاہدانہ تھی۔ اس کے باوجود اس حکم الٰہی کے احترام میں اس مختصر سی مدت میں آپ نے چند مرتبہ صدقہ دیا اور ضروری مسائل نجویٰ کے ذریعہ پیغمبرؐ کے سامنے رکھے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ مسئلہ مفسرین اور ارباب حدیث کے درمیان طے شدہ اور مسلّم ہے لیکن بعض لوگ اس حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کے افضل ہونے کا انکار کریں۔ وہ منجملہ دیگر باتوں کے یہ کہتے ہیں کہ اگر بزرگان صحابہؓ نے یہ اقدام نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی یا ان کے پاس کافی وقت نہیں تھا یا وہ خیال کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فقراء کی تکلیف و پریشانی اور اغنیاء کی وحشت کا سبب بنے اس بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے یہ اقدام کسی فضیلت اور دوسروں سے سلب فضیلت کا سبب نہیں ہے[1]

لیکن انہوں نے دوسری آیت کے معنی پر غور نہیں کیا جس میں خدا سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے: (ءاشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات) "کیا تم فقر و فاقہ سے ڈر گئے ہو اور تم نے بخل کیا ہے جو نجویٰ کے لیے صدقہ نہیں دیا"۔ یہاں تک کہ آیت کے ذیل میں توبہ کا ذکر آیا ہے جو واضح طور پر ان معانی پر دلالت کرتا ہے کہ صدقہ دے کر پیغمبرؐ سے نجویٰ کا اقدام کرنا ایک

---

[1] تفسیر فخر رازی "روح البیان" آیات زیر بحث کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

پسندیدہ کام تھا ورنہ توبہ اور سرزنش کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے جانے پہچانے افراد کی ایک جماعت اس واقعہ سے پہلے پیغمبرؐ سے نجویٰ کرتی تھی (کیونکہ عام اور دور افتادہ افراد یہ اقدام بہت کم کرتے تھے) لیکن انہی مشہور صحابہ نے صدقہ کے حکم کے بعد نجویٰ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ تنہا شخص جس نے اس حکم کا احترام کیا اور اسے عملی جامہ پہنایا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے۔ اس میں کون سی قباحت ہوگی کہ ہم واضح آیات اور روایات کے پیش نظر جو اس سلسلہ میں مختلف اسلامی کتب میں مندرج ہیں انہیں قبول کر لیں اور کمزور و بے بنیاد احتمالات کی بنا پر ایک حقیقت کو نظر انداز نہ کریں اور عبداللہ ابن عمر کے ہمنوا بن جائیں جو اس فضیلت کو حضرت فاطمہ علیہا السلام کے ساتھ تزویج اور فتح خیبر کے دن کی علمداری سے مربوط اور حمر النعم (سرخ رنگ کے اونٹ) سے افضل و برتر سمجھتے ہیں۔

۴۔ مدت حکم اور مقدارِ صدقہ

مندرجہ بالا حکم یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نجویٰ کرنے سے پہلے صدقہ کا وجوب کتنی مدت پر حاوی ہو کر منسوخ ہوا، اس سلسلہ میں مختلف قول نقل ہوئے ہیں۔ بعض اس کو صرف ایک گھنٹے اور بعض ایک رات تک محدود سمجھتے ہیں اور بعض اس مدت کو دس دن پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ صحیح تیسرا قول ہی ہے کیونکہ ایک گھنٹہ یا ایک رات اس قسم کے امتحانی حکم کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ اس مختصر سی مدت میں نجویٰ کے لیے کوئی سبب پیش نہیں آیا لیکن دس دن کی مدت حقائق کو واضح کر سکتی ہے اور اس حکم سے تخلف کرنے والوں کے لیے ملامت و سرزنش کے اسباب فراہم کر سکتی ہے۔ جہاں تک صدقہ کی مقدار کا تعلق ہے تو آیت میں اس کو معین نہیں کیا گیا اور اسلامی روایات کے مطالعہ سے بھی کوئی مقدار دستیاب نہیں ہوتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لیے ایک درہم بھی کفایت کرتا تھا۔

❖ ❖ ❖

۱۴- اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ
مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ۝
۱۵- اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝
۱۶- اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝
۱۷- لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
۱۸- يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ
لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝
۱۹- اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ

أُولَٰٓئِكَ حِزۡبُ ٱلشَّيۡطَٰنِۚ أَلَآ إِنَّ حِزۡبَ ٱلشَّيۡطَٰنِ هُمُ ٱلۡخَٰسِرُونَ ۝

ترجمہ

۱۴۔ کیا تُو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان افراد کے ساتھ دوستی کرلی ہے جو محلِ غضبِ خُدا ہیں یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے جھوٹی قسم کھاتے ہیں (کہ وُہ تم میں سے ہیں) حالانکہ وہ خود جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں)۔

۱۵۔ خُدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کر رکھا ہے کیونکہ جن اعمال کو وہ انجام دیتے ہیں وُہ بُرے ہیں

۱۶۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال قرار دیا ہے اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روک رکھا ہے لہٰذا ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے۔

۱۷۔ انکے مال اور اولاد کسی طرح بھی انہیں عذاب الٰہی سے محفوظ نہیں رکھ سکتے وہ اصحاب آتش ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

۱۸۔ یاد کرو اس دن کو جب خُدا سب کو قبروں سے اُٹھائے گا وہ خدا کے لیے بھی جھوٹی قسم کھائیں گے۔ جس طرح (آج) تمہارے لیے قسم کھاتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ (ان جھوٹی قسموں کے ساتھ) کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔ وہ جھوٹے ہیں۔

۱۹۔ شیطان ان پر غالب آچکا ہے اور خُدا کی یاد ان کے دلوں سے نکال کرلے گیا ہے۔ وہ شیطان کا گروہ ہیں۔ جان لو کہ شیطان کا گروہ ہی خسارے میں ہے۔

تفسیر

حزب شیطان

یہ آیات منافقین کی بعض سازشوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور ان کی نشانیوں کے ساتھ مسلمانوں سے ان کا تعارف کراتی ہیں۔ نجویٰ کی آیات کے بعد اس چیز کا عنوان کلام بننا شاید اس مناسبت سے ہے کہ پیغمبرؐ سے نجویٰ کرنے والوں میں کچھ منافق افراد بھی تھے جو اس چیز کو اپنی سازشوں پر پردہ ڈالنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہار قرب کے لیے استعمال کرتے تھے اور یہی بات سبب بنی کہ قرآن ایک امر کلی کی شکل میں اس کو پیش کرتا ہے۔ پروردگار عالم پہلے فرماتا ہے :

"کیا تُو نے ان افراد کو نہیں دیکھا جو ایسی قوم سے دوستی کی طرح ڈالتے ہیں جس پر خدا نے غضب کیا ہے": الم تر الی الذین تولوا قوماً غضب اللّٰہ علیهم)۔ یہ مغضوب علیهم قوم واضح طور پر قوم یہود تھی جس کا سُورۂ مائدہ آیت ۶۰ میں اسی عنوان سے تعارف ہوا ہے۔ وہاں یہودیوں کے بارے میں پروردگار عالم فرماتا ہے :

قل هل انبئکم بشر من ذالك مثوبة عند اللّٰہ من لعنه اللّٰہ وغضب علیه ...: "کہہ دے کیا تمہیں ان افراد سے باخبر کروں جن کی وضع وکیفیت اس سے زیادہ بُری ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور انہیں موردِ غضب قرار دیا ہے"۔
اس کے بعد مزید فرماتا ہے :

"یہ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے (یہود) (ماهم منکم ولا منهم)۔ نہ مشکلات میں اور نہ پریشانیوں میں تمہارے مددگار ہیں؛ نہ ان کے کوئی جگری دوست ہیں بلکہ منافق ہیں جو ہر روز رُخ بدل لیتے ہیں اور ہر روز نئی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔
یہ تعبیر سُورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ کے ساتھ منافات نہیں رکھتی جو کہتی ہے : ومن یتولهم منکم فانه منهم۔ جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی اور محبت کرے وہ انہی میں سے ہے اس لیے کہ وہ تمہارے دشمنوں میں شمار ہوں گے اگرچہ حقیقتاً ان کا جز شمار نہ ہوں۔
اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے : "تم سے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے قسم کھاتے ہیں لیکن جھوٹی قسم جسے وہ خود بھی جانتے ہیں (ویحلفون علی الکذب وهم یعلمون)۔ یہ منافقین کے طور طریقے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے قبیح اور قابلِ نفرت چہرہ کو چھپانے کے لیے جھوٹی قسموں کی پناہ لیتے ہیں جب کہ ان کا عمل ان کا بہترین تعارف کراتا ہے۔ اس کے بعد ان ہٹ دھرم منافقین پر نازل ہونے والے عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"خدا نے ان کے لیے عذاب شدید تیار کیا ہے": (اعد اللّٰہ لهم عذاباً شدیداً)۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ عذاب عادلانہ ہے کیونکہ وہ بُرے اعمال بجالاتے ہیں۔ (انهم ساء ما کانوا یعملون)۔ اس کے بعد ان منافقین کی علامتوں کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے :

"اُنہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکے رکھیں" (اتخذوا ایمانهم جنة فصدوا عن سبیل اللّٰہ)۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور سوائے اصلاح کے ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے حالانکہ اس قسم کے پردہ کے پیچھے وہ انواع و اقسام کے فساد، تخریبی کارروائیوں اور سازشوں میں مصروف ہیں اور حقیقت میں خدا کا مقدس نام لے کر راہ خدا سے روکنے کا فائدہ اُٹھاتے ہیں جی ہاں! جھوٹی قسمیں کھانا منافقین کی نشانی ہے جو یہاں کے علاوہ سُورۂ منافقین میں بھی ان کے اوصاف کے بیان میں پیش ہوئی ہے (سُورۂ منافقین آیہ ۲)
آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے:

"اس بنا پر ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے" (فلهم عذاب مهين). وہ چاہتے تھے کہ ان جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنے لیے سامانِ عزت فراہم کریں لیکن خدا انہیں ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اس نے پہلے بھی فرمایا ہے:

"ان کے لیے عذاب شدید ہے" (اسی سورہ کی آیت ۱۵) اس لیے کہ یہ پیچھے مومنین کے دلوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں عذاب آخرت سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ دو مختلف اوصاف کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لہذا تکرار بھی نہیں ہے کیونکہ عذاب کی تشریح ان دو صفتوں کے ساتھ قرآن مجید میں عام طور پر آخرت کے عذابوں کے سلسلہ میں آتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال تجویز کیا ہے کہ پہلا عذاب دنیا یا قبر سے متعلق ہے اور دُوسرا عذاب آخرت سے مربوط ہے اور چونکہ منافقین عام طور پر حلِ مشکلات کے سلسلہ میں اپنے مال اور اولاد (اقتصادی اور انسانی قوت) پر انحصار کرتے تھے لہذا قرآن بعد والی آیت میں کہتا ہے: "ان کے مال اور اولاد انہیں عذاب الٰہی سے کسی طرح بھی محفوظ نہیں رکھیں گے" (لن تغنى عنهم اموالهم ولا اولادهم من الله شيئا)[2]۔

بلکہ یہی اموال ان کی گردن میں لعنت کا طوق بن جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب کا سبب بنیں گے، جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۸۰ میں ہم پڑھتے ہیں: سيطوقون ما بخلوا به يوم القيامة اور اسی طرح ان کی گمراہ اولاد ان کے عذاب کا باعث ہوگی اور اگر ان کے درمیان مومن اور نیکوکار افراد ہوں تو وہ ان سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔ جی ہاں! قیامت کا دن ایسا دن ہے کہ جس میں خدا کی (رحمت) کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ بیکار ہو جائے گا جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۶۶ میں ہم پڑھتے ہیں: (و تقطعت بهم الاسباب). "ان کا ہاتھ ہر قسم کے ذریعے اور اسباب سے منقطع ہو جائے گا"۔ اور پھر آیت کے آخر میں اس جملہ کے ساتھ تہدید کرتا ہے۔ "وہ اصحاب دوزخ ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے": (اولٰئك اصحاب النار هم فيها خالدون). اور اس طرح ان پر نازل ہونے والے عذاب کو کبھی شدید کہہ کر باعثِ تہدید بناتا ہے اور کبھی "مهين" "ذلیل کرنے والا کہہ کر اور کبھی اس کا جاودانی ہونا باعثِ تہدید ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک منافقین کے اعمال کی وجہ سے مناسب حال ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ منافقین قیامت میں بھی اپنی منافقت سے دست بردار نہیں ہوں گے جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے
"یاد کرو اس دن کو جس میں خدا ان سب کو مبعوث کرے گا اور ان کے اعمال ان کے سامنے پیش کرے گا اور اپنی دادگاہ عدل میں ان سے سوال کرے گا لیکن وہ خدا کے سامنے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے جیسی کہ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ (يوم يبعثهم الله

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)
[1] جنة اصل میں "جن" (بروزن فن) کے مادہ سے کسی چیز کے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ ڈھال انسان کو دشمن کی ضربوں کے مقابلہ میں چھپاتی ہے لہذا اسے جنة، مجن اور مجنہ کہتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۱)
[2] بعض مفسرین نے یہاں لفظ عذاب کو مقدر سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مراد من عذاب الله ہے (قرطبی، رُوح البیان، کشاف) لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ آیت میں کوئی چیز مقدر نہ ہو اور من اللہ سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کوئی دوسری پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔

جمیعاً فیحلفون لہ کما یحلفون لکم[1]۔

قیامت انسان کے اس دنیا کے اعمال اور نیتوں کی تجلی گاہ ہے اور چونکہ منافقین یہی احساسات اپنے ساتھ قبر اور برزخ میں لے کر جائیں گے لہٰذا میدان قیامت میں بھی آشکار ہوں گے اور باوجودیکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا علام الغیوب ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے لیکن پھر بھی پرانی عادات کی بنا پر جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ یہ چیز اس دادگاہ عدل الٰہی کے بعض مواقف میں ان کے گناہوں کے اقرار کے ساتھ متصادم نہیں کیونکہ قیامت کے مختلف منازل و مواقف میں ہر جگہ ایک الگ انضباط اوقات ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"وہ گمان کرتے ہیں کہ ان جھوٹی قسموں سے وہ اپنے لیے کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں یا کسی نقصان کو دور کر سکتے ہیں (و یحسبون انھم علی شیء)۔ یہ ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن چونکہ دنیا میں انہوں نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ خطروں اور مضر چیزوں کو اپنے سے دور کریں اور فائدہ حاصل کریں لہٰذا یہ قبیح اور پست و پختہ عادتیں وہاں بھی اپنا اثر دکھائیں گی۔ آخر کار آیت کو اس جملہ پر ختم کرتا ہے: "جان لو کہ وہ جھوٹے ہیں" (الا انھم ھم الکاذبون)۔ یہ اعلان ممکن ہے کہ دنیا کے ساتھ تعلق رکھتا یا قیامت سے مربوط ہو یا دونوں کے ساتھ ربط رکھتا ہو۔ اس طرح ان کی رسوائی کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا ہے اور ہر جگہ منادی ہو رہی ہے۔ آخری زیر بحث آیت میں ان تاریک دل رکھنے والے منافقین کی حقیقی سرگزشت کو اس طرح بیان کرتا ہے: "شیطان ان پر مسلط ہو گیا ہے اور تیزی کے ساتھ ہانکتا ہے اور اس بنا پر ان کے دل سے خدا کی یاد نکال کر لے گیا ہے (استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللہ)۔

اسی دلیل کی رو سے "وہ گروہ شیطان ہیں" (اولئک حزب الشیطان)۔

آگاہ رہو کہ گروہ شیطان ہی گھاٹا اٹھانے والوں میں ہے" (الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون)۔

"استحوذ" "حوذ" (بروزن "موز") کے مادہ سے ہے اور اونٹ کی ران کے پشت والے حصہ کے معنی میں ہے اور چونکہ ساربان اونٹوں کو ہنکاتے وقت ان کی رانوں کی پشت پر ضرب لگاتا ہے اس لیے یہ لفظ تسلط حاصل کرنے اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے لیے آیا ہے۔

جی ہاں جھوٹے اور مغرور منافقین باوجود مال و دولت اور مقام و منزلت کے اس کے علاوہ اور کوئی قسمت نہیں رکھتے کہ وہ شیطان کی گرفت اور اس کی خواہشات کے اختیار میں ہوتے ہیں اور وہ خدا کو کلی طور پر بھول جاتے ہیں اور نہ صرف خدا سے منحرف ہو جاتے ہیں، بلکہ شیطان کے عمال، انصار، مددگار اور لشکر کے زمرہ میں آ کر دوسروں کو گمراہ کرنے والے قرار پاتے ہیں۔

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فتنوں اور اختلافات کے وقوع کے آغاز کے بارے میں فرماتے ہیں:

(ایھا الناس انما بدأ وقوع الفتن اھواء تتبع و احکام تبتدع یخالف فیھا کتاب اللہ، یتولی فیھا رجال رجالا،
فلو ان الباطل خلص لم یخف علی ذی حجی، و لو ان الحق خلص لم یکن اختلاف و لکن یؤخذ من ھذا ضغث
و من ھذا ضغث فیمزجان فیجیئان معا فھنالک استحوذ الشیطان علی اولیائہ و نجی الذین سبقت لھم من اللہ الحسنی)

"اے لوگو! فتنوں کے وقوع کا آغاز باطل آراء ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور ایسی بدعتیں ہیں جو حکم خدا کے خلاف قائم کی جاتی ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی دوستی میں ان

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور "اذکر" محذوف سے متعلق ہے یا اس کے ماقبل یعنی لھم عذاب مھین سے یا اولئک اصحاب النار سے متعلق ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

امور میں ان کی پیروی اختیار کرتا ہے۔ اگر باطل اپنی خالص شکل میں خود نمائی کرتا تو کسی صاحب عقل کی نگاہ سے پنہاں نہ رہتا اور اگر حق، باطل کی آمیزش سے پاک و صاف ہوتا تو اختلاف پیدا نہ ہوتا لیکن کچھ حصہ اس کا لے لیتے ہیں اور کچھ حصہ اس کا اور انہیں آپس میں ملا دیتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ لوگ جن کے توفیق الٰہی شامل حال ہے وہ رہائی پا جاتے ہیں"۔ [1]

یہی تفسیر امام حسین علیہ السلام کے کلام میں کربلا میں نظر آتی ہے۔ جس وقت اہل کوفہ کی صفوں کو اندھیری رات اور غل مچاتے ہوئے سیل آب کی طرح اپنے مد مقابل دیکھا تو فرمایا:

"بہت برے لوگ ہو کہ خدا کی اطاعت اور پیغمبرؐ پر ایمان کا اظہار کرتے ہو لیکن اب اس لیے آئے ہو کہ اولادِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرو:

(لقد استحوذ علیکم الشیطان فانساکم ذکر اللہ العظیم) شیطان نے تم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے وہ خدائے عظیم کی یاد تمہارے دلوں سے نکال کر لے گیا ہے۔ اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"تم کو اور جو کچھ تم چاہتے ہو خدا نیست و نابود کر دے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون"[2]

حزب الشیطان اور حزب اللہ کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ آیات کے ذیل میں ہم تفصیلی بحث کریں گے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] اصول کافی مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۷

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۶۶

۲۰۔ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝

۲۱۔ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

۲۲۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ
حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ
أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ
الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں۔

۲۱۔ خدا نے اس طرح مقرر کر رکھا تھا کہ میں اور میرے رسولؐ کامیاب ہوں گے کیونکہ خدا قوی اور ناقابل شکست ہے۔

۲۲۔ کسی ایسی قوم کو تو نہیں پائے گا جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ خدا اور اس کے

رسولؐ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرے خواہ وہ ان کے آباؤ اجداد، اولاد، بھائی اور رشتہ دار کیوں نہ ہوں وہ ایسے لوگ ہیں جن کے صفحۂ دل پر ایمان لکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح کے ذریعے ان کی تقویت فرمائی ہے۔ انہیں جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش ہے اور وہ خدا سے خوش ہیں۔ وہ اللہ کا حزب ہیں۔ جان لو کہ اللہ کا حزب ہی کامیاب ہے

تفسیر

حزب اللہ کامیاب ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو منافقین اور دشمنانِ خدا کے بارے میں اور ان کی کچھ صفات اور علامتوں سے متعلق تھی۔ اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے اِن آیتوں میں جو سورۂ مجادلہ کی آخری آیات ہیں ان کی کچھ اور نشانیاں پیش کرتا ہے اور ان کی حتمی سرنوشت جو شکست و بربادی ہے اسے واضح کرتا ہے پہلے فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ترین افراد کے زمرہ میں ہیں"
(ان الذین یحادون اللہ و رسولہ اولٰئک فی الاذلین)[1]

بعد والی آیت حقیقت میں ان معانی کی دلیل ہے فرماتا ہے:

"خدا نے اس طرح مقرر کیا تھا کہ میں اور میرے پیغمبر ہی کامیاب ہوں گے" (کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی)۔ "ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ خدا قوی اور ناقابلِ شکست ہے"۔ (ان اللہ قوی عزیز)۔ جس قدر خدا صاحب قوت ہے اتنے ہی اس کے دشمن کمزور اور ذلیل ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں (اذلین) کی تعبیر آئی ہے تو اس کی وجہ یہی تھی "کتب" لکھا ہے، کی تعبیر اس کامیابی کے قطعی ہونے کی تاکید ہے اور لاغلبن کا جملہ لام تاکید اور نون ثقیلہ کے ساتھ اس کامیابی کے موکد ہونے کی دلیل ہے اس طرح کہ کسی شخص کے لیے کسی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ اس چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ صافات کی آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳ میں آئی ہے۔ (ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون)

"ہمارا قطعی وعدہ ہمارے مُرسل بندوں کے بارے میں پہلے سے مُسلم ہو چکا ہے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر تمام میدانوں

---

[1] "یحادون" "محادہ" کے مادہ سے مسلح یا غیر مسلح مبارزہ کے معنی میں ہے یا مخالفت کے معنی میں ہے۔ (ہم اس سورہ کی آیت ۵ کے ذیل میں وضاحت کر چکے ہیں)

میں کامیاب ہے۔"

تاریخ کے طویل دور میں خدا کے پیغمبروں اور اس کے بھیجے ہوئے افراد کی کامیابی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوئی ہے۔ مختلف عذابوں کی صورت میں مثلاً طوفان نوح میں، صاعقۂ عاد و ثمود میں، قوم لوط کو تباہ و برباد کرنے والے زلزلے کی صورت میں اور اسی قسم کی چیزوں میں، مختلف جنگوں میں مثلاً جنگ بدر وحنین، فتح مکہ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باقی غزوات میں۔ ان سب سے زیادہ اہم شیطانی مکاتب فکر اور حق و عدالت کے دشمنوں پر ان کی منطقی کامیابی تھی۔ یہاں ان لوگوں کے سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ وعدہ قطعی تھا تو پھر کیوں بہت سے انبیا و مرسلین، آئمہ معصومینؑ اور سچے مومنین کو ان کے دشمنوں نے شہید کیا اور وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ان اعتراض کرنے والوں نے حقیقت میں کامیابی کے معنی کو صحیح طرح نہیں سمجھا۔ مثلاً ممکن ہے (تصور کریں) کہ امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں شکست کھائی اس لیے کہ آپؑ خود اور آپؑ کے یاور و انصار تمام کے تمام شہید ہوگئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپؑ اپنے اصلی مقصد تک پہنچ گئے۔ آپؑ کا مقصد یہ تھا کہ بنی اُمیہ رسوا ہوں اور مکتب آزادی کی بنیاد رکھی جائے اور ساری دنیا کے لوگوں کو درس آزادی دیا جائے۔ آپؑ نے یہ مقصد یقیناً حاصل کیا اور آپؑ آج بھی سرور شہیدان عالم اور جہان انسانیت کے رہبر کامل کی حیثیت سے انسانوں کے ایک عظیم طبقہ کے دلوں پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔[1]

اس چیز کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ یہی حکم یعنی خدائی وعدہ کے مطابق کامیابی انبیاؑ و اولیاؑ کے پیروکاروں کے بارے میں بھی ثابت ہے یعنی ان کی کامیابی کی بھی خدا کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۵۱ میں ہم پڑھتے ہیں۔ (انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد) ہم یقیناً اپنے رسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی زندگیٔ دنیا میں اور اس دن جب گواہ قیام کریں گے (قیامت کے دن) مدد کریں گے۔ یقیناً خدا جس کی مدد کرے وہ کامیاب ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ خدا کا یہ حتمی وعدہ قید اور شرط کے بغیر نہیں ہے۔ اس کی شرط ایمان اور آثار ایمان ہیں اس کی شرط یہ ہے کہ بندہ سستی و کمزوری کو اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے اور مشکلات سے نہ گھبرائے اور غمگین نہ ہو جیسا کہ آل عمران کی آیت ۱۳۹ میں فرماتا ہے:

(ولا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین) اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ تغیرات کو اپنی ذات سے شروع کرے کیونکہ خدا کسی قوم و ملت کی نعمتوں کو متغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تغیر پیدا نہ کریں۔ (ذالک بان اللہ لم یک مغیرًا نعمۃ انعمھا علیٰ قوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم) (انفال ۵۳) انہیں خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیئے۔ انہیں چاہیئے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور اپنی قوتوں کو مجتمع کریں۔ نیتوں کو خالص رکھیں اور مطمئن رہیں کہ دشمن خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اور وہ خود بظاہر کمزور ہوں اور تعداد میں کم ہوں لیکن آخر کار جہاد، کوشش اور خدا پر توکل کی وجہ سے وہ کامیاب ہوں گے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے مندرجہ بالا آیت کے لیے ایک شان نزول بیان کی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے جس وقت حجاز کی بعض آبادیوں کی فتح کو دیکھا تو انہوں نے کہا کہ خدا عنقریب ہمیں روم و ایران کی فتح بھی نصیب کرے گا اس پر منافقین نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ ایران و روم بھی ان بستیوں کی مانند ہیں جنہیں تم نے فتح کر لیا ہے اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس کامیابی کا ان سے وعدہ کیا۔ آخری زیر بحث آیت جو سورہ مجادلہ کی آخری اور آیات قرآنی میں سب سے زیادہ سرکوبی کرنے والی آیت ہے مومنین کو باخبر کرتی ہے کہ خدا کی محبت

---

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت کے لیے اس تفسیر کی جلد ۱۹ سورہ صافات کی آیت ۱۷۱ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اور "دُشمنانِ خدا کی محبت" کو ایک ہی دل میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کریں۔ اگر واقعی وہ مومن ہیں تو انہیں دُشمنانِ خدا کی دوستی سے پرہیز کرنا چاہیئے ورنہ وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"کسی ایسے گروہ کو جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو تو نہیں پائے گا کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی کریں چاہے وہ ان کے آباؤ اجداد، اولاد یا رشتہ دار ہوں": (لا تجد قومًا یؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر یوادون من حاد اللّٰہ ورسولہ ولو کانوا اٰباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم)۔ جی ہاں! ایک دل میں دو متضاد محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں اور جو دو متضاد محبتوں کے حامل ہوں وہ یا تو ضعیف الایمان ہوتے ہیں یا پھر منافق ہوتے ہیں! اسی لیے غزواتِ النبی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مخالف صفوں میں مسلمانوں کے عزیز و اقارب کی ایک جماعت تھی لیکن چونکہ انہوں نے اپنا رشتہ خدا سے توڑ رکھا تھا اور وہ حق تعالیٰ کے دشمنوں کی صف سے وابستہ تھے لہٰذا مسلمانوں نے ان سے جنگ کی یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ آباؤ اجداد اولاد اور رشتہ داروں کی محبت بہت اچھی چیز ہے اور انسان کے جذبۂ کرم کے زندہ ہونے کی نشانی ہے لیکن جب اس محبت کا مقابلہ خدا کی محبت سے ہو تو پھر یہ محبت اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ البتہ انسان کے مرکزِ محبت صرف یہی چار گروہ نہیں ہوتے جن کا ذکر مذکورہ آیت میں ہوا۔ یہ انسان کے نزدیک ترین افراد ہیں اور ان کی مثال کو پیشِ نظر رکھ کر باقی افراد کی کیفیت بھی واضح ہو جائے گی۔ اسی لیے زیرِ بحث آیت میں گفتگو بیوی، شوہر، مال و دولت، تجارت اور گھروں کے متعلق، جو مرکزِ محبت ہو سکتے ہیں، درمیان میں نہیں آئی جبکہ سُورہ توبہ کی آیت ۲۴ میں یہ سب امور موردِ توجہ قرار پائے ہیں خدا فرماتا ہے:

(قل ان کان اٰباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللّٰہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتّٰی یأتی اللّٰہ بامرہ واللّٰہ لا یھدی القوم الفاسقین) "کہہ دے اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، بھائی اور قبیلہ اور وہ مال جو تمہارے ہاتھ لگے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خطرہ ہے اور وہ گھر جن سے تمہارا دلی تعلق ہے خدا، اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس انتظار میں رہو کہ خدا اپنا عذاب تم پر نازل کر دے اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

دُوسرے امور کے زیرِ بحث آیت میں مذکور نہ ہونے کی دوسری دلیل ممکن ہے وہ شانِ ہائے نزول ہوں جو آیت کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ منجملہ دوسری شانِ ہائے نزول کے ایک یہ ہے کہ "حاطبؓ ابن ابی بلتعہ" نے اہلِ مکہ کو خط لکھا اور انہیں خبردار کیا کہ ہو سکتا ہے رسولِ خداؐ فتحِ مکہ کے لیے روانہ ہوں۔ جب یہ بات کھلی، تو حاطب نے عُذر پیش کیا کہ میرے عزیز و اقارب مکہ میں کفار کے چنگل میں ہیں۔ میں نے چاہا کہ اہلِ مکہ کی خدمت کروں تاکہ میرے عزیز امان میں رہیں[1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کا بیٹا صاحبِ ایمان تھا۔ اس نے ایک دن دیکھا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی نوش فرما رہے ہیں تو اس نے عرض کیا کہ تھوڑا سا پانی اس برتن میں رہنے دیجئے تاکہ میں وہ اپنے باپ کو پلاؤں شاید خدا اس کے دل کو پاک کر دے۔ مختصر یہ کہ وہ جس وقت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیئے ہوئے پانی میں سے بچا ہوا پانی اپنے باپ کے پاس لے کر پہنچا تو اس نے وہ پانی پینے سے انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۲۵۵

ایک بہت ہی توہین آمیز جملہ کہا۔ اس کا بیٹا پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے اپنے باپ کے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ پیغمبرؐ نے اجازت نہ دی اور فرمایا اس کا لحاظ کرو لیکن دل میں اس کے اعمال سے بیزار رہو۔

اس کے بعد پروردگارِ عالم اس گروہ کے عظیم اجر کو پیش کرتا ہے جس کے دل مکمل طور پر عشقِ خدا کے قبضہ میں ہیں اور پانچ موضوعات کو بیان کرتا ہے جن میں سے بعض امداد اور توفیق کی شکل میں ہیں اور بعض نتیجے اور انجامِ کار کی صورت میں۔ پہلے اور دُوسرے حصّہ کے سلسلہ میں فرماتا ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا نے ایمان کا خط ان کے دلوں کے صفحے پر کھینچ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح کے ذریعے ان کو تقویت پہنچائی ہے۔" (اولٰئك كتب فی قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه)۔ واضح رہے کہ یہ امداد اور لطفِ الٰہی انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی کی رُوح سے متصادم نہیں ہوتے کیونکہ پہلے قدم، یعنی دُشمنانِ خدا کی محبت کو ترک کرنا، خود انہی کی طرف سے اُٹھائے گئے ہیں۔

اس کے بعد خدا کی طرف سے امداد "استقرارِ ایمان" کی شکل میں ان کی جانب آئی ہے۔

کیا یہ رُوحِ الٰہی جس سے خدا مومنین کی تائید کرتا ہے ایمان کی بنیادوں کی تقویت ہے یا عقلی دلائل ہیں یا قرآن ہے یا وہ خدا کا عظیم فرشتہ جس کا نام رُوح ہے؟ اس سلسلے میں مختلف تفسیریں اور احتمالات بیان ہوئے ہیں اور ان سب کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ رُوح ایک طرح کی جدید حیاتِ معنوی ہے جس کا فیضان خدا مومنین پر کرتا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں فرماتا ہے:

"خدا انہیں جنّت کے باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں اور محلّوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔" (ويدخلهم جنّات تجری من تحتها الانهار خالدين فيها)۔ چوتھے مرحلے میں اضافہ کرتا ہے:

"خدا اُن سے راضی اور خوش ہے اور وہ خدا سے راضی و خوش ہیں۔" (رضی الله عنهم ورضوا عنه)۔ قیامت کے مادّی انعامات یعنی حُور و قصور کے مقابلے میں یہ عظیم ترین رُوحانی اجر ہے جو مومنین کے اس گروہ کو دیا جائے گا۔ یہ گروہ احساس کرے گا کہ خدا ان سے راضی ہے۔ ان کے معبود کی یہ رضامندی کہ اس نے انہیں قبول کر لیا ہے اور اپنی عنایت سے انہیں نوازا ہے اور اپنی بساطِ قرب پر انہیں بٹھایا ہے بہترین لطف دینے والا احساس ہے جو انہیں حاصل ہو گا اور اس کا نتیجہ خدا سے ان کی مکمل خوشنودی ہے۔ جی ہاں کوئی نعمت اس دوہری نعمت کے برابر نہیں ہے۔ اور یہ دوسری نعمتوں کی کلید ہے اس لیے کہ جب خدا کسی سے خوش ہو تو جو وہ طلب کرے گا خدا اسے دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ کریم بھی ہے اور قادر و توانا بھی۔ کیا ہی عمدہ تعبیر ہے۔ فرماتا ہے:

"خدا بھی ان سے راضی ہے اور وُہ بھی خدا سے راضی ہیں۔" یعنی ان کا مقام اس قدر اُونچا ہو گیا ہے کہ ان کا نام خدا کے نام کے ساتھ اور ان کی رضامندی خدا کی رضا کے پہلو بہ پہلو قرار پائی ہے۔ آخری مرحلہ میں ایک ایسے عمومی اعلان کی شکل میں جو ایک اور نعمت کی ترجمانی کرتا ہے، فرماتا ہے:

"وہ اللہ کی جماعت ہیں اور جان لو کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے۔" (اولٰئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون)۔ نہ صرف انہیں دوسرے جہان میں کامیابی اور قیامت میں انواع و اقسام کی مادّی و معنوی نعمتیں حاصل ہوں گی بلکہ جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی آیا ہے وہ اس دنیا میں بھی اللہ کی مہربانی سے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کریں گے اور اس دنیا کے اختتام پر بھی حق و عدالت کی حکومت ان کے قبضہ میں ہو گی۔

چند نکات

۱ - حزبُ اللہ اور حزبِ شیطان کی اصل نشانی

قرآن مجید کی دو آیتوں میں حزب اللہ کی طرف اشارہ ہوا ہے (زیر بحث آیت اور سورۂ مائدہ کی آیت ۵۶) اور ایک آیت میں حزب شیطان کی طرف اشارہ ہے۔ دونوں مواقع جن پر حزب اللہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے (حُب فی اللہ اور بُغض فی اللہ) اور اولیائے حق کی ولایت کے مسئلہ پر انحصار کرتا ہے۔ سورہ مائدہ میں مسئلہ ولایت اور خدا و رسول کی اطاعت کے وجوب کی بات کرتا ہے جس میں مذکور ہے کہ (علیؑ) نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی ہے۔ (ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون) زیر بحث آیت میں بھی دُشمنانِ خدا کی دوستی سے قطع روابط پر تکیہ کرتا ہے۔ اس بنا پر حزب اللہ کا خط وہی خطِ ولایت ہے اور خدا، پیغمبرؐ اور اس کے اوصیاء کے دُشمنوں سے قطع تعلق کا خط ہے۔

اس کے مقابلے میں حزبِ شیطان کے تعارف کے وقت جس کی طرف اس سورہ کی گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے اس کی جو واضح ترین نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ نفاق، حق سے دُشمنی، یادِ خدا کی فراموشی، جھوٹ اور فریب ہیں۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ایک موقع پر کہتا ہے: (فان حزب اللہ ھم الغالبون) اور دُوسری جگہ فرماتا ہے: (الا ان حزب اللہ ھم المفلحون) اس طرف توجہ کرنے سے کہ فلاح بھی دشمن کے مقابلہ میں کامیابی اور ان پر غلبہ کے ہمراہ ہے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دونوں آیتوں کا مفہوم ایک مربوط صورت میں اس امر کے ساتھ ظاہر ہے کہ فلاح و رستگاری غلبہ و کامیابی کی نسبت زیادہ گہرا مفہوم رکھتی ہے، اس لیے کہ وہ مقصد تک پہنچنے کو بھی مشخص کرتی ہے۔ اس کے برعکس حزبِ شیطان کا تذکرہ اس کی شکست، اس کے نقصان اور مقاصد میں ناکامی کے حوالے سے کرتا ہے۔ مسئلہ ولایت، ولایت خاص معانی میں اور "حبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ" عام معانی میں ایک ایسا مسئلہ ہے کہ روایات اسلامی میں اس کی بہت تاکید ملتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت سلمان فارسیؓ امیر المومنینؑ سے عرض کرتے ہیں کہ جب بھی میں پیغمبرؐ کی خدمت میں گیا تو انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"کہ اے سلمان! یہ شخص اور اس کا گروہ کامیاب ہے۔ (یا ابا الحسن ما اطلعت علی رسول اللہ الاضرب بین کتفی وقال یا سلمان ھذا وحزبہ ھم المفلحون)[۱]

دوسرے مورد میں یعنی ولایت عامہ کے سلسلہ میں ایک حدیث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں ملتی ہے:

(ود المؤمن للمؤمن فی اللہ من اعظم شعب الایمان)

ایک مومن کی دُوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی اہم ترین شعبۂ ایمان ہے۔[۲]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ پر وحی کی کہ کیا کوئی عمل میرے لیے بھی انجام دیا ہے۔ عرض کیا: جی ہاں میں نے تیرے لیے نماز پڑھی ہے، روزہ رکھا ہے انفاق کیا ہے اور تجھے یاد کرتا رہا ہوں۔ فرمایا:

نماز تیرے لیے حق کی نشانی تھی۔ روزہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں سپر تھا۔ انفاق محشر کے لیے سایہ اور ذکر نور ہے۔ اے موسیٰ میرے لیے تم نے کونسا عمل کیا ہے؟

۱۔ یہ حدیث تفسیر برہان میں اہل سنت کی کتب سے نقل ہوئی ہے۔ (برہان جلد ۴ ص ۳۱)

۲۔ اصول کافی جلد ۲ باب حب فی اللہ حدیث ۳۔

عرض کیا خداوندا! خود تو اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرما۔ فرمایا:

(هل واليت لي وليا وهل عاديت لي عدوا قط فعلم موسىٰ ان افضل الاعمال الحب في الله والبغض في الله)

کبھی میرے لیے کسی سے محبت کی ہے اور میری خاطر کسی سے دشمنی کی ہے؟ یہ وہ مقام تھا کہ حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ افضل ترین عمل حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔ اللہ کے لیے دوستی اور اللہ کے لیے دشمنی[1]

ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

(لا يمحض رجل الايمان بالله حتى يكون الله احب اليه من نفسه وابيه وامه وولده واهله وماله ومن الناس كلهم)

"کسی شخص کا اللہ پر ایمان کامل نہیں ہوتا تاوقتیکہ خدا اس کو اس کی جان، اس کے ماں باپ، اولاد، اہل خانہ اور اس کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو"[2]

اس عنوان کے ماتحت اثبات کی سمت بھی یعنی دوستان خدا سے دوستی اور نفی کی سمت میں بھی دوستان خدا سے دشمنی سے روایات بہت زیادہ ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اس گفتگو کو امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک پُر معنی حدیث پر ختم کر دیں۔ آپ نے فرمایا ہے:

(اذا اردت ان تعلم ان فيك خيرا فانظر الى قلبك فان كان يحب اهل طاعة الله عزوجل و يبغض اهل معصيته ففيك خير والله يحبك واذا كان يبغض اهل طاعة الله و يحب اهل معصيته ليس فيك خير والله يبغضك والمرء مع من احب)۔

اگر یہ جاننا چاہو کہ تم ایک اچھے انسان ہو تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو اگر وہ اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو دوست اور اس کے نافرمانوں کو دشمن رکھتا ہے تو جان لو کہ تم اچھے انسان ہو اور خدا بھی تمہیں دوست رکھتا ہے اور اگر تمہارا دل خدا کی اطاعت کرنے والوں کو دشمن اور اس کی معصیت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو پھر تم میں کوئی خوبی نہیں اور خدا تم سے دشمنی رکھتا ہے اور انسان ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔[3]

۲۔ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھا ہے کہ خدا نے ان لوگوں کے لیے، جو اس کے عشق کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور ہر تعلق کو اس سے لگاؤ کے ماتحت قرار دیتے ہیں، اس کے دوستوں کو دوست اور اس کے دشمنوں کو دشمن قرار دیتے ہیں، پانچ عظیم اجر مقرر کیے ہیں جن میں سے تین اجر تو اسی دنیا میں عطا کرتا ہے اور دو اجر قیامت میں عطا فرمائے گا۔ اس جہان کی پہلی نعمت ایمان کا ان کے دلوں میں قرار

---

[1] و [2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۰۱۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۰۱

ثبات ہے ۔ خدا ان کے دلوں میں ایمان کا نقش اس طرح مرتسم کرتا ہے کہ حوادث کے ہاتھ اور زندگی کے طوفان اسے محو نہیں کرسکتے اور دقتِ نظر اس سے ایک نئی رُوح سے ان کو تقویت دیتا ہے اور تیسرے یہ کہ انہیں اپنے حزب میں شمار کرتا ہے اور دُشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی عطا کرتا ہے ۔ آخرت میں بہشت جاوداں اپنی تمام نعمتوں کے ہمراہ ان کے اختیار میں دے دیتا ہے ۔ اس کے علاوہ اپنی مطلق خوشنودی و رضا کا اعلان کرتا ہے ۔ ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

(مامن مؤمن الا ولقلبه اذنان فی جوفه اذن ینفث فیها الوسواس الخناس و اذن ینفث فیها الملک فیؤید الله المؤمن بالملک فذالک قوله و ایدهم بروح منه)

ہر مومن کے دل کے دو کان ہیں ایک وہ جس میں " وسواس خناس " پھونک مارتا ہے اور دوسرے کان میں ملک پھونک مارتا ہے ۔ خدا مومن کو فرشتے کے ذریعہ تقویت دیتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق فرماتا ہے : (وایدھم بروح منہ) [1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کی تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہے کہ آپ [2] نے فرمایا :

(اذا زنی الرجل فارقه روح الایمان)

جب انسان زنا کرتا ہے تو اس وقت رُوحِ ایمان اس سے جُدا ہو جاتی ہے ۔ یہ رُوحِ ایمان وہی ہے جس کے متعلق خدا نے قرآن میں فرمایا ہے : (وایدھم بروح منہ) [2]

مندرجہ بالا احادیث سے رُوحِ ایمان کی وسعت اور رُوحِ انسانی کے اعلیٰ مرتبہ اور شمولِ فرشتہ کے بارے میں وضاحت ہوتی ہے ۔ یہ آیات اس حقیقت کو بھی بتاتی ہیں کہ روحِ ایمان کے اس مرتبہ کے ہوتے ہوئے انسان شراب خوری اور اس قسم کے دوسرے گناہوں کا مرتکب نہیں ہوتا ۔

خداوندا ! اگر تو ہمیں یہ رُوحِ ایمان عطا کردے تو اپنے کمزور اور ضعیف بندوں پر تیرا احسان عظیم ہوگا ۔ اس کے بعد انہیں کوئی غم نہیں رہے گا ۔

پروردگارا ! ہمیں اپنے دوستوں کی دوستی اور اپنے دشمنوں کی دشمنی کی توفیق عطا فرما اور اپنے دشمنوں کی دوستی اور دوستوں کی دُشمنی سے محفوظ فرما ۔

بارالٰہا ! تُو نے سچے مؤمنین سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے اور انہیں حزب اللہ شمار کیا ہے ۔ ہمیں اس حزب میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرما اور اپنی کامیابی ہمارے شاملِ حال فرما (آمین یا ربّ العالمین)

سُورۂ مجادلہ کا اختتام
جمعہ ۸ شعبان ۱۴۰۶ ھ

اختتام ترجمہ ۳۰ شوال بروز ہفتہ ۱۴۰۷ ھ
مطابق ۲۷ جون ۱۹۸۷ء بوقت بارہ بجے دن بر مکان
حقیر قم المقدسہ کوچۂ جمشیدی محل سلطان محمد شریف ایران

---

[1] کافی مطابق نقل تفسیر المیزان جلد ۱۹ ص ۲۱۸

[2]

۶۔ سُورَہ حَشْر

* یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا۔
* اس میں ۲۴ آیتیں ہیں

شروع جمعہ ۸ شعبان ۱۴۰۶ ھ ق
۲۹/۱/ ۱۳۶۵ ھ ش

سُورۂ حشر کے مضامین

یہ سُورہ زیادہ تر مسلمانوں اور یہود بنی نظیر کی لڑائی سے متعلق بیانات پر مشتمل ہے اور آخر کار ان کے مدینہ سے اخراج یعنی ان کے وجود سے اس مقدس سرزمین کے پاک ہو جانے پر ختم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ قرآن مجید کے بیدار کرنے والی اور جھنجوڑنے والی اہم سورتوں میں سے ایک ہے اور یہ گزشتہ سُورہ کی آخری آیات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے جن میں حزب اللہ سے کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے اور فی الحقیقت یہ کامیابی کا ایک واضح نمونہ ہے۔

اس سُورہ کے مشمولات کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے حصّہ میں صرف ایک آیت ہے جو اس سُورہ کے مختلف مباحث کے لیے دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں پروردگار علیم و حکیم کی اس تسبیح کے بارے میں گفتگو ہے جو تمام موجودات بجالاتے ہیں۔ دوسرے حصّہ میں دو سے لے کر دس تک کل نو آیتیں ہیں وہ مسلمانوں کی مدینہ کے عہد شکن یہودیوں سے لڑائی کے واقعہ کو بیان کرتی ہیں۔ تیسرا حصّہ جو آیت گیارہ سے لے کر سترہ تک محیط ہے۔ منافقین کے بارے میں ہے جو اس اقدام میں یہودیوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ چوتھا حصّہ جو چند آیتوں سے زیادہ نہیں تمام مسلمانوں کے لیے پند و نصائح کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے اور درحقیقت مندرجہ بالا واقعہ سے نتیجہ اخذ کرنے کے مترادف ہے۔ پانچویں حصّہ میں صرف ایک آیت ہے اس میں قرآن کی توصیف بلیغ ہے اور پاکبازی میں رُوح کی تاثیر کا بیان ہے۔ چھٹے اور آخری حصّہ میں بائیس سے لے کر چوبیس تک تین آیتیں ہیں اس میں خدا کے اوصاف جلال و جمال اور اس کے اسمائے حُسنیٰ کے اہم حصّہ کا بیان ہے۔ یہ حصّہ اللہ کی معرفت کے سلسلہ میں انسان کی نہایت عمدہ انداز میں مدد کرتا ہے۔

اس سُورہ کا نام اس کی دوسری آیت سے ماخوذ ہے جس میں مدینہ سے یہودیوں کے کوچ کرنے کے لیے جمع ہونے اور مسلمانوں کے اس امر کے لیے جمع ہونے کا ذکر ہے کہ یہودیوں کو مدینہ سے نکالا جائے۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حشر (جمع ہونے) کا قیامت سے کوئی تعلق نہیں ہے بعض مفسرین نے اس سُورہ کا نام سورہ بنی نظیر بتایا ہے کیونکہ اس کا زیادہ حصّہ انہی کے بارے میں ہے۔ بالآخر یہ سُورہ بھی مسبحات میں سے ایک ہے

یعنی اُن سُورتوں میں سے ایک ہے جو خدا کی تسبیح سے شروع ہوتی ہیں اور یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ اس سُورہ کا اختتام بھی تسبیح الٰہی پر ہوا ہے۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

اس سُورہ کی تلاوت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ منجملہ دیگر فضیلتوں کے ایک فضیلت کے بارے میں ہم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ملتی ہے:

(من قرأ سورة الحشر لم يبق جنة ولا نار ولا عرش ولا كرسي ولا حجاب ولا السمٰوات السبع ولا الارضون السبع والهوام والرياح والطير والشجر والدواب والشمس والقمر والملٰئكة الا صلوا عليه واستغفروا له وان مات من يومه او ليلته مات شهيدًا)

جو شخص سُورۂ حشر پڑھے تو جنّت و دوزخ، عرش و کرسی، حجاب، ساتوں آسمان، ساتوں زمینیں، حشرات الارض، ہوائیں، پرندے، درخت، چلتے پھرتے ہوئے جاندار، چاند اور سُورج اور ملائکہ سب اس کے لیے دُعائے مغفرت کریں گے اور وہ اگر اس دن یا رات فوت ہو جائے تو شہید شمار ہو گا۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

من قرأ اذا امسى الرحمٰن والحشر وكل الله بداره ملكا شاهرًا سيفه حتٰى يصبح)

جو شخص سُورۂ رحمٰن اور سُورۂ حشر غروب آفتاب کے وقت پڑھے تو خدا ایک فرشتے کو ننگی تلوار کے ساتھ اس کے گھر کی حفاظت پر مامور کرے گا۔[2]

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام آثار اس سُورہ کے مضامین میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ غور و فکر اس کی قرأت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اور انسانی زندگی پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

* * *

۱، ۲ "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۵۵، ۲۵۶۔ پہلی حدیث کو قرطبی نے بھی اسی سُورہ کے آغاز میں تحریر کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

١. سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝
٢. هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ
دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا
اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ
حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ
بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي
الْاَبْصَارِ ۝
٣. وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ
وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝
٤. ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝
٥. مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓي اُصُوْلِهَا

فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَلِیُخۡزِیَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خُدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

۲۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کفار کو مسلمانوں سے پہلے مقابلہ میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ تم گمان نہیں کرسکتے تھے کہ وہ خارج ہوں گے اور وہ خُود بھی گمان کرتے تھے کہ ان کے مستحکم قلعے انہیں عذاب الٰہی سے مانع ہوں گے۔ لیکن خُدا نے جہاں سے وُہ گمان نہیں کرتے تھے ان کو آ لیا۔ اور ان کے دل میں خوف ڈال دیا۔ اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو خُود بھی ویران کرتے اور مومنین بھی اُن کو ویران کرتے تھے۔ پس اے آنکھوں والو عبرت حاصل کرو۔

۳۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے جلاوطنی ان کے لیے مقرر کردی تھی تو وہ ان پر اس دُنیا میں عذاب نازل کرتا اور ان کے لیے آخرت میں بھی آگ کا عذاب ہے۔

۴۔ یہ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دُشمنی کی۔ اور جو خدا کے ساتھ دُشمنی کرے تو عذاب الٰہی اس کے لیے شدید ہے۔

۵۔ کھجور کا ہر قیمتی درخت جو تم نے قطع کیا، یا اسے اس کی جگہ برقرار رکھا سب کچھ خُدا کے فرمان سے تھا، تاکہ خُدا فاسقوں کو رُسوا کرے۔

شانِ نزول

مفسرین و محدثین و اربابِ تاریخ نے ان آیات کے بارے میں ایک مفصل شانِ نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے رہتے تھے، بنی نظیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، کہا جاتا ہے کہ وہ اصلاً اہل حجاز نہ تھے لیکن چونکہ اپنی مذہبی کتب میں انہوں

نے پڑھا تھا کہ ایک پیغمبر مدینہ میں ظہور کرے گا لہذا انہوں نے اس سرزمین کی طرف کوچ کیا اور وہ اس عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں تھے۔

جس وقت رسول خدا نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپ نے ان کے ساتھ عدم تعرض کا عہد باندھا لیکن ان کو جب بھی موقع ملا انہوں نے یہ عہد توڑا۔ دوسری عہد شکنیوں کے علاوہ یہ کہ جنگ اُحد کے بعد (جنگ اُحد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی) کعب ابن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچا۔ وہ اور اس کے ساتھی سب قریش کے پاس گئے اور ان سے عہد کیا کہ سب مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں۔ اس کے بعد ابو سفیان چالیس مکی افراد کے ساتھ اور کعب بن اشرف ان چالیس یہودیوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس اپنے عہد و پیمان کو مستحکم کیا۔ یہ خبر بذریعہ وحی پیغمبر اسلام کو مل گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک روز پیغمبر اسلام اپنے چند بزرگ اصحاب کے ساتھ قبیلۂ بنی نضیر کے پاس آئے۔ یہ لوگ مدینہ کے قریب بستے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ بنی عامر کے دو مقتولوں کی دیت ادا کرنے کے سلسلہ میں جو عمرو بن اُمیہ (ایک صحابی) کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے ان سے مدد قرض لیں (غالباً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا مقصد حقیقی یہ تھا کہ آپ اس طرح بنو نضیر کے حالات قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان غفلت کا شکار ہو کر دشمنوں کے ہاتھوں مارے جائیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود کے قلعہ کے باہر تھے۔ آپ نے کعب بن اشرف سے اس سلسلہ میں بات کی۔ اسی دوران یہودیوں کے درمیان سازش ہونے لگی۔ وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ایسا اچھا موقع اس شخص کے سلسلہ میں دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اب جب کہ یہ تمہاری دیوار کے پاس بیٹھا ہے ایک آدمی چھت پر جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس پر پھینک دے اور ہمیں اس سے نجات دلا دے۔ ایک یہودی جس کا نام عمر بن جحاش تھا، نے آمادگی ظاہر کی وہ چھت پر چلا گیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذریعہ وحی باخبر ہوئے اور وہاں سے اُٹھ کر مدینہ آ گئے۔ آپ نے اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں کی ان کا خیال تھا کہ پیغمبر لوٹ کر مدینہ جائیں گے ان کو معلوم ہوا کہ آپ مدینہ پہنچ گئے چنانچہ وہ بھی مدینہ پلٹ آئے یہ وہ منزل تھی کہ جہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودیوں کی پیماں شکنی واضح و ثابت ہو گئی۔ آپ نے مسلمانوں کو جنگ کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ بنی نضیر کے ایک شاعر نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کہی اور آپ کے بارے میں بدگوئی بھی کی۔ ان کی پیماں شکنی کی یہ ایک اور دلیل تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وجہ سے کہ ان پر پہلے سے ایک کاری ضرب لگائیں محمد بن مسلمہ کو جو کعب بن اشرف رئیس یہود سے آشنائی رکھتا تھا، حکم دیا کہ وہ کعب کو قتل کر دے۔ اس نے کعب کو قتل کر دیا۔ کعب بن اشرف کے قتل ہو جانے نے یہودیوں کو متزلزل کر دیا۔ اُس کے ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ جبر مسلمان اس عہد شکن قوم سے جنگ کرنے کے لیے چل پڑے۔ جس وقت وہ اس صورت حال سے باخبر ہوئے تو انہوں نے اپنے مضبوط و مستحکم قلعوں میں پناہ لی اور دروازے بند کر لیے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ چند کھجوروں کے درخت جو قلعوں کے قریب ہیں کاٹ دیے جائیں یا جلا دیے جائیں۔ یہ کام غالباً اس مقصد کے پیش نظر ہوا کہ یہودی اپنے مال و اسباب سے بہت محبت رکھتے تھے وہ اس نقصان کی وجہ سے قلعوں سے باہر نکل کر آمنے سامنے جنگ کریں گے۔ مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ کاٹے جانے والے کھجوروں کے یہ درخت مسلمانوں کی تیز نقل و حرکت میں رکاوٹ ڈالتے تھے لہذا انہیں کاٹ دیا جانا چاہیئے تھا۔ بہرحال اس پر یہودیوں نے فریاد کی۔ انہوں نے کہا: "اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ تو ہمیشہ اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے یہ کیا سلسلہ ہے؟" تو اس سورہ کی مندرجہ بالا آیات میں سے پانچویں آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا کہ یہ ایک مخصوص حکم الٰہی تھا۔ محاصرہ نے کچھ دن طول کھینچا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوں ریزی سے پرہیز کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ مدینہ کو خیرباد کہہ دیں اور کہیں دوسری جگہ چلے جائیں۔ انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا۔ کچھ سامان اپنا لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا۔ ایک جماعت "اذرعات" شام کی طرف اور ایک مختصر سی تعداد خیبر کی طرف چلی گئی۔ ایک گروہ حیرہ کی طرف چلا گیا۔ ان کے چھوڑے ہوئے اموال زمینیں

باغات اور گھر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ چلتے وقت جتنا ان سے ہو سکا انہوں نے اپنے گھر توڑ پھوڑ دیے۔ یہ واقعہ جنگ اُحد کے چھ ماہ بعد اور ایک گروہ کے نظریہ کے مطابق جنگ بدر کے چھ ماہ بعد ہوا[1]

تفسیر

یہودِ بنی نظیر کی مدینہ میں سازش کا خاتمہ

یہ سُورہ خدا کی تسبیح و تنزیہ اور اس کی عزت و حکمت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے:

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے"۔ (سبح للّٰہ ما فی السماوات وما فی الارض وھو العزیز الحکیم)

یہ درحقیقت یہود بنی نظیر کی سرگزشت کے بیان کی تمہید ہے۔ یہ لوگ خدا اور اس کی صفات کی معرفت کے سلسلہ میں انواع و اقسام کی تحریفوں کا شکار تھے انہیں اپنی قوت و عزت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ یہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ زمین و آسمان کے موجودات کی عمومی تسبیح، عام اس سے کہ تسبیح کرنے والے فرشتے ہوں یا انسان یا حیوانات و جمادات و نباتات، ممکن ہے کہ زبان قال کے ساتھ ہو یا پھر زبانِ حال کے ساتھ، اس لیے کہ حیران کُن نظام جو ہر ذرہ کی تخلیق میں مصروفِ کار ہے وہ زبان حال سے خدا کے علم و قدرت اور اس کی عظمت کو بیان کرتا ہے پھر علما کی ایک جماعت کے نظریہ کے مطابق ہر موجود اپنے وجود میں عقل و ادراک و شعور کا ایک حصہ رکھتا ہے اگرچہ ہم اس سے آگاہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام وجود اپنی زبان سے خدا کی تسبیح کرتے ہیں اگرچہ ہمارے کان ان کے سُننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تمام عالم میں اس کی تسبیح و حمد کا غلغلہ ہے اگرچہ ہم اس سے بے خبر ہیں لیکن وہ جو صحیح معنی میں زندہ ہیں اور پتھر نہیں ہیں ان کو غیب کے سلسلہ میں ایک چشم بینا عطا ہوئی ہے وہ عالم کے تمام موجودات کے رازدار ہیں، وہ پانی اور مٹی کے نطق کو اچھی طرح سُنتے ہیں۔ یہ نطق اہل دل کو محسوس ہوتا ہے۔

به ذکرش هرچه خواهی در خروش است ۔۔۔ دلے داند چنیں معنی کہ گوش است

نہ بلبل بر گلش تسبیح خوان است ۔۔۔ کہ ہر خارے بہ توحیدش زبان است

جس کو تو دیکھے گا وہ اس کی تسبیح میں مصروف ہے لیکن اسے وہ سُن سکتا ہے جسے خدا نے کان عطا کیے ہیں۔ نہ صرف بُلبل اپنے پھول کو دیکھ کر تسبیح کر رہا ہے بلکہ ہر خار اس کی توحید کی زبان ہے۔

اس سلسلہ میں مزید تشریح سُورہ اسریٰ کی آیت ۴۴ کے ذیل میں آچکی ہے (جلد ۱۲ ص ۱۳۳ تا ۱۴۰)۔ اس تمہید کو بیان کرنے کے بعد مدینہ کے بنو نظیر کے نکلنے کی داستان بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"خدا وہی ہے جس نے اہل کتاب کفار کو مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلے اجتماع میں ہی ان کے گھروں سے نکالا" (ھو الذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتاب من دیارھم لاول الحشر)۔ "حشر" اصل میں کسی گروہ کو میدانِ جنگ یا اسی قسم کی کسی دوسری جگہ کی طرف بھیجنے کے معنی میں ہے۔ یہاں اس سے مُراد مسلمانوں کا اجتماع اور مدینہ سے یہودیوں کے قلعوں کی طرف چل پڑنا ہے یا یہودیوں کا مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اکٹھا ہونا ہے۔ چونکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلا اجتماع تھا لہٰذا قرآن میں اسے "لاول الحشر" کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ خود ایک لطیف اشارہ ہے

---

[1] مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر قرطبی، نور الثقلین در ذیل آیات زیر بحث (تلخیص کے ساتھ)۔

یہود بنی نظیر اور یہود خیبر سے مقابلہ کی طرف. تعجب کی بات یہ ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے سلسلہ میں کئی ایسے احتمال پیش کیے ہیں جو آیت کے نفس مضمون سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے. دوسرے احتمالات میں سے ایک یہ ہے کہ حشر اول سے مُراد روز قیامت کا حشر ہے، جب قبروں سے محشر کی طرف رجوع ہوگا. زیادہ عجیب یہ ہے کہ بعض نے اس آیت کو اس امر کی دلیل قرار دیا ہے کہ قیامت میں حشر سرزمین شام میں واقع ہوگا کیونکہ یہودی مدینے سے نکل کر شام کی طرف گئے تھے. یہ تمام ضعیف احتمال لفظ حشر سے پیدا ہوئے ہیں، حالانکہ یہ لفظ حشر قیامت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر قسم کے اجتماع، قرارگاہ سے نکلنے اور میدان میں حاضر ہونے پر ہوا ہے. جیسا کہ سورہ نمل کی آیت ۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں: (وحشر لسلیمان جنوده من الجن والانس والطیر) سلیمانؑ کا لشکر جن و انس اور پرندوں میں سے ان کے پاس جمع ہوا. اسی طرح فرعونی جادوگروں سے حضرت موسیٰؑ کے مبارزہ کے مشاہدہ کے لیے اجتماع کے بارے میں ہمیں ملتا ہے کہ: (وان یحشر الناس ضحی).
" ہماری قرارداد یہ ہے کہ جس وقت دن چڑھے سب لوگ جمع ہوں). (طٰہٰ ۔ ۵۹) ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " تم ہرگز یہ گمان نہ کرتے تھے کہ وہ اس مقام سے چلے جائیں گے اور وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کے مستحکم قلعے شکست اور عذاب الٰہی سے انہیں محفوظ رکھیں گے. (ماظننتم ان یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ) ۔ وہ اس طرح مغرور اور اپنی ذات سے رضامند تھے کہ ان کی تکیہ گاہ ان کے مضبوط قلعے اور ان کی ظاہری قوت تھی. آیت کا یہ انداز بیان بتاتا ہے کہ بنو نظیر کے یہودی مدینہ میں وسیع وسائل کے حامل تھے اور ان کے پاس بہت ساز و سامان تھا. اس طرح نہ وہ خود باور کرتے تھے کہ آسانی کے ساتھ مغلوب ہوں گے نہ دوسرے لوگ. لیکن چونکہ خدا چاہتا تھا کہ سب پر واضح کر دے کہ اس کے ارادہ کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی، یہاں تک کہ جنگ واقع ہوئے بغیر انہیں اس سرزمین سے نکال دیا اس لیے اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

" لیکن خدا جہاں سے انہیں گمان نہیں تھا ان کو آ لیا اور ان کے دل میں خوف ڈالا اس طرح سے کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں ویران کرتے تھے". (فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی المؤمنین) ۔ جی ہاں خدا نے اس غیر مرئی (نظر نہ آنے والا) لشکر یعنی خوف کے لشکر کو جسے بہت سی جنگوں میں مومنین کی مدد کے لیے بھیجا تھا ان کے دلوں پر مسلط کیا اور ان سے ہر قسم کے مقابلہ کی طاقت چھین لی. انہوں نے اپنے آپ کو بیرونی لشکر کے مقابلہ کے لیے تیار کیا تھا. وہ اس سے بے خبر تھے کہ خدا ان کے اندر سے ایک لشکر ان کے لیے بھیجے گا اور اس طرح انہیں ایک تنگ گلی میں بند کر دے گا کہ وہ خود دشمن سے مل کر اپنی تخریب کاری اور ویرانی میں مدد کریں گے. ٹھیک ہے کہ ان کے رئیس کعب بن اشرف کے مارے جانے نے اس واقعہ سے پہلے ان کے دلوں میں ایک طرح کی وحشت پیدا کر دی تھی لیکن یہ طے ہے کہ آیت سے مُراد یہ نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے گمان کیا ہے بلکہ یہ ایک قسم کی خدائی امداد تھی جو بارہا اسلامی جنگوں میں مسلمانوں کی مدد کے لیے سامنے آئی ہے. قابل توجہ امر یہ ہے کہ مسلمان باہر سے ان کے گھروں کو تباہ کرتے تھے تاکہ اندر جانے کا راستہ پائیں اور یہودی انہیں اندر سے ویران کرتے تھے تاکہ وہ مکان صحیح و سلامت مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئیں. اس صورت حال کا نتیجہ ان کے استحکام کا ویران ہونا تھا. اس آیت کے بارے میں کچھ اور تفاسیر بھی پیش کی گئی ہیں. ایک یہ کہ یہودی اندر سے اپنے مکانوں کی دیواروں کو توڑتے تھے کہ بھاگ کھڑے ہوں اور مسلمان باہر سے توڑتے تھے کہ ان پر قبضہ کر سکیں (لیکن یہ احتمال بعید ہے) ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت میں معانی کنایۃً رکھے گئے ہیں، جیسے کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص نے اپنا گھر اور اپنی زندگی اپنے ہاتھ سے تباہ کی یعنی نادانیوں اور کج فہمیوں کی وجہ سے اپنی زندگی کے برباد ہونے کا سبب بنا. یا یہ کہ یہودیوں کا بعض گھروں کو ویران کرنے سے مقصد یہ تھا کہ قلعوں کے اندر کے کوچوں کے دہانے بند کر دیں تاکہ

مسلمان اندر نہ آسکیں اور آئندہ یہاں رہائش اختیار نہ کر سکیں، یا یہ کہ قلعوں کے اندر کے کچھ گھر انہوں نے خراب کیے تاکہ اگر قلعہ کے اندر کا حصہ میدانِ جنگ بن جائے تو جنگ کرنے کے لیے کافی جگہ موجود ہو، یا یہ کہ بعض گھروں کی تعمیر میں گراں قیمت اشیاء صرف ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھروں کو خراب کیا تاکہ جو کچھ اٹھانے کے قابل ہو اسے اٹھا کر لے جائیں لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ آیت کے آخر میں ایک مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو": (فاعتبروا یا اولی الابصار)۔ "اعتبروا" "اعتبار" کے مادہ سے اصل میں عبور سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز کی طرف جانا ہے۔ یہ جو اشکِ چشم کو "عبرہ" کہا جاتا ہے آنسوؤں کے قطروں کا آنکھ کو عبور کرنے کی بنا پر ہے اور "عبارۃ" کو اس بنا پر عبارت کہتے ہیں کہ وہ مفاہیم کو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کرتی ہے اور خواب کے مفہوم پر تعبیرِ خواب کا اطلاق اس بنا پر ہے کہ وہ انسان کو اس کے ظاہر سے اس کے باطن کی طرف منتقل کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے وہ حوادث جو انسان کو نصیحت کا سرمایہ دیتے ہیں انہیں عبرت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کی کلی تعلیمات کے ایک سلسلہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور ایک مطلب سے دوسرے مطلب کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ "اولی الابصار" کی تعبیر (آنکھوں والے) ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حوادث کو اچھی طرح دیکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے ان کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ "بصر" کا لفظ عام طور پر بینائی کے عضو، بصیرتِ باطنی یعنی ادراک و آگاہی کے لیے بولا جاتا ہے۔[1]

حقیقت میں "اولی الابصار" وہ لوگ ہیں جو درسِ عبرت حاصل کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اس حادثہ سے ضرور سبق حاصل کریں۔ اس میں شک نہیں کہ عبرت پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مشابہ حوادث جو حکمِ عقلی کے لحاظ سے یکساں ہیں ان کا ایک دوسرے پر قیاس کریں۔ مثلاً دوسرے کفار اور ان کی عہد شکنیوں کی حالت کا بنو نضیر کے یہودیوں کے احوال پر قیاس کریں لیکن یہ جملہ ہرگز قیاساتِ ظنی سے تعلق نہیں رکھتا جن سے بعض لوگ احکامِ دینی کے استنباط میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ بعض فقہائے اہلِ سنت نے اس مقصد کے اثبات کے لیے مندرجہ بالا آیت سے استفادہ کیا ہے جب کہ بعض دوسروں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عبرت اور اعتبار سے مراد مندرجہ بالا آیت میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منطقی اور قطعی انتقال ہے نہ یہ کہ خیال و گمان پر عمل کرنا۔ بہرحال واقعی اس قوم یہود کی سرگزشت باوجود اس قوت و عظمت و شوکت کے اور باوجود وسائل و امکانات و استحکامات کے عبرت انگیز تھی، یہاں تک کہ بغیر اس کے کہ اسلحہ کو ہاتھ لگائیں مسلمانوں کی ایسی جمعیت کے مقابلہ میں جو بظاہر ہرگز ان کے مقابلہ کے قابل نہیں تھی سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے گھر اپنے ہاتھوں برباد کیے اور اپنے مال ضرورت مند مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے اور مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ حالانکہ تاریخوں کے حوالوں کے مطابق ابتدا میں انہوں نے مدینہ میں اس لیے سکونت اختیار کی تھی کہ جس پیغمبر کی آمد کا ان کی کتابوں میں وعدہ کیا گیا تھا اس کو حاصل کریں اور اس کے اصحاب کی صفِ اول میں قرار پائیں۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

(کان اکثر عبادۃ ابی ذر التفکر والاعتبار)

ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی۔[2]

---

[1] مفردات راغب۔

[2] کتاب خصال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۸۴

لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دردناک حوادث کو خود آزمائیں اور شکستوں کا تلخ مزہ خود چکھیں لیکن کوئی عبرت حاصل نہ کریں
امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :

(السعید من وعظ بغیرہ)

سعادت مند وہی ہے جو دوسروں سے وعظ و نصیحت حاصل کرے۔[1]

اس کے بعد والی آیت کہتی ہے :

" اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے ان کے لیے مقرر کر رکھا تھا کہ جلا وطن ہو جائیں اور اس جگہ کو چھوڑ دیں تو ان پر اسی دنیا میں عذاب نازل کرتا" (ولولا ان کتب اللہ علیھم الجلاء لعذبھم فی الدنیا)۔ اس میں شک نہیں کہ جلاوطنی اور ان عمدہ سرمایوں کا چھوڑ جانا جن جمع کرنے میں انہوں نے ایک عمر صرف کی تھی خود ان کے لیے ایک دردناک عذاب تھا۔ اسی بنا پر اوپر والے جملہ سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ عذاب ان کے لیے مقدر نہ کیا گیا ہوتا تو دوسرا عذاب ان پر نازل ہوتا یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوتے اور قتل ہو جاتے۔ خدا چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں دربدر مارے مارے پھریں اور یہ دربدر ہونا ان کے لیے بسا اوقات زیادہ دردناک تھا اس لیے کہ جس وقت وہ اپنے ان تمام قلعوں، سجے سجائے گھروں، کھیتوں اور باغات کو یاد کرتے جو اب دوسروں کے قبضہ میں تھے اور وہ خود عہد شکنی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے کی وجہ سے دوسرے علاقوں میں محروم و سرگرداں تھے تو وہ بہت زیادہ تکلیف اور روحانی عذاب میں گرفتار ہوتے تھے۔ جی ہاں لہٰذا یہ چاہتا تھا کہ یہ مغرور، فریب کار اور عہد شکن گروہ اس قسم کے دردناک عذاب سے دوچار ہو لیکن یہ صرف ان کا دنیاوی عذاب تھا" اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے :

" اور ان کے لیے آخرت میں بھی جہنم کا عذاب ہے : (ولھم فی الاٰخرۃ عذاب النار)۔

یہ ہے دنیا و آخرت ان لوگوں کی جو حق و انصاف کو ٹھکرا دیتے ہیں اور غرور و خود پرستی کے رہوار پر سوار ہوتے ہیں۔ چونکہ اس واقعہ کا بیان، علاوہ اس کے کہ پروردگار کی قدرت اور پیغمبر اسلامؐ کی حقانیت کا بیان ہے، تمام لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے جو یہود بنی نظیر جیسے اعمال کے حامل ہیں تاکہ مسئلہ انہی تک محدود نہ رہے لہٰذا بعد والی آیت میں ایک بامقصد تعلیم دیتے ہوئے مزید فرماتا ہے :

" یہ دنیا و آخرت کا عذاب اس بنا پر ان پر نازل ہوا کہ وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن بن گئے "۔ (ذالک بانھم شاقوا اللہ ورسولہ)۔ " اور جو شخص خدا کی دشمنی اختیار کرے تو وہ اس پر عذاب نازل کرتا ہے اس لیے کہ وہ شدید العقاب ہے" (ومن یشاق اللہ فان اللہ شدید العقاب)۔[2]

" شاقوا " مادہ " شقاق " سے اصل میں دو چیزوں کے درمیان شگاف پڑنے اور جدائی کے معنوں میں ہے اور چونکہ دشمن ہمیشہ مد مقابل قرار پاتا ہے اور اپنے آپ کو الگ کر لیتا ہے لہٰذا اس کے عمل کو شقاق کہتے ہیں۔ بعینہٖ یہی آیت بہت جزوی اختلاف کے ساتھ سورہ انفال کی آیت ۱۳ میں جنگ بدر کے واقعہ اور مشرکین کے شکست کھانے کے واقعہ کے بعد آئی ہے جو ہر لحاظ سے اس کے مضمون کو بیان کرتی ہے۔ قابل توجہ یہ کہ پروردگار عالم آغاز آیت میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی کو پیش کرتا ہے جب کہ آیت کے ذیل میں صرف خدا کی دشمنی کی بات کرتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول خدا سے دشمنی بھی خدا کی دشمنی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶
[2] من شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ ومن یشاق اللہ یعاقبہ فان اللہ شدید العقاب۔

سے جُدا نہیں ہیں۔ شدید العقاب کی تعبیر ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ جو عفو و رحمت کا مقام ہے وہاں وہ ارحم الراحمین ہے اور جہاں عذاب، سزا اور عقوبت کا مقام ہے وہاں وہ اشد المعاقبین ہے جیسا کہ دُعا میں آیا ہے۔ وایقنت انك انت ارحم الراحمین فی موضع العفو والرحمة واشد المعاقبین فی موضع النکال والنقمة[1]

مجھے یقین ہے کہ تو عفو و رحمت کے مقام پر ارحم الراحمین ہے اور عذاب و سزا کی منزل میں اشد المعاقبین ہے۔ زیر بحث آیات کی آخری آیت میں خداوندِ عالم ایک اعتراض کا جواب پیش کرتا ہے جو بنو نظیر کے یہودنے جیسا کہ ہم شانِ نزول میں بھی کہہ چکے ہیں اُس موقعہ پر پیغمبرِ اسلام پر کیا تھا جب آپ نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کے قلعوں کے پاس کی کھجوروں کے کچھ درخت کاٹ دیے جائیں (تاکہ جنگ کے لیے جگہ کھلی ہو جائے یا اس لیے کہ یہودی پریشان ہوں اور قلعوں سے باہر نکل کر جنگ کریں) انہوں نے کہا تھا کہ اے محمدؐ! کیا وہ آپ ہی نہیں تھے جو اس قسم کے کاموں سے منع کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ

"کھجور کے جس قیمتی درخت کو تم نے کاٹا تھا یا اسے اپنی حالت پر رہنے دیا ہے یہ سب کچھ خدا کے حکم سے تھا۔"

(ما قطعتم من لینة او ترکتموها قائمة علیٰ اصولها فباذن الله).[2]

مقصد یہ تھا کہ فاسقین کو ذلیل و رسوا کرے۔ (و لیخزی الفاسقین)۔ "لینة" "لون" کے مادہ سے ہے اور اس کے معنی کھجور کے درخت کی ایک اعلیٰ نوع کے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کی "لین" کے مادہ سے کھجور کے درخت کی ایک نوع کی نرمی کے معنوں میں تفسیر کی ہے۔ یہ درخت نرم ہوتا ہے اور اس کی شاخیں زمین کے قریب ہوتی ہیں۔ اس درخت میں لگنے والی کھجوریں نرم اور لذیذ ہوتی ہیں۔ اور کبھی لینة کی تفسیر "الوان" کے حوالے سے ہوتی ہے جس کے معنی کھجور کے درخت کی مختلف انواع ہیں۔ اس کی تفسیر "نخل کریمہ" بھی کی گئی ہے۔ یہ سب تفسیریں ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بنو نظیر کے کھجوروں کے درخت بعض مسلمانوں نے کاٹے جبکہ دوسرے مسلمان مخالف تھے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور نزاع کو ختم کیا۔[3]

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحاب میں سے دو افراد کے عمل سے متعلق ہے کہ جن میں سے ایک کھجور کے اچھے درخت کاٹ رہا تھا تاکہ یہودی غصہ میں آکر قلعوں سے باہر نکل آئیں۔ دوسرا کم قیمت درختوں کو کاٹتا تھا تاکہ جو قیمتی درخت ہیں ان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس بنا پر ان کے درمیان اختلاف ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا کہ دونوں کام اللہ کے حکم سے تھے۔[4]

لیکن آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے "لینة" اچھی قسم کے درختوں کو کاٹا اور ان میں سے بعض کو چھوڑ دیا۔ یہ چیز یہودیوں کے اعتراض کا سبب بنی اور قرآن نے اس کا جواب دیا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ کام ہوائے نفس کے نتیجے میں نہیں تھا بلکہ اس سلسلہ میں ایک حکم الٰہی صادر ہوا تھا کہ محدود طریقہ پر اس کام کو کیا جائے تاکہ نقصان زیادہ نہ ہو۔ بہرصورت یہ حکم اسلام کے ایک مشہور قانون کا استثناء تھا جو یہ کہتا ہے کہ دُشمن پر حملے کے وقت درختوں کو نہیں کاٹنا چاہیے، جانوروں کو ذبح نہیں کرنا چاہیے اور کھیتوں میں آگ نہیں لگانی چاہیے۔ یہ استثناء صرف ایسے موقف سے تعلق رکھتا تھا کہ جہاں دشمن کو قلعہ سے باہر نکالنے یا میدان جنگ بنانے کی ضرورت تھی۔

---

[1] دُعائے افتتاح از "ادعیۂ ماہِ مبارک رمضان"۔

[2] اوپر والی آیت میں ما شرطیہ ہے اور فباذن اللہ اس کی جزا ہے۔

[3] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۹۳۔ یہی معنی تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۸۸ پر بیان ہوئے ہیں۔

[4] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۸۳۔

ہر قانون کلی میں ضروری جزوی استثناء عام طور پر موجود ہوتے ہیں جیسا کہ اصل کلی مردار کا گوشت نہ کھانا ہے لیکن مجبوری اور اضطرار کی صورت میں اکل میتۃ "مردار کا کھانا جائز ہے (ولیخزی الفاسقین) "تاکہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے"۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ دشمن کو ذلیل کیا جائے اور ان کے حوصلوں کو پست کیا جائے

چند نکات

۱۔ خدا کے غیر مرئی لشکر

اہل دنیا کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی ظاہری اور مادی قوتوں پر انحصار کرتے ہیں لیکن خدا پرستوں کا انحصار خدائی مدد پر ہوتا ہے جس کا ایک نمونہ ہم نے بنو نظیر کے شکست کھانے اور مدینہ سے باہر نکلنے کے سلسلہ میں مندرجہ بالا آیتوں میں دیکھا ہے۔ ان آیتوں میں ہم نے پڑھا ہے کہ کامیابی کا ایک مؤثر سبب وہی خوف تھا جو خدا نے یہودیوں کے دلوں میں ڈالا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے توڑنے لگے اور اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اپنے اموال کو نظر انداز کر دیں اور اس علاقہ سے باہر نکل جائیں۔ ان معانی کی نظیر قرآنی آیات میں چند مرتبہ آئی ہے۔ منجملہ دوسرے مواقع کے ایک موقع پر جب کہ مسلمان بنو قریظہ سے جنگ احزاب میں آمنے سامنے ہوئے تھے، یہ نظیر موجود ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

(و انزل الذین ظاہروھم من اہل الکتاب من صیاصیھم و قذف فی قلوبھم الرعب فریقاً تقتلون و تأسرون فریقاً) "خدا نے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کو جس نے مشرکین عرب کی حمایت کی اس کے محکم قلعوں سے نیچے اتارا اور ان کے دلوں میں خوف ڈال دیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک گروہ کو تم نے قتل کیا اور ایک گروہ کو اسیر کیا"۔ (احزاب ۲۶)

یہی مفہوم جنگ بدر کے واقعہ میں بھی موجود ہے جہاں کہا گیا ہے (سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا"۔ اسی رعب کا ایک حصہ جو خدا کے ایک غیر مرئی لشکر کا حکم رکھتا ہے۔ طبیعی ہے اگرچہ اس کا ایک حصہ پُراسرار ہے اور اس کے روابط عام وسائل کے ذریعہ ہم پر منکشف نہیں ہیں جو چیز طبعی و فطری ہے کہ مومنین ہمیشہ ہر حالت میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھیں چاہے قتل ہو کر شہید ہو جائیں اور چاہے دشمن کی سرکوبی کریں۔ جس کی یہ منطق ہو وہ خوف اور وحشت کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا بلکہ اس قسم کا عجیب انسان اپنے دشمن کے لیے باعث خوف و وحشت ہوتا ہے۔ جیسا کہ دنیا میں ہم بڑے بڑے ممالک کو دیکھتے ہیں کہ باوجود جدید ترین ہتھیار رکھنے کے اور بہت عظیم ہونے کے سچے مومنوں کے ایک چھوٹے گروہ سے ڈرتے ہیں اور ان سے جنگ کرنا ان کے لیے خوف کا باعث ہوتا ہے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے نہ الجھیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہمیں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

(نصرت بالرعب مسیرۃ شھر)

"میری خدا کی جانب سے ایک ماہ کے فاصلے سے خوف و وحشت سے مدد کی گئی ہے"۔[1]

یعنی نہ صرف وہ لوگ جو میدانِ جنگ میں میرے سامنے ہوتے ہیں مجھ سے خوف کھاتے ہیں بلکہ جن علاقوں میں دشمن مجھ سے ایک ماہ کے فاصلے پر ہوتے ہیں ان پر بھی وحشت و اضطراب طاری رہتا ہے۔ حضرت مہدیؑ کی فوج کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ تین لشکر

---

[1] مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۱۹ (آل عمران کی آیت ۱۵۱ کے ذیل میں)۔

آپ کی مدد کریں گے۔ (الملائکۃ والمؤمنون والرعب) "فرشتے مومن اور خوف"[1]

حقیقت میں وہ تو کوشش کرتے ہیں کہ انہیں باہر سے کوئی ضرب نہ لگے لیکن خدا انہیں اندر سے ضرب لگاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اندرونی ضرب زیادہ جانکاہ اور ناقابلِ تلافی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر تمام دنیا کے ہتھیار اور لشکر کسی کے قبضہ میں ہوں لیکن اس میں جنگ کرنے کا جذبہ اور حوصلہ نہ ہو تو اُسے ضرور شکست ہوگی۔

۲۔ موجودہ زمانے میں یہودیوں کی سازشیں

تاریخ اسلام اپنے آغاز ہی سے یہودیوں کی سازشوں سے بھری پڑی ہے اور ہم بہت سے دردناک حوادث میں میدان کے اندر یا پس منظر میں ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ پیغمبر موعودؐ کے عشق و محبت میں سرزمین حجاز میں آئے تھے لیکن ان کے عظیم ظہور کے بعد بدترین دشمن ہو گئے اور موجودہ زمانے میں بھی اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں میں ہم یہودیوں کو منظر یا پس منظر میں دیکھتے ہیں اور یہ صاحبانِ بصیرت کے لیے سامانِ عبرت ہے۔

جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ بتاتی ہے، یہودیوں کو پسپا کرنے کا واحد راستہ ان سے براہ راست مقابلہ کرنا ہے خصوصاً صیہونیت جس کی لغت میں عدل و انصاف اور نرمی کا کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ طاقت ان کی زبان ہے۔ سوائے قوت و طاقت کے ان سے بات نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے باوجود وہ سچے مومنین سے بہت ڈرتے ہیں۔ اگر موجودہ زمانے کے مسلمان اصحاب پیغمبرؐ کی طرح ایمان و استقامت سے کافی حد تک بہرہ ور ہوں تو ان کا خوف خون خوار دشمنوں پر غالب آجائے اور اسی لشکر خدائی کے ذریعہ یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا درس ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں چودہ سو سال پہلے دیا تھا۔

✣ ✣ ✣

---

[1] اثبات الہداۃ جلد ۷، ص ۱۲۳

۶۔ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ
وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۷۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰی
وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ
الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ
عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۶۔ اور جو کچھ خدا اپنے رسولؐ کو ان یہود سے لوٹا دے تو وہ ایسی چیز ہے جس پر قبضہ کرنے کے لیے (تم نے کوئی زحمت نہیں اُٹھائی) نہ تم نے گھوڑا دوڑایا ہے، نہ کوئی اُونٹ لیکن خُدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلّط کر دیتا ہے اور خُدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۷۔ جو کچھ خدا ان آبادیوں والوں سے اپنے رسولؐ پر لوٹائے وہ خدا، رسول، ذوی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور ابن السبیل (راستہ میں عاجز ہو کر رہ جانے والوں) کے لیے ہے تاکہ (یہ عظیم مال) دست بدست تمہارے دولت مندوں کے درمیان گردش نہ کرے۔ جو کچھ خدا کا رسولؐ تمہارے لیے لایا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ اور خدا کی مخالفت سے پرہیز

کرو کیونکہ خدا شدید العقاب ہے۔

شانِ نزول

چونکہ یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کی تکمیل ہیں جو یہودِ بنی نظیر کی شکستوں کو بیان کر رہی تھیں، لہٰذا ان کی شانِ نزول بھی اُسی شانِ نزول کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ بنی نظیر کے یہودیوں کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد ان کے باغات، زمینیں، زراعتیں، گھر اور دوسرے مال کا کچھ حصّہ مدینہ میں رہ گیا۔ مسلمانوں کے سرداروں کی ایک جماعت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور زمانۂ جاہلیت کے قانون کے مطابق جو بات ان کے دل میں تھی وہ انہوں نے عرض کی اور وہ یہ کہ اس مالِ غنیمت کا منتخب حصّہ اور باقی کی ایک چوتھائی آپ لے لیجیے اور باقی ہمیں دے دیجیے تاکہ اسے ہم اپنے درمیان تقسیم کرلیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور صراحت کے ساتھ کہا کہ چونکہ ان اموالِ غنیمت کے لیے جنگ نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے کوئی زحمت و مشقت برداشت نہیں کی، لہٰذا یہ تمام مال و اسباب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت ہیں۔ جس طرح ان کی مصلحت ہوگی وہ تقسیم کریں گے اور جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اموال ان مہاجرین کے درمیان جو مدینہ میں مال دنیا نہ رکھتے تھے اور انصار کی وہ تھوڑی سی تعداد جنہیں مال کی شدید احتیاج تھی، ان کے درمیان تقسیم کر دیے۔[1]

تفسیر

ان اموالِ غنیمت کے بارے میں حکم جو جنگ کے بغیر ہاتھ لگیں

یہ آیتیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے، بنو نظیر کے اموالِ غنیمت کے بارے میں جو حکم ہے اسے پیش کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام اموالِ غنیمت کے سلسلہ میں ایک قانونِ کلی کو بھی واضح کرتی ہیں جو مال بغیر کسی زحمت و مشقت کے اسلامی معاشرہ کو ملے اسے فقہ اسلامی میں "فے" کہتے ہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

"جو کچھ خدا نے اپنے رسولؐ کی طرف ان سے پلٹایا وہ ایسی چیز ہے جس کے حصول کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے ہیں اور نہ اونٹ"

وما افاء اللّٰہ علیٰ رسولہ منھم فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب۔[2]

"افاء" "فیء" کے مادہ سے اصل میں رجوع و بازگشت کے معنی میں ہے اور یہ جو اموالِ غنیمت پر اس کا اطلاق ہوا ہے شاید اسی بنا پر ہے کہ خدا نے اس جہان کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین کے لیے اور سب سے پہلے اپنے پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے پیدا

---

[1] "مجمع البیان" اور دوسری تفاسیر در ذیل آیاتِ زیرِ بحث۔

[2] "ما" ما افاء اللّٰہ میں موصولہ ہے اور مبتدا اور "ما" فما اوجفتم میں نافیہ ہے اور یہ سارا جملہ خبر ہے۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ پہلا "ما" شرطیہ اور دوسرا اس کے بعد والے جملہ کے ساتھ جواب شرط ہو (فا کا آنا اس خبر پر جو شرط کے مشابہ ہو کوئی مانع نہیں رکھتا)۔

کی ہیں جو اشرف کائنات و فخرِ موجودات ہیں اور غیر مومن و گنہگار افراد حقیقت میں ان اموال کے غاصب ہیں (اگرچہ وہ حسب قوانین شرعی و عرفی مالک شمار ہوں) جس وقت یہ اموال حقیقی مالکوں کی طرف لوٹیں تو فیٔ ان کے لیے بہترین عنوان ہے۔ "اوجفتم" "ایجاف" کے مادہ سے تیزی سے ہانکنے کے معنی میں ہے جس کا عام طور پر جنگوں میں اتفاق ہوتا ہے۔ خیل کے معنی گھوڑے ہیں۔ (یہ ایسی جمع ہے جس کا مفرد خود اس کی جنس میں سے نہیں ہے)۔[1]

"رکاب" "رکوب" کے مادہ سے عام طور پر سواری کے اونٹوں کے لیے آتا ہے۔ پورے جملہ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام مواقع جن میں مالِ غنیمت حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوئی جنگ واقع نہ ہو وہاں مال غنیمت جنگجو افراد میں تقسیم نہیں ہوگا اور وہ مکمل طور پر رئیس مسلمین کے اختیار میں ہوگا اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق بعد والی آیت میں بیان شدہ مصارف میں سے کسی مصرف میں صرف کرے گا۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"اس طرح نہیں کہ کامیابیاں ہمیشہ تمہاری جنگوں کا نتیجہ ہوں لیکن خدا اپنے رسولوں کو جس پر چاہے تسلط عطا کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔" (ولٰکن اللہ یسلط رسلہ علیٰ من یشاء واللہ علیٰ کل شیء قدیر)۔ جی ہاں یہودِ بنی نظیر جیسے قوی دشمن پر کامیابی خدا کی مدد کے نتیجے میں ممکن ہوئی تاکہ تم جان لو خدا ہر چیز پر قادر ہے اور چشم زدن میں ایک طاقتور قوم کو زبوں حال بنا سکتا ہے اور ایک گروہ کو ان پر مسلط کر سکتا ہے اور پہلے گروہ کے تمام امکانات و وسائل دوسرے گروہ کو منتقل کر سکتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے کہ مسلمان اس قسم کے میدانوں میں اللہ کی معرفت کا درس بھی لے سکتے ہیں اور پیغمبرؐ کی حقانیت کی نشانیاں بھی دیکھ سکتے ہیں اور ذات پاک خدا سے خلوص اور اسی پر انحصار کو مشعل راہ بنا سکتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودِ بنی نظیر کے اموال غنیمت جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آئے بلکہ انہوں نے لشکر کشی کی اور یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کسی حد تک تلوار بھی چلی جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بنو نظیر کے قلعے جیسا کہ مؤرخین نے کہا ہے، مدینہ سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں تھے۔ (بعض مفسرین نے یہ فاصلہ دو میل یا تین کلو میٹر سے کم بیان کیا ہے)۔ مسلمان پیادہ قلعوں کی طرف آئے اس وجہ سے انہوں نے کوئی مشقت برداشت نہیں کی۔ باقی رہی تلواروں کی جنگ تو وہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ محاصرہ نے بھی زیادہ طول نہیں کھینچا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ، حقیقت میں وہ چیز جسے جنگ کا نام دیا جا سکے، واقع نہیں ہوئی اور کوئی قطرۂ خون زمین پر نہیں گرا۔ بعد والی آیت وضاحت کے ساتھ فیٔ کا مصرف بتاتی ہے جو گزشتہ آیت میں آیا تھا۔ خداوند عالم ایک قاعدۂ کلی کے طور پر فرماتا ہے:

"جو کچھ خدا نے ان آبادیوں والے لوگوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پلٹایا ہے وہ خدا، رسولؐ، اس کے ذوی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور راستوں میں درماندہ لوگوں کے لیے ہے۔ (ما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اھل القریٰ فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل)۔ یعنی مسلح جنگ کے اموال غنیمت کی مانند نہیں جن کا صرف پانچواں حصہ پیغمبرؐ اور دوسرے حاجت مندوں کے اختیار میں ہے، باقی چار حصے جنگجو افراد کے لیے ہیں۔ نیز اگر گزشتہ آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ تمام کا تمام رسولؐ خدا سے متعلق ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ سارے کا سارا اپنے شخصی اور ذاتی مصارف میں صرف کریں بلکہ اس لیے کہ وہ اسلامی حکومت

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ خیل اصل میں خیال کے مادہ سے خیالات اور ذہنی تصورات کے معنی میں ہے اور "خیلا" تکبر اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے معنی میں ہے، اس لیے کہ ایک قسم کا تخیل فضیلت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ انسان جب گھوڑے پر سوار ہو تو عام طور پر ایک قسم کا غرور محسوس کرتا ہے لہٰذا لفظ خیل کا گھوڑے پر اطلاق ہوا ہے۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ خیل گھوڑوں اور سواروں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

کے سربراہ ہیں اور خصوصاً حاجت مندوں کے حقوق کے محافظ ہیں لہٰذا وہ اس کا زیادہ حصہ ان پر خرچ کریں گے۔

اس آیت میں کلی طور پر خمس کے لیے چھ مصرف بیان ہوئے ہیں :

۱۔ سہم خدا :۔ واضح ہے کہ خدا ہر چیز کا مالک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی نسبت تشریفی و اعزازی ہے تاکہ دوسرے گروہ جو اس کے بعد بیان ہوئے ہیں کسی قسم کی حقارت محسوس نہ کریں اور اپنا حصہ خدا کے حصہ کا سلسلہ خیال کریں۔ اس طرح ان کی شخصیت عام افراد کے ذہنوں میں کسی نقص کا شکار نہ ہو۔

۲۔ سہم پیغمبر :۔ جس سے فطری طور پر ان کی ذاتی ضرورتیں اس کے بعد مقامی حاجتیں اور وہ توقعات جو لوگ ان سے رکھتے ہیں وہ سب اس سے پوری ہوں۔

۳۔ سہم ذوی القربیٰ :۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے یہاں مراد پیغمبرؐ کے ذوی القربیٰ ہیں اور بنی ہاشم ہیں جو زکوٰۃ کے لینے سے محروم ہیں جو عام مسلمانوں کے اموال کا جزہے۔[1]

اصولی طور پر اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس سے مراد عام لوگوں کے ذوی القربیٰ ہوں کیونکہ اس صورت میں تمام مسلمانوں کو بغیر کسی استثناء کے شامل کرنا پڑے گا کیونکہ تمام لوگ ایک دوسرے کے عزیز و اقربا ہیں۔ اب رہا یہ کہ ذوی القربیٰ میں احتیاج و فقر شرط ہے یا نہیں اس پر مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اگرچہ وہ قرائن جو اس آیت کے آخر میں اور بعد والی آیت میں ہیں اس کا شرط ہونا زیادہ صحیح نظر نہیں آتا۔

۴، ۵، ۶۔ یتیموں، مسکینوں اور سفر میں درماندہ افراد کا حصہ ہے۔ یہ کہ یہ تینوں گروہ بنی ہاشم میں سے ہونے چاہئیں یا عام یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا اس میں حصہ ہے مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر فقہائے اہل سنت اور ان کے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ عمومیت رکھتا ہے جب کہ وہ روایتیں جو طرق اہلبیت سے ہم تک پہنچی ہیں وہ اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ بنی ہاشم کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہے لیکن بعض روایات میں تصریح ہوئی ہے کہ یہ حکم عمومیت رکھتا ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

(کان ابی یقول لنا سهم رسول الله و سهم ذی القربیٰ ونحن شرکاء الناس فیما بقی)

ہمارے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ذوی القربیٰ کا حصہ ہے اور ہم ان باقی ماندہ حصوں میں لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔[2]

اس سورہ کی آیت ۸، ۹ جو اس آیت کی وضاحت کرتی ہیں اور گواہی دیتی ہیں کہ یہ حصہ بنی ہاشم کے لیے مخصوص نہیں ہے کیونکہ ان میں عام فقراء مہاجرین و انصار کے بارے میں گفتگو ہے۔ علاوہ ازیں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے بنو نظیر کے واقعہ کے بعد ان اموال

---

[1] یہ تفسیر نہ صرف شیعہ مفسرین نے بلکہ بہت سے اہل سنت مفسرین نے بھی تحریر کی ہے مثلاً فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں، برسوئی نے روح البیان میں، سید قطب نے فی ظلال میں، مراغی نے اپنی تفسیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۱ ، وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۶۸ (حدیث ۱۲ باب ۱ ابواب انفال)۔

کو جو وہ چھوڑ گئے تھے مہاجرین میں جو عام طور پر مدینہ میں سخت حالات میں زندگی گزار رہے تھے، اور انصار کے تین گروہوں میں جو بہت زیادہ حاجت مند تھے تقسیم کر دیے اور یہ امر آیت کے مفہوم کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اب اگر بعض روایات اس کی تائید نہ کرتی ہوں تو ظاہر قرآن کو ترجیح دینی چاہیئے۔[1]

اس کے بعد اس حساب شدہ تقسیم کے فلسفہ کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"یہ اس بنا پر ہے کہ یہ عظیم اموال تمہارے امیر لوگوں کے درمیان دست بدست گردش نہ کرتے رہیں اور حاجت مند اُن سے محروم رہیں"۔

(کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم)[2]

مفسرین نے اس جملہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ ایک شان نزول بیان کی ہے جس کی طرف پہلے بھی اجمالاً اشارہ ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ رؤسا مسلمین کی ایک جماعت واقعہ بنی نضیر کے بعد پیغمبرؐ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا جس کو آپ خود منتخب کریں وہ اور ان اموال غنیمت کا چوتھا حصہ آپ لیجئے اور بقایا ہمارے اختیار میں دے دیجئے تاکہ ہم اپنے درمیان تقسیم کر لیں جیسا کہ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں متنبہ کیا کہ یہ اموال اغنیاء میں دست بدست گردش نہ کرنے پائیں۔ یہ آیت اقتصاد اسلامی کے ایک بنیادی اصول کو بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا مزاج یہ ہے کہ باوجود شخصی اور خصوصی مالکیت کے احترام کے سلسلہ کا ایسا رکھا جائے کہ مال و دولت ایک مخصوص گروہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ صرف انہیں کے درمیان گردش کریں۔ البتہ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنی طرف سے قوانین وضع کر لیں اور مال و دولت ایک گروہ سے لے کر دوسرے گروہ کے حوالے کر دیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر دولت کے حصول کے سلسلہ میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے اصول سرکاری مالیات مثلاً خمس، زکوٰۃ اور افراج وغیرہ کے احکام اور بیت المال و انفال کے احکام ٹھیک طرح سے عملی جامہ پہن لیں تو خود بخود یہ نتیجہ نکل آئے گا کہ باوجود انفرادی کوششوں کے احترام کے اجتماعی مصلحتیں بھی پوری ہو جائیں گی۔ اور معاشرہ میں نہ بہت امیر طبقہ رہے گا نہ بہت غریب، بلکہ دولت کی معتدل تقسیم بروئے کار آئے گی۔ خداوند تعالیٰ آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

"جو کچھ خدا کا رسولؐ تمہارے لیے لایا ہے اُسے لے لو اور جس سے اس نے تمہیں منع کیا ہے اس سے باز رہو اور تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ خدا شدید العقاب ہے"۔ (وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب)

یہ جملہ اگرچہ بنو نضیر کے اموال غنیمت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن یہ مسلمانوں کے تمام کاروبار زندگی میں ایک حکم عمومی کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ چیز سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجت ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔ اس اصول اساسی کے پیش نظر تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ پیغمبرؐ کے اوامر و نواہی کو گوش دل سے سنیں اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، خواہ وہ حکومت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں ہوں یا اقتصادی مسائل سے متعلق ہوں یا حقوق بندگان کے بارے میں ہوں یا ان سے علیحدہ ہوں۔ یہ حقیقت خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ مخالفت کریں گے ان کو شدید عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۳۵۶ ، حدیث ۳ باب ۱ الباب انفال۔

[2] "دولة" دال کے زبر اور پیش کے ساتھ، ایک ہی معنی میں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ان کے درمیان فرق کیا ہے کہ پہلے کو اموال کے ساتھ مخصوص اور دوسرے کو جنگ کے ساتھ اور مقام کے ساتھ مربوط جانتے ہیں یا پہلے کو اسم مصدر اور دوسرے کو مصدر شمار کیا ہے۔ بہر حال تداول کے مادہ سے دست بدست کرنے کے معنی میں دونوں ایک سی ہیں۔

ایک نکتہ

فئ ا مصرف (وہ اموال غنیمت جو بغیر جنگ کے حاصل ہوں ان کا مصرف)

و اموال جو فئ کے عنوان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ میں سربراہ حکومتِ اسلامی کی حیثیت سے آتے تھے وہ ان تمام اموال پر مشتمل ہوتے تھے جو بغیر جنگ مسلمانوں کے ہاتھ لگتے تھے۔ یہ اموال اسلامی معاشرہ میں اعتدالِ ثروت کے سلسلہ میں اہم کردار انجام دے سکتے تھے کیونکہ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے خلاف یہ اموال کبھی بھی اقوام و قبائل کے دولت مندوں میں تقسیم نہیں ہوتے تھے بلکہ براہِ راست مسلمانوں کے سربراہِ اعلیٰ کے اختیار میں ہوتے تھے اور وہ بھی سب سے زیادہ استحقاق کے اصول کو پیشِ نظر رکھ کر تقسیم کیے جا سکتے تھے جیسا کہ انفال کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ فئ انفال کا ایک حصہ ہے اور اس کا دوسرا حصہ وہ تمام اموال ہیں جن کا مالک مشخص نہیں ہوتا۔ اس کی تشریح فقہ اسلامی میں ہو چکی ہے اور اس سے متعلق زیادہ موضوعات ہیں۔ اس طرح الٰہی نعمتوں کا زیادہ حصہ حکومتِ اسلامی کے قبضہ میں جاتا اور اس کے بعد ضرورت مندوں کو ملتا۔[1]

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی اور دوسری آیت کے درمیان، جیسا کہ ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے، کوئی تضاد نہیں ہے اگرچہ پہلی آیت بظاہر فئ کو خُود پیغمبرؐ کے اختیار میں دیتی ہے اور دُوسری آیت میں اس کے چھ مصرف بیان ہوئے ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ چھ مصرف ان شدید استحقاق رکھنے والوں سے متعلق ہیں جن کا پیغمبرؐ کو خصوصیت سے خیال رکھنا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام اموال کو اپنی ذات کے لیے اپنے پاس نہیں رکھتے بلکہ حکومت اسلامی کے سربراہ و امیر کی حیثیت سے جس شعبہ میں ضرورت محسوس کرتے ہیں صرف فرماتے ہیں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ حق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آئمہ معصومین کو اور ان کے بعد ان کے نائبین کو یعنی مجتہدینِ جامع الشرائط کو پہنچتا ہے کیونکہ اسلامی احکام کبھی معطل نہیں ہوتے اور حکومت اسلامی ان اہم ترین مسائل میں سے ہے جس سے مسلمان سروکار رکھتے ہیں اور اس حکومت کی بنیاد کا ایک حصہ اقتصادی مسائل پر منحصر ہے اور اصلی ا[illegible] اقتصا[illegible]دی مسائل [illegible]ہیں۔

۲۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ہو سکتا ہے یہ سوال پیش ہو کہ خدا نے یہ حکم کس [illegible] رح دیا ہے کہ تمام افراد، بغیر کسی استثناء کے، جو کچھ پیغمبرؐ کہیں اسے بلا حیل و حجت قبول کر لیں لیکن ام[illegible]نت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پیغمبرؐ کو معصوم کہتے ہیں اور یہ حق صرف ان کے لیے اور ان کے معصوم جانشینوں کے لیے ہے

---

[1] [illegible] انفال کے بارے میں مختلف موضوع اس طرح ہیں: (۱) وہ زمین [illegible] جن کے مالکوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ وہاں سے چلے گئے ہوں [illegible] بنی نضیر کے یہودیوں کی زمینوں کی طرح (۲) وہ زمینیں جن کے مالکوں نے انہیں اپنی مرضی سے مسلمانوں کے سربراہ کے سپرد کر دیا (فدک کی طرح) (۳) اراضی موات (غیر آباد زمینیں)۔ (۴) سمندروں کے کنارے۔ (۵) پہاڑوں کی چوٹیاں۔ (۶) درّے (۷) جنگلات (۸) بادشاہوں کے منتخب اموال جو جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔ (۹) جو کچھ مسلمانوں کا پیشوا اموالِ غنیمت میں سے اپنے لیے رکھے (۱۰) وہ اموالِ غنیمت جو ان جنگوں کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں جو سربراہِ مسلمین کی اجازت کے بغیر لڑی گئی ہوں۔ (۱۱) معدنیات (۱۲) اس شخص کی میراث جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ مذکورہ بالا بعض موارد میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے لیکن اکثریت ان موارد کو قبول کرتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی روایتوں میں اس مسئلہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اگر خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو اس قسم کے اختیارات دیے ہیں تو یہ اس لیے ہیں کہ خدا نے اسے مکمل طور پر آزمایا ہے اور وہ حد سے زیادہ اخلاق حسنہ کا مالک ہے خلق عظیم کا مصداق ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ حق اس پیغمبرؐ کو منجانب اللہ تفویض کیا گیا ہے۔ [۱]

۲۔ فدک کی غم انگیز داستان

فدک اطراف مدینہ میں تقریباً ایک سو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر خیبر کے نزدیک ایک آباد قصبہ تھا۔ جب سات ہجری میں خیبر کے قلعے یکے بعد دیگرے افواج اسلامی نے فتح کر لیے اور یہودیوں کی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو فدک کے رہنے والے یہودی صلح کے خیال سے بارگاہ پیغمبرؐ میں سر تسلیم خم کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی آدھی زمینیں اور باغات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیے اور آدھے اپنے پاس رکھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ کی زمینوں کی کاشتکاری بھی اپنے ذمہ لی۔ اپنی کاشتکاری کی زحمت کی اُجرت وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وصول کرتے تھے۔ اس سورہ کی آیت فیٔ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ زمینیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت خا[ص] تھیں۔ اُن کی آمدنی کو آپؐ اپنے مصرف میں لاتے تھے یا ان مدات میں خرچ کرتے تھے جن کی طرف اس سورہ کی آیت ۷ میں اشارہ ہوا ہے۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ساری زمینیں اپنی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو عنایت فرما دیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تصریح کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منجملہ دیگر مفسرین کے تفسیر درالمنثور میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس وقت آیت (فآت ذا القربیٰ حقہ (روم ۳۸)) نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کو فدک عنایت فرمایا:

(اقطع رسول اللّٰہ فاطمۃ فدکا) [۲]

کتاب کنز العمال جو مسند احمد کے حاشیہ پر لکھی گئی ہے، میں صلہ رحم کے عنوان کے ماتحت ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ جس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ سلام اللہ علیہا کو طلب کیا اور فرمایا:

(یا فاطمۃ لک فدک)

اے فاطمہ فدک تیری ملکیت ہے۔ [۳]

حاکم نیشاپوری نے بھی اپنی تاریخ میں اس حقیقت کو تحریر کیا ہے۔ [۴]

ابن ابی الحدید معتزلی نے بھی نہج البلاغہ کی شرح میں داستان فدک تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے [۵] اور اسی طرح بہت سے دیگر مورخین نے بھی

---

[۱] وہ روایات جو اس بحث کو اچھی طرح پیش کرتی ہیں ان کے لیے تفسیر نور الثقلین کی جلد ۵ ص ۲۷۹ سے لے کر ص ۲۸۲ تک ملاحظہ کیجئے۔

[۲] درالمنثور جلد ۴ ص ۱۷۷۔

[۳] کنز العمال جلد ۲ ص ۱۵۸۔

[۴] کتاب فدک ص ۴۹ ملاحظہ فرمائیں۔

[۵] شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص ۲۰۹ سے آگے۔

لیکن وہ افراد جو اس اقتصادی قوت کو حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کے قبضہ میں رہنے دینا اپنی سیاسی قوت کے لیے مضر سمجھتے تھے" انہوں نے مصمم ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کے یاور و انصار کو ہر لحاظ سے کمزور اور گوشہ نشین کردیں۔ حدیث مجہول (نحن معاشر الانبیاء ولا نورث) کے بہانے انہوں نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور باوجودیکہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا قانونی طور پر اس پر متصرف تھیں اور کوئی شخص "ذوالید" (جس کے قبضہ میں مال ہو) سے گواہ کا مطالبہ نہیں کرتا جناب سیدہ سے گواہ طلب کیے گئے۔ بی بی نے گواہ پیش کیے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں فدک عطا فرمایا ہے لیکن انہوں نے ان تمام چیزوں کی کوئی پرواہ نہیں کی بعد میں آنے والے خلفاء میں سے جو کوئی اہلبیت سے محبت کا اظہار کرتا تو وہ فدک انہیں لوٹا دیتا لیکن زیادہ دیر نہ گزرتی کہ دوسرا خلیفہ اس کو چھین لیتا اور دوبارہ اس پر قبضہ کرلیتا۔ خلفائے بنی اُمیہ اور خلفائے بنی عباس بارہا یہ اقدام کرتے رہے۔ واقعہ فدک اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف النوع حوادث جو صدر اسلام میں اور بعد کے ادوار میں پیش آئے بہت زیادہ دردناک اور غم انگیز ہیں اور وہ تاریخ اسلام کا ایک عبرت انگیز حصہ بھی ہیں جو محققانہ طور پر مستقل مطالعہ کا متقاضی ہے تاکہ تاریخ اسلام کے مختلف حوادث نگاہوں کے سامنے آسکیں۔

✣ ✣ ✣

۸۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ
اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ
اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ
۹۔ وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ
هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً
مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ ؕۛ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۚ
۱۰۔ وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا
وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ
قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۠

ترجمہ

۸۔ یہ اموال ان مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھر بار اور اموال سے باہر نکالے گئے ہیں اور وہ

اللہ کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں، وُہ سچے ہیں۔

۹۔ اور ان لوگوں کے لیے جو دارالہجرۃ (مدینہ) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں وُہ ایسے لوگوں کو جو ان کی طرف ہجرت کریں دوست رکھتے ہیں اور اپنے دل میں اس چیز کے لیے جو مہاجرین کو دی گئی ہے کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے، وہ مہاجرین کو خود پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ شدت سے فقیر ہوں اور جن لوگوں کو خدا نے بخل اور اپنے نفس کی حرص سے بچا رکھا ہے وہی رستگار اور نجات پانے والے ہیں۔

۱۰۔ اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے ہیں اور کہتے ہیں پروردگارا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو، جنہوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی ہے، بخش دے اور ہمارے دلوں میں مومنین کی نسبت حسد و کینہ قرار نہ دے۔ پروردگار تو مہربان اور رحیم ہے۔

تفسیر

تین گروہ: مہاجرین، انصار اور تابعین اور ان کے نمایاں اوصاف

یہ آیتیں گزشتہ آیتوں کے مباحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو مال فیٔ کے چھ مصارف کے بارے میں تھیں اور جو حقیقت میں تیموں، مسکینوں اور درماندہ مسافروں کی تفسیر ہیں اور سب سے زیادہ ابن السبیل کی تفسیر ہیں کیونکہ مسلمان مہاجرین کی زیادہ تر تعداد انہی پر مشتمل تھی جو اپنے وطن اور شہر میں تو مسکین نہیں تھے لیکن ہجرت کی بنا پر تہی دست ہو گئے تھے۔ خداوندعالم فرماتا ہے:

"یہ اموال ان مہاجرین کے لیے ہیں جو اپنے گھروں سے باہر نکالے گئے ہیں": للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم[1]

"وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں اور وہ سچے ہیں"۔ (یبتغون فضلاً من اللہ و رضواناً وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون)۔ یہاں مہاجرین کے تین اہم اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو اخلاص، جہاد

[1] للفقراء بدل ہے اور ابن السبیل کی تفسیر ہے۔

اور صدق پر منحصر ہیں۔ سب سے پہلے "ابتغائے فضلِ خدا و رضائے خدا" کو پیش کرتا ہے جو اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ان کی ہجرت دنیا اور ہوائے نفس کے لیے نہیں تھی بلکہ پروردگار کی خوشنودی اور اس سے حاصل ہونے والے ثواب کے لیے تھی۔ اس بنا پر فضل یہاں ثواب کے معنی میں ہے اور رضوان خوشنودیٔ پروردگارِ عالم ہے جو تمنائے ثواب کا بلند ترین مرحلہ ہے" جیسا کہ متعدد آیاتِ قرآنی میں بھی یہی معنی آتے ہیں۔ منجملہ دیگر آیات کے سُورہ فتح کی آیت ۲۹ میں جہاں اصحاب پیغمبرِ خدا کی اس عبارت کے ساتھ توصیف کرتا ہے۔ (تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا) "تو ان کو ہمیشہ رکوع و سجود میں دیکھے گا جب کہ وہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں۔"

فضل کی تعبیر ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے اعمال کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ اسے مستحق ثواب ہی نہیں سمجھتے بلکہ ثواب کو وہ ایک انعام الٰہی شمار کرتے ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے فضل کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس سے مُراد دُنیاوی رزق ہے۔ کیونکہ بعض دوسری آیاتِ قرآنی میں یہی معانی آتے ہیں۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ مہاجرین کے اخلاص کے بیان کا مقام ہے یہ معنی مناسب نہیں ہیں بلکہ مناسب وہی اجرِ خداوندی ہے۔ البتہ یہ احتمال بعید نہیں ہے کہ فضل سے جنت کی جسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہو اور رضوان معنوی اور رُوحانی نعمتوں کی طرف لیکن جو کچھ بھی ہو وہ آخرت سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ دنیا سے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ دینِ حق اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہیں اور اس راہ میں جہاد کرنے سے ایک لمحے کے لیے بھی دست بردار نہیں ہوتے۔ (توجہ رکھنی چاہیئے کہ ینصرون کا جملہ فعل مضارع اور استمرار کی دلیل ہے) تو اس طرح وہ صرف زبانی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ انہوں نے اپنے اعمال کو مستقل جہاد سے ثابت کیا ہے۔ تیسرے مرحلہ میں خداوندِ عالم ان کی سچائی کے عنوان کے تحت تعریف کرتا ہے جس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کی صداقت کو ہر چیز میں ثابت کرتا ہے۔ وہ ایمان کے دعویٰ میں بھی سچے ہیں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے دعویٰ میں بھی اور دینِ حق کی طرف داری کے سلسلہ میں بھی۔ بغیر اظہار کیے یہ بات واضح ہے کہ یہ صفات اصحاب پیغمبر میں ان آیات کے نزول کے زمانے میں تھیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کے اندر کچھ ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے راستہ بدل لیا اور اس آیت کے عظیم اعزازات و افتخارات سے اپنے آپ کو محروم کر لیا" ان لوگوں کی طرح جنہوں نے بصرہ میں جنگِ جمل کی آگ اور شام میں صفین کی آگ بھڑکائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خلیفہ برحق کے مقابلہ میں جس کی باتفاقِ مسلمین اطاعت واجب تھی آمادۂ جنگ و قتال ہوئے اور اس طرح انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کا خون ناحق بہایا۔ اور پھر انہی جیسے دوسرے افراد بھی انہی کے زمرہ میں ہیں۔ بعد والی آیت میں ان اصول کے ایک اور مصرف کو پیش کرنے کے ضمن میں گروہِ انصار کی ایک بہت ہی جاذبِ توجہ، عُمدہ اور بلیغ توصیف پیش کرتا ہے اور وہ بحث جو گزشتہ آیت میں مہاجرین سے متعلق تھی اس کی تکمیل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور وہ لوگ جو دار الہجرۃ میں (مدینہ میں) اور ایمان کے گھر میں مہاجرین سے پہلے سکونت پذیر تھے" (والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم)۔ قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ "تبوؤ" "بواء" (بروزن دوا) کے مادہ سے اصل میں اجزائے مکان کی مساوات کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں مکان کو صاف ستھرا اور مرتب رکھنے کے لیے "بواء" آتا ہے۔ یہ تعبیر ایک لطیف کنایہ ہے اس اعتبار سے کہ انصارِ مدینہ اس سے پہلے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اس شہر میں وارد ہوں ہجرت کے لیے راہ ہموار کر چکے تھے اور جیسا کہ تاریخ کہتی ہے وہ دو مرتبہ "عقبہ" (مکّے کے قریب ایک گھاٹی ہے) میں آئے اور پوشیدہ طور پر انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی اور مبلّغین کی شکل میں مدینہ لوٹ گئے۔ یہاں تک کہ مکّے کے مسلمانوں میں سے ایک شخص مصعب ابن عمیر کو مبلّغ کی حیثیت سے وہ مدینہ اپنے ہمراہ لے گئے تاکہ عوام کے ذہنوں کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے لیے آمادہ کریں۔ اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے ظاہری گھروں کو

مہاجرین کی پذیرائی کے لیے آمادہ کیا بلکہ اپنے خاندان کو اور شہر کے ماحول کو بھی جتنا ہو سکتا تھا مہاجرین کے استقبال کے لیے سازگار بنایا۔ "من قبلھم" کی تعبیر بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کی ہجرت سے پہلے ہو چکا تھا اور یہی چیز اہم ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مدینہ کے انصار بھی ان اموال کے مستحقین میں سے تھے۔ یہ چیز اس سے تضاد نہیں رکھتی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے گروہ انصار میں سے صرف دو یا تین افراد کو اموال بنی نظیر میں سے کچھ عنایت فرمایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ انصار مدینہ میں ان چند کے علاوہ مسکین و فقیر نہ ہوں جبکہ ان اموال کے استحقاق کی بنیادی شرط فقر ہے۔ مہاجرین کی صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی اگر وہ فقیر کے مصداق نہ بھی ثابت ہوتے تو ابن سبیل ضرور تھے۔

اس کے بعد تین اور ایسے اوصاف جو انصار کے جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"وہ لوگ اس طرح ہیں جو ہر اس مسلمان کو، جو ان کی طرف ہجرت کرکے آئے، دوست رکھتے ہیں" (یحبون من ھاجر الیھم)۔ اور اس سلسلہ میں ان کی نظر میں تمام مسلمان برابر ہیں بلکہ ان کے نزدیک ایمان و ہجرت اہم مسئلہ ہے۔ یہ دوست رکھنا ان کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے سینہ میں اس کے بارے میں جو مہاجرین کو دیا گیا ہے، کسی قسم کی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ (ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا)۔ نہ ان اموال غنیمت پر ان کی آنکھ ہے جو انہیں دیے گئے ہیں اور نہ وہ ان سے حسد کرتے ہیں حتیٰ کہ جو چیزیں مہاجرین کو عطا ہوئی ہیں ان کے متعلق اپنے دل میں کوئی احتیاج محسوس نہیں کرتے۔ یہ چیز انصار کی انتہائی عظمت اور بلند نظری پر دلالت کرتی ہے تیسرے مرحلہ میں مزید فرماتا ہے:

"وہ مہاجرین کو خود پر مقدم سمجھتے ہیں اور انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بہت زیادہ فقر میں مبتلا ہیں" (و یؤثرون علیٰ انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ)[1]

اس صورتِ حال کے پیش نظر انصار کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک محبت، دوسرے بلند نظری اور تیسرے ایثار۔ مفسرین نے اس آیت کی شانِ نزول میں متعدد داستانیں بیان کی ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نظیر کے یہودیوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے دن انصار سے فرمایا:

"اگر پسند کرو تو اپنے مال اور گھر مہاجرین میں تقسیم کر دو اور ان اموال غنیمت میں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ اور اگر چاہو تو تمہارے اموال اور گھر تمہارے ہی رہیں اور ان اموال میں سے تمہیں کوئی چیز نہ دی جائے"۔ اس پر انصار نے کہا:

"ہم اپنے اموال اور گھر بھی مہاجرین میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اموال غنیمت میں سے بھی کچھ نہیں لیتے۔ ہم مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں"۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ان کے اس اعلیٰ جذبہ کی تعریف کی[2]

---

[1] "خصاصۃ" خصاص کے مادہ سے (بروزن اساس) ان شگافوں کے معنی میں ہے جو گھر کی دیوار میں پڑ جاتے ہیں چونکہ فقر و فاقہ انسان کی زندگی میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا اسے خصاصہ کہا گیا ہے۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۰

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک شخص خدمت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آیا اور عرض کیا:

"میں بھوکا ہوں"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا:

"میرے گھر سے اس کے لیے کھانا لے آئیں" لیکن آپؐ کے گھر میں کھانا نہیں تھا اس پر آپؐ نے فرمایا: "کون شخص ہے جو آج رات اس شخص کو مہمان رکھے؟"

انصار میں سے ایک شخص نے آمادگی ظاہر کی۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس کے گھر میں تھوڑی سی غذا کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور وہ بھی اس کے بچوں کے لیے تھی۔ اُس نے زوجہ سے کہا کہ مہمان کے لیے کھانا لے آئے اور چراغ گُل کر دے اور جس طرح ممکن ہو بچوں کو سُلا دے۔ اس کے بعد بیوی اور شوہر دونوں دسترخوان پر بیٹھ گئے اور بغیر اس کے کہ کھانے میں سے کچھ کھائیں وہ اپنا منہ چلاتے رہے۔ مہمان نے خیال کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ اُس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ وہ دونوں میاں بیوی اس رات بھوکے سو گئے۔ صبح کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپؐ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے اور بغیر اس کے کہ وہ کچھ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی اور ان کے ایثار کی تعریف کی۔ اُن روایات میں جو طُرقِ اہل بیتؑ سے پہنچی ہیں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے چھوٹے چھوٹے فرزند میزبان تھے اور جس نے بچوں کو بھوکا سُلا دیا وہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں۔[1]

توجہ کرنی چاہیئے کہ ہو سکتا ہے پہلی داستان آیت کی شانِ نزول ہو۔ لیکن دوسری صورت حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ایک قسم کی تطبیق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ایثار پر مبنی مہمانی کے بارے میں آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس وجہ سے انصار کے بارے میں آیات کا نزول حضرت علی علیہ السلام کے میزبان ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آیت اُحد کے جنگجو غازیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن میں سے سات افراد بہت زیادہ پیاسے تھے اور زخمی بھی تھے۔ کوئی شخص ایک آدمی کی پیاس بجھانے کی مقدار کے برابر پانی لے کر آیا۔ وہ جس کے پاس لے کر گیا اس نے دُوسرے کا حوالہ دیا اور اُسے اپنے اُوپر ترجیح دی۔ آخر کار سب نے پیاس کی حالت میں جان دے دی اور خدا نے ان کے اس ایثار کی تعریف و توصیف کی۔[2]

لیکن واضح رہے کہ یہ آیت بنی نظیر کے واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے جب کہ اپنے مفہوم کی عمومیت کی بنا پر یہ آیت مشابہ موارد پر قابلِ تطبیق ہے۔ آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے مذکورہ اوصاف کریمہ کی بنا پر اور نتیجے کے بیان کے طور پر مزید فرماتا ہے:

"وہ لوگ جن کو خدا نے بخل اور حرص سے روکا وہی رستگار ہیں"۔ (ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون)۔

"شح" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے ایسے بخل کے معنی میں ہے جس میں حرص شامل ہو اور جو عادت بن چکا ہو۔ "یوق" "وقایۃ" کے مادہ سے اگرچہ فعل مجہول کی شکل میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا فاعل یہاں خدا ہے یعنی جس شخص کو خدا اس عیب سے محفوظ رکھے وہ کامیاب ہے۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک صحابی سے فرمایا:

(اتدری ما الشحیح)

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۰

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۲

"کیا تم جانتے ہو کہ شحیح کون ہے؟

اُس نے جواب میں عرض کیا: ھو البخیل۔

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اشح اشد من البخل. ان البخیل یبخل بما فی یدہ والشحیح یشح بما فی ایدی الناس وعلی ما فی یدہ حتی لا یری فی ایدی الناس شیئا الا تمنی ان یکون له بالحلال والحرام ولا یقنع بما رزقه الله عزوجل"

شح بخل سے زیادہ سخت ہے۔ بخیل وہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو اس کے متعلق بخل کرے لیکن شحیح وہ ہے جو اس کے بارے میں بھی بُخل کرتا ہو جو لوگوں کے پاس ہو اور جو کچھ اس کے اپنے پاس ہو اس میں بھی۔ یہاں تک کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے وہ آرزو کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ آجائے چاہے حلال طریقہ سے ہو چاہے حرام سے اور جو رزق اسے خدا نے دیا ہے اس پر کبھی قناعت نہیں کرتا۔[1]

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

"لا یجتمع الشح والایمان فی قلب رجل مسلم ولا یجتمع غبار فی سبیل الله ودخان جھنم فی جوف رجل مسلم"

"بُخل و حرص و ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے جس طرح راہ جہاد کا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں ایک مرد مُسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بُخل و حرص ترک کرنا انسان کو فلاح و کامیابی تک پہنچاتا ہے؛ جب کہ اس عیب سے آلودگی سعادتِ انسانی کے قصر کو ڈھا دیتی ہے اور اسے ویران کر دیتی ہے۔ آخری زیر بحث آیت مسلمانوں کے تیسرے گروہ کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جو قرآن مجید کے الہام و ہدایت کی بنا پر ہمارے درمیان تابعین کے نام سے معروف ہیں۔ وہ مہاجرین و انصار کے بعد جن کے متعلق گزشتہ آیات میں گفتگو آئی تھی مسلمانوں کے تیسرے عظیم گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے:

"اور وہ لوگ جو ان کے بعد آتے ہیں وہ کہتے ہیں پروردگارا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت حاصل کی ہے بخش دے اور ہمارے دلوں میں مومنین کی نسبت حسد و کینہ قرار نہ دے۔"

پروردگارا! "تو مہربان و رحیم ہے": (والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رءوف رحیم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس جملہ کا مفہوم ان لوگوں میں محدود کر دیا جو اسلام کی کامیابی اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ آن ملے لیکن اس محدودیت کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے تمام مسلمان اس میں شامل ہیں۔ (والذین جاءو ......) کا جملہ بظاہر عطف ہے "للفقراء المھاجرین" پر اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اموالِ فئ مہاجرین و انصار کے مساکین کے لیے نہیں ہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمان بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے (اس طرح سے والذین جاءو مبتدا اور

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۱ حدیث ۶۴

یعقولون خبر ہے)، لیکن گزشتہ آیات سے اس کی ہم آہنگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ قابلِ توجہ یہ ہے کہ یہاں بھی تابعین کے تین اوصاف بیان کیے گئے ہیں پہلی صفت یہ کہ وہ اپنی اصلاح، طلب آمرزش اور بارگاہِ خدا میں توبہ کی فکر میں رہتے ہیں۔ دوسری صفت یہ کہ وہ ایمان کی طرف سبقت کرنے والے کو بڑے بھائی کی طرح دیکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے قابلِ احترام ہوتے ہیں اور ان کے لیے بھی بارگاہِ خدا میں بخشش و مغفرت کی استدعا کرتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ ان کی کوشش ہے کہ ہر قسم کا کینہ، دشمنی اور حسد اپنے دل سے باہر نکال دیں اور اس راہ میں خداوند رؤف و رحیم سے مدد طلب کرتے ہیں، اس اعتبار سے اپنی شخصیت کی تعمیر، ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کا احترام اور کینہ و حسد سے دُوری ان کی خصوصیات ہیں۔ "غل" (بروزن سل) جیسا کہ پہلے بھی ہم نے عرض کیا ہے اصل میں کسی چیز کے پوشیدہ طور پر نفوذ کے معنی میں ہے اسی لیے درختوں کے درمیان جاری رہنے والے پانی کو "غلل" کہتے ہیں اور چونکہ حسد، عداوت اور دشمنی پوشیدہ طور پر انسان کے دل میں نفوذ کرتے ہیں، اس لیے اسے "غل" کہا جاتا ہے اس بنا پر غل صرف حسد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں بہت سے عیوب اور قبیح عادات شامل ہیں۔ "اخوان" (بھائی) کی تعبیر اور آیت کے آخر میں خداوند رؤف و رحیم سے مدد طلب کرنا رُوحِ محبت و صفا ہے اور اخوت کا ترجمان ہے جسے سارے اسلامی معاشرہ پر فرماں روا ہونا چاہیئے۔ اور جو شخص کسی نیکی کو چاہتا ہے وہ صرف اپنے لیے نہ چاہے بلکہ تمام کوششیں اجتماعی شکل میں سب کے لیے انجام پانی چاہئیں اور ہر قسم کا کینہ، بغض، عداوت، دشمنی، بخل، حرص اور حسد سینوں سے دھو دینا چاہیئے۔

ایک نکتہ : صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں

یہاں بعض مفسرین ان اوصاف کی طرف توجہ کیے بغیر، جو مہاجرین و انصار اور تابعین میں سے ہر ایک کے لیے مندرجہ بالا آیت میں آئے ہیں، اصرار رکھتے ہیں کہ تمام صحابہ کو بغیر کسی استثناء کے پاک و منزہ شمار کریں اور وہ غلط کام جو بعض اوقات خود زمانہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں یا آپ کے بعد ان میں سے بعض سے سرزد ہوئے ہیں ان سے چشم پوشی کی جائے اور جو شخص بھی مہاجرین و انصار و تابعین کی صف میں قرار پایا ہے آنکھیں بند کر کے اُسے مقدس و محترم سمجھیں۔ حالانکہ مندرجہ بالا آیت ان افراد کو دنداں شکن جواب دیتی ہے اور سچے مہاجرین و انصار و تابعین کے ضوابط و قواعد کو باریک بینی کے ساتھ معیّن کرتی ہے۔ مہاجرین میں پروردگارِ عالم اخلاص جہاد اور صدق بتاتا ہے۔ اور انصار میں مہاجرین کی بہ نسبت محبت، ایثار اور ہر قسم کے بُخل و حرص سے پرہیز کی نشان دہی کرتا ہے اور تابعین میں شخصی تعمیر، ایمان میں سبقت کرنے والوں کا احترام اور ہر قسم کے کینہ و حسد سے پرہیز جیسی صفات کو بیان کرتا ہے۔ ان حالات میں ہم اُن افراد کو کس طرح محترم شمار کریں جو جنگ جمل میں موجود تھے اور انہوں نے اپنے امام و رہبر کے خلاف تلوار کھینچی۔ انہوں نے نہ تو اخوت اسلامی کی رعایت کی نہ اپنے سینوں کو غل، کینہ، حسد اور بُخل سے پاک کیا اور نہ حضرت علی علیہ السلام کی سبقتِ ایمانی کا احترام کیا۔ ہم کس طرح ان پر ہر قسم کی تنقید کو گناہ سمجھیں اور آنکھیں بند کر کے ان کے اور ان کی باتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اس بنا پر خطِ ایمان کی طرف سبقت کرنے والوں کے احترام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے ایمان کے معاملے کو پیغمبر کے زمانے کے حوالے سے اور ان شدید طوفانوں میں جو آپ کے بعد اسلامی معاشرہ کو لاحق ہوئے ان کے حوالے سے باریک بینی اور دقتِ نظر کے ساتھ زیرِ مطالعہ رکھیں گے اور ان معیاروں کی بنیادوں پر جو قرآن کی آیات سے ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اپنا تعلق ان کے ساتھ مستحکم رکھیں گے جو اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے ہیں اور ان سے جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد اپنا رابطہ آپ سے توڑ لیا ہم رشتہ توڑ لیں گے۔ یہ ہے صحیح اور محکم قرآن و عقل سے ہم آہنگ منطق۔

١١- اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ
مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ
لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

١٢- لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا
لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ
لَا يُنْصَرُوْنَ ○

١٣- لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

١٤- لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ
وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ
جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
يَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۔ کیا تُو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اہلِ کتاب میں سے اپنے کافر بھائیوں سے کہتے تھے جس وقت تمہیں (وطن سے) باہر کریں تو ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہارے معاملہ میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

۱۲۔ اگر انہیں باہر نکال دیں تو یہ ان کے ساتھ باہر نہیں جائیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں بھی تو میدان سے فرار کریں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

۱۳۔ تمہاری وحشت ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے یہ اس بنا پر کہ وہ نادان گروہ ہے۔

۱۴۔ وہ کبھی بھی تمہارے ساتھ مجموعی صورت میں جنگ نہیں کریں گے مگر مضبوط قلعوں کے اندر سے یا دیواروں کے پیچھے سے۔ ان کی جنگ آپس میں شدید ہے۔ (لیکن تمہارے مقابلہ میں کمزور ہیں) ان کے ظاہر کی طرف تو دیکھتا ہے تو انہیں متحد پاتا ہے۔ جب کہ ان کے دل پراگندہ ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ وہ بے عقل قوم ہیں۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیت کے لیے بعض مفسرین نے ایک شانِ نزول بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔ منافقین مدینہ کے ایک گروہ عبداللہ بن ابی وغیرہ نے پوشیدہ طور پر کسی کو بنی نظیر کے یہودیوں کے پاس بھیجا اور کہا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلو۔ اپنے قلعوں کو مستحکم کرو۔ ہمارے پاس دو ہزار افراد ہیں جو آخر دم تک تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں۔ بنی قریظہ اور تمہارے حلیف قبیلہ غطفان کے لوگ بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ یہی وہ محرک تھا جس نے بنی نظیر کے یہودیوں کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت پر ابھارا لیکن اسی دوران بنی نظیر کے ایک سردار جس کا نام سلام تھا اس نے حی ابن اخطب سے، جو بنی نظیر کے لائحہ عمل کا نگران خاص تھا، کہا تو عبداللہ بن ابی کا اعتبار نہ کر وہ چاہتا ہے کہ تجھے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف جنگ پر ابھارے اور خود اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور تجھے مصیبتوں کے حوالے کر دے۔ حی نے کہا: "تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی دشمنی اور اس سے جنگ کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتے۔" سلام نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمیں آخرکار اس سرزمین سے نکلنا پڑے گا اور ہمارا مال و دولت، شرف و بزرگی یہ سب برباد ہوں گے۔ ہمارے بچے قیدی بنائے جائیں گے اور ہمارے جوان قتل کر دیے جائیں گے[۱]

مندرجہ بالا آیات اس واقعہ کو بیان کرتی ہیں:

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ آیات بنو نظیر کے واقعہ سے پہلے نازل ہوئیں اور اس کے بعد کے حوادث کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس وجہ سے انہیں قرآن کے اخبارِ غیب میں شمار کرتے ہیں۔ آیات کا لب ولہجہ جو فعل مضارع کی شکل میں ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تائید کرتا ہے لیکن گزشتہ آیات سے ان آیات کا جوڑ یہ بتاتا ہے کہ یہ بنو نظیر کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیونکہ گزشتہ آیات بنو نظیر کی شکست کے واقعہ اور ان کی جلا وطنی کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ فعل مضارع کا استعمال حکایتِ حال کے طور پر ہے۔ (غور فرمائیے)۔

تفسیر

یہودیوں کی فتنہ انگیزی اور اس میں منافقین کی شمولیت

گزشتہ آیات میں یہود بنی نظیر کے واقعہ کو بیان کرنے اور مومنین کے تین گروہ یعنی مہاجرین، انصار اور تابعین کے حالات کی ہر ایک خصوصیت کو تشریح کے ساتھ پیش کرنے کے بعد پروردگارِ عالم زیرِ بحث آیات میں ایک اور گروہ یعنی منافقین اور ان کی اس واقعہ سے متعلق کارکردگی کو پیش کرتا ہے تاکہ تمام افراد کے حالات کی کیفیت ایک دوسرے کے موازنہ کے ساتھ واضح کر دے۔ اور یہ قرآن کا طریق کار ہے کہ وہ مختلف گروہوں کے تعارف کے لیے انہیں ایک دوسرے کے تقابل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پہلے رُوئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"کیا تُو نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے بھائی اہلِ کتاب کفار سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں تمہارے وطن سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے

۱۔ روح البیان جلد ۹ ص ۴۴۹۔ یہی معنی کچھ اختلاف کے ساتھ تفسیر درالمنثور جلد ۶ ص ۱۹۹ میں بھی آیا ہے۔

ساتھ ہوں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے جنگ ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ (الم تر الی الذین نافقوا یقولون لاخوانهم الذین کفروا من اهل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدا ابدا وان قوتلتم لننصرنکم)۔ اس طرح اس گروہِ منافقین نے طائفۂ یہود سے تین باتوں کا وعدہ کیا۔ جب کہ وہ ہر بات میں جھوٹے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر انہوں نے اس سرزمین سے تمہیں نکالا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے بعد تمہاری خالی جگہ کو دیکھیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی حکم کسی شخص کی طرف سے تمہارے خلاف صادر ہو۔ نہ صرف اب بلکہ کبھی بھی تو ہم اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم تمہارے دوش بدوش جنگ کریں گے اور تمہاری مدد کے سلسلہ میں کسی تردد کا شکار نہیں ہوں گے۔ جی ہاں یہ قول و قرار تھے جو منافقین نے اس واقعہ سے پہلے یہود سے کیے تھے لیکن بعد کے واقعات نے بتایا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اسی بنا پر قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

"خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں"۔ (واللہ یشهد انهم لکاذبون)۔ کیا لرزا دینے والا انداز کلام ہے جو انواع و اقسام کی تاکیدوں کے ساتھ ہے۔ خدا کا لفظ گواہ کو جملہ اسمیہ کی شکل میں لانا پھر "ان" اور "لام" کی تاکید یہ سب باتیں بتاتی ہیں کہ جھوٹ اور نفاق ایک دوسرے سے اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے۔ منافق ہمیشہ جھوٹے تھے اور زیادہ تر جھوٹے منافق ہوتے ہیں۔ "لخوانهم" (بھائی) کی تعبیر بتاتی ہے کہ منافقین اور کفار کے درمیان بہت نزدیکی رابطہ ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں مومنین کے درمیان رابطہ اخوت پر زور دیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مومنین اپنی اخوت کے بارے میں سچے تھے اس لیے وہ کسی قسم کے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس منافقین آپس میں کسی قسم کی وفاداری اور ہمدردی نہیں رکھتے اور سخت ترین لمحات میں اپنے بھائیوں کی ہمدردی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یہ مومنین اور کافرین کی اخوت میں فرق ہے۔ (ولا نطیع فیکم احدا ابدا) "ہم تمہارے معاملے میں کسی کی اطاعت نہیں کریں گے" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ہم تمہارے بارے میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتوں، نصیحتوں اور تنبیہوں کو اور خطرات کے اشاروں کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کی دروغ گوئی کے متعلق مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے:۔

"اگر یہودیوں کو نکال دیں تو یہ منافقین ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے"۔ (لئن اخرجوا لا یخرجون معهم)۔ "اور اگر ان کے ساتھ جنگ ہو تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے"۔ (ولئن قوتلوا لا ینصرونهم)۔ اور بالفرض اگر اپنے قول پر عمل کریں اور ان کی مدد کے لیے آمادہ ہو بھی جائیں تو جلد ہی میدان سے فرار کر جائیں گے۔ (ولئن نصروهم لیولن الادبار)۔ "اور اس کے بعد ان کی مدد نہیں کی جائے گی"۔ (ثم لا ینصرون)۔ ان آیات کا قاطع لب و لہجہ ہر منافق کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ خصوصاً یہ کہ آیت اگرچہ ایک خاص مورد میں نازل ہوئی ہے لیکن طے شدہ طور پر اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ منافقین کے تمام دشمنان اسلام سے رابطے، ایک دوسرے سے اشتراک کار اور ان وعدوں کے سلسلہ میں جو وہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ یہ ایک اصل کلی ہے حالانکہ وہ تمام وعدے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال نہ صرف گزشتہ تاریخ اسلام میں نظر آتی ہے بلکہ آج بھی اسلامی ممالک میں، منافقین کی دشمنان اسلام سے ساز باز کے سلسلہ میں اس کے زندہ نمونے نظر آتے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ اگر سچے مومنین اپنی اسلامی ذمہ داریاں پوری کریں اور اپنا فرض ادا کریں تو ان کے مقابلہ میں کامیابی سے ہم کنار ہوں گے اور ان کے منصوبے نقش بر آب ثابت ہوں گے۔

بعد والی آیت میں اس شکست کے اسباب کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے

"تمہارا خوف ان کے دلوں میں خدا کے خوف سے زیادہ ہے"۔ (لانتم اشد رھبۃ فی صدورھم من اللہ)۔

چونکہ وہ خدا سے نہیں ڈرتے لہٰذا ہر چیز سے وحشت و خوف رکھتے ہیں۔ خصوصاً اے مومنو! تم جیسے سخت دشمن سے۔" یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے"۔ (ذالک بانھم قوم لا یفقھون)۔ "رھبۃ" اصل میں اس خوف کے معنوں میں ہے جس کے ساتھ اضطراب و احتیاط ہو۔ اور حقیقت میں یہ ایسا گہرا اور جڑیں رکھنے والا خوف اور وحشت ہے جس کے اثرات کردار میں منعکس ہوتے ہیں۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت یہود بنی نظیر اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی شکست کے عوامل کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا نفس مضمون ایک حکم کلی و عمومی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کے دل میں کبھی دو خوف جمع نہیں ہو سکتے "خوف خدا اور ما سوا اللہ کا خوف" اس لیے کہ تمام چیزیں حکم خدا کی تابع ہیں اور جو شخص خدا سے ڈرے اور اس کی قدرت سے آگاہ ہو وہ اس کے غیر سے کبھی خائف نہیں ہو سکتا ان سب بدبختیوں کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور حقیقت توحید سے بے خبر ہونا ہے۔ اگر اس زمانے کے مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان، مومن اور موحد ہوں تو وہ نہ صرف موجودہ دنیا کی فوجی اور صنعتی طاقتوں سے خائف نہ ہوں بلکہ مذکورہ طاقتیں ان سے ڈریں۔ جیسا کہ ہم اس کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ طاقتیں باوجود ان ترقی یافتہ وسائل کے اور ان مہلک ہتھیاروں کے ایک چھوٹی سی لیکن قربانی دینے کی صلاحیت رکھنے والی قوم سے خوف زدہ ہیں۔ اسی مفہوم کی ایک نظیر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۱ میں بھی آئی ہے۔ (سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب بما اشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطاناً و ماواھم النار و بئس مثوی الظالمین) "عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس لیے کہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے کچھ چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیا ہے۔ ان کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور ظالموں کی قرار گاہ کیا ہی بری ہے"

اس کے بعد اس اندرونی خوف کی واضح نشانی کو بیان کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"وہ سوائے محکم قلعوں میں رہ کر یا پس دیوار ہو کر تم سے کبھی منظم ہو کر جنگ نہیں کر سکیں گے۔ وہ تمہارے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں" (لا یقاتلونکم جمیعاً الا فی قری محصنۃ او من وراء جدر)۔ "قری" جمع ہے قریہ کی جو آبادی کے معنی میں ہے۔ خواہ وہ شہر ہو یا گاؤں۔ کبھی ایک ہی جگہ جمع شدہ انسانوں کے بارے میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ "محصنۃ" کا مادہ "حصن" (بروزن جسم) قلعہ کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "قری محصنۃ" ان آبادیوں کو کہا جاتا ہے جو برجوں اور قلعوں کے ذریعہ یا خندق کھود کر یا اور دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنے کی وجہ سے دشمن کی یلغار سے محفوظ ہوں۔ "جدر" جمع ہے "جدار" کی جو دیوار کے معنی میں ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی بلندی کے ہیں۔ جی ہاں چونکہ وہ ایمان اور توکل علی اللہ کی پناہ گاہ سے باہر ہیں لہٰذا سوائے دیواروں اور قلعوں کی پناہ کے مومنین سے جنگ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے،

"لیکن یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور، ناتواں اور فنون جنگ سے ناواقف افراد ہیں۔ جب جنگ خود ان کے مابین واقع ہو تو نہایت شدید ہوتی ہے"۔ (بأسھم بینھم شدید)۔ لیکن تمہارے مقابلہ میں صورت حال بالکل بدل جاتی ہے اور خوف و وحشت اور ایک عجیب اضطراب ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بنیادی حقیقت ہے کہ تمام بے ایمان اقوام کی جب آپس میں جنگ ہو اور اس کے مقابلہ میں جب مسلمانوں سے مقابلہ ہو تو مذکورہ صورت حال پیش آتی ہے۔ اس کے نمونے ہم نے موجودہ زمانے میں بار بار دیکھے ہیں۔ جب خدا کی معرفت نہ رکھنے والے افراد ایک دوسرے سے لڑتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کی سرکوبی کرتے ہیں کہ ان کی جنگ جوئی میں کسی قسم کا

شبہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب ان کا مقابلہ مومنین اور شہادت فی سبیل اللہ کا شوق رکھنے والوں سے ہوتا ہے تو وہ فوراً ہتھیاروں، محکم مورچوں اور قلعوں کی پناہ لے لیتے ہیں اور اضطراب انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اگر مسلمان واقعی اسلامی اقدار اختیار کریں تو وہ دشمنوں کے مقابلہ میں از سرِ نو افضل و برتر ثابت ہوں۔

اسی آیت کو جاری رکھتے ہوئے ان کی شکست اور ناکامی کے ایک اور سبب کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"تُو ان کے ظاہر کی طرف دیکھے تو انہیں متفق و متحد تصور کرے گا حالانکہ ان کے دل پراگندہ ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو عقل سے محروم ہیں"۔ (تحسبهم جميعًا و قلوبهم شتّٰى ذالك بانهم قوم لا يعقلون)۔ شتی جمع "شیت" کی یعنی متفرق قرآن تحصیل مسائل میں فی الواقعی بہت ہی وقیق اور الہام بخش ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ تفرقہ اور اندرونی نفاق جہالت، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ شرک کا سبب جہالت ہے اور پراگندگی و انتشار کا سبب شرک ہے اور انتشار کا نتیجہ شکست ہے۔ اس کے برعکس علم جو ہے وہ عقیدۂ توحید، عملی اتفاق اور ہم آہنگی کو وجود میں لاتا ہے اور بجائے خود کامیابیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح بے ایمان افراد کا ظاہری اجتماع، ان کے آپس کے معاہدے اور فوجی و اقتصادی وحدت سے ہمیں کبھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ اس لیے کہ ان باہمی معاہدوں اور نعروں کے پیچھے وہ دل ہوتے ہیں جو انتشار کا شکار ہوں۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے وہ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مادی مفاد کا محافظ ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ مادی منفعتوں میں ہمیشہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جب کہ مومنین کی وحدت اور ان کا اجتماع ایسے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں تضاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کی وحدت کا اصول اصل ایمان، توحید اور الٰہی اقدار پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا جہاں کہیں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑے تو مندرجہ بالا آیات کے مطابق اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حقیقتِ ایمانی سے محروم ہوتے ہیں جب تک اس کی طرف واپس نہیں لوٹیں گے ان کے حالات بہتر نہیں ہوں گے۔

۞ ۞ ۞

۱۵۔ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

۱۶۔ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ
قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝

۱۷۔ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ
جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ۝

۱۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ
وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

۱۹۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

۲۰۔ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ
هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

ترجمہ

۱۵۔ یہودیوں کے اس گروہ کا کام ان لوگوں کی طرح ہے جو ان سے کچھ پہلے تھے۔ انہوں نے اپنے کام کا تلخ مزہ چکھا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۱۶۔ ان کا کام مثل شیطان کے ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا۔ (تاکہ تیری مشکلات حل ہو جائیں)۔ لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں۔ میں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں۔

۱۷۔ انجام ان کا یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنم کی آگ میں ہیں۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ ستمگروں کی سزا ہے۔

۱۸۔ اے ایمان لانے والو! خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا جس کام کو تم انجام دیتے ہو اس سے آگاہ ہے۔

۱۹۔ اور ان لوگوں کی طرح، جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار کیا، نہ ہو جاؤ۔ اور وہ فاسق و گنہگار ہیں۔

۲۰۔ ہرگز اصحابِ دوزخ اور اصحابِ بہشت یکساں نہیں ہیں صرف اصحابِ جنت ہی کامیاب ہیں۔

تفسیر

شیطان کی بوسیدہ رسیوں کے ساتھ کنوئیں میں نہ جاؤ

یہ آیات اسی طرح یہود بنی نظیر اور منافقین کی داستان کے بارے میں بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان دونوں گروہوں

کی حیثیتوں کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ مشخص کرتی ہیں۔ خداوند عالم پہلے فرماتا ہے:

"بنو نضیر کے یہودیوں کی داستان ایسے لوگوں کی داستان کی مانند ہے جو ماضی قریب میں ان سے پہلے تھے۔ وہی جنہوں نے اس دنیا میں اپنے کام کا تلخ انجام دیکھا تھا اور قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (کمثل الذین من قبلھم قریبًا ذاقوا وبال امرھم ولھم عذاب الیم)[1]

رہی یہ بات کہ وہ کون سا گروہ تھا جس کی بنو نضیر کے واقعہ سے پہلے عبرت ناک سرگزشت تھی تو وہ اس طرح ہے کہ ان دو واقعات کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں تھا۔ ایک جماعت تو انہی مشرکین مکہ کی تھی جنہوں نے جنگ بدر میں شکست کا تلخ مزہ اپنے پورے وجود کے ساتھ چکھا تھا اور مجاہدین اسلام کی ضربوں نے انہیں تہ تیغ کر دیا تھا۔ بنو نضیر کا واقعہ جیسا کہ پہلے بھی ہم نے اشارہ کیا ہے جنگ احد کے بعد پیش آیا اور واقعۂ بدر احد سے ایک سال پہلے ہوا اس وجہ سے ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا۔ بہت سے مفسرین اسے یہودِ بنی قینقاع کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو بدر کے واقعہ کے بعد ہوا اور یہود کے اس گروہ کے مدینے سے نکالے جانے پر ختم ہوا۔ یہ تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ یہ یہودِ بنی نضیر کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ یہودِ بنی قینقاع بھی یہودِ بنی نضیر کی مانند دولت مند، جنگ جو اور مغرور افراد تھے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو اپنی قوت و طاقت کی بنا پر دھمکیاں دیتے تھے نکات کے زیرِ عنوان ہم انشاء اللہ اس کی تشریح پیش کریں گے۔ انہیں آخر کار سوائے بدبختی، دربدری اور آخرت کے عذابِ الیم کے اور کچھ نہ ملا۔

"وبال" کے معنی تلخ اور منحوس انجام کے ہیں اور اصل میں "وابل" شدید بارش کے معنوں میں ہے۔ اس لیے کہ شدید بارشیں عام طور پر خطرناک ہوتی ہیں اور انسان ان کے تلخ نتائج سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کے پیچھے خطرناک سیلاب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد منافقین کے متعلق ایک تشبیہ پیش کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے:

"ان کی داستان شیطان کی داستان جیسی ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا تاکہ میں تیری مشکلات کو حل کروں لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں، میں اس خدا سے جو عالمین کا پروردگار ہے ڈرتا ہوں۔" (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریء منک انی اخاف اللہ رب العالمین)[2]

یہ بات کہ اس آیت میں انسان سے کون مراد ہے کیا مطلق طور پر انسان ہیں جو شیطان کے زیرِ اثر آ جاتے ہیں، اس کے جھوٹے وعدوں سے دھوکہ کھاتے ہیں اور راہِ کفر اختیار کرتے ہیں اور شیطان آخر کار انہیں تنہا چھوڑ کر ان سے بیزاری اختیار کرتا ہے یا پھر اس سے مراد کوئی خاص انسان ہے مثلاً ابوجہل اور اس کے پیروکار جو جنگ بدر میں شیطان کے فریب دینے والے وعدوں سے سرگرمِ پیکار ہوئے اور آخر کار انہوں نے شکست کا تلخ مزہ چکھا جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت ۴۸ میں ہم پڑھتے ہیں: (واذ زین لھم الشیطان اعمالھم وقال لا غالب لکم الیوم من الناس وانی جار لکم فلما تراءت الفئتان نکص علی عقبیہ وقال انی بریء منکم انی اری ما لا ترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب) اور یاد کرو اس وقت کو

---

[1] یہ جملہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے: مثلھم کمثل الذین من قبلھم۔

[2] اگرچہ کمثل کی تعبیر اس آیت میں اور اس سے قبل والی آیت میں ایک دوسرے سے مشابہ ہے اسی بنا پر بعض مفسرین دونوں کو ایک ہی گروہ پر ناظر سمجھتے ہیں لیکن قرائن اچھی طرح گواہی دیتے ہیں کہ پہلی آیت بنو نضیر کی کیفیت کی طرف ناظر ہے اور دوسری منافقین کی کیفیت کی طرف۔ بہرحال یہ عبارت بھی مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیرِ عبارت اس طرح ہے: مثلھم کمثل الشیطٰن ... ۔

جب شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نگاہ میں وقیع بنایا اور کہا کہ آج تم پر کوئی شخص غالب نہیں آئے گا اور میں تمہارا ہمسایہ اور پناہ دینے والا ہوں لیکن جس وقت مجاہدین اسلام اور ان کے حامی فرشتوں کو دیکھا تو پیچھے ہٹ گیا اور کہا میں تم سے بیزار ہوں میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسے تم نہیں دیکھ رہے میں خدا سے ڈرتا ہوں اور خدا شدید العقاب ہے:

یا پھر یہ کہ انسان سے مراد " برصیصا " بنی اسرائیل کا عابد ہے جس نے شیطان سے دھوکہ کھایا اور کافر ہو گیا اور پھر حساس لمحات میں شیطان نے اس سے بیزاری اختیار کی اور اس سے الگ ہو گیا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔ پہلی تفسیر آیت کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور دوسری اور تیسری تفسیر، ہو سکتا ہے، اس کے وسیع مفہوم کے ایک مصداق کا بیان ہو۔ بہرحال وہ عذاب جس سے شیطان اظہارِ وحشت کرے گا بظاہر عذاب دنیا ہے۔ اس بنا پر اس کا خوف واقعی اور پختہ ہے۔ کسی قسم کی شوخی اور مزاح نہیں ہے۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو قریب کی سزا سے ڈرتے ہیں لیکن کافی مدت بعد کی سزا سے خائف نہیں ہوتے۔ جی ہاں منافقین کی یہی حالت ہے وہ اپنے دوستوں کو جھوٹے وعدوں کا سہارا دے کر اور مکر و فریب سے کام لے کر میدانِ جنگ میں بھیج دیتے ہیں۔ پھر انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اس لیے کہ نفاق میں وفاداری نہیں ہوتی۔ بعد والی آیت میں ان دونوں گروہوں یعنی "شیطان اور اس کے پیروکار" اور "منافقین اور ان کے کافر دوست" کے انجام کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" ان کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں جہنم کی آگ میں ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے ظالموں کی سزا۔ (فکان عاقبتهما انهما فی النار خالدین فیها وذالك جزاؤا الظالمین)[۱]

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ کفر و نفاق اختیار کرنے اور شیطان اور اس کے ساتھیوں کے شریک کار بننے کا انجام شکست و ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔ عذابِ دنیا و آخرت اس پر مستزاد ہے جبکہ مومنین اور ان کے دوستوں کا مستقل طور پر شریک کار بننا کامیابی سے ہم کنار کرتا ہے اور دونوں جہان میں رحمتِ خدا جیسی عظیم نعمت سے انسان کو سرفراز کرتا ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں خداوندِ عالم مومنین کو خطاب کر کے بنی نظیر، منافقین اور شیطان کے منحوس اور دردناک واقعہ سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

" اے ایمان لانے والو خدا کی مخالفت سے ڈرو اور ہر انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے قیامت کے دن کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے"
(یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا الله ولتنظر نفس ما قدمت لغد)[۲]

اس کے بعد دوبارہ تاکید کے لیے فرماتا ہے:

" خدا سے ڈرو اس لیے کہ خدا اس کام سے جسے تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے"۔ (واتقوا الله ان الله خبیر بما تعملون)۔

جی ہاں تقویٰ اور خوفِ خدا سبب بنتے ہیں کہ انسان روزِ قیامت کے لیے اپنے اعمال کو پاک و پاکیزہ کرے۔ تقویٰ کے حکم کی تکرار، جیساکہ ہم نے کہا ہے، تاکید کے لیے ہے کیونکہ تمام نیک اعمال بجا لانے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کا سبب یہی تقویٰ اور خدا کا خوف ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ تقویٰ کا پہلا حکم تو اچھے اعمال انجام دینے کا محرک ہے اور دوسرا حکم ان اعمال میں خلوص کی کیفیت

۱۔ عاقبتهما کان کی خبر ہے اور منصوب ہے اور انهما فی النار اسم کان کی جگہ ہے اور "خالدین" هما کا حال ہے۔

۲۔ یہ کہ "ما" "ما قدمت لغد" میں موصولہ ہے یا استفہامیہ مفسرین نے دو احتمال تجویز کیے ہیں اور یہ آیہ شریفہ میں دونوں کی گنجائش ہے۔ استفہامیہ زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پیدا کرنے کے بارے میں ہے۔ یا یہ کہ پہلے حکم کی ندا اچھے کام انجام دینے کی طرف ہے۔ (ما قدمت لغد کے جملے کے قرینے سے) اور دوسرا گناہوں اور معاصی سے پرہیز کی طرف اشارہ ہے۔ یا یہ کہ پہلا حکم گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آئندہ کے تقویٰ کے لیے ہے لیکن آیات میں ان تفاسیر کے لیے کوئی قرینہ کلام موجود نہیں ہے لہٰذا "تاکید" والی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ "غد" (کل) کی تعبیر قیامت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ عمرِ دنیا کی سُرعتِ رفتار کی طرف توجہ کرنے سے یہ چیز محسوس ہو جاتی ہے کہ قیامت بہت جلد آجائے گی، اور نکرہ کی صُورت میں اس کا ذکر اس کی اہمیت کی بنا پر ہے۔ "نفس" (ایک شخص) کی تعبیر ہو سکتا ہے، کہ ایک فرد کے معنی میں ہو یعنی انسان اپنے کل کی فکر کرے اور بغیر اس کے کہ دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ اس کے لیے کوئی کام انجام دیں گے وہ جب تک اس دنیا میں ہے جو کچھ بھیج سکتا ہے آگے بھیجے۔ یہ تفسیر بھی اُوپر والی تعبیر کے بارے میں کی گئی ہے اور یہ ان افراد کی قلت کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کی فکر کرتے ہیں، بالکل اس طرح جیسے ہم کہیں گے کہ بس ایک ہی شخص مل جائے جو اپنی نجات کی فکر میں ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے اور یا ایھا الذین اٰمنوا کا خطاب اور تقویٰ کے امر کی عمومیت کی دلیل ہے۔ اس کے بعد کی آیت تقویٰ اور معاد کی طرف توجہ کے امر کے بعد یادِ خدا کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے:

"ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو بُھلا دیا ہے اور خدا نے بھی انہیں خود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔" (ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم)۔ اصولی طور پر تقویٰ کی اصل حقیقت اور بنیاد دو چیزیں ہیں:

ایک تو خدا کی یاد یعنی خدا کی دائمی مراقبت اور اس کے ہر جگہ اور ہر حال میں حاضر و ناظر ہونے کا یقین اور یہ احساس کہ خدا عادل ہے۔

دوسرے اعمال کی طرف توجہ کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جو نامۂ اعمال میں مندرج نہ ہو۔ اس بنا پر یہی دو باتیں مبدأ اور معاد کی طرف توجہ انبیاء و اولیاء کے تربیتی لائحہ عمل کا عنوان قرار پاتی ہیں اور ان کی تاثیر فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح اور تزکیہ کی مکمل طور پر نگران ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن یہاں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا کو بُھلا دینا خود فراموشی کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ ایک طرف تو پروردگار کو بھُول جانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان مادّی لذتوں اور حیوانی خواہشات میں ڈوب جائے اور اپنے مقصدِ خلقت کو بھلا دے اور اس کے نتیجے میں روزِ قیامت کے لیے نیک اعمال کا ذخیرہ کرنا ہے اس سے غافل ہو جائے۔ دوسری جانب خدا کو فراموش کرنا اس کی صفاتِ پاک کو فراموش کرنے کے مترادف ہے، اس لیے کہ ہستی مطلق، علمِ بے پایاں اور غیر متناہی استغناء و تونگری کے ساتھ مخصوص ہے اُس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کی ذاتِ پاک کا محتاج ہے۔ ان حقائق کو بُھلا دینا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان خُود کو مستقل غنی اور بے نیاز کہنے لگے اور اس طرح اپنی حقیقت اور انسانی واقعیت کو فراموش کر دے۔[1]

اصولی طور پر انسان کی سب سے بڑی بدبختی اور مصیبت خود فراموشی ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اس ذاتی قدر و قیمت، استعداد اور لیاقت کو جسے خدا نے اس کے وجود میں پوشیدہ رکھا ہے اور اسے باقی مخلوق سے ممتاز قرار دیا ہے، فراموشی کے سپرد کر دیتا ہے اور یہ اقدام اپنی انسانیت کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔ اس قسم کا انسان ایک درندہ کی سطح تک گر جاتا ہے اور اس کا مقصد سوائے کھانے پینے، سونے جاگنے اور شہوت رانی کے اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ باتیں فسق و فجور کا بنیادی سبب ہیں بلکہ یہ فراموشی فسق کا اور اطاعتِ خدا کے حلقہ سے نکل جانے کا بنیادی سبب ہے۔ اسی بنا پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

"اس قسم کے فراموش کرنے والے انسان فاسق ہیں۔" (اولٰئک ھم الفاسقون)۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرماتا کہ خدا کو

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۲۵۳

نہ بھولو بلکہ فرماتا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول گئے ہیں اور خدا نے انہیں خود فراموشی کا شکار بنا دیا ہے۔ یہ موقع حقیقت میں ایک واضح جیسی مصداق کی نشان دہی کرتا ہے جس میں لوگ خدا کو فراموش کرنے کا انجام دیکھ سکتے ہیں۔ یہ آیت بظاہر منافقین کے متعلق ہے جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا یا یہود بنی نظیر کے متعلق ہے یا دونوں کے متعلق ہے۔ اس مضمون کی ایک آیت سورہ توبہ کی آیت ۶۷ میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے بارے میں آچکی ہے جہاں پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

(المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يأمرون بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون ايديهم نسوا الله فنسيهم ان المنافقين هم الفاسقون) "منافق مرد اور عورتیں سب ایک ہی گروہ سے ہیں وہ بُری چیز کا حکم دیتے ہیں اور اچھی چیز سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ انفاق و بخشش سے روکے رکھتے ہیں وہ خدا کو بھول چکے ہیں۔ خدا نے بھی انہیں فراموش کر دیا ہے۔ منافقین یقیناً فاسق ہیں"۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہاں خدا کو فراموش کرنا اس کی رحمت کے منقطع ہونے کا سبب بیان ہوا ہے اور یہاں خود فراموشی کا سبب ہے جو دونوں ایک ہی نقطے پر منتہی ہوتے ہیں (غور کیجئے)۔

آخری زیر بحث میں ان دونوں گروہوں (مومنین، صاحب تقویٰ اور مبدا کی طرف متوجہ افراد اور خدا کو فراموش کرنے والے افراد جو خود فراموشی کا شکار ہوئے ہیں) کے موازنہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اصحاب دوزخ اور اصحاب بہشت یکساں نہیں ہیں"۔ (لا يستوي اصحاب النار واصحاب الجنة)۔ اس دنیا میں اور اس کے معارف میں طرزِ فکر میں، انفرادی و اجتماعی طرزِ زندگی میں، اس کے مقاصد میں، آخرت اور اس کے عذاب و ثواب میں ان دونوں گروہوں کا خطِ عمل ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ ایک یادِ خدا، قیامت، بلند انسانی اقدار کے تصورات میں محو اور زندگانی جاودانی کے لیے ذخائرِ حسنات جمع کرنے میں مصروف ہے اور دوسرا مادی خواہشات میں غرق اور ہر نیکی کی فراموشی میں گرفتار اور ہر ہوا و ہوس کا قیدی ہے۔[1]

اس طرح انسان دوراہے پر نظر آتا ہے یا پہلے گروہ سے ملحق ہو جائے یا دوسرے سے وابستہ ہو جائے۔ درمیان میں تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آیت کے آخر میں ایک حکم قاطع کی شکل میں فرماتا ہے:

"صرف اصحاب جنت ہی کامیاب ہیں"۔ (اصحاب الجنة هم الفائزون)۔ نہ صرف قیامت میں رستگار و کامیاب ہیں بلکہ دنیا میں بھی کامیابی، آرام و سکون اور نجات انہی کے لیے ہے اور شکست دونوں جہان میں ان کا مقدر ہے جو خدا کو فراموش کرنے والے ہیں۔

ایک اور حدیث رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں ملتی ہے جس میں آپ نے اصحاب جنت ایسے لوگوں کو قرار دیا جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور ولایت جناب امیر علیہ السلام کو قبول کیا۔ لہٰذا اصحاب النار وہ ہوئے جنہوں نے ولایت علیؑ کو قبول نہیں کیا، آپ سے جنگ کی اور نقضِ عہد کیا۔ یہ آیت کے مفہوم کا ایک واضح مصداق ہے اور اس کی عمومیت میں اس سے کوئی کمی نہیں آتی۔

چند نکات

۱۔ اہلِ نفاق کے ساتھ بے مقصد شرکتِ عمل

جو کچھ مندرجہ بالا آیتوں میں منافقوں کی عہد شکنی اور اپنے دوستوں کو سخت لمحات میں تنہا چھوڑ دینے کے بارے میں آیا ہے یہ ایک ایسی چیز

---

[1] حذفِ متعلق "لا یستوی" عمومیت کی دلیل ہے۔

جس کے نمونے ہم نے بارہا اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ یہ لوگ گمراہ کرنے والے شیطان کی طرح ہر شخص کے دل میں وسوسہ ڈالتے ہیں، ان سے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کرتے ہیں، انہیں میدان حوادث میں بھیجتے ہیں اور انواع و اقسام کے گناہوں میں آلودہ کرتے ہیں لیکن بحرانی لمحات میں انہیں وسط میدان میں چھوڑ کر اپنی جان کی حفاظت اور مفادِ ذات کے لیے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی سرگزشت ہے جو منافقین کے شریک کار اور ان کے ساتھ عہد محبت استوار کرنے والے افراد ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے زمانہ میں وہ عہد و پیمان ہیں جو سپر طاقتیں (ہمارے زمانے کے شیاطین) ان ممالک کے سربراہوں سے کرتے ہیں جو ان سے وابستہ ہیں اور ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ یہ وابستہ ممالک جنہوں نے اپنی ساری بضاعت طبق اخلاص میں رکھ کر ان شیطان صفت حامیوں کے سامنے پیش کر دی ہے، سخت حوادث میں مکمل طور پر تنہا رہ جاتے ہیں اور ہر جگہ سے دھتکارے جاتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں ہم قرآن کے اس پیغام سے زیادہ شناسائی حاصل کر سکتے ہیں جو کہتا ہے: (کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریء منك انی اخاف اللّٰہ رب العالمین) "ان کا کام شیطان کی مانند ہے جس نے انسان سے کہا کافر ہو جا جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا میں تجھ سے بیزار ہوں میں اس خدا سے ڈرتا ہوں جو عالمین کا پروردگار ہے۔"

۲۔ برصیصا عابد کی حیرت انگیز داستان

بعض مفسرین اور ارباب حدیث نے ان آیات کے ذیل میں ایک پُر معنی روایت بنی اسرائیل کے برصیصا عابد کے بارے میں پیش کی ہے جو تمام افراد کے لیے درسِ عبرت ہو سکتی ہے یعنی وہ یہ داستان سُن کر شیطان کے فریب سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں جو شخص ان کے بہکاوے میں آتا ہے وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس داستان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

بنی اسرائیل میں ایک نامی گرامی عابد تھا جس کا نام برصیصا تھا جس نے طویل عرصہ تک عبادتِ پروردگار کی تھی جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ جاں بلب مریضوں کو اس کے پاس لاتے تھے اور اس کی دعا کے نتیجے میں انہیں دوبارہ صحت و سلامتی میسر ہو جاتی تھی۔ ایک دن ایک معقول گھرانے کی عورت کو اُس کے بھائی اس کے پاس لائے اور طے پایا کہ کچھ عرصہ تک وہ عورت وہیں رہے تاکہ اُس کو شفا حاصل ہو۔ اُب شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا پروگرام بنایا اور اس قدر اُس کو اپنے دام میں اسیر کیا کہ اس عابد نے اُس عورت سے زیادتی کی۔ کچھ دنوں بعد یہ بات کُھل گئی کہ وہ عورت حاملہ ہے (کیونکہ ہمیشہ ایک گناہ عظیم تر گناہوں کا سرچشمہ بنتا ہے)۔ اس نے عورت کو قتل کر دیا اور بیابان کے ایک گوشہ میں دفن کر دیا۔ اُس عورت کے بھائی اس واقعے سے باخبر ہوئے کہ مرد عابد نے اس قسم کے ظلم عظیم کا اقدام کیا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ یہاں تک کہ امیرِ شہر کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلا تاکہ حقیقت حال سے باخبر ہو۔ جس وقت عابد کا ظلم ثابت ہو گیا تو اُس کو اُس کی عبادت گاہ سے کھینچ کر باہر لے آئے۔ اقرارِ گناہ کے بعد حکم دیا گیا کہ اسے سُولی پر چڑھا دیا جائے جس وقت وہ سُولی پر چڑھایا جانے لگا تو شیطان اس کے سامنے نمودار ہوا اور کہا وہ مَیں تھا جس نے تجھے اس مصیبت میں پھنسایا۔ اب اگر جو کچھ میں کہوں وہ مان لے تو میں تیری نجات کا سامان فراہم کرتا ہوں۔ عابد نے کہا میں کیا کروں۔ اس نے کہا میرے لیے تیرا صرف ایک سجدہ کافی ہے۔ عابد نے کہا جس حالت میں تو مجھے دیکھ رہا ہے اس میں سجدہ کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ شیطان نے کہا: اشارہ ہی کافی ہے۔ عابد نے گوشہ چشم یا ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرح شیطان کی بارگاہ میں سجدہ بجا لایا اور اسی وقت مر گیا اور دنیا سے کافر گیا۔[1]

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۵ تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۵۱۸۔ اور تفسیر روح البیان میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے جلد ۹ ص ۴۴۶۔

۳۔ جو کچھ آگے بھیجنا چاہیئے

مندرجہ بالا آیات میں اس مسئلہ پر زور دیا گیا تھا کہ انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے قیامت کے لیے کون سا ذخیرہ اعمال جمع کیا ہے۔ (ولتنظر نفس ما قدمت لغد) درحقیقت میدانِ قیامت میں انسان کا سرمایۂ اصلی وہ اعمال و افعال ہیں جو اس نے آگے بھیجے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص اس فکر میں نہیں ہے کہ اس کے لیے اس کی موت کے بعد کوئی چیز بھیجے اور اگر بھیجے بھی تو اس کی زیادہ قدر و قیمت نہیں ہے۔

ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سامنے آئی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

> "راہِ خدا میں انفاق کرو چاہے تین سیر کھجوریں ہوں یا اس سے بھی کم یا مٹھی بھر ہوں یا اس سے بھی کم۔ یہاں تک کہ آدھا خرما ہی کیوں نہ ہو اور اگر کسی کو یہ بھی نہ مل سکے تو پھر وہ پاکیزہ باتوں سے دلوں کو خوش کرے اس لیے کہ قیامت میں جب انسان بارگاہِ خدا میں پیش ہوگا تو خدا پوچھے گا کیا میں نے تیرے متعلق ایسا اور ایسا نہیں کیا؟ کیا کان اور آنکھ تیرے اختیار میں نہیں دیے؟ کیا مال اور اولاد تجھ کو نہیں بخشے تھے؟ بندہ عرض کرے گا ہاں۔ تو اس وقت خداوند متعال کہے گا تو پھر دیکھ کہ تو نے اپنے آگے کے لیے کیا بھیجا ہے۔"

(فینظر قدامہ وخلفہ وعن یمینہ وعن شمالہ فلا یجد شیئا یقی بہ وجہہ من النار)۔

وہ اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھے گا اسے کوئی چیز نہیں ملے گی جس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ جہنم کی آگ سے محفوظ رکھ سکے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعض اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ قبیلہ مضر کا ایک گروہ وارد ہوا جن کی کمروں میں تلواریں لٹکی ہوئی تھیں۔ (وہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے آمادہ تھے)۔ لیکن ان کے کپڑے اچھے نہیں تھے۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجت مندی اور بھوک کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آپ مسجد میں آئے، منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد و ثنا بجا لانے کے بعد ارشاد فرمایا:

> "خدا نے یہ آیت قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد..."

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا:

> "راہِ خدا میں انفاق کرو اس سے پہلے کہ قوت و قدرت تم سے سلب ہو جائے اور راہِ خدا میں صدقہ دو قبل اس کے کہ اس میں کوئی مانع پیدا ہو جائے جن کے پاس دینار ہے وہ دینار سے جن کے پاس درہم ہے وہ درہم سے اور جو گندم و جو رکھتے ہیں وہ گندم و جو سے انفاق کریں اور کسی چیز کو کم تر خیال نہ کریں خواہ خرما کا آدھا دانہ ہی کیوں نہ ہو۔"

انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک تھیلی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی تو آثار سرور و انبساط آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۲

کے چہرۂ مبارک پر ہویدا ہوئے فرمانے لگے:

"جو شخص سنّتِ حسنہ کی بنیاد رکھے اور لوگ اس پر عمل کریں تو اس کا اجر اور ان تمام لوگوں کا اجر جو اس پر عمل کرتے ہیں اس ابتدا کرنے والے شخص کو نصیب ہوگا بغیر اس کے کہ لوگوں کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو اور جو شخص بُری رسم کو جاری کرے اس کا گناہ اور ان تمام لوگوں کا گناہ جو اس پر عمل کرتے ہیں اس رسم قبیح جاری کرنے والے کے ذمہ ہوگا بغیر اس کے کہ دوسرے لوگوں کے گناہ میں کوئی کمی ہو:"

لوگ کھڑے ہوگئے، جس کے پاس دینار تھا وہ دینار لے آیا۔ جس کے پاس درہم تھا وہ درہم لے آیا۔ جس شخص کے پاس جو چیز تھی وہ خدمت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے آیا۔ اس طرح سے معقول قسم کی مدد۔ نقد اور بصورت اشیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہوگئیں جسے آپ نے ان حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا[1]۔

یہی مفاہیم قرآن کی دوسری آیات میں بارہا آئے ہیں اور ان کی تاکید کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۰ میں ہم پڑھتے ہیں:

(واقیموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ان اللہ بما تعملون بصیر)

نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جس کارِ خیر کو اپنے لیے تم آگے بھیجتے ہو اسے خدا کے ہاں پاؤ گے خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

٭ ٭ ٭

[1] تفسیر درالمنثور ج ۶ ص ۲۰۱۔

۲۱۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝
۲۲۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ
الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝
۲۳۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ
اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝
۲۴۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ
يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ

۲۱۔ اگر اس قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو دیکھتا کہ وُہ اس کے سامنے خشوع سے پیش آتا
اور خوفِ خدا سے ریزہ ریزہ ہو جاتا یہ مثالیں ہم لوگوں کیلئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔
۲۲۔ خُدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ وُہ پوشیدہ و آشکار سے آگاہ ہے اور
وُہ رحمٰن و رحیم ہے۔

۲۳۔ خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اصلی حاکم اور مالک وہی ہے ہر عیب سے منزہ ہے۔ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ مومنین کو امنیت بخشتا ہے۔ ہر چیز کا نگہبان ہے اسے شکست نہیں ہوتی۔ طاقتور ہے اپنے ہر ارادہ نافذ کے ساتھ اصلاح کرتا ہے۔ وہ بزرگی و عظمت کے لائق ہے اور اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

۲۴۔ وہ خداوند خالق اور بے سابقہ پیدا کرنے والا ہے۔ وہ (بے نظیر) صورت کشی کرنے والا ہے اس کے لیے اچھے نام ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وُہ عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

اگر قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وُہ ریزہ ریزہ ہو جاتے

گزشتہ آیتوں کے بعد جو مختلف طریقوں سے انسانوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور جنہوں نے ان کے تقدیر ساز مسائل زندہ شکل میں پیش کیے، ان آیات میں، جو سُورہ حشر کی آخری آیات ہیں اور عام آیاتِ قرآنی پر روشنی ڈالتی ہیں، اس حقیقت کو منکشف کیا گیا ہے کہ قرآن کا نفوذ اس قدر گہرا ہے کہ اگر یہ پہاڑوں پر نازل ہوتا تو انہیں ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن تعجب ہے اس سنگ دل انسان پر کہ وہ سُنتا تو ہے مگر اس پر لرزہ بھی طاری نہیں ہوتا۔ خداوند عالم پہلے فرماتا ہے:

"اگر قرآن کو ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو مشاہدہ کرتا کہ وہ اس کے سامنے خشوع کر رہا ہے اور خوفِ خدا سے اس میں شگاف پڑ گئے ہیں۔" (لو انزلنا هٰذا القراٰن علیٰ جبل لرأیته خاشعًا متصدعًا من خشیة الله)۔ اور یہ ضربُ الامثال جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ لوگ ان میں غور و فکر کریں: (وتلك الامثال نضربها للناس لعلکم یتفکرون)۔

بہت سے مفسرین نے اس آیت کی تشبیہ کی شکل میں تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ پہاڑ باوجود اس سختی کے جو ان میں ہے اگر عقل و احساس بھی رکھتے اور یہ آیات انسانوں کے دلوں کی بجائے ان پر نازل ہوتیں تو وہ اس طرح لرزہ براندام ہو جاتے کہ ان میں شگاف پڑ جاتے لیکن سخت دل انسانوں کا ایک گروہ اسے سنتا ہے اور بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اور اس جملہ کو (وتلك الامثال نضربها للناس) مذکورہ تفسیر پر دلیل قرار دیا ہے۔ بعض مفسرین نے اسے اس کے ظاہر پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس جہان کے تمام موجودات جن میں پہاڑ بھی شامل ہیں، اپنے اندر ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں اور اگر یہ آیات پہاڑوں پر نازل ہوتیں تو وہ یقیناً ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ ان معانی پر سُورہ بقرہ کی آیت

کو گواہ قرار دیتے ہیں۔ ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ وان من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار وان منھا لما یشقق فیخرج منہ الماء وان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ) " پھر تمہارے دل اس واقعہ کے بعد پتھر کی طرح سخت ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت کیونکہ کچھ پتھر ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جن میں شگاف پڑ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی ٹپکنے لگتا ہے اور بعض خوف خدا کے باعث نیچے گر جاتے ہیں۔

"مثل" کی تعبیر ہو سکتا ہے کہ توصیف کے معنی میں ہو جیسا کہ یہ لفظ قرآن مجید میں بارہا اس معنی میں آیا ہے اس بنا پر مذکورہ تعبیر اس تفسیر سے نہیں ٹکراتی۔ قابل توجہ یہ بات ہے کہ پہلے فرماتا ہے کہ پہاڑ قرآن کے سامنے خاشع و خاضع ہو جاتے ہیں، پھر مزید فرماتا ہے کہ ان میں شگاف پڑ جاتے ہیں جو اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن ان میں بتدریج نفوذ کرتا اور ہر زمانے میں قرآن کی تاثیر کے نئے آثار ان میں نمایاں ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کی قوت جواب دے دیتی ہے اور یہ عاشق بے قرار کی طرح والہ و شیدا ہو جاتے اور پھر شگافتہ ہو جاتے ہیں[1]۔

لیکن بعد میں آنے والی آیات میں خدا کے اوصافِ جلال و جمال میں سے ایک اہم حصہ کا تذکرہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا تربیت نفوس اور تہذیب قلوب کے لیے بڑا پُر تاثیر ہے۔ پروردگارِ عالم ان آیتوں میں سے تین آیات میں پندرہ صفتیں اور دوسرے الفاظ میں اٹھارہ اوصاف اپنی صفاتِ عظیمہ میں سے بیان کرتا ہے اور ہر آیت توحید الٰہی اور اللہ کے مقدس نام کے بیان سے شروع ہوتی ہے اور انسان کی حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کے نورانی عالم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فرماتا ہے:

"خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو غیب و شہود سے آگاہ ہے اور رحمٰن و رحیم ہے": (ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمٰن الرحیم)۔ یہاں ہر چیز سے پہلے مسئلہ توحید جو تمام اوصافِ جلال و جمال کی رُوح ہے خدا کی معرفت کو اس پر مبنی قرار دیتا ہے اور غیب و شہود کے بارے میں خدا کے علم و دانش پر انحصار کرتا ہے۔ "شہادت و شہود" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے: مشاہدہ کے ساتھ مشروط ہے چاہے دل کی آنکھ سے ہو چاہے ظاہری آنکھ سے۔ اسی بنا پر ان کا حسی اور علمی دائرہ کار جو ہے وہ عالم شہود ہے اور جو کچھ اس دائرہ سے باہر ہے وہ عالم غیب شمار ہوتا ہے لیکن یہ سب علم خدا کے لیے یکساں ہے اس لیے کہ اس کا وجود بے پایاں ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور کوئی جگہ بھی اس کے علم و حضور کی قلمرو سے باہر نہیں ہے۔ اسی لیے سورہ انعام کی آیت ۵۹ میں ہمیں ملتا ہے۔ (وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو) "غیب کی چابیاں صرف اس کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی شخص انہیں نہیں جانتا۔ اس شان کے خدا کے نام کی طرف توجہ سبب بنتی ہے کہ انسان اسے ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھے اور تقویٰ اختیار کرے۔ اس کے بعد اس کی رحمت عام پر جو تمام مخلوقات کے شامل حال ہے لفظ رحمٰن کے حوالے سے اور اس کی رحمت خاص پر جو مومنین کے لیے مخصوص ہے، لفظ رحیم کے حوالے سے انحصار ہوا ہے تاکہ وہ انسان کو امید دلائے اور اسے معرفت خدا اس طولانی راستے میں مدد دے جو اس کو درپیش ہے۔ اس مرحلہ کا طے کرنا پروردگار کے لطف و کرم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ راستہ ایک طرح کا ظلمانی اور اس میں گمراہی کا خطرہ ہے۔ اس طرح صفتِ توحید کے علاوہ اس کی عظیم صفتوں میں سے اس آیت میں تین عظیم صفتیں بیان کی ہیں۔ فرماتا ہے:

[1] "متصدع" "صدع" کے مادہ سے سخت و محکم چیزوں میں شیشہ اور پتھر کی طرح شگاف پڑنے کے معنی میں ہے اور اگر درد سر کو صداع کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا انسان کا سر پھٹ رہا ہے۔

"خدا وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ (هو الله الذی لا اله الا هو)۔" "حاکم و مالک اصلی وہی ہے" (الملک) "ہر عیب سے پاک و منزہ ہے۔" (القدوس) "کسی پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھتا اور اس کی طرف سے سب سلامتی ہی ہے۔" (السلام)[1] اصولی طور پر اس کی دعوت فکر سلامتی کی طرف لے جاتی ہے۔" واللہ یدعوا الی دار السلام) (یونس ۲۵) اور اُس کی ہدایت بھی سلامتی ہی کی طرف متوجہ ہے۔" (یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام) (مائدہ ۱۶) اور جو قرارگاہ مومنین کے لیے ہے وہ سلامتی کا گھر ہے۔" (لهم دار السلام عند ربهم) "جنتیوں کا درود و تحیہ بھی سلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔" (الا قیلا سلاما سلاما) (واقعہ ۲۶)۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے:

"وہ اپنے دوستوں کو تحفظ بخشتا ہے اور ایمان عطا فرماتا ہے۔" (المؤمن)[2]

"ہر چیز کا نگہبان ہے۔" (المھیمن)[3]

"وہ ایسا صاحبِ قدرت ہے جو کبھی مغلوب نہیں ہوگا۔" (العزیز)۔ "وہ اپنے نفوذ والے ارادہ کے ساتھ ہر چیز کی اصلاح کرتا ہے۔" (الجبار) یہ لفظ جو مادہ جبر سے لیا گیا ہے کبھی قہر و غلبہ اور نفوذِ ارادہ کے معنوں میں آتا ہے اور کبھی اصلاح کے معنوں میں۔ راغب دونوں معنوں کو آپس میں ملا کر کہتا ہے، جبر کی اصل کسی چیز کی غلبہ اور قوت سے اصلاح کرنا ہے۔ یہ لفظ جب خدا کے لیے استعمال ہو تو اس کی ایک عظیم صفت کو بیان کرتا ہے یعنی وہ ارادہ کے نفوذ کے ساتھ اور کمال قدرت کے ساتھ ہر فساد کی اصلاح کرتا ہے۔ لیکن جب یہی لفظ خدا کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذمت کا باعث ہوتا ہے اور بقول راغب ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنی کوتاہیوں کا ازالہ ایسے منصب کا دعویٰ کر کے کرے جس کا وہ اہل نہ ہو۔ یہ لفظ قرآن مجید میں دس مواقع پر استعمال ہوا ہے جس میں سے نو موقعوں پر ظالم اور گردنیں کاٹنے والے مفسد افراد کے بارے میں ہے۔ صرف ایک موقع پر قادرِ مطلق کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ اسی زیرِ بحث آیت میں ہے۔ اس کے بعد مزید فرماتا ہے

---

1. بعض مفسرین نے سلام کو یہاں ہر قسم کے عیب و نقص و آفت سے سلامتی کے معنی میں لیا ہے لیکن اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ معنی لفظ "قدوس" میں موجود ہیں، جو پہلے آچکا ہے۔ اس کے علاوہ سلام عام طور پر قرآن مجید میں دوسروں کو سلامتی بخشنے کے مسئلہ میں آیا ہے اور اصولی طور پر لفظ سلام جو ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت کہا جاتا ہے۔ وہ اظہارِ دوستی اور متقابل سے روابط کی سلامتی کے بیان کے لیے ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ مناسب نظر آتا ہے۔

2. بعض مفسرین نے یہاں مومن کی صاحب ایمان کے معنی میں تفسیر کی ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلا ہے جو خدا کی پاک ذات اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہے وہ خود وہی ہے لیکن جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔

3. اس لفظ کے اصل کے بارے میں مفسرین اور ارباب لغت کے درمیان دو قول موجود ہیں۔ بعض اسے "هیمن" کے مادہ سے جانتے ہیں جس کے معنی نگہبان کے ہیں اور بعض ایمان کے مادہ سے، کہ اس کا ہمزہ "ھا" میں بدل گیا ہے اور سکون و اطمینان دینے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ دو مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ ایک دفعہ خود قرآن کے بارے میں (مائدہ ۴۸) اور ایک دفعہ خدا کی تعریف و توصیف میں زیر بحث آیت میں استعمال ہوا ہے۔ اور دونوں موارد میں وہی پہلے معنی مناسب ہیں۔ (لسان العرب، تفسیر فخر رازی، روح المعانی، ابوالفتوح رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں ابو عبیدہ سے نقل کرتا ہے کہ کلام عرب میں صرف پانچ نام ہیں جو اس وزن پر آئے ہیں۔ "مهیمن" "مسیطر" "مبیطر" (طبیب کا جانور) "مبیقر" وہ شخص جو اپنا راستہ کھولتا ہوا اور آگے بڑھتا ہو۔ "مخیمر" ایک پہاڑ کا نام ہے۔

"وہ بزرگی اور عظمت کے لائق ہے اور کوئی چیز اس سے برتر و بالا نہیں ہے"۔ (المتکبر)۔ متکبر تکبر کے مادہ سے دو معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک معنی ممدوح ہیں جو خدا کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ بزرگی، نیک کاموں اور بہت سی پسندیدہ صفتوں کا حامل ہو۔ دوسرے معنی مذموم ہیں جو غیر خدا کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ چھوٹے اور کم حیثیت افراد بزرگی اور عظمت کا دعویٰ کریں اور جن صفات کے وہ حامل نہیں ہیں ان کا دعویٰ کریں اور چونکہ بزرگی و عظمت صرف خدا کو زیبا ہے، لہٰذا یہ لفظ اپنے ممدوح معنی میں صرف خدا کیلئے استعمال ہوتا ہے اور جب اس کے غیر کے لیے استعمال ہو تو مذموم معانی رکھتا ہے۔ آیت کے آخر میں دوبارہ مسئلہ توحید پر، جس سے ابتدا ہوئی تھی، زور دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"خدا اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں"۔ (سبحان اللّٰہ عما یشرکون)۔ جو وضاحت کی گئی ہے اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ کوئی موجود ان صفات میں، جو یہاں بیان ہوئی ہیں، اس کا شریک اور اس کی شبیہ و نظیر نہیں ہو سکتا۔ آخری زیر بحث آیت میں ان صفات کی تکمیل کے لیے چھ اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ خدا ہے پیدا کرنے والا" (هو اللّٰہ الخالق)۔ "وہ خدا جس نے مخلوقات کو بے کم و کاست اور بغیر کسی سابقہ نمونہ کے خلق کیا ہے (البارئ)[1]۔

وہ خالق و آفریدگار جس نے ہر چیز کو ایک مخصوص شکل و صورت بخشی ہے (المصور) اور پھر چونکہ خدا کے اوصاف لامحدود ہیں بلکہ وہ اس کی رفعت و بلندی کی طرح لامتناہی ہیں لہٰذا مزید فرماتا ہے:

"اس کے لیے اچھے نام ہیں"۔ (له الاسماء الحسنیٰ)۔ اسی وجہ سے وہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے مبرّہ و منزہ ہے اور وہ تمام موجودات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسے ہر عیب و نقص سے پاک شمار کرتے ہیں۔ (یسبح له ما فی السماوات والارض)۔ آخر کار تاکید مزید کے لیے نظام آفرینش پر اس کی صفتوں میں سے دو صفتوں کی طرف، جن میں سے ایک پہلے آچکی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وہ عزیز و حکیم ہے"۔ (وهو العزیز الحکیم)۔ پہلی صفت ہر چیز پر کمالِ قدرت رکھنے اور ہر مانع پر غالب ہونے کی نشانی ہے دوسری نظام آفرینش، امرِ خلقت اور تدبیر کے معاملہ میں دقیق اور باریک بینی سے منظم لائحہ عمل کے متعلق علم و آگہی کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح ان تینوں آیتوں کے مجموعہ میں مسئلہ توحید کے علاوہ، جس کی دو مرتبہ تکرار ہوئی ہے، خدا کے اوصاف میں سے سترہ صفتیں آئی ہیں اور ان کی ترتیب یہ ہے:۔

۱۔ عالم الغیب والشهادہ۔

۲۔ رحمٰن

۳۔ رحیم

---

[1] "باریؑ" مادہ "برء" (بروزن قفل) اصل میں صحت یابی اور ناخوشگوار امور سے رہائی کے معنی میں ہے لہٰذا باری اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو کمی بیشی کے بغیر مکمل اور موزوں طور پر ایجاد کرے۔ بعض نے اسے "بری" (بروزن نفی) کے مادہ سے لکڑی کو تراشنے کے معنی میں لیا ہے جو اسے موزوں بنانے کے مقصد کے لیے انجام دیا جاتا ہے۔ بعض اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ باری وہ شخص ہے جو کسی چیز کو بغیر سابقہ نمونہ کے ایجاد کرے۔

۴۔ ملک

۵۔ قدوس

۶۔ سلام

۷۔ مؤمن

۸۔ مھیمن

۹۔ عزیز

۱۰۔ جبار

۱۱۔ متکبر

۱۲۔ خالق

۱۳۔ بارئ

۱۴۔ مصور

۱۵۔ حکیم

۱۶۔ اسمائے حسنیٰ کا مالک

۱۷۔ عالم کے تمام موجودات جس کی تسبیح کرتے ھیں۔

صفتِ توحید کے شامل ہونے سے یہ صفات اشارہ ہو جاتی ہیں۔ (توجہ کیجئے کہ توحید بھی دو مرتبہ اور عزیز بھی دو مرتبہ بیان ہوا ہے)۔
ان تین آیات میں ان تمام اوصاف ذات میں سے بالکل عام صفت علم اور اوصاف فعل میں سے بالکل عام صفت رحمت کا ذکر ہے جو تمام افعال کی اصل ہے۔ دوسری آیت میں اس کی حاکمیت اور اس کے کوائف کے بارے میں گفتگو ہے۔ اور قدوس و سلام و مؤمن و جبار و متکبر جیسی صفات کا اُن کے اُن معانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو ہم نے اُوپر بیان کیے ہیں، ذکر ہے۔ یہ سب خدا کی حاکمیت مطلقہ کی خصوصیات ہیں۔
آخری آیت میں مسئلہ خلقت اور جو چیزیں اس سے متعلق ہیں مثلاً تنظیم، تشکیل، اور قدرت و حکمت کے بارے میں بحث ہے۔ اس طرح یہ آیات معرفت خدا کی راہ طے کرنے والوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو منزل بہ منزل آگے لے جاتی ہیں۔ اس کی ذاتِ پاک سے ابتداء کرتی ہیں اور پھر عالم خلقت کی طرف لے آتی ہیں اور پھر اسی " سیر الی اللہ " میں مخلوق سے خالق کی طرف لے جاتی ہیں۔ دل کو خدا کے اسماء وصفات کا مظہر اور انوار ربانی کا مرکز قرار دیتے ہوئے ان معارف وانوار کے سلسلہ میں اس کی اصلاح و تربیت کرتی ہیں اور تقویٰ کے شگوفہ اس کی شاخِ وجود پر ظاہر کر کے اُسے خدا کے قُرب وجوار کے قابل بناتی ہیں تاکہ وہ عام ذراتِ عالم کے ساتھ ہم آواز ہو کر تسبیح کرتے ہوئے سبوح قدوس کی نغمہ سرائی کرے اس لیے تعجب کا مقام نہیں کہ روایات اسلامی میں ان آیتوں کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کی طرف انشاء اللہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔

چند نکات

۱۔ قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ

افکار اور دلوں میں قرآن کی تاثیر، ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور اسلام کی طویل تاریخ میں اس حقیقت کے بہت سے شواہد نظر آتے ہیں اور یہ عملی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ سخت ترین دل چند آیات قرآنی سننے کے بعد اس طرح نرم ہو جاتے تھے کہ فوراً اپنے آپ کو اسلام کے سپرد کر دیتے۔ صرف ہٹ دھرم اور کج فہم افراد اس اثر سے مستثنٰے تھے۔ وہ لیسے افراد تھے جن کے وجود میں حصول ہدایت کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسی لیے ہم نے اوپر والی آیات میں پڑھا ہے کہ خدا فرماتا ہے :

اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ خاضع ہوتے اور پھٹ جاتے۔ یہ سب اس خدائی کلام کی قوت جاذبہ کی نشانی ہے جسے ہم بھی حضورِ قلب سے تلاوت کے موقع پر محسوس کرتے ہیں۔

۲۔ سورۂ حشر کی آخری آیات کی عظمت

اس سورہ کی آخری آیات، جو اسماء وصفات الٰہی کے اہم حصّہ پر مشتمل ہیں، حد سے زیادہ الہام بخش اور باعظمت آیات ہیں اور انسانوں کے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہیں کیونکہ خدا کہتا ہے :

" اگر قربِ خدا طلب کرتے ہو اور عظمت کمال کے خواہاں ہو تو ان صفات کا ایک شعلہ اپنے وجود میں زندہ کرلو"۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ خدا کا اسم اعظم سورہ حشر کی آخری آیات میں ہے [۱]

ہمیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ملتا ہے :

(من قرأ اخر الحشر غفرلہ ماتقدم من ذنبہ وماتأخر)

"جو شخص سورہ حشر کے آخر کو پڑھے تو اس کے گزشتہ اور آئندہ گناہ بخش دیے جائیں گے"[۲]

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

(من قرأ لو انزلنا ھٰذا القراٰن الیٰ اٰخرھا فمات من لیلتہ مات شھیدًا)

" جو شخص لو انزلنا ھٰذا القراٰن کی آیتوں کو آخر تک پڑھے اور اسی رات مرجائے تو وہ شہید مرتا ہے"[۳]

ایک صحابی کہتا ہے : میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خدا کے اسم اعظم کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

(علیک باخر الحشر واکثر قراءتھا)

"تو سورۂ حشر کے آخری حصّہ کو پڑھ اور زیادہ سے زیادہ پڑھ۔ میں نے دوبارہ یہی سوال کیا تو آپ

۱۔ مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۷۔

۲۔ ۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۳۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ یہی جواب دیا۔[1]

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے :

(انها شفاء من کل داء الا السام والسام الموت)

یہ آیات سوائے موت کے ہر بیماری کی دوا ہیں۔[2]

خلاصہ یہ کہ اس سلسلہ میں شیعہ اور اہل سنت کی کتب میں بہت زیادہ روایات ہیں جو سب ان آیات کی عظمت اور ان کے نفسِ مضمون میں غور و فکر اور تدبر و تفکر پر زور دیتی ہیں۔ قابل توجہ یہ کہ یہ سورہ جس طرح خدا کی تسبیح اور عزیز و حکیم کے نام سے شروع ہوتا ہے اسی طرح عزیز و حکیم کے نام پر ختم بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سورہ کا مقصد خدا کی حقیقی معرفت، اس کی تسبیح اور اس کے مقدس اسماء و صفات سے آگاہی ہے۔ اسمائے حسنیٰ کے بارے میں جن کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے ایک تفصیلی بحث سورہ اعراف کی آیت ۱۸۰ میں گزر چکی ہے۔[3]

"خداوندا ! تجھے اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات مقدسہ کی عظمت کی قسم ہمارے دلوں کو قرآن مجید کے سامنے خاضع و خاشع قرار دے۔"

"پروردگارا ! شیطان کا دام فریب سخت ہے اگر تیرا لطف و کرم مددگار نہ ہو تو ہمارا اس سے بچنا مشکل ہے۔ ہمیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں شیاطین کے وسوسوں سے محفوظ رکھ۔"

"بارالٰہا ! ایثار و تقویٰ کی رُوح، ہر قسم کے بُخل، کینہ اور حسد سے دُور رکھ کر، ہمیں عطا فرما اور ہم کو خود پسندی و خود خواہی سے محفوظ رکھ۔ آمین یا رب العالمین !

سُورۂ حشر کا اختتام
جلد ۲۳ کا اختتام
آخر شعبان ۱۴۰۶ ھق
۱۳۶۵/۲/۲۰ شمسی

اختتام ترجمہ بتاریخ ۸ ذی قعد ۱۴۰۷ھ مطابق ۵ جولائی ۱۹۸۷ء بروز اتوار بوقت آٹھ بج کر دس منٹ صبح، بر مکان حقیر قم مقدس جمہوری اسلامی ایران۔

الحمد للہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ سرمداً ابداً

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۹۳۔

[2] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۲۰۱۔

[3] تفسیر نمونہ جلد ۷، ص ۴۹ سے آگے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشاریہ

"تفسیر نمونہ" ـــــ "اردو ترجمہ"

جلد نمبر ۲۳

ترتیب و تدوین ـــــ سید شکیل حسین موسوی

○ اصول و عقائد ۳۹۲
○ احکام ۳۹۴
○ اخلاقیات ۳۹۴
○ اقوام گزشتہ ۳۹۵
○ شخصیات ۳۹۵
○ علماء و دانشور ۴۰۰
○ کتب آسمانی ۴۰۰
○ کتب تاریخ، تفسیر و سیرۃ ۴۰۱
○ لغات قرآن ۴۰۳
○ متفرق موضوعات ۴۰۷
○ مقامات ۴۱۱

اصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

الٓہ ۳۸۳
اللہ ۱۵، ۳۱، ۸۹، ۱۵۷، ۲۱۹، ۲۲۵، ۲۳۱، ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۶۱، ۲۶۹، ۲۸۳، ۲۹۳، ۳۰۲، ۳۰۸، ۳۱۴، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۳۱، ۳۴۳، ۳۵۳، ۳۶۸، ۳۷۴
باری ۳۸۳
بصیر ۲۲۵، ۲۹۳
جبّار ۳۸۳
حکیم ۲۱۹، ۳۴۳، ۳۸۳
حمید ۲۶۱
خالق ۳۸۳
خبیر ۲۳۲، ۲۹۳، ۳۱۴، ۳۱۹، ۳۷۴
ذوالجلال والاکرام ۱۴۵
ربّ ۴۴، ۱۰۲، ۱۰۶، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۹۲، ۲۰۹، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۶۱، ۳۷۴
رحمٰن ۳۱، ۸۳، ۸۹
رحیم ۳۱، ۸۹، ۲۳۱، ۲۸۴، ۳۱۹، ۳۶۱، ۳۸۳
رؤف ۲۳۱، ۳۶۱
سُبحان ۳۸۳
سلام ۳۸۳
سمیع ۲۹۳
شہید ۳۰۲
عزیز ۲۱۹، ۲۶۹، ۳۳۱، ۳۴۳، ۳۸۳
عفوّ ۲۹۳
علیم ۲۱۹، ۲۲۵، ۳۰۲
غفور ۲۸۳، ۲۹۳، ۳۱۹
غنی ۲۶۱
قدّوس ۳۸۳
قدیر ۲۱۹، ۳۵۳
قوی ۲۶۹، ۳۳۱
متکبّر ۳۸۳
مصوّر ۳۸۳
ملک ۳۸۳
مؤمن ۳۸۳
مہیمن ۳۸۳

توحید

توحید و عدل کی اصل کا درمیانی نقطہ۔ ۷۹
خدا کا فرمان صرف ایک کلمہ "کُن" اور چشم زدن میں عمل ہونا۔ ۸۰
خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی انسان کو پیدا کیا۔ بیان کرنا سکھایا ۹۱
ہم نے دو دریاؤں کو ایک دوسرے کے قریب قرار دیا۔ ۱۰۶
تم دونوں اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کروگے۔ ۹۵
ربّ ذوالجلال والاکرام کی ذات باقی رہ جائے گی ۱۱۳
جو لوگ زمین و آسمان میں ہیں اُسی سے سوال کرتے ہیں وُہ ہر روز نئی شان اور نئے کام میں ہے ۱۱۳، ۱۱۵
ہمت و قدرت ہو تو زمین اور آسمانوں کی حدود سے نکل جاؤ ۱۲۱

ہم نے پیدا کیا تو پھر دوبارہ زندگی کی تصدیق کیوں نہیں کرتے
نطفہ کو زندگی تم دیتے ہو یا ہم ؛ موت کو مقدر کر دیا ہم پر کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا ۱۸۴
تمہاری جگہ تم جیسا ہی گروہ لائیں گے تمہیں اک اور جہان کی زندگی ملے گی
یہ کاشت جو کی ہے تم اگاتے ہو یا ہم ؛ ہم جب چاہیں اسے برباد کر دیں ۱۸۹ تا ۱۹۱
پانی پیتے ہو اسے ہم برساتے ہیں یا تم ؛ ہم چاہیں تو اسے تلخ کر دیں
آگ جو روشن کرتے ہو اس کا درخت ہم نے اگایا یا تم نے رب کی تسبیح کرو ۱۹۲ تا ۱۹۶
ستاروں کے محل طلوع و غروب کی قسم یہ یقیناً بہت اہم قسم ہے ۔ ۱۹۸
زمین و آسمان کو چھ ادوار میں بنایا ، انتظام سنبھالا ، ہر دم تمہارے ساتھ ہیں ۔ ۲۲۶
آسمان و زمین کی ملکیت اُسی کے لیے ہے ۔ ۲۲۸
رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ، دلوں کا حال جانتا ہے ۔ ۲۲۹
آسمانوں اور زمین کی میراث خدا کے لیے ہے ۔ ۲۳۲
جہاد اور نیکی کرنے والوں سے احسان کا وعدہ کیا ہے ۔ ۲۳۳
کیا وقت نہیں آیا کہ مومنین کے دل خدا کے ذکر سے خشوع حاصل کریں ۲۴۸
ہر مصیبت جو تمہیں پہنچے وہ لوح محفوظ میں ثبت ہے ۔ خدا کسی متکبر کو
دوست نہیں رکھتا جو بخل کرے تو خدا بے نیاز اور لائق حمد ہے ۔ ۲۶۳
ہم نے رسُولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا میزان اتاری اور لوہے کو نازل کیا
جس میں شدید قوت ہے اور منافع ہے ۔ ۲۶۹
ایمان والو خدا سے ڈرو تاکہ تمہیں بخش دے ، وہ غفور و رحیم ہے ۔ ۲۸۴
ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں ، کافروں کے لیے عذاب ہے ۔ ۳۰۲
جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے خدا اُسے جانتا ہے ۔ جب یہ
سرگوشی کریں تو وہ ان میں موجود ہوتا ہے ۳۰۳
جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ، خدا کی تسبیح کرتے ہیں وہ عزیز و حکیم ہے ۳۲۲
خدا اس سے منزہ ہے جسے یہ اُس کا شریک قرار دیتے ہیں ۳۸۷
وہ خالق ہے ، رحمان و رحیم اور عزیز و حکیم ہے
سب ہی موجودات اُس کی تسبیح کرتے ہیں ۔ ۳۸۸

عدل

قوم لُوط کو اللہ نے اپنی عدالت کا کرشمہ دکھایا ۶۶
ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے ۔ ۷۴
وزن کو عدل کی بُنیاد پر قائم کرو ۔ میزان کو کم نہ رکھو ۔ ۹۵، ۹۷
تم آج ہرگز خدا کی عدالت حکم اور صادر شدہ سزاؤں سے بچ نہیں سکتے ۔ ۱۲۲
مقام پروردگار سے عدالت الٰہی مُراد ہے ۔ ۱۳۲
اصحاب یمین و شمال اور سابقون کا انجام عین عدالت ہے ۲۱۳
العدل بعد الجور سے زمین کا عدالت و انصاف کے ذریعے زندہ ہونا ہے ۔ ۲۵۱
میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ عدالت کے ساتھ قیام کریں ۔ ۲۶۹
یہ چیز دادگاہ عدل الٰہی کے بعض مواقف ہیں ۳۲۹

نبوت

خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ
کیوں ایمان نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں پکارتا (دعوت ایمان دیتا) ہے
وہ اپنے بندے محمدؐ پر آیات بینات نازل کرتا ہے ۲۳۲
ہم نے رسُولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا
کون اُس کی اور اُس کے رسُولوں کی مدد کرتا ہے ؟ ۲۶۹
ہم نے متواتر نبی بھیجے ۔ نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا ، پھر اور نبی بھیجے
پھر مریمؑ کے بیٹے عیسٰےؑ کو بھیجا ۲۷۶

امامت

بعض روایات میں میزان سے مراد وجود امام لیا گیا ہے ۹۷
نُور سے مُراد وہ امام معصوم ہے جس کی لوگ اقتدا کرتے ہیں ۔ ۲۸۶

قیامت

قیامت کا ورود نئی زندگی کی ابتداء ہے ۔ ۳۱
وہ دن کہ جس میں سب قبروں سے باہر نکلیں گے ۔ ۴۰
وحشت کی شدت سے اُن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوں گی ۔ ۴۱
قیامت کا دن بہت سخت کیوں ہے ۔ ۴۲

مائیں اولاد کو بھول جائیں گی، حمل ساقط ہو جائیں گے۔ ۴۳
قیامت اُن کی وعدہ گاہ ہے۔ قیامت کا عذاب ہولناک ہے۔ ۶۹
اے جن وانس! ہم عنقریب تمہارا حساب کریں گے۔ ۱۲۱
بغیر دھوئیں کی آگ اور تہ بہ تہ دھواں تم پر بھیجے گا۔ ۱۲۳
آسمان شگافتہ ہو کر پگھلے ہوئے تیل کی طرح سرخ ہو جائے گا۔
ان ہولناک حوادث کو کوئی بھی برداشت نہ کر سکے گا۔ ۱۲۶
جب قیامت واقع ہوگی اس کے وقوع کا کوئی انکار نہ کرے گا
گروہ زیر و زبر ہوں گے زمین لرزے گی پہاڑ بکھر جائیں گے ۱۵۷/۱۵۸
تم تین گروہوں میں بٹ جاؤ گے
وہ قیامت کے انکار پر اصرار کرتے تھے ۱۶۹
گمراہوں کو قیامت میں کھانے کو زقوم اور پینے کو کھولتا ہوا پانی ۱۸۱
ایک گروہ کو دوسرے کی جگہ لائیں گے، تمہیں دوسرے جہان
کی زندگی بخشیں گے جسے تم نہیں جانتے ۱۸۴ تا ۱۸۰
پانی برسنا، مردہ زمینوں کا زندہ ہونا قیامت کی دلیل ہے۔ ۱۹۳
سبز درخت سے آگ پیدا کرنا بھی قیامت کی نشانی ہے۔ ۱۹۴
خدا قیامت میں سب کو اٹھائے گا اور ان کے اعمال سے باخبر کریگا۔ ۲۰۳
قیامت کے دن انسان کا اصل سرمایہ اُس کے نیک اعمال ہوں گے ۲۸۱

مُعجزہ

چاند شق ہو گیا ۳۱/۳۴
ناقۂ صالح ایک معجزہ کے طور پر۔ ۶۰
قرآنی پیش گوئیوں کا پورا ہونا بھی معجزہ ہے۔ ۴۲

جنت

پرہیزگار جنت کے باغوں میں ہیں ۴۴
جو اپنے پروردگار سے ڈرے اُس کے لیے جنت کے دو باغ ہیں۔ ۱۳۱
اہلِ جنت بہشت کی نعمتوں میں ۱۶۵

جہنم

جس دن جہنم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔
اب جہنم کی آگ کا مزہ چکھو ۴۳

احکام

تسبیح

پس اپنے پروردگار کی تسبیح کر ۱۹۲
اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کر اور اسے پاک شمار کر ۲۱۰

قرضِ حسنہ

کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اُس کے اجر
میں اضافہ کرے۔ ۲۳۳

مغفرت

خدا کی مغفرت اور جنت تک پہنچنے کے لیے
ایک دوسرے پر سبقت کرو۔ ۲۶۳

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

نیک عمل

اس جہان میں کوئی چیز ختم نہیں ہوتی
ہر نیکی و برائی باقی رہتی ہے ۳۳

انفاق فی سبیل اللہ

کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے تاکہ وہ اسے بڑھا کر واپس کرے ۲۳۸

میں اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں (رسول پاکؐ) ۲۷۰
ایک گروہ تو ایمان لایا۔ ۲۸۷
حزب اللہ ، اطاعت خدا و رسول
فلاح و رستگاری غلبہ و کامیابی ۳۳۶
چراغ گل کر کے مہمان کو کھانا کھلایا خود اور بچے بھوکے رہے۔ ۳۶۵
پانی ملا تو زخمی مجاہدین نے پیاس کی حالت میں رہنے پر دوسروں کو ترجیح دی
اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ۳۶۵

اخلاقِ رذیلہ

منافق
منافقوں کی پیش رو تاریکی ہوگی۔ ۲۴۴
منافقین و ضالین کی گمراہی اور کیفیات ۲۴۵
جو کافر ہو گئے وہ اصحابِ جحیم ہیں۔ ۲۵۵
مگر اکثر فاسقین میں سے تھے ۲۷۶
حزبِ شیطن
نفاق، حق سے دشمنی ، یادِ خدا کی فراموشی
جھوٹ اور فریب ۳۳۶
جنہوں نے آیاتِ خدا کو سنا مگر دل قساوت پر مائل رہے۔ ۲۵۲ تا ۲۵۴

اقوامِ گزشتہ

ثمود
قوم ثمود خوفِ خدا سے نہیں ڈری ۵۷
ثمود کا دردناک انجام ۔ ایک چیخ سے ہلاکت ۵۸ تا ۶۱
عاد
قوم عاد نے ہود پیغمبر کی تکذیب کی۔
سرد ، تیز ، وحشت ناک آندھی سے معذب ہوئی ۵۰ تا ۵۲
فرعونی
آلِ فرعون کے لیے تخویف و تنبیہ آئی۔ ۶۸
لوطؑ کی قوم
لوطؑ کے انذار کو جھٹلایا۔ ہم نے ایسی آندھی کے ذریعے
(جو پتھروں کو اڑاتی تھی) انہیں تباہ کر دیا۔ ۹۳

شخصیات

ابوالنجم ایک شاعر ۱۶۱
ابوبکرؓ مفسرین کی ایک جماعت نے انفاق کرنے والے کا مصداق
حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سمجھا ہے۔ ۲۳۶
ابوذر غفاریؓ
جنتی بیوی شوہر سے کہے گی" میں نے تجھ سے بہتر کوئی چیز نہیں پائی" ۱۳۷
ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی (امام صادقؑ) ۳۶۸
ابوسعید خدریؓ
ہو سکتا ہے ایک قوم تمہارے بعد آئے جو تمہیں چھوٹا تصور کرے (حدیث) ۲۳۹
اے فاطمہ! فدک تیری ملکیت ہے۔ (حدیث رسولؐ) ۲۵۹
ابن حزم
قرآن پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے (حدیث رسولؐ) ۲۰۳
ابن عمرؓ
قرآن پاک کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے (حدیث رسولؐ) ۲۰۳
ابن ماسویہ
عباسی خلیفہ مامون الرشید کا طبیب خاص ۲۰۷
اوس بن صامت
اپنی زوجہ خولہ سے ظہار کیا ۳۹۵
بختیشوع
عباسی خلیفہ مامون کا طبیب ۲۰۷

براءؑ بن عازب

خدا کو اسم اعظم کے ساتھ پکارو سورہ حدید کی آیات پڑھو (جناب امیرؑ) ۲۳۰

برصیصا

بنی اسرائیل کا ایک عابد جو شیطان کے بہکانے سے کافر ہو گیا۔ ۳۴۷

جعفرؑ بن ابی طالبؑ

رسول پاکؐ کے حکم سے ستر آدمیوں کے ساتھ تبلیغ کے لیے حبشہ گئے ۲۸۵

جعفرؑ بن محمدؑ امام صادق

سقر جہنم کا ایک درہ متکبر لوگوں کے لیے ہے ۷۵

"تکذبان" کے بعد "لا بشیء ....." کہے وہ دن کو مرے یا رات کو شہید کا درجہ پائے گا ۸۰

رحمن اسم خاص ہے عمومی صفت رکھتا ہو۔ اس کی رحمت سب کے شامل حال ہے۔ ۹۰

البیان وہی اسم اعظم ہے جس سے تمام چیزوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ۹۴

علیؑ و فاطمہؑ دو عمیق سمندر ہیں، حسنؑ و حسینؑ لولو و مرجان ہیں۔ ۱۱۲

خدا قیامت میں تمام بندوں کو ایک ہی مقام پر جمع کرے گا
آسمان اول کے فرشتوں کو نزول کا حکم دے گا وغیرہ ۱۲۳

جو خدا کو حاضر و ناظر جانتا ہے وہ خائف ہے۔ ہوائے نفس سے باز رہتا ہے۔ ۱۳۲

نیکی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے ایک طویل حدیث ۱۳۸

نیکی کے بدلے میں اس سے بہتر اور بالاتر نیکی کرنی چاہیے ۱۳۹

خدا فرماتا ہے۔ دو جنتیں ہیں جنتوں کے دو درجے ہیں۔ ۱۴۱، ۱۴۲

اپنے بچوں کو انار کھلاؤ۔ جلدی جوان ہوں گے ۱۴۴

جو شب جمعہ سورہ واقعہ پڑھے خدا اسے دوست رکھے گا
مفلسی اور آفتوں سے محفوظ رہے گا۔ امیرالمومنینؑ کے رفقا میں ۱۵۴
شمار ہو گا۔

ایک جماعت سے فرمایا۔ تم پہلے سابقون اور آخری سابقون ہو۔
ہماری ولایت اور جنت کی طرف سبقت کرنے والے ہو۔ ۱۶۳

اگر مقربین میں سے ہے تو اس کے لیے قبر میں رُوح و ریحان اور
آخرت میں پُر نعمت بہشت ہے۔ ۲۱۱

خدا نے کسی احتیاج کی بنا پر سوال نہیں کیا۔ خدا کے حقوق اس کے خاندان
اور ولی کے لیے ہیں۔ ۲۴۰

العدل بعد الجور سے زمین کا عدالت انصاف کے ذریعے زندہ ہونا ہے ۲۵۱

مومن شہید ہے۔ والذین آمنوا ...... والشہداء ۲۵۲ تا ۲۵۵

سورہ مجادلہ پڑھنے والا قیامت میں حزب اللہ میں شمار ہو گا۔ ۲۹۱، ۲۹۲

بصورت استطاعت ظہار کا کفارہ اٹھارہ دن کے روزے کافی ہیں۔ ۳۰۱

ہر چیز اس پر واضح و آشکار ہے۔ ۳۰۷

جب تک اپنی جان، ماں باپ، اولاد سے زیادہ خدا کی محبت نہ ہو ایمان کامل نہیں ہوتا ۳۲۷

ہر مومن کے دو کان ہیں، ایک میں وسواس خناس پھونک مارتا ہے اور دوسرے میں ملک۔
خدا مومن کو فرشتے کے ذریعے تقویت دیتا ہے۔ ۳۳۸

جو شخص سورہ رحمن و حشر کو غروب آفتاب کے وقت پڑھے
ایک فرشتہ ننگی تلوار لے کر اس کے گھر کی حفاظت کرے گا ۳۴۲

ابوذر کی زیادہ تر عبادت غور و فکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا تھی ۳۴۸

شحیح وہ ہے جو اپنے مال کے علاوہ دوسرے کے مال کا بھی بخیل ہے۔ ۳۶۶

حبیب نجار

حبیب نجار کا شمار سابقون الاولون میں ہے۔ ۱۶۱

حسنؑ بن علی عسکری

سعد و نحس ایام پر آپ کے ارشادات ۵۴، ۵۵

حسنؑ بن علیؑ

حمد ہے اس خدا کی جس کی ابتدا و انتہا معلوم نہیں
نہ اس کے ظاہر و باطن کا ادراک ہو سکتا ہے ۲۲۳

حسینؑ بن علیؑ

خدا جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے اس کی ہر روز نئی شان اور نیا کام ہے۔ ۱۱۸

تم بہت برے لوگ ہو۔ اطاعت خدا و رسولؐ کرتے ہو۔ اور اب آئے ہو
کہ پیغمبرؐ کی اولاد کو قتل کرو۔ ۳۲۹

خولہ

اوس بن صامت کی بیوی، شوہر کے ظہار کرنے کی رسول پاکؐ
سے شکایت کی۔ ۲۹۵

داؤدؑ نبی

اللہ نے لوہے کو آپ کے لیے نرم کر دیا تاکہ زرہیں بنا سکیں۔ ۲۶۱، ۲۶۲

سعید بن جبیرؓ

حجاج کے آپ کے حکم قتل پر ایک شخص کا رونا اور آپ کا
آیت ما اصاب من مصیبۃ ۔۔۔ الخ تلاوت فرمانا ۲۶۶

سلمانؓ فارسی

آپ نے منافقین سے فرمایا یہ قرآن احسن القصص ہے ۲۹۹
یا علیؑ! رسول پاکؐ نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:
"یہ (علیؑ) اور اس کا گروہ کامیاب ہے" ۲۳۶

شیطان

انسان سے کہا کافر ہو جا جب ہو گیا کہا میں تجھ سے بیزار ہوں
پس دونوں جہنم کی آگ میں ہیں۔ ۳۷۵

صالحؑ نبی

قوم ثمود کو تبلیغ کی۔ ثمود کا عبرت ناک انجام ۵۸ تا ۶۰

عائشہؓ

یہودیوں کا رسول پاکؐ کو السام علیک کہنا۔ آپؐ کا ناراض ہونا
حضورؐ کا تلقین صبر کرنا ۳۰۹

عبداللہ ابن عباسؓ

علیؑ اور اُن کے پیروکار مقربین بارگاہ ہیں۔ (حدیث رسولؐ) ۱۶۳
پیغمبر اسلامؐ نے پیاس کی حالت میں دعا کی اور پانی برسا ۲۰۲
حدیث نجویٰ بیان کی ۲۲۲
رسول پاکؐ نے "وآت ذی القربیٰ ۔۔۔ الخ" کے نزول پر
فدک کی جاگیر جناب فاطمہؑ کو دے دی ۲۵۹
بنی نضیر پر کامیابی کے بعد رسول پاکؐ نے انصار سے فرمایا اپنے
گھروں کو مہاجرین پر تقسیم کرو تو بنی نضیر کے مال سے حصہ لے لو ۳۶۴

عبداللہ ابن عمرؓ

آیت نجویٰ رسول پاکؐ پر صدقہ دینے کا عمل علیؑ نے انجام دیا۔ ۳۲۲

عبداللہ ابن مسعودؓ

آپ نے "علم القرآن" تلاوت کیا تو قریش نے آپ کو تھپڑ مارے
یہ پہلے شخص تھے کہ کفار قریش کے سامنے قرآن پڑھا۔ ۱۵۰
رہبانیت کے بارے میں حدیث رسولؐ بیان کی۔ ۲۸۱

علیؑ ابن ابی طالبؑ

دو مشرقوں اور دو مغربوں پر آپ کی حدیث ۱۰۴، ۱۰۵
حمد و ستائش اُس خدا کی جو نہیں مرتا۔ ہر روز نئی شان نیا موضوع ہے ۱۱۲
امیر المومنینؑ سابقون الاولون میں شمار ہیں۔ ۱۶۱
"ام نحن الخالقون" کی تلاوت پر فرمایا (بل انت یا رب) تا آخر ۱۹۶، ۱۹۷
محتضر کا عمل مجسم ہو کر سامنے آئے گا۔ (طویل حدیث) ۲۱۳، ۲۱۴
وہ اپنے تسلط و عظمت کی بنا پر غلبہ رکھتا ہے۔ اپنے علم و معرفت کی
وجہ سے اس کے باطن میں راہ رکھتا ہے۔ ۲۲۲
اس کی اوّلیت کی ابتدا اور بقا کی انتہا نہیں ۲۲۳
سورہ حدید و حشر کی آخری آیات کی تلاوت و ثواب پر طویل حدیث ۲۳۰
کسی کام میں جلدی نہ کرو پشیمان ہوگے
حق سے فاصلہ کی بنا پر قساوت قلبی ہوگی ۲۵۰
جو اپنے بستر پر مرے پیغمبر اور اہل بیت کے حق کی معرفت رکھتا ہو وہ شہید مرا ۲۶۰
جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے غم نہ کرنا۔ جو کچھ خدا نے دیا ہے
اُس پر فخر نہ کرنا ۲۶۷
لوہے کو نازل کرنے سے مراد اُسے پیدا کرنا ہے۔
منافع سے ہر قسم کا نفع مراد ہے جو لوہے سے ہوتا ہے ۲۷۱
کسی چیز کی اصلاح بھی جہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ ۲۷۳
جن کی کوششیں زندگی میں گم ہو گئیں وہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام کر
رہے ہیں۔ وہی گھاٹے میں ہیں ۲۸۴
راہب جو پہاڑوں، بیابانوں میں خود کو قید کیے ہوتے ہیں
وہ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ ۲۸۳
جہاں ہوائے نفس ہو وہاں دین نہیں ہوتا ۲۸۸
خدا کے امنا ساری مخلوق پر تسلط رکھتے ہیں ۳۰۶
خدا ہم پر احاطہ کیے ہوتے ہے۔ ۳۰۶، ۳۰۷

جو زمانۂ طالب علمی میں مرجائے اُس کے اور انبیا کے درمیان ایک درجہ کا فاصلہ ہے ۲۱۷
تیری نیازمندی اور حاجت مندی گفتگو کی نرمی اور حُسن سلوک سے ظاہر ہو۔ ۲۱۸
آیت نجویٰ پر نہ مجھ سے پہلے نہ میرے بعد کسی نے عمل کیا۔ ۲۲۲
فتنوں کے وقوع باطل آرا ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ۲۲۹
سعادت مند وہی ہیں جو دوسروں سے عبرت حاصل کریں۔ ۲۲۹

علیؑ ابن الحسینؑ

قیامت خافضہ ہے۔ خدا کی قسم وُہ دشمنان خدا کو جہنم میں گرائے گی اور اولیا اللہ کو بہشت میں لے جائے گی۔ ۱۶۰،۱۵۹
دربار یزید میں فرمایا: ہمارے لیے تو "ما اصاب من مصیبة" آیت اُتری ہے۔ ۲۶۵

علیؑ بن موسیٰؑ

الرحمٰن علم القرآن پر آپ کی حدیث۔ ۹۴
میزان سے مُراد وجود امام ہے۔ ۹۷
قرآن کو طہارت کے بغیر مَس نہ کرو۔ ۲۰۳

عیسیٰؑ ابن مریم

وُہ باتیں جو خدا کے ذکر سے خالی ہوں نہ کرو۔ ۲۵۱،۲۵۰

فاطمہؑ زہرا

رسولِ پاکؐ کا عطیہ، جائیداد فدک خلافت اوّل میں بجبر آپ سے واپس لے لی گئی۔ ۲۶۰،۲۵۹

فضیل بن عیاض

ابتدا میں راہزن تھے: "تخشع قلوبھم" آیت سُن کر توجہ کی اور ایمان والوں میں داخل ہوگئے (امام صادقؑ کے موثق راوی) ۲۵۳،۲۵۲

قتیبہ بن سعید

اُپنے اُونٹوں کے مالک کا صبر و ضبط (تمام اُونٹ مرجانے پر) بیان کیا ۲۶۸
قدارہ بن سالف: قوم ثمود کا ایک فرد جس نے ناقۂ صالح کی کونچیں کاٹ دیں۔ ۶۱

مامون عباسی

مامون کی جانکنی کا واقعہ ۲۰۷

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بن عبداللہ رسول پاک

القبر الفضاء واسعة لیس بھم جار (حدیث) ۷۶
میری اُمت کے دو گروہ "جبری، قدری" کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ۷۹
جس نے سُورۂ رحمٰن کی تلاوت کی اللہ اُس پر رحم فرمائے گا۔ ۸۷
اللہ گناہوں کو بخشتا اور رنج و تکلیف کو برطرف کرتا ہے۔ ایک گروہ کو بلندی اور ایک کو پستی عطا کرتا ہے۔ ۱۱۹
دو جنتیں ایک کُل چاندی کی اور دُوسری سونے کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۴۱
ذوالجلال والاکرام کے واسطے سے دُعا پر دو حدیثیں قبولیت دُعا۔ ۱۴۹
واقعہ کا قاری غافلین میں نہیں مجھے سُورہ ہُود، واقعہ، مرسلات اور عم نے بُوڑھا کر دیا۔ ۱۵۴
ہر شب سُورہ واقعہ کا قاری مفلس نہ ہوگا۔ (عبداللہ بن مسعودؓ) ۱۵۵
سابقون الاولون پر آپ کی طویل حدیث۔ ۱۶۲،۱۶۱
"سدر مخضود" اس بیری سے کانٹے ختم کرکے عُمدہ پھل لگا دیے ۱۷۲
وہ بچہ جو شوہردار عورت سے پیدا ہو وہی اس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۸۲،۱۸۳
جو دُنیا کو دیکھتا ہے اور آخرت کا انکار کرتا ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے مگر ساری توجہ دُنیاداری پر ہے۔ دونوں کا معاملہ عجیب ہے۔ ۱۸۸
کوئی نہ کہے میں نے زراعت کی۔ زراعِ حقیقی خدا ہے۔ ۱۹۰
حمد اُس خدا کی جس نے میٹھے پانی سے سیراب کیا، اُسے کڑوا نہ کیا۔ ۱۹۴
یہ آگ جو جلاتے ہو جہنم کی آگ کے ستر اجزا میں سے ایک جزء ہے۔ ۱۹۵
تمہارے پاس جو فالتو پانی ہو اُسے بندگانِ خدا کو استعمال کرنے سے نہ روکنا۔ ۱۹۷
آپ کو پیاس لگی دُعا فرمائی، بارش ہوئی کسی نے کہا ستارے کی برکت سے ہوئی۔ ۲۰۲
پاکیزہ افراد کے سوا قرآن کو کوئی مس نہ کرے، قرآن پوشیدہ کتاب میں ہے ۲۰۳
سبحان ربی العظیم و سبحان ربی الاعلیٰ کا ذکر، رکوع و سجود میں ۲۱۳
قاری "حدید" مومن ہے "حدید، صف، جمعہ، تغابن" کی فضیلت ۲۱۸
تو ایسا اوّل کہ پہلے کوئی چیز نہیں ایسا آخر کہ بعد میں کوئی چیز نہیں ۲۲۳

خدا کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھنا افضل ایمان ہے۔ ۲۲۸
خدا، فرشتوں اور رسولوں پر ایمان کی تفصیل اور امتیاز۔ ۲۳۵، ۲۳۴
ایسا انفاق جس میں خیانت کا دخل ہو۔ خدا قبول نہیں کرتا۔ ۲۳۸
انفاق میں مسابقت پر حدیث (ابو سعید خدری) ۲۴۰، ۲۳۹
در قرب قیامت پر تلوار کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں تاکہ خدائے واحد
کی عبادت ہو۔ میری روزی میرے نیزے کے سائے میں ہے ۲۴۲
لوگوں کو تلوار کے علاوہ کوئی چیز سیدھا نہیں کر سکتی۔ ۲۴۳
میری اُمت کی رہبانیت، راہ خدا میں جہاد کرنا ہے۔ ۲۸۰
میری اُمت کی رہبانیت ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج اور عمرہ ہے۔ ۲۸۱
اگر شیاطین انسانی دلوں پر قبضہ نہ کرتے تو وہ ملکوت سمٰوٰت کو دیکھ سکتے۔ ۲۸۸
اوس بن صامت کو سورۂ مجادلہ کی آیات سنائیں اور ظہار کا کفارہ ادا کرایا۔ ۲۹۶
دو افراد تیسرے سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔
کیا تمہیں نجویٰ سے منع نہیں کیا گیا۔ (بذریعہ ابو سعید خدری) ۳۱۲
خدا نے ہمیں بہتر سلام کا حکم دیا ہے۔ ۳۱۳
عالم شہید سے اور شہید عابد سے ایک درجہ بلند ہے۔ ۳۱۷
عالم کی عابد پر فضیلت، بدر کامل کی ستاروں پر فضیلت کی طرح ہے۔ ۳۱۷
انبیاء، علماء، شہداء، قیامت میں ۳۱۷
مومن کی دوسرے مومن سے برائے خدا خوشنودی، بہترین عمل ہے ۳۳۶
سورۂ حشر کی تلاوت کے بے حساب فضائل ۳۴۲
دشمنوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کر کے خدا نے ایک ماہ کے فاصلہ
سے میری مدد کی۔ ۳۱۵
بنی نظیر پر کامیابی کے بعد ان کی جائیداد کی تقسیم۔ ۳۶۴
ایک بھوکے سوالی کے لیے فرمایا کوئی ہے جو اسے کھانا کھلائے۔ ۳۶۵
بخل و حرص اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ۳۶۶
روز قیامت کے لیے انفاق کرو خواہ ایک خرمہ ہو۔ اللہ کا سوال آگے کیلئے
کیا بھیجا: راہ خدا میں انفاق کرو خواہ خرمہ کا آدھا دانہ ہو۔ ۳۸۱
رسول پاکؐ کی تحریک پر شخص کچھ نہ کچھ لایا۔ ایک معقول امداد جمع ہو گئی۔ ۳۸۲

سورۂ حشر کی آخری آیات پڑھنے سے اگلے پچھلے گناہ بخشے جائیں گے
وہ مرے تو شہید ۳۸۹
حشر کی آخری آیات موت کے سوا ہر مرض کا علاج ہیں۔ ۳۹۰

محمدؑ بن علیؑ باقر

رسول پاکؐ کا پسندیدہ پھل انار۔ ۱۲۷
ہم اللہ کا جلال اور اس کی کرامت ہیں ۱۲۹
ہم سابقون بھی ہیں اور آخرون بھی۔ ۱۶۳
قرآن کو وضو کے بغیر مس نہ کرو۔ ۲۰۳
اصحاب یمین ہمارے دوست اور ہمارے شیعہ ہیں۔ ۲۱۲
مسبحات کی تلاوت کرنے والا ظہور امام تک زندہ رہے گا۔
یا پھر رسول پاکؐ کا دوسرے جہان میں ہم نشین ہو گا۔ ۲۱۸
خدا مُردہ زمین کو حضرت مہدیؑ کے ذریعے زندہ کرے گا۔
زمین کا مُردہ ہونا اس پر کفر کا غلبہ ہونا مراد ہے۔ ۲۵۱
صدیقین اور شہداء پر آپ کی طویل حدیث ۲۶۰، ۲۵۹
تمام خوبیاں تلوار، تلوار کے نیچے اور تلوار کے سائے میں ہیں۔ ۲۴۳
اپنے دل کا جائزہ لو اس میں اللہ والوں کی دوستی اور اس کے نافرمانوں
سے دشمنی ہے تو تم اچھے آدمی ہو۔ ۳۲۷
جب انسان زنا کرتا ہے تو روح انسان اس سے جدا ہو جاتی ہے ۳۲۸
ہمارے لیے رسول خدا اور ذوی القربیٰ کا حصہ ہے اور دوسرے
حصوں میں بھی ہم لوگوں کے شریک ہیں۔ ۳۵۶

معاذ بن جبل

قرآن کو پاکیزہ افراد کے سوا کوئی نہ چھوئے (حدیث رسولؐ) ۲۰۳

موسیٰؑ بن جعفرؑ

آیۂ انفاق امام کو ہدیہ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ۲۴۰
خدا مُردہ دلوں کو نورِ حکمت سے زندہ کرتا ہے ۲۵۱
رہبانیت کے طور پر سفر کرنے یا گھر میں بیٹھ رہنے کو منع فرمایا ۲۸۰
موسیٰؑ بن عمران نبی: پروردگار میں تجھے کہاں پاؤں، کہا، جب تو

میرا ارادہ کرے تو میرے پاس پہنچ گیا۔ ۲۲۸
کیا میرے لیے کسی سے محبت، کسی سے دشمنی کی ہے عمل
بالله و بُغض فی الله ۳۳۹، ۳۳۸

ن آلِ فرعون

۔ ون الاولون میں شمار ہے۔ ۱۶۱

نجاشی

جعفرؓ بن ابی طالبؑ کی تبلیغ سے ایمان لائے۔ ۲۸۵

نوحؑ نبی

اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا مگر اُس نے ہدایت نہ پائی ۴۴
ہم نے نوحؑ و ابراہیمؑ کو بھیجا۔ اُن کی ذریت میں نبوت و کتاب قرار دی۔ ۲۷۵

ویل دورانت

ایک عیسائی مبلغ کا رہبانیت پر بیان۔ چوتھی صدی میں راہبوں سے
میل جول ہوا۔ دسویں صدی میں انتہا کو پہنچ گیا۔ ۲۸۱

ہابیل

سابقون الاولون میں شمار ہیں۔ ۱۶۱

علماء و دانش ور

آلوسی : مفسر ۲۳۹، ۲۵۶
ابن ابی الحدید : مؤرخ ۲۵۹
ابن اثیر : مؤرخ ۲۷۹
ابن منظور : مصنف لسان العرب ۱۲۳
ابن ندیم : سورۂ واقعہ کی فضیلت بیان کی۔ ۱۵۳
ابو عبداللہ زنجانی : مؤلف تاریخ القرآن ۱۵۳
برسوقی : مفسر روح البیان ۲۵۶
بیضاوی : مفسر ۲۲۹
حاکم نیشاپوری : ۲۵۹
راغب : ۶۵، ۹۳، ۶۳، ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۶۲، ۱۶۶، ۱۸۲، ۱۹۳، ۲۰۰
۲۲۰، ۲۳۸، ۲۷۹، ۳۲۸، ۳۵۵، ۳۶۵، ۳۸۵، ۳۸۶
سیوطی : مفسر ۳۱۵
طبرسی : مفسر ۱۱۴، ۲۰۲، ۲۳۹، ۳۱۳، ۳۲۰، ۳۲۲
طوسی : ۲۹۹
فخر الدین رازی : ۲۳۹، ۳۵۶
فرید وجدی : ۹۲، ۱۰۸، ۱۰۹
قطب سید : ۳۲۲
مسعودی : مؤرخ ۲۰۷
ملا صدرائے شیرازی : ۱۱۸، ۱۱۹

کُتب آسمانی

انجیل

انجیل یا اناجیل یہ یونانی لفظ جس کے معنی "بشارت" ہیں۔
حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ہے ۲۸۳

قرآن

سُورۂ قمر : مضامین۔ یہ سُورہ مبداء و معاد، صالحؑ نوحؑ
اور لوطؑ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ۲۹، ۳۰
فضیلت۔ قاری سورہ کے لیے بہت سے فضائل ۳۰
ہم نے قرآن کو نصیحت اور انسان کو بیدار کرنے کے لیے آسان کیا ہے
کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔ ۶۲
سُورۂ قمر کا آغاز و اختتام ۸۰

سُورۂ الرحمٰن

مضامین۔ اللہ کی نعمتیں، رحمتیں، مومنین و مجرمین کا انجام
جنت و دوزخ کا ذکر ۸۵، ۸۶
فضیلت : قاریٔ سورہ شکرِ خدا کے باعث اللہ کے رحم و کرم کا
مستحق ہوگا۔ ۸۷
رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی ۹۰

سورہ واقعہ
مضامین : قیامت پر خصوصی گفتگو مضامین کے آٹھ حصے ۱۵۳
فضائل : تلاوت کی فضیلت پر ارشادات رسولؐ و آئمہ ۱۵۴
انہ لقرآن کریم وہ قرآن کریم محفوظ و مکنون کتاب ہے
پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی چھو نہیں سکتا، نزول رب کی طرف سے ۱۹۸ تا ۲۰۲
خصوصیات قرآن، موضوعات و مضامین، عمیق معنی، پاکیزگی
تربیتی پہلو ۲۰۲
قرآن و طہارت : پاک لوگوں کے سوا اسے کوئی مس نہیں کر سکتا۔ ۲۰۳

سورۂ حدید
مشمولات : مدنی ہے، اجتماعی، حکومتی و عملی احکام
انفاق راہ خدا، توحید، نبوت، قیامت ۲۱۷
فضائل : اس سورہ کے قاری کا توحید و رسالت پر مکمل ایمان ہوگا۔ ۲۱۸
جو کچھ گنوا دیا اس کا غم نہ کرو۔ جو اللہ نے دیا اس پر خوش نہ ہونا۔ ۲۶۶
آیت نمبر ۲۸، ۲۹ کی شان نزول ۲۸۵

سورہ مجادلہ
مضامین : فقہی احکام اجتماعی نظام زندگی غیر مسلموں سے باہمی ربط ۲۹۱
فضائل : قاری سورہ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ذات میں
کوئی برائی نہ دیکھے گا۔ ۲۹۱، ۲۹۲
شان نزول : خولہ اور اس کے شوہر اوس بن صامت کے خولہ
سے ظہار کرنے کا واقعہ ۲۹۵
آیات نجویٰ کی شان نزول : یہود و منافقین کا سرگوشیاں کرنا
مسلمانوں کا پریشان ہونا۔ ۳۰۹
تفسحوا فی المجالس کی شان نزول
رسول پاکؐ کی خدمت میں چند بدری اصحاب کا آنا
انہیں جگہ دینے کے لیے ساتھیوں کو حکم دینا ۳۱۴، ۳۱۵
آیات نجویٰ رسول کی شان نزول
نجویٰ سے برتری حاصل کرنا مقصود تھا اس لیے حکم ہوا کہ
نجویٰ سے پہلے صدقہ دو۔ ۳۲۰

سورہ حشر
مضامین : بنی نظیر سے لڑائی، جلاوطن کر کے مدینہ کو پاک کرنا
تسبیح الٰہی پر سورہ کا خاتمہ ۳۴۱، ۳۴۲
فضائل : قاری سورہ کے لیے رسول پاکؐ اور امام صادقؑ
کی احادیث میں ثواب کا ذکر (شخصیات) ۳۴۴
شان نزول : بنی نظیر کی عہد شکنی، رسول پاکؐ کی ہلاکت کا منصوبہ
بنو نظیر کی جلاوطنی ۳۴۴، ۳۴۶
آیات "فے" کی شان نزول
بنی نظیر کی جلاوطنی کے بعد متروکہ اموال کی تقسیم
مسلمانوں کی خواہش اور حکم خدا ۳۵۴
حشر کی آیات ۱۱ تا ۱۴ کی شان نزول
قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے ۳۷۰
پہاڑ خوف خدا سے کانپتے خشوع و خضوع کرتے ۳۸۴ تا ۳۸۵
سورہ حشر کی آخری آیات
اسمائے حسنیٰ پر مشتمل پر عظمت آیات کو اپنے وجود میں منعکس کرو ۳۸۹

کتب تاریخ تفسیر و سیرت

ابن ماجہ : ۷۹
اسد الغابہ : ۱۵۰
اصول کافی : ۱۱۶، ۱۴۴، ۱۴۳، ۲۲۰، ۲۵۱، ۳۱۲، ۳۲۹، ۳۳۶، ۳۳۸
الغدیر : ۱۱۷
المنجد : ۱۴۷
اولین دانش گاہ : ۱۸۵
بحار الانوار : ۳۴، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۱۴۳، ۱۴۴، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۷۰، ۲۸۰
بخاری : ۷۹، ۱۱۶، ۲۳۵
بلوغ الادب : ۳۱۳

تاریخ القرآن : ۱۵۳
تاریخ ویل دورانت : ۲۸۱، ۲۸۲
تحف العقول : ۵۵
تحفہ حکیم مومن : ۱۰۸
ترمذی : ۷۹
تفسیر ابوالفتوح رازی : ۴۶، ۱۴۸، ۱۹۷، ۱۹۱، ۲۱۳، ۲۹۸
۲۸۵، ۲۹۶، ۳۱۵، ۳۵۰، ۳۸۹
تفسیر البیان : ۳۲۲
تفسیر المیزان : ۳۲۸، ۳۷۸
تفسیر انوار التنزیل : ۲۴۹
تفسیر برہان : ۱۴۹، ۱۵۴، ۲۱۲، ۳۳۷
تفسیر تبیان : ۲۹۹
تفسیر خوارزمی : ۳۰۰
تفسیر درالمنثور : ۷۹، ۱۱۲، ۱۴۲، ۱۷۴، ۱۴۸، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۳
۲۱۳، ۲۱۸، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۴۹، ۳۱۲
۳۱۵، ۳۲۲، ۳۵۰، ۳۵۹، ۳۷۰، ۳۸۲، ۳۹۰
تفسیر روح البیان : ۱۳۹، ۱۸۸، ۱۹۰، ۲۱۳، ۲۲۸، ۲۵۳، ۲۵۴
۲۶۶، ۲۶۸، ۳۲۲، ۳۴۳، ۳۵۶، ۳۷۰، ۳۸۰
تفسیر روح المعانی : ۴۷، ۸۹، ۸۱، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۵۵، ۱۷۴، ۱۸۳
۱۸۸، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۱۳
۲۳۹، ۲۸۵، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۵۹، ۳۸۹
تفسیر صافی : ۷۵، ۱۲۳، ۱۹۳، ۲۴۰
تفسیر علی بن ابراہیم : ۹۷، ۲۶۵، ۳۴۶
تفسیر عیاشی : ۱۳۸، ۲۵۷
تفسیر فی ظلال القرآن : ۲۳۵، ۳۱۵، ۳۲۲، ۳۵۹
تفسیر قرطبی : ۷۹، ۱۸۸، ۱۹۵، ۲۰۲، ۲۱۳، ۲۲۳
۲۵۳، ۲۹۶، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۴۲، ۳۴۶، ۳۸۰

تفسیر قمی : ۱۱۴، ۱۱۸
تفسیر کبیر فخر رازی : ۳۴، ۹۷، ۱۷۳، ۲۳۹، ۳۰۶
۳۲۲، ۳۲۳، ۳۵۰، ۳۵۹، ۳۸۶
تفسیر کشاف : ۴۶
تفسیر مجمع البیان : ۳۴، ۹۴، ۱۱۲، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۲
۱۵۴، ۱۵۵، ۱۸۲، ۱۹۰، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۱۸، ۲۳۹
۲۴۹، ۲۵۱، ۲۶۰، ۲۸۱، ۲۸۵، ۲۹۵، ۲۹۸، ۳۰۹
۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۳۴، ۳۴۲، ۳۴۶
۳۵۱، ۳۵۴، ۳۵۶، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۸۰، ۳۸۹
تفسیر مراغی : ۱۶۲، ۱۸۸، ۱۹۴، ۲۰۲، ۲۱۳
۲۳۵، ۲۷۲، ۳۱۰، ۳۵۶
تفسیر نور الثقلین : ۵۳، ۶۷، ۱۰۵، ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۵۴، ۱۶۰
۱۶۲، ۱۷۳، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۴
۲۲۰، ۲۲۳، ۲۴۴، ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۶۵، ۲۸۱
۲۸۶، ۲۸۷، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۷
۳۲۹، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۵۹، ۳۶۶، ۳۸۹، ۳۹۰
ثواب الاعمال : ۱۵۴
جوامع الجامع : ۳۱۷
خصال صدوق : ۱۵۴، ۱۶۰
دائرة المعارف : ۹۲، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۲۸۱، ۲۸۲
وحی مدرک : ۵۵
راز آفرینش انسان : ۹۳
سفینة البحار : ۲۰۸، ۲۵۳، ۳۳۷
سیرۂ ابن ہشام : ۱۵۰
شرح ابن ابی الحدید : ۳۵۹
فروع کافی : ۲۷۲
کامل ابن اثیر : ۱۱۸
کتاب خصال : ۳۴۸

کتاب فدک : ۲۵۹
کمال الدین : ۲۵۱
کنز العرفان : ۲۵۲، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۰۱
کنز العمال : ۲۸۳، ۲۵۹
لسان العرب : ۱۲۳، ۱۴۷، ۱۷۸، ۱۸۳، ۳۰۰، ۳۸۶
مجمع البحرین : ۹۴، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۲۸۱، ۲۸۲
مروج الذھب : ۲۰۷، ۲۰۸
مسند احمد : ۲۵۹
مفردات : ۶۵، ۹۴، ۱۰۳، ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۲۸، ۱۹۴، ۱۹۹، ۱۸۲
۱۹۳، ۲۰۰، ۲۲۰، ۲۳۵، ۲۷۹، ۲۴۸، ۳۵۵، ۳۶۵، ۳۸۵
من لایحضرہ الفقیہ : ۱۹۷
نہایہ : ۲۷۹، ۲۹۹
نہج البلاغہ : ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۶۰، ۲۵۹
وسائل الشیعہ : ۲۰۳، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۱۸، ۳۵۲، ۳۵۷

لغات القرآن

ا

اباریق : ابریق کی جمع ۔ دستہ اور ٹونٹی والا برتن ۱۹۶
اترابا : اتراب جمع ہے ترب کی (بروزن ذہن) مثل و مانند ۔ ہم سن ۔ ۱۴۴
اججاج : مادّہ "اج" (بروزن حج) آگ بھڑکنا جلنا ۱۹۴
اخذ : پکڑنا ، گرفت کرنا ۷۰
ادھی : مادّہ "دھو ، دھا" عظیم مصیبت ۔ حادثہ ۱۰
ارتبتم : مادّہ "ریب" شک مراد قرآن و قیامت پر شک کرنا ۱۷
ازدجر : زجر ، دھتکارنا ، دُور کرنا ، روکنا ۴۶
استبرق : موٹا اور ضخیم ریشم ۱۳۴
اشر : بروزن قمر خوش حالی ۵۹
اشیاع : شیعہ شبیہ ، مانند و مثل ، پیروکار ۷۵
اعتبروا : مادّہ "اعتبار" ایک چیز سے گزر کر دوسری کی طرف جانا
مشتقات : عبرہ (اشک چشم) عبارت تعبیر خواب وغیرہ ۳۴۸
اعجاز : جمع عجز کی نچلا یا پچھلا حصہ ۵۱
اعراب : (بروزن اظہار) آشکار و ظاہر کرنا ۔ فصیح و خوش بیان ۱۴۴
اعلام : جمع عَلَم (بروزن قلم) کی معنی پہاڑ ۱۱۰
اعین : بڑی آنکھیں ۱۶۸
افنان : فنن (بروزن قلم) کی جمع ترو تازہ شاخیں ٹہنیاں ۱۳۳
اقتباس : مادّہ "قبس" آگ کا شعلہ لینا ۲۴۴
اقدام : قدم کی جمع پاؤں ۱۲۸
اقطار : قطر کی جمع کسی چیز کے اطراف ۱۲۲
اکمام : کم (بروزن جن) کی جمع بہت سے معنی بالخصوص غلاف چھپانے والی شے ۹۸
اکواب : کوب کی جمع پیالہ ۱۹۶
الانسان : مراد عالم نوع انسانی ہے نہ کہ کوئی خاص مرد ۹۱
آن : آنی کھولتا ہوا پانی ۱۲۹
انام : انسان یا جن ۔ جن و انسان دونوں
یا خلق مطلق ۹۸
انباء : خبریں ۔ یہاں گزشتہ اُمتوں اور قوموں کی خبریں مراد ہیں ۴۰
انتصر : مدد طلب کرنا ۔ ۴۶
انزلنا : مادّہ "نزل" ایسی شے جسے مہمان کی تواضع کے لیے پیش کریں ۲۷۱
انشزوا : مادّہ "نشز" بلند زمین اُٹھنا ، کھڑے ہونا ۔ ۳۱۶
انظرونا : مادّہ "نظر" نگاہ کرنا سوچ بچار ، غور و خوض کرنا ۲۴۴
اوجفتم : مادّہ "ایجاف" تیزی سے ہانکنا ۳۵۵

ب

بارئ : مادّہ برء (بروزن قفل) صحت یابی ، ناخوشگوار امور سے رہائی ۳۸۷
باس : شدت ۔ قدرت ۲۷۱
بست : مادّہ "بس" آٹے کو پانی سے نرم کرنا ۱۹۰
بسیما : علامت و نشانی ۱۲۸

بطائن : بطانہ کی جمع معنی استر ۱۳۵

بطش : (بروزن فرش) کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا ۶۶

بکرۃ : دن کا آغاز ۶۷

ت

تبارک : مادہ "برک" (بروزن ورک) اونٹ کا سینہ مراد ثابت قدم
پائیدار ۱۴۸

تبوؤ : مادہ "بواء" (بروزن دوا) اجزاء و مکان کی مساوات ۲۶۳

تجادل : مادہ "جدل" رسی بٹنا۔ اصرار آمیز گفتگو ۲۹۷

تحاور : مادہ "حور" بروزن غور طرفین کی گفتگو ۲۹۷

تحرثون : مادہ "حرث" (بروزن درس) کاشت کرنا ۱۹۰

تخشع : مادہ "خشوع" کسی بزرگ کے سامنے مؤدب ہونا ۲۵۰

تربصتم : مادہ "تربص" انتظار کرنا ۲۴۵

تصلیہ : مادہ "صلی" (بروزن سعی) جلنا۔ آگ میں داخل ہونا ۲۱۲

تفسحوا : مادہ "فسح" (بروزن قفل) وسیع مکان وسعت دینا ۳۱۵

تفکہون : مادہ "فاکہہ" پھل، فکاہت، مزاح، خوش طبعی ۱۹۱

تماروا : مادہ "تماری" شک کرنا، جھگڑنا ۶۶

تنفذوا : مادہ "نفاذ" کسی چیز کو ٹکڑے کرنے کے بعد عبور کرنا ۱۲۲

تورون : مادہ "وری" (بروزن نفی) چھپانا ۱۹۴

ث

ثقلان : مادہ "ثقل" علم و شعور اور علم و آگہی کا وزن ۱۲۲

ثلۃ : پشم کا ایک مجتمع ٹکڑا۔ جماعت کثیر ۱۶۵

ج

جبار : مادہ "جبر" کسی چیز کی غلبہ اور قوت سے اصلاح کرنا ۲۸۶

جدر : جدار کی جمع دیوار ۳۴۲

جنی : (بروزن بقا) وہ پھل جس کے توڑنے کا وقت آگیا ہو یعنی پکا ہوا پھل ۱۳۵

جنات : جنت کی جمع وسیع فضا ۷۶

جوار : جاریہ کی جمع چلنا پھرنا متحرک ہونا۔ کشتی کی صنعت ۱۰۹

ح

حاصب : ایسی تیز آندھی جس میں سنگریزے اڑتے ہوں ۶۵

حب : ہر قسم کا دانہ کٹی ہوئی گھاس ۹۹

حسبان : (بروزن غفران) حساب اور نظم و ترتیب ۹۲

حشر : کسی جماعت کو میدان جنگ یا ایسی ہی کسی دوسری جگہ بھیجنا ۳۴۶

حطام : مادہ "حطم" (بروزن ختم) کسی چیز کا ٹوٹنا، زمین کے ۱۹۱
نیچے بوسیدہ نہ اگنے والا بیج، کٹی ہوئی گھاس ۳۵

حمیم : گرم چیز، گرم پانی حمام اس کا مشتق ہے ۱۷۸

حنث : ہر قسم کا گناہ تمام گناہ حنث العظیم میں شامل ہیں ۱۷۹

حور : جمع ہے حوراء اور احور کی سیاہ چشم صاف شفاف سفید رنگ عورت ۱۴۷

حیوک : مادہ "تحیت" حیات، سلامتی ۳۱۰

خ

خصاصہ : مادہ "خصاص" وہ شگاف جو گھر کی دیوار میں پڑ جاتے ہیں ۳۶۴

خیام : خیمہ کی جمع، خیمہ کپڑے کے علاوہ۔ اینٹ پتھر اور لکڑی
سے بنے ہوئے مکان کو بھی کہتے ہیں ۱۴۷

خیل : گھوڑے ۳۵۵

د

دان : اصل دانی ہے معنی نزدیک ۱۳۵

دُبر : قُبُل کی ضد، پیٹھ، پُشت ۷۱

دُسر : دسار کی جمع دھتکار، کیل کا شدید چوٹ سے لکڑی میں گھسنا ۴۷

دہان : (بروزن کتاب) پگھلا ہوا روغن، سرخ رنگ کا چمڑا ۱۲۷

ذ

ذواتا : ذات کا تثنیہ ہے معنی صاحب، حامل ۱۳۳

ر

رأیتم : یہاں روایت سے علم کے معنی میں ہے ۱۸۵

رُجّت : مادہ "رج" (بروزن حج) حرکت کرنا ۱۶۰

رفرف : درختوں کے بڑے اور چوڑے پتے، رنگ برنگ کے
خوبصورت پارچات ۱۴۷

رکاب : مادہ "رکوب" سواری کے اونٹ ۲۵۵
رَوح : (بروزن قول) تنفس ۲۱۰
رہبانیت : مادہ "رہبہ" خوف خوفِ خدا ۲۷۹
ریحان : خوشبودار گھاس ہر قسم کی روزی ۹۹، ۲۱۰

ز

زبر : زبور کی جمع معنی کتاب، لکھی ہوئی چیز، اعمال نامہ ۷۶
زقوم : بدبودار تلخ گھاس ۱۸۲

س

سُرر : مادہ "سرور" سریر کی جمع تخت یا پلنگ ۱۹۶
سعر : بروزن شتر بھڑکتی ہوئی آگ سریر کی جمع ۵۸
〃 جنون، ہیجان، اشتعال ۷۴
سقر : (بروزن سفر) دھوپ کی شدت یا کسی وجہ سے جسم کا رنگ
متغیر ہونا۔ ۷۴
سموم : مادہ "سم" زہر مراد جلانے والی ہوا ۱۷۸
سور : دیوار، فصیل، شہر پناہ ۲۹۴
سیھزم : مادہ "ھزم" (بروزن جزم) درہم برہم کرنا۔ ۷۱

ش

شاقوا : مادہ "شقاق" شگاف دو چیزوں کے درمیان جدائی ۳۴۹
شتّیٰ : شتیت کی جمع ۳۷۳
شح : ایسا بخل جس میں حرص بھی شامل ہو ۳۶۵
شواظ : بغیر دھوئیں والے آگ کے شعلے ۱۴۳
شہداء : مادہ "شہود" شہید کی جمع، ایسا حضور جس کے ساتھ
مشاہدہ وابستہ ہو۔ ۲۵۶

ط

طرف : بروزن حرف پلک ۱۳۷
طلح : سبز رنگ کا خوشبودار درخت ۱۷۲

ع

عبقری : بے نظیر و بے مثال شے ۱۴۷
عُرُباً : عرب کی جمع، عروبہ (بروزن ضرورۃ) صرف شوہر کو
چاہنے والی خوش گفتار عورت ۱۸۴
عصف : بروزن اسپ پتوں اور گھاس کے اجزاء ۹۹
عقر : مادہ "عقر" بنیاد، جڑ ۶۱
عیون : عین کی جمع آنکھ چشمے ۴۷

غ

غدا : کل، یہاں کل سے مراد قیامت ہو یا مستقبل قریب ۵۶، ۶۰
غرور : مادہ "غر" (بروزن حر) کسی چیز کا ظاہر اثر ۲۵۸

ف

فتنہ : آزمائش، امتحان سونا پگھلانے اور صاف کرنے کی کٹھالی ۶۰
فتنتم : مادہ فتنہ : بہت سے معنی خصوصاً گمراہی، شرک، بت پرستی ۲۹۵
فخار : مادہ "فخر" جو بہت زیادہ فخر کرتا ہو، کوزہ، ٹھیکری ۱۰۳
فخور : صیغہ مبالغہ مادہ "فخر" جو شخص دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فخر کرے ۲۶۷

ق

قریٰ : قریہ کی جمع بستی ۳۷۲
قفینا : مادہ قفا، پشت، بعد میں اسی سے قافیہ بنا ۲۷۶

ک

کبتوا : مادہ "کبت" (بروزن ثبت) ایسا مانع جو ذلیل بھی کرتا ہو۔ ۳۰۳
کریم : مادہ "کرامت" فائدہ ۱۷۸
کفل : (بروزن طفل) وہ حصہ جو انسان کی حاجت کو پورا کرے ۲۸۶

ل

لم یطمثھن : مادہ "طمث" ماہواری کا خون ۱۴۷
لینۃ : مادہ لون : اعلیٰ نسل کا کھجور کا درخت ۳۵۰

م

مارج : مادہ "مرج" (بروزن مرض) اختلاط و آمیزہ، داگوہ ۱۰۳

متصدع : مادہ "صدع" سخت ومحکم اشیا میں شیشہ و پتھر کی طرح
شگاف پڑنا۔ (صداع درد سر) ۳۸۵
مترفین : مترف مادہ "ترف" (بروزن سبب) عیش وعشرت کے باعث نافرمانی ۱۰۸
محتضر : مادہ "حضور" مراد مقررہ وقت ۶۰
محتظر : مادہ "حظر" (بروزن مغز) منع کرنا، بھیڑ بکریوں کا باڑہ ۶۶
محصنہ : مادہ "حصن" معنی قلعہ ۳۴۲
مختال : مادہ "خیال" معنی متکبر ۲۶۷
مخضود : مادہ "خضد" (بروزن مجد) کانٹوں کا قطع کر دینا ۱۴۲
مخلدون : یہ تعبیر اس لیے ہے کہ تمام اہل بہشت جاودانی ہیں ۱۶۶
مدھامتان : مادہ "ادھیمام" معنی دھمہ کی جڑ ہے سیاہی اور
رات کی تاریکی ۱۴۲
مدھنون : مادہ "دھن" روغن، تیل، نرمی سے پیش آنا ۲۰۱
مدینین : مادہ "دین" مدین کی جمع معنی جزا ۲۰۷
مرج : (بروزن فلج) خلط ملط کرنا۔ بھیجنا، چھوڑنا۔ ۱۰۷
مرجان : ایک دریائی جانور جو درخت کی شاخ کے مشابہ ہوتا ہے ۱۳۷
عموماً سفید رنگ اور مختلف رنگوں میں بھی ہوتا ہے
مرجئہ : مادہ "ارجا" تاخیر میں ڈالنا ۷۹
مزن : (بروزن حزن) برسنے والے بادل ۱۹۳
مستطر : مادہ "سطر" صف، صف بستہ ۷۶
مسکوب : مادہ "سکب" (بروزن کبک) ما مسکوب آبشار ۱۴۳
مشأمہ : شوم سے مشتق ہے بدبختی، ناراحتی، بے نوا گروہ ۱۶۱
معشر : عشر سے بنا ہے، دس مراد گروہ ۱۳۳
معین : مادہ "معن" (بروزن صحن) جاری رہنا ۱۶۶
مغرمون : مادہ "غرامت" زیادہ نقصان اُٹھانا ۱۹۱
مقوین : مادہ "قوی" (بروزن کتاب) خشک و خالی بیابان ۱۹۵
منبثا : پراگندہ کرنا منتشر کرنا ۱۶۰
منتصر : مادہ "انتصار" انتقام لینا کامیاب ہونا۔ ۷۱

منشآت : منشا کی جمع ایجاد کرنا ۱۰۹
منضود : مادہ "نضد" تہ بہ تہ ہونا ۱۴۳
منقعر : مادہ "قعر" گہرائی کا آخری نقطہ مراد جڑ یا
جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔ ۵۱
منھمر : مادہ "ھمر" (بروزن صبر) شدت سے آنسو بہنا
پانی برسنا۔ تھن سے آخری قطرہ بھی دودہ لینا ۴۶
مھطعین : مادہ "اھطاع" گردن اُٹھا کر دیکھنا ۴۴
مھیمن : مادہ "ھیمن" نگہبان، سکون و اطمینان ۲۸۶
میراث : وہ مال جو بغیر کسی معاہدے کے انسان کو ملے ۲۳۵
میقات : مادہ "وقت" مراد قیامت ۱۸۰
میمنہ : یمن سے مشتق سعادت و خوش بختی ۱۶۱

ن

نجم : ستارہ بغیر تنے کی گھاس ۹۳
نحاس : دھواں، سرخ شعلوں اور دھوئیں سے بھرپور آگ ۱۴۳
نُذر : نذیر کی جمع ڈرانے والی چیز ۴۰
نزل : وہ اشیا جن سے مہمان کی پذیرائی کی جاتی ہے ۱۸۳
نحس و نحاس : سُرخ شعلہ ۴۱
نضاختان : مادہ "نضخ" پانی اُبل کر نکلنا ۱۴۲
نکر : مادہ "نکارہ" غیر معروف اور وحشت ناک چیز ۴۱
نواصی : مادہ "نصا" ناصیہ کی جمع، سر کے اگلے بال ۱۲۸

و

وردہ : ورد کے پھول مراد سرخ رنگ ۱۲۷
وَلَہٗ : خدا کے لیے ۱۰۹

ھ

ھباء : بہت ہی باریک غبار جو ہوا میں معلق رہے ۱۶۰
ھشیم : مادہ "ھشم" کسی چیز کو توڑنا۔ پامال یا کتری ہوئی گھاس ۶۱
ھیم : (بروزن میم) ھائم کی جمع پیاس کی بیماری جو اونٹوں کو ہوتی ہے۔ ۱۸۲

ی :

یأن : انی، نزدیک ہونا، کسی کے حضور حاضر ہونا۔ ۲۵۰
یحادون : مادہ "محادہ" (لوہے کے ساتھ) مسلح ہو کر لڑنا۔ ۳۰۳
یحموم : حمیم سے ماخوذ مراد بہت گرم ۱۴۸
یسعٰی : مادہ "سعی" تیزی سے چلنا ۲۹۳
یصدعون : مادہ "صداع" (بروزن حباب) دردِ سر ۱۶۷
یطوف : مادہ "طواف" چکر لگانا ۱۶۶
یوق : مادہ "وقایہ" جس شخص کو خدا اس عیب سے محفوظ رکھے ۳۶۵
یولج : ایلاج ولوج داخل ہونا نفوذ کرنا۔ ۲۲۹
یھیج : مادہ "ھیجان" گھاس کا خشک ہونا، حرکت میں آنا۔ ۲۵۸

متفرق موضوعات

آدابِ مجلس :
سلام کرنا۔ نوواردوں کو جگہ، اہلِ فضیلت کا احترام کرنا ۳۱۸

آسمان کو بلند کیا، ہر چیز کے لیے میزان قرار دی
آسمان سے وحی، بارش اور دوسری نعمتوں کا نزول اور
میزان وضع کی۔ ۹۷،۹۶

اصحاب الشمال
نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں، گرم ہوا، اُبلتا ہوا پانی، آگ، دھواں
دنیا میں مست و مغرور تھے، اگلے پچھلے سب جمع کر دیے جائیں گے ۱۸۰ تا ۱۷۷

اصحاب المشأمہ :
بدبخت، بے چارہ اور بے نوا گروہ ۱۶۱

اصحاب المیمنہ :
جن کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ ۱۶۱

اصحاب الیمین :
بیری و طلح کا سایہ آبشار، بے شمار پھل، بہترین ساتھی (شوہر، بیویاں)
ایک گروہ پہلی اُمتوں سے اور ایک آخری اُمت سے ہے۔ ۱۷۰، ۱۷۱

اصحابُ النّار و اصحابُ الجنۃ برابر نہیں ہیں
نہ اس دنیا میں نہ قیامت میں نہ بعد از قیامت برابری ہے
اصحاب جنت ایک کامیاب گروہ ہے۔ ۳۷۹

اعمال نامہ
ہائے افسوس یہ کیسا نامۂ عمل ہے، چھوٹا بڑا کوئی کام ایسا نہیں
جو اس میں درج نہ ہو۔ ۹۲

انفاق راہِ خدا ۲۳۷
اللہ پر ایمان لانے اور راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کی جزا ۲۳۳، ۲۳۴
انسان کی عظیم کامیابی ہے۔
جہاد کے لیے مدد کرنا، حاجت مندوں کی حاجت روائی
بعض انفاق قرضِ حسنہ شمار ہوا، مال کے بہترین حصے دس شرطیں ۲۳۸، ۲۳۹

اہلِ نفاق کے اعمال میں بے مقصد شرکت
منافقین بہکاتے ہیں، مدد کا وعدہ کرتے ہیں مگر مشکل کے وقت
الگ ہو جاتے ہیں۔ ۳۷۹-۳۸۰

آیاتِ اسمِ اعظم
خدا کی صفات ذات اور صفات اعمال چھ آیتوں میں بیان ہوئیں
اسماء اعظم کی نشانیاں ۲۳۰

ایامِ نحس و سعد
قرآن کی رُو سے شب قدر مبارک ہے۔ نحس پر خاص دلیل ہے
مہینہ کا آخری بدھ قتل ہابیل اور قوم عاد کی تباہی کے سبب نحس ہے ۵۲ تا ۵۵

بعثتِ انبیاء کا مقصد
ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا۔ ۲۶۹

بغیر جنگ حاصل ہوئے اموال کا حکم :
جس کے لیے نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ۔ اس مال میں مجاہدین کا
حصہ نہیں، یہ صرف رسولؐ کو اللہ نے دیا ہے۔ ۳۵۴ تا ۳۵۷

ہر طور ہمیشہ اُس کی قدرت آشکار ہے
زمین و آسمان کو چھ ادوار میں بنایا پھر ان کا انتظام سنبھالا ۲۲۶ تا ۲۲۹

پانی اور آگ کس کی طرف سے ہیں
پانی ہم نے برسایا یا تم نے، آگ کا درخت ہم نے اُگایا یا تم نے ۱۹۲

پھلوں کی قدر و قیمت
خصوصی طور پر کھجور، انگور اور سیدالفاکہ انار کے فوائد اور خصوصیات ۱۹۳

تقدیر الٰہی اور اُس کے ارادے کی آزادی
ہمارے اعمال بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ لیکن اعمال پر ہمیں اختیار و
آزادی عطا کی ہے۔ ۷۸

تقویٰ اور دُور رس نگاہوں کا رابطہ
اگر ایمان لے آؤ، تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے بچو تو خدا اسے
حق و باطل کا امتیاز قرار دے گا۔ ۲۸۸،۲۸۷

تمام چیزیں تابع حکمت ہیں
ہم نے ہر چیز کو مقدار پر خلق کیا ہے ۷۷

جب جان حلق میں آجائے گی
جانکنی کی حالت میں تم زندگی کو واپس نہیں لوٹا سکو گے، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے
تمہاری نسبت ہم اُس سے زیادہ قریب ہیں۔ ۲۰۸،۲۰۶

جنّت کی بیویوں کا دُوسری بار ذکر
مخصوص خوبیاں (خوش بیان، پاکیزہ، حسن صورت، حسن سیرت،
خیراتٌ حسان) ۱۹۶

جنّت کی بے شمار نعمتیں مقربین کے لیے
پاکیزہ شراب کے جام، پرندوں کا گوشت، حورالعین بیویاں
نوجوان خادم گفتگو میں سلام ہی سلام ۱۶۵

جو لوگ خدا سے دشمنی کرتے ہیں
جو لوگ خدا اور اُس کے رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں وہ ذلیل ہوں گے۔ ۳۰۲ تا ۳۰۵

چاند سُورج کی حرکات
شمس و قمر کے ادوار کا انسانی زندگی پر اثر۔ موسم، رات، دن،
مہینے، صدیاں وغیرہ ۹۳

چاند شق ہوگیا
خدائے بزرگ و برتر کی قدرت، پیغمبر گرامی کا عظیم معجزہ
تاریخی اعتبار سے چاند شق نہ ہونے کے اسباب ۳۱،۳۲ تا ۳۷

حبّ فی اللہ اور بغض فی اللہ کا اجر
اللہ کی راہ میں محبت اور اللہ کے لیے دشمنی کرنے کے تین اجر
اس دُنیا میں اور دو قیامت میں ملیں گے۔ ۳۲۸،۳۲۷

حرکت جوہری
حرکت جوہری کے طرف داروں کا قرآن سے استدلال ۱۱۹،۱۱۸

حزب اللہ کامیاب ہے
خدا کے گروہ کی کامیابی، قوم نوحؑ، عاد و ثمود و قوم لوطؑ کو برباد کرنے والے
طوفان اور زلزلے، فتح مکہ اسلام کی کامیابی، عبداللہ بن ابی کا واقعہ۔ ۳۳۲ تا ۳۳۵

حزب اللہ اور حزب الشیطن کی نشانیاں
اللہ کے اطاعت گزاروں سے دوستی اور اسکے نافرمانوں سے دشمنی۔ ۳۲۷،۳۲۶

خدا کا سلام کونسا ہے
السلام علیکم اسلام کا سلام ہے ۲۶۳

خدا کی صفات میں اضداد کا اجتماع
اوّل و آخر، ظاہر و باطن، حیٌّ لا یموت متضاد صفات ہیں جو
خدا کی ذات میں موجود ہیں۔ ۲۲۲

خدا کا پوشیدہ لشکر
اللہ والوں کو خدا پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کے لشکر پوشیدہ طور پر مدد
کرتے ہیں۔ جنگ بدر اور بنی نضیر کے واقعات ۳۵۱

خدا و رسولؐ کے دشمن
ذلیل ترین افراد ہیں جو خدا اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ ۳۳۱

دنیا متاع غرور کے علاوہ کچھ نہیں
جو لوگ خدا و رسولؐ پر ایمان لائے وہ صدیقین و شہدا ہیں
دُنیاوی زندگی کھیل کُود، سرگرمی و تجمل پرستی اور تفاخر ہے۔ ۲۵۶ تا ۲۵۹

دُنیاوی زندگی مختلف اسباب و علل کا مجموعہ ہے۔
قرآن پاک نے لہو و لعب، زینت و تفاخر و تکاثر اور متاع قلیل کو اسباب زندگی بتایا ہے۔ ۲۶۰

دونوں جنتیں اللہ سے ڈرنے والوں کی منتظر ہیں
جو لوگ اللہ کے مرتبہ سے خائف ہیں، اُن کے لیے دُہری جنتیں ہیں پاکیزہ میوے۔ آرام کی جگہ ہے ۱۳۰ تا ۱۳۱

ذی الجلال والاکرام کے نکات
جو کچھ بھی ہے سب اُسی کی طرف سے ہے۔ ۱۲۹

رہبانیت
اُن کی اختراع ہے۔ ہم نے مقرر نہیں کیا، وہ خوشنودیٔ خدا چاہتے تھے حق کی اعانت نہیں کی۔ دینِ مسیح میں خرابیاں کر دیں ۲۷۷
موجودہ رہبانیت قرن اول میں نہ تھی، تیسری صدی میں ابتدا ہوئی
جب عیسائیوں نے امیر تیمور (خونخوار) سے شکست کھا کر جنگلوں میں پناہ لی ۲۸۰
رہبانیت کے باعث اجتماعی و اخلاقی فساد پیدا ہوئے۔
کاہلی و بے دینی اور اخلاقی انحطاط ہوا۔ ۲۸۱، ۲۸۲

زمین بطور ایک نعمت
زمین کا مدارِ ارضی و مدارِ محوری، دن رات کا ہونا اور موسم نعمت ہیں۔ ۹۸

زندگی ایک نظم و حساب
خود ہماری زندگی ایک عظیم نظم و حساب پر قائم ہے۔ ۱۰۰، ۱۰۱

زندگی کی عمدہ ضرورتیں لوہے سے متعلق ہیں
زراعت، صنعت، مسکن، حکومت ان سب میں لوہا ایک بُنیادی شے ہے۔ ۲۷۳، ۲۷۴

سحرِ مستمر
کفار جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ سحرِ مستمر ہے۔ ۳۱، ۳۲

سمندر اور اس کے قیمتی ذخائر
دو سمندر پاس پاس ہیں اُن کے درمیان ایک حجاب ہے اُن سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں، کشتیاں چلتی ہیں۔ ۱۰۷

سمندر خدا کی نعمتوں کے مراکز
ادویات موتی مونگے، مچھلی، خوردنی اور استعمال کی دوسری بے شمار چیزیں۔ ۱۱۰
گلف سٹریم بڑی تیزی سے سمندر میں جاری کچھ لہریں گرم پانی کی اور بعض سرد پانی کی یہ آب و ہوا پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ ۱۱۱

شیطان کے بہکانے سے کوئیں میں نہ گرو
یہ انسان کو کافر بنا کر تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے تم سے بیزار ہوں اور خدا سے ڈرتا ہوں واقعات بنی نضیر و بنی قینقاع ۳۵ تا ۳۷

شیاطین کا گروہ
خدا کے مخالف گروہ سے دوستی، اپنے کو چھپانا، قسمیں کھانا وہ بداعمال ہیں خدا کا عذاب ہوگا گروہ شیاطین گھاٹے میں ہے۔ ۳۲۷ تا ۳۲۹

صحابہ قرآن و تاریخ کی میزان میں
مہاجرین، انصار، تابعین کے جو اوصاف قرآن میں آئے ہیں۔
تمام صحابہ کے کردار پر منطبق نہیں ہیں اس لیے سب مرتبہ میں برابر نہیں۔ ۳۶۷، ۳۶۸

ضال و مکذبین میدانِ محشر میں
گمراہو! یقیناً زقوم کے درخت سے کھاؤ گے کھولتا ہوا پانی پیاسے اُونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ قیامت میں تمہاری پذیرائی ہے۔ ۱۸۱

ظہار
جاہلیت کا عمل قبیح، اوس بن صامت کا خولہ سے ظہار رسول پاک کا فیصلہ اور کفارہ کی ادائیگی۔ ظہار کے بعض احکام ۲۹۶ تا ۳۰۱

غفلت و بے خبری کب تک
کیا وقت نہیں آیا۔ صاحب ایمان افراد کے دل ذکر خدا سے خوف کھائیں۔ ۲۵۰، ۲۵۱

غور و فکر کرنے والوں کی نشانیاں
غور و فکر سے حقائق آشکار ہو جاتے ہیں، خدا کی ممکن معرفت پر عبور ہو جاتا ہے۔ ۲۲۰ تا ۲۲۲

فدک کی غم انگیز داستان
رسول پاکؐ نے اراضیات فدک جناب فاطمہؑ کو ہبہ کردی تھیں
بعداز رسولؐ یہ جائیداد آپؑ سے واپس لے لی گئی۔ ۳۵۹، ۳۶۰

قرآن کا حد سے زیادہ نفوذ
سخت ترین دل بھی قرآنی آیات سن کر نرم و اثر پذیر ہو جاتے ہیں۔ ۳۸۹

قرآن میں صدیقوں کا ذکر
قرآن نے حضرت ابراہیمؑ حضرت ادریسؑ اور جناب مریمؑ کو صدیق کہا ہے۔ ۲۵۹

قیامت میں مجرموں کا بے مقصد مدد کرنا
مجرم قیامت کو بھی معاملات دنیا کی طرح خیال کرتے ہوئے مدد کے
طلب گار ہوں گے مگر کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔ ۲۴۶، ۲۴۷

کل یوم ھو فی شان
ایک غلام نے تفسیر کی دن رات کا لانا موت زندگی، غنی و فقیر ۱۱۸

گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے
سیاہ چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ سر سے پاؤں تک جکڑے ہوئے
جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ ۱۲۶ تا ۱۲۹

گروہ السابقون المقربون
سبقت کرنے والے اور معنوی قربت رکھنے والے افراد ۱۶۱

مجالس میں آنے والوں کا احترام
مجلس میں آنے والوں کو بیٹھنے کی جگہ دو۔ اللہ تمہارے لیے جنت
کو وسیع کرے گا۔ ۳۱۵، ۳۱۶

مرج البحرین کی باطنی تفسیر
علیؑ اور فاطمہؑ گہرے سمندر ہیں، حسنؑ و حسینؑ لؤلؤ و مرجان ہیں (صادقؑ) ۱۱۲

مقربین بارگاہ
قرب مقامی جن کے لیے بہشت کی مادی و معنوی سب نعمتیں ہیں۔ ۱۶۴

موت اور بقا
وہ تمام افراد جو اس زمین پر ہیں فنا ہو جائیں گے، ذات خدا باقی
رہے گی۔ ۱۱۳

موت کی حقیقت
جسم و جان کا تعلق ختم ہوتا ہے۔ مردے قبروں سے اٹھیں گے
بوسیدہ ہڈیاں لباس حیات پہنیں گی ۱۸

منافقین
اہل کتاب کافروں سے کہتے ہیں، جب تمہیں مسلمان جلاوطن کریں گے
تو ہم تمہارے ساتھ ہوں گے۔ جنگ میں مدد کریں گے یہ جھوٹے ہیں ۳۶۹
یہودیوں کی فتنہ انگیزی میں منافقوں کی شرکت۔ آپس میں لڑیں تو جنگجو ہیں، یہ
مسلمانوں کے مقابلے میں وحشت سے قلعوں میں پناہ لیتے ہیں۔ ۳۷۰ تا ۳۷۳

مومنین اپنے نور سے استفادہ کریں گے
ایمان و عمل صالح کے انوار مجسم ہو کر قیامت میں مومنین کی رہنمائی
کریں گے۔ ہر مومن کے ایمان کا درجہ الگ ہوگا۔ ۲۴۳ تا ۲۴۶

مہاجرین و انصار و تابعین کے نمایاں اوصاف
گھروں سے نکالے ہوئے مہاجر، جو خدا و رسولؐ کے مددگار ہیں۔
ان کی مدد کرنے والے انصار اور بعد میں آنے والے تابعین ہیں۔ ۳۶۲ تا ۳۶۷

نجویٰ
یہودی خدا اور رسولؐ کی مخالفت میں سرگوشی کرتے تھے، مومنین کو
اس سے منع کیا۔ ۳۱۰، ۳۱۱
مومنین کو رنجیدہ کرنے والا نجویٰ شیطانی ہے۔ علیحدہ ہو کر سرگوشی کرنا
بد اعتمادی پیدا کرتا ہے وغیرہ۔ ۳۱۲
رسولؐ سے سرگوشی کرو تو پہلے صدقہ دیا کرو۔ کیا ڈر گئے ہو فقیر ہو جاؤ گے ۳۱۹ تا ۳۲۲
نجویٰ سے متعلق اہم نکات ۳۲۲ تا ۳۲۴

نعمتوں کی شناخت
معرفت خدا کا زینہ ہے۔ نعمات دنیا سے خالق کی معرفت حاصل کرنا ۱۰۰

نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام
اگر محتضر نیکوکار ہے۔ تو اس وقت راحت و آرام میں ہوگا
اگر گمراہ اور جھوٹا ہے تو دوزخ کے گرم پانی سے تواضع ہوگی ۲۱۰ تا ۲۱۳

نیکی اور نیکی کی جزا

نیکی کا بدل اس سے بہتر نیکی سے کرو (رسول پاکؐ و آئمہؑ) ۱۳۹، ۲۱۱

وسیع و عریض جنت کی طرف سبقت کرو

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا۔ تائب ہونا، گناہ سے پاک ہونا۔

شرائط کے ساتھ، مصیبتیں غافلوں کے لیے ہوشیار رہو کی آواز ہیں۔ ۲۶۲ تا ۲۶۸

وہ گنہگار افراد جنہوں نے آیات کو سن کر توبہ کی

کیا وقت نہیں آیا۔ ایماندار دل خدا کے ذکر سے خوف کھائیں اور ان افراد کی

طرح نہ ہوں جنہوں نے آیات کو سنا مگر دل قساوت پر مائل رہے۔ ۲۵۲ تا ۲۵۴

وہ ہر روز ایک نئی چیز تخلیق کرتا ہے

حضرت ابوذرؓ کو رخصت کرتے وقت امام حسنؑ و حسینؑ و

جناب امیر علیہم السلام کی وصیتیں۔ ۱۱۷

یہود

بنی نظیر کی عہد شکنی، کعب بن اشرف کا قتل، جلا وطنی مدینہ

سے سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۳۴۶ تا ۳۵۱

موجودہ دور میں یہودیوں کی سازش، براہِ راست مقابلہ ہی سے

سازش کا خاتمہ ہوگا۔ ۳۵۲

مقامات

بدیدون : ایک چشمہ کا نام ۲۰۷

جنت : پرہیزگار جنت کے باغوں میں ۴۲

جو اپنے پروردگار سے ڈرے اُس کے لیے جنت کے دو باغ ۱۳۱

اہلِ جنت، بہشت کی راحتوں میں ۱۶۵

جہنم : جس دن جہنم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔

اب جہنم کی آگ کا مزہ چکھو۔ ۷۳

حجر : حجر، قوم ثمود کی بستی، حجاز کے شمال میں واقع ہے۔ ۵۸

عالم برزخ : محتضر کو جو حالات درپیش ہوں گے رُوح و ریحان یا

دردناک سزائیں اُن میں ایک حصہ کا قیامت اور

دوسرے کا قبر و برزخ سے تعلق ہے۔ ۲۱۳، ۲۱۴

عسفان : مکہ کے قریب ایک جگہ ۲۳۶

قشیرہ : وہ علاقہ جہاں بدیدون چشمہ واقع ہے۔ ۲۰۷